خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

# سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

جون 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

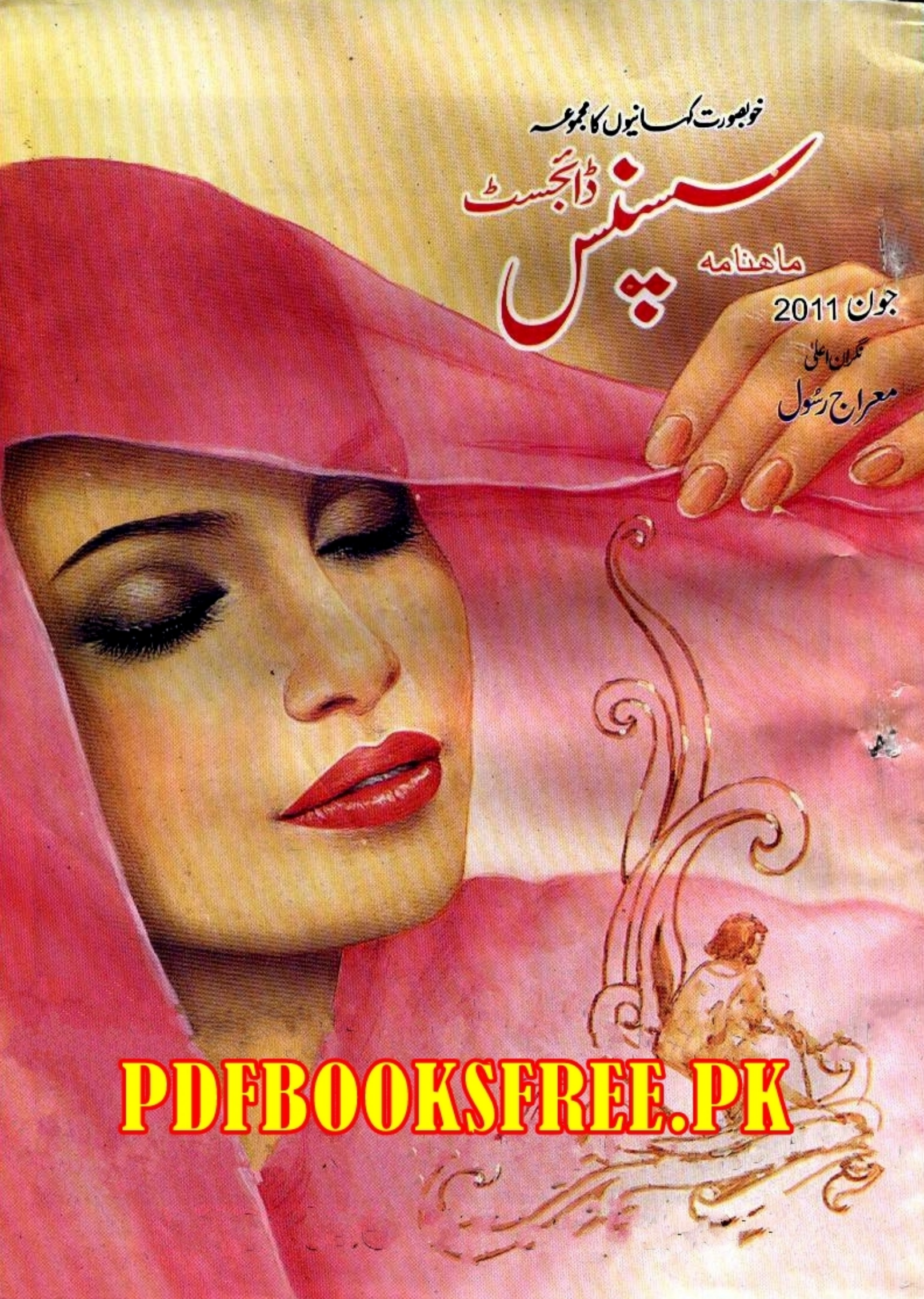

PDFBOOKSFREE.PK

# سسپنس ڈائجسٹ


**11 — انشائیہ** — جون ایلیا
عروس البلاد کراچی میں انسانی خون کی ارزانی پر ایک صاحب دل کا نوحہ

**12 — خطوط** — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی محفلِ مشاورت، قارئین کی تلخ وشیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

**20 — تدبیر بنی تقدیر** — ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

**59 — فرار** — کاشف زبیر
آسمان کی بلندیوں کو چھونے والی نگاہوں کے احساسِ کمتری کا قصہ

**71 — تسلسل** — منظر امام
اے قوم ترے غم پہ روؤں کہ ہنسوں… سیاسی ابتری کا منظرنامہ

**76 — واپسی** — محی الدین نواب
عکس در عکس حیرتوں کا سلسلہ ایک صحرا نورد کی طویل داستان

**123 — شلغم کی چوری کی** — نجمہ مودی
غم روزگار میں مبتلا ایک بہروپیے کا دلچسپ روپ

**138 — کینہ پرور** — ملک صفدر حیات
ایک کریہہ فعل انجام دینے والے شقی القلب مجرموں کی روداد

**167 — شیطان** — تنویر ریاض
خیالات کی ہم آہنگی سے بے خبر ایک مخلص انسان کی مخفی غلاظت

**174 — محفلِ شعر و سخن** — قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق کے ہم آہنگ

**177 — ٹوٹی کہاں کمند** — سلیم انور
عقل سے پیدل چند نادانوں کی نادانی کا قصۂ تمام

**181 — خوب تر** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
پل پل رنگ بدلتی ایک حسینہ کی بے قراری کا احوال

**184 — اناڑی** —
حالات سنگینی اور دریاؤں کی روانی کھلاڑیوں پہ بھاری ایک اناڑی کی کتھا

**221 — تحفۂ رفاقت** — رضوانہ منظر
چاہت کے مہکتے جذبوں سے معطر ایک دلربا کا اندازِ محبت

**229 — حضرت الیسعؑ** — رضوانہ ساجد
قدم قدم پر تائید ایزدی پانے والے نبی کے ماہ و سال کا احوال

**247 — عجیب آدمی** — ڈاکٹر ساجد امجد
محبت کا کاروبار کرنے والے ایک بیوپاری کا ماجرا

**260 — انجانے پہلو** — ایچ اقبال
سنسنی خیز حالات اور معاشرتی استحصال کا شکار ایک حسینہ کی پرفکر داستان

**000 — کترنیں** — ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے اقتباسات، سائنسی اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے



جلد 40 • شمارہ 06 • جون 2011 • زرِسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس: 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

# ایک طور

جون ایلیا

میں گلہ کرتا ہوں، میں لہو میں تھڑا ہوا گلہ کرتا ہوں۔ زندگی اس شہر میں بری طرح بے حرمت ہوئی ہے۔ خوں ریزی کے ان جانے ہنرمندوں نے اس شہر کی زندگی کو بڑی سفاکی سے لتاڑا ہے اور اس شہر کا حلیہ بگاڑا ہے اور اس کی راہوں اور اس کے چوراہوں کو بڑی شقاوت سے جاڑا ہے۔

”جون ایلیا! یہ بات تو تم نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔“

”ہاں، یہ بات میں نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔ اور یہ بات میں آج بھی کہہ رہا ہوں، کل بھی کہوں گا، پرسوں بھی کہوں گا اور کہتا ہی رہوں گا اس لیے کہ جو کچھ ہوتا تھا وہ ہے اور جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ ہوئے جا رہا ہے۔ مجھے اس شہر کے شہریوں کے دکھ جھیلنے کی نوکری ملی ہے۔ اس نوکری سے میرا دل اچاٹ ہوگا تو میں اپنے آپ کو حرام خور سمجھوں گا۔ یہ نوکری پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نے مجھے بڑی بڑی سفارشوں کے بعد دی ہے۔

”ہاں، میں اس شہر کے وجود کے سڑے ہوئے زخموں کا، پھپھوندے ہوئے پھوڑوں کا نوکر ہوں، چاکر ہوں اور یہ نوکری، یہ چاکری میرے لیے بڑی عزت کی نوکری اور بڑے فخر کی چاکری ہے کہ اس کی کوئی تنخواہ نہیں ہے۔ کیا میں زخموں سے، اپنے ہی زخموں سے تنخواہ لوں گا؟ کیا میں پھوڑوں سے، اپنے ہی پھوڑوں سے روزینہ طلب کروں گا؟“

”تم جو ہو یعنی تم! تم بھی عجب ہو اور تمہارا روگ بھی عجب ہے۔“

”ہاں، میں بھی عجب کوئی ہوں اور میرا روگ بھی عجب کچھ ہے۔ مجھے اپنے اس روگ کی پہچان نے دل اور دماغ کی جو صحت بخشی ہے، وہ میری روح کا بہت ہی بڑا ابتلا ہے۔ میں اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتا۔“

”تم اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتے! آخر ایسا کیوں ہے؟“

”ایسا یوں ہے کہ یہ ابتلا میرا، میرا ہی نہیں، ہمارا مقسوم ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ یہی میری بود و نبود ہے۔ ہماری بود و نبود ہے۔

”تو گویا کیا تم نہیں جانتے، کیا تم میری یہ بات نہیں مانتے کہ میں تم میں ایک عمر سے بڑی اذیت ناکی کے ساتھ تڑپایا گیا ہوں۔ پر کسی کے نہ جاننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ مجھے تو اپنے ہوتے اپنے زخموں کو دھونا ہی تھا۔ پر میں ہوں کون؟ یعنی یہ کہ میں ہوں کون۔ میں کوئی بھی تو نہیں ہوں۔ یعنی یہ کہ تم، یعنی یہ کہ میں۔ ہاں، میں اور تم!

”میں اپنے آپ پر اور اس شہر کے شہرۂ آفاق شہریوں پر صبح سے شام تک اتنی بار ہنستا ہوں، اتنی بار ہنستا ہوں اور اتنی بار روتا ہوں، اتنی بار روتا ہوں کہ بس۔ کیا ہماری سرگزشت ایسی نہیں ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے؟“

”ہاں تمہاری سرگزشت ایسی ہی ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے۔“

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اپنے ہونے کا ایسا بھگتان بھلا کس گروہ نے بھگتا ہوگا جیسا بھگتان تم نے بھگتا۔ مجھے تمہارا ہونا ہر لمحہ ہونا بہت ہی اولو اولو لگتا ہے، بہت ہی اولو اولو لگ ہو اور ہرگز نہیں ہو۔

کھڑکی کے باہر رات بلا کی اندھیری ہے۔ جانے اس وقت کیا بجا ہوگا! وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہم ان آوازوں کو اپنے وجود کا لحن کیوں نہ جانیں۔ اپنی نمود کا آہنگ کیوں نہ گردانیں؟ اے گروہ! اگر تیری تہذیب کے سب سے بڑے شاعر میر خسرو اس لحن اور اس آہنگ کو سنتے تو کتنے جاؤ سے سر دھنتے!

”اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیماردار کون؟“

”اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیماردار کون ..... یہی تو کہا تھا تو نے؟“

”ہاں، میں نے یہی کہا اور ایسی اس ہی کو کہا۔“

اس شہر کا کوئی چارہ گر نہیں ہے، کوئی تیماردار نہیں ہے۔ دوسرے شہر اس شہر کی حالت پر بس ترس ہی کھا سکتے ہیں اور اس کے سوا بھلا وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سو وہ ترس کھا رہے ہیں۔ اے ترس کھانے والو! میں تم سے اس شہر کی حالت پر بہت زیادہ ترس کھانے کی بھیک مانگتا ہوں۔ یہ شہر اپنے ہونے کے جس عذاب میں مبتلا ہے، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ پر اس کا اندازہ لگانا اس ملک کی ہر بستی اور ہر شہر کا فرض ہے۔ یہ شہروں کا شہر ہے۔ یہ کسی ایک زبان بولنے والے گروہ کا شہر نہیں ہے۔ یہ تو برادریوں کی برادری کا شہر ہے۔

”اے شہر! یرمیاہ نبی نے یروشلم کا مرثیہ کہا تھا۔ میرا سینہ بھی دکھ سے بری طرح بھرا ہوا ہے۔ میرے پپوٹے بھی سوج گئے ہیں۔ تیری راتیں مجھے بڑی بے رحمی سے جگاتی ہیں۔ تیرے دن مجھے جان لیوا اذیت سے ہلکان رکھتے ہیں۔ تیری گلیاں، تیرے راستے اور تیرے چوک میرے خون سے تھڑے ہوئے ہیں۔ میرا خون میں نہایا ہوا بدن جگہ جگہ پڑا ہوا تڑپ رہا ہے۔ میں جگہ جگہ دم توڑ رہا ہوں۔ آخر میں اپنی لاشیں کہاں کہاں سے اٹھاؤں؟

”میں تجھے پھر سے تازہ دم دیکھنا چاہتا ہوں۔ تجھے ایک نئے انداز کی زندگی سے آراستہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔ میری اس بات کو دھیان دے کر سننا اور وہ یہ کہ زندگی ایک طور کا نام ہے۔ نفس کے ایک طور کا نام ہے۔ تو بہت ہارا مارا ہے پر دیکھنا نفس کے اس طور کو بھی نہ ہارنا۔“



سوناگھاٹ کا پجاری، انکا، افابل!...

جیسی یادگار اور سدابہار داستانیں جو آج بھی قارئین کے دلوں میں زندہ ہیں ہوش ربا، پرتحیر، پرتجسس اور سنسنی خیز کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

کے قلم سے
ایک نئی
سلسلے وار،
دلچسپ کہانی

کشکول

بہت جلد ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ میں پیش کی جارہی ہے

ازل سے برسرِ پیکار، خیر و شر کی متضاد قوتوں کی آویزش کی داستان

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
created by asifzamil

عزیز قارئین
السلام علیکم!

جون 2011ء ..... کا شمارہ موسم گرما کی طرح تمام لوازمات کے ساتھ حاضر ہے۔ سیاسی ماحول کی گرمی اور ارباب اختیار کی سرد مہری..... متضاد صورت حال کا یہ امتزاج اب ہمارے ملک کا طرۂ امتیاز بنتا جارہا ہے۔ جس ملک کی معیشت کو زنگ لگ جائے اور روزگار کے دروازوں پر تالے ..... تعلیمی رستوں پر جال اور ذہنوں میں جالے لگ جائیں ..... جہاں تعصبات کی دیواریں اونچی ..... غربا یتیموں کے مانند بے بس ..... امرا پتھروں کی طرح بے حس ہو جائیں۔ جہاں طاقت کا منبع دولت اور ہتھیار کو سمجھ لیا جائے وہاں کا موسم تو دسمبر میں بھی جون کی طرح تپتا ریگستان بن جاتا ہے کیونکہ سیاسی ماحول میں درجۂ حرارت بڑھ جانے کی وجوہات تو ہر وقت ہمارے پاس موجود رہتی ہیں.....

جون کا مہینا ہمارے لیے بے شمار مصائب اور مسائل کا مہینا بنتا جارہا ہے جس میں بجٹ کی آمد، بجٹ کا اعلان اور اس کا اطلاق..... ان تمام مراحل میں عوام کو ہی تختۂ مشق بنایا جاتا ہے..... بہر حال ان مصائب کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خبر یہ بھی ہے کہ صومالی بحری قزاقوں کی قید میں گرفتار پاکستانی کپتان اور دیگر افراد کی رہائی کے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں اور جب تک یہ سطور آپ تک پہنچیں گی، انشاء اللہ وہ آزاد ہو چکے ہوں گے..... اب ہم بھی آزاد ہوتے ہیں اپنے ذہنی دباؤ سے اور چلتے ہیں اپنی خوشگوار محفل کی جانب جہاں نہ کبھی مہنگائی ہوتی ہے نہ دہشت گردی اور نہ ہی کسی بجٹ کی آمد کا خوف.....

✠ **محمد شکیل حیدر دواسو جھنگ (پنجاب)** سے ''لیجیے صاحب کوئی آئے نہ آئے میں تو آ گیا، میں اس بار بھی شاید نہ آتا مگر آپ نے دھمکی دی تھی کہ نہ آئے تو ''سسپنس'' وارنٹ جاری کر دیے جائیں گے اس لیے حاضر ہوں (بہت خوب) اس بار ''سسپنس'' 16 تاریخ کو ملا۔ سرورق انتہائی سادہ تھا تاروں کی جھلمل میں حسینہ خود اپنے اندر ایک کہانی چھپائے کھڑی تھی۔ مختصر آیہ کہ اس کے محبوب کے والدین رشتہ لے کر آئے ہوں اور گھر والوں نے ہاں کر دی ہو، چہرے پر بھی معصوم اور پاکیزہ مسکراہٹ دلکشی میں اضافہ کر رہی تھی۔ جون صاحب نے انشائیہ بہت اچھا لکھا۔ حقیقت ہے کہ ہم ابھی تک بھی ہر غلامی کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے، وہ ہمیں ہر بار جھنجھوڑنے کی کوشش تو کرتے ہیں۔ وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ پتھر کے صنم پیار کے قائل نہیں ہوتے۔ ہمایوں سعید صاحب آپ کو مبارکباد کہ آپ کو کرسیٔ صدارت ملی ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ کرسی نہ تیری ہے نہ میری ہے جو بھی اس پر بیٹھے والا بدل جاتا ہے پتا نہیں کتنی بار کس کو ملے؟ (یہ تو حقیقت ہے) روشنی صاحبہ شکریہ کہ آپ نے اپنی جھلک تو دکھائی، دکھ بھی ہوا کہ ڈاک کے ہرکارے آپ کی اور ہماری ملاقات کی راہ میں دیوار بنے رہتے ہیں۔ دلنشین بلوچ صاحبہ لیجیے ہم آپ سے دوستی کر لیتے ہیں ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیجیے گا۔ کچھ دوست میرے تبصرے تو بہت پسند کرتے ہیں مگر میرا پورا نام نہیں لکھتے تو ان سے گزارش ہے کہ ''محمد'' میرے نام کا پہلا حصہ ہے وہ بھی ساتھ ضرور لکھا کریں کیونکہ

میں جو اک برباد ہوں آباد رکھتا ہے مجھے
دیر تک اسم محمد شاد رکھتا ہے مجھے

کہانیوں میں سب سے پہلے مقدر آزما پڑھی، کاشف صاحب نے حق ادا کر دیا۔ کہانی میں سب کچھ تھا۔ سنسنی، مزہ بھی ہم جولی بھی، مقدر اور تدبیر کا جھگڑا بھی، بالآخر تقدیر نے وکی اور میریا کو نئی زندگی دی۔ انہی صفحات پر اختر شاہ کا چٹکلا بھی بہت پسند آیا۔ ''جب استاد نے سکھ اسٹوڈنٹ سے پوچھا کہ پانی میں رہنے والے پانچ جانداروں کے نام بتاؤ تو اس نے جواب میں کہا۔ ''مچھلی اس کی ماں اس کا باپ اس کی بہن اور اس کا بھائی۔'' بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد منظر صاحب کی ''کون'' پڑھی۔ محبت اور قربانی کی یہ مختصر مگر پر اثر کہانی میں شاید ساری زندگی فراموش نہ کر سکوں۔ یہ تو ضرور سنا تھا کہ لوگ عورت کے لیے قتل کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں مگر دوست کی محبت کے لیے اتنی بڑی قربانی کی مثال شاید اس سے پہلے نہ سنی نہ پڑھی۔ ''سیر انتقام'' بھی ایک اچھی تحریر تھی اگرچہ لکھنے والے نئے تھے مگر کہانی لکھنے کا انداز ویرانوں جیسا ہی لگا۔ غضب خدا کا چھ عورتوں کا قاتل ایک ہی شخص نیری اوینش تھا مارک نے کمال عقلمندی سے یہ معمہ صرف آٹھ گھنٹوں میں حل کر دیا (پاکستانی پولیس والے کہاں ہیں) ''سچی توبہ'' بھی ایک اچھی تحریر تھی۔ مرزا صاحب کی تعریف میں اب کیا کہیں سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ''ہیرا کانچ'' ایک زبردست کہانی تھی۔ جواد نے خاندان کی خاطر نورین کو چھوڑ دیا حالانکہ وہ بے چاری اسے دل و جان سے اپنانے کو تیار تھی۔ کیا ہم منافقت کی زندگی جیتے ہیں، جواد نے اپنے بٹوے میں نورین کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ نورین نے کمرا اس کی تصویروں سے سجا رکھا تھا۔ دونوں کے دلوں سے محبت نہ نکل سکی تو پھر وہ اپنی اپنی زندگی کیسے ایمانداری سے گزاریں گے؟ واہ ری محبت! تیرے کتنے رنگ ہوتے ہیں۔ محفل شعر و سخن میں محمد قاسم (خوشاب) کا شعر بہت پسند آیا۔ شعر یہ تھا

انا کا مسئلہ درپیش ہے ورنہ حقیقت میں
اسے میری مجھے اس کی کمی محسوس ہوتی ہے

ابن خلدون کے بارے میں ضیا صاحب کا مضمون بہت معلومات افزا تھا حیرت ہے کہ اتنے عظیم لوگوں کو آغاز میں کتنی مشکلات اور آزمائشوں سے



گزرنا پڑا۔ پانچ دریاؤں کی بیٹی ایک دل کو ہلا دینے والی تحریر تھی۔ تحریر اس کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ ہماری بے حسی کی انتہا ہے۔ ''حضرت ایسع'' رضوانہ صاحبہ کی اچھی تحریر تھی۔ ایک دوست نے جو تجویز دی تھی کہ اسلامی سلسلے کی کہانی ایک ہی بار ساری شائع کر دی جائے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا ہر بار اسلامی مواد چھپتا رہے تو ایمان تازہ رہتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے جیسا کہ پہلے ہے۔ ''درمیانی حل'' مغرب سے درآمد شدہ ایک اچھی تحریر تھی جسے مریم کے خان نے بہت خوبصورتی سے نبھایا۔ قسمی دنیا کے دھوکے اور بے حسی اس کہانی کا موضوع تھا۔ جیکسن نے ایملی کو ربی کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا کیونکہ ربی حق پر تھی۔ ''فاصلوں کا قرض'' بہت ہی خوبصورت کہانی تھی۔ رشتے بعض اوقات کتنے نازک موڑ پر پہنچ جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ابھی ٹوٹ جائیں گے مگر کچھ لوگ اپنی جان کی قربانی دے کر ان رشتوں کو ٹوٹنے اور لوگوں کو بکھرنے سے بچا لیتے ہیں۔ نعیمہ ناز نے 22 سالہ رفاقت کے باوجود اپنے خاوند پر شک کرنا شروع کر دیا۔ فرحان نے گھر کے ماحول کو ذہن پر سوار کر لیا۔ اسی پریشانی میں وہ بے چارا ایک حادثے میں مارا گیا لیکن یہ حادثہ اس کے والدین میں دوبارہ قربت کا سبب بنا۔ شہلا بے چاری کو بھی خدا کی مرضی ماننا پڑی۔ کہانی کے انجام نے رلا دیا کوئی بتائے کہ فرحان کا کیا قصور تھا، اس بے چارے کو کیا ملا ہر بار تقدیر ہی کیوں جیت جاتی ہے؟ مستقل سلسلے اور کامل ناول ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اب بھی اگر میرا خط ردی کی ٹوکری کی زینت بنا تو پھر قیامت تک کے لیے خدا حافظ۔ ویسے میرے ساتھ آج تک بھی ایسا ہوا نہیں کہ میرا خط.....'' (جو کبھی نہیں ہوتا وہ بھی نہ کبھی ضرور ہو جاتا ہے..... لہٰذا ہمت مرداں مدد خدا)

✠ **ماہا ایمان، حافظ آباد** سے چلی آرہی ہیں۔ ''آپ اور آپ کے ادارے کے تمام اراکین کی شب و روز محنت کے نتیجے میں ایک خوبصورت چہرے اور بہترین کہانیوں سے سجا ماہنامہ سسپنس اپنے مقررہ وقت پر آن پہنچا۔ حسینہ خوشگوار تاثرات چہرے پہ سجائے سرورق پر موجود ہے۔ محترمہ گو کہ تنہا ہیں لیکن یہ تنہائی ہمیں منظور ہے کہ ہم سرورق پہ خون ریزی اور آلات تشدد برداشت نہیں کر سکتے۔ ذاکر انکل کے پر امن پیغامات ہم تک تو پہنچ رہے ہیں۔ کاش وہ تمام اقوام عالم تک پہنچ جائیں، یوں تو پورے ملک کی مجموعی صورت حال قابل رحم ہے لیکن کراچی میں تشدد کی لہر نے پھر سے جنم لیا ہے جگہ جگہ فائرنگ اور ٹارگٹ کلنگ کے واقعات نے معصوم شہریوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ اس ساری صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ شاید ہم میں سے کسی کے پاس جواب نہیں۔ بقول شاعر

تخت و تاج کی دنیا میں بس چہرے بدلے جاتے ہیں
کب حالات بدلتے دیکھے پل پل کے بدلاؤ میں

ناول دیکھنے کے بعد تین چار کاوش پھلانگ کے محفل کا رخ کیا۔ سب سے پہلا نمبر جون ایلیا صاحب سے ہوا جن کا انشائیہ سونا چاندی اگل رہا تھا۔ اب یہ جس کا نصیب ہو وہ اسے حاصل کرلے۔ وننگ سیٹ پر ہمایوں سعید موجود ہیں۔ موصوف کا پچھلی بار کا جلنا کڑھنا کام آ گیا ہے۔ ابرار احمد ساقی آپ تو دلوں کے حال جان لیتے ہیں کہیں اسٹارز خوانی سے فال تو نہیں نکلواتے۔ دھیان رکھنا انجم بھی وہی نہ ہو۔ دلنشین آپ مجھے اسی لیے دلنشین لگتی ہو کہ تعریف کرنے میں کنجوسی نہیں کرتی ہو، سو ہاؤس آف یو۔ قربتی میں اپنے پچھلے الفاظ واپس لیتی ہوں کہ آپ تو خاصے جوہر شناس نکلے۔ مرزا طاہر الدین بیگ آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں پھر آپ کا شکریہ ادا کروں۔ ایم ذیشان اے میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی، آپ نے پہاڑ بنا دیا اور پھر خود ہی کھودنا شروع کر دیا اور مجھے یقین ہے کہ نکلے گا چوہا ہی۔ محمد نعمان پیارے مجھے پتا نہیں تھا کہ کمپیوٹر اور موبائل تمہاری ایجاد ہیں ورنہ میں تم سے ضرور جلتی، لگتا ہے تمہاری اوپری منزل کے کرائے دار مکان خالی کر گئے ہیں۔ رضوان تنولی بھائی میرے آپ ہنڈرڈ اینڈ ٹین پرسنٹ غلطی پر ہو۔ روشنی رشید کا دوستوں کو مشورے دینا اور عہد گزشتہ کو آواز دینا اچھا لگا اور آنٹی جی، میں آپ سے ناراض ہوں آپ کے حساب سے تو پھر ہم بھی چٹکلی مچھیر چھاڑ اور نوک جھوک کرنے والے سلجھے ہوئے لوگوں کی فہرست سے ہی خارج ہیں۔ حالانکہ یہ ہم اس محفل کو چٹپٹی اور کھٹی میٹھی بنانے کے لیے ہی تو کرتے ہیں۔ خطوط کی محفل اور محفل شعر و سخن کے لیے دعا ہے کہ یہ یونہی برقرار رہیں۔ ورنہ حوادث زمانہ، حالات کی ستم گری اور زمانے کے گورکھ دھندے کب کسی کو سدا خوش گفتار رہنے دیتے ہیں۔ محمد عقیل چٹھہ اور محمد حسین اکبر کے اشعار قابل تعریف ہیں۔ کہانیوں کی تلاطم خیز دنیا میں سب سے پہلے کاشف زبیر کی ''مقدر آزما'' نے ہماری بھٹکتی ہوئی نظروں کو جکڑا۔ یہ سچ ہے کہ کبھی تدبیر سے تقدیر بنتی ہے تو کبھی تقدیر سے تدبیر کا کام بنتا ہے۔ وکی کو بھی بالآخر حالات کے تھپیڑے کھانے کے بعد تقدیر کا قائل ہونا پڑا۔ میریا کے خیالات کی پختگی وکی کی رہنمائی کا باعث بنی۔ عمدہ تاثراتی تحریر تھی۔ دلیسی میں نئے کردار شامل ہوئے ہیں اور پرانے پس پشت چلے گئے ہیں۔ روحانی علاج کی بدولت منوہر کا علاج کامیاب رہا۔ تھری ایس وقت سے پہلے ہی ندا جیسی بچی کو کندن بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اناڑی اس دفعہ سست رفتار لیکن تھرلر رہی۔ نور جہاں کی واپسی ہنگامہ خیز رہی۔ شہلا کا اغوا اور پھر بازیابی خاصی ڈرامائی تھی۔ آخری طویل تحریر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''فاصلوں کا قرض'' تھی جو خاصی حساس نوعیت کی تحریر رہی جس کی بنیاد ایک نازک سے نقطے سے اٹھائی گئی تھی۔ فرحان جیسے حساس نوجوان آج کل بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ فرحان کے ڈیڈی کو خاتون کے ساتھ تعلق کو واضح کرنا چاہیے تھا لیکن وہ انا کی دیوار بلند رکھنے کی خاطر بیٹا کھو بیٹھے۔ بابائے تاریخ ابن خلدون جو اپنے علمی اور تاریخی کارناموں کی وجہ سے مشہور ہیں زندگی بھر عجیب و غریب واقعات و حالات کا شکار رہے لیکن مقدمہ ابن خلدون سے شہرت دوام پائی۔ بیگ صاحب کی ڈائری ہمیں گزشتہ سے پیوستہ واقعے کے اہم تر حادثے سے متعارف کرا گئی۔ سچی توبہ ایک نئے واقعے لیکن پرانے انداز پر مشتمل تھی سالے صاحب نے بہن کو قتل کر کے بہنوئی کو پھنسانے کی

خوب خوب کوشش کی مگر بے نقاب ہوگیا۔ سلیم انور کی رہائی میں مارتھا کے غیاب کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ فریڈ نے تو "خس کم جہاں پاک" سوچ کے اطمینان کی سانس لی۔ نظارت نصر کی ترجمہ تحریر سرد انتقام میں میری اونیل چھ عورتوں کو مار بیٹھا لیکن اپنی سابقہ بیوی مارتھا کو ڈھونڈ کے نہ مار سکا۔ مغربی دنیا میں کچھ بھی ہونا ممکن ہے۔ "ہیرا کا تاج" میں مجھے جواد پر بہت غصہ آیا۔ بھلا جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس گننے سے فائدہ۔ بے چاری نورین کو بیچ راستے پر لا کے چھوڑ دیا۔ یہ ہوتے ہیں مرد خود چاہے زمانے بھر کی غلاظت میں لتھڑے ہوں۔ بیوی پاکیزہ ہی چاہتے ہیں۔ "پانچ دریاؤں کی بیٹی" میں نذیراں کے ساتھ بہت برا ہوا۔ حیرت ہے ایسے ماں باپ پر جو پیسوں کی خاطر بیٹیوں کو جہنم میں جھونک دیتے ہیں۔ مریم کے خان کی "درمیانی حل" اسکی ماریان نے رینی کا حق غصب کرنے کی کوشش کی جسے جان نے درمیانی حل نکال کے تصفیہ کرایا۔"

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ "اول نمبر آنے والا تبصرہ لائق تحسین تھا، ہمایوں سعید صاحب آپ کے اسم گرامی کے ساتھ جو "راج" کا لاحقہ لگا ہوا ہے وہ کون سا راج ہے، راجپوت والا۔۔۔ راج ہنس والا یا پھر راج مستری والا، وضاحت فرمائیں۔ گر یہ گستاخی ہو تو معافی کا طلب گار ہوں۔ راج کی مناسبت سے آپ کو ایک ماہ کی راجدھانی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بھائی رضا دی گریٹ میں نے کشمیر دیکھا ہی نہیں، میرا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ رہی بات گاڑھی اردو کی تو بھائی کسی ادبی جریدے کو خط لکھنا ہو تو تہذیب اور شائستگی کو مقدم رکھنا ہوتا ہے، بس اتنی سی بات ہے۔ دلنشین صاحبہ کا مشکور ہوں انہوں نے اس احقر کا تبصرہ پسند فرمایا۔ اشعار کی محفل میں اس بار سب سے خوبصورت شعر روشنی رشید صاحبہ کا تھا۔ محمد اسماعیل اجاگر کا چاؤ بھی مسحور کن تھا۔ حسنین عباس اور تفسیر عباس کے قطعات بھی بہت دلسوز تھے، ان سب کو داد دیتا ہوں۔ اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ "کابل تا دکن" تاریخی معلومات کے ساتھ بہت سی ڈھکی چھپی باتوں سے بھی آگاہی ہوئی جس سے میں ناآشنا تھا۔ "مقدر آزما" جو لوگ غیبی طاقت پر یقین نہیں رکھتے وہ یہ کہانی ضرور پڑھیں، مسبب الاسباب پر ایمان پختہ ہو جائے گا۔ "واپسی" اور "اناڑی" اپنے اپنے ڈھب پر بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں، دونوں کا اختتام دل دہلانے والا تھا۔ "رہائی" اچھی نہیں لگی۔ "سچی توبہ" بٹ صاحب کی پچھلی کہانی "جھوٹی گواہی" کا تسلسل ہے، یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ بھی بٹ صاحب ایسا منفرد انداز اپنائیں گے۔ عدالتی کارروائی میں لطف آگیا۔ پانچ دریاؤں کی بیٹی نے کافی متاثر کیا۔ غیر ملکی کہانیوں میں سب سے بہترین کہانی "درمیانی حل" تھی۔ "سرد انتقام" تو بس گزارا تھی۔ "ہیرا کا تاج" اس سے ملتی جلتی ایک کہانی سسپنس میں پہلے بھی چھپ چکی تھی۔ "ابن خلدون" پڑھ کر بالکل لطف نہیں آیا۔ اس میں جا بجا تشنگی پائی گئی، ایسا لگ رہا تھا یہ کسی تاریخ داں کا لکھا ہوا مضمون ہے۔ پھر بھی دل کے بہلانے کے لیے پاشا یہ بیان اچھا ہے۔ "فاصلوں کا قرض" کہانی الم ناک اور دل فگار تھی، اسے پاکیزہ میں لگنا چاہیے تھا، اسے پڑھ کر خواتین گریہ زاری کرتی رہیں گی۔"

✠ فہیم تبسم، شورکوٹ سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ "نہ چاہتے ہوئے بھی خط لکھ رہا ہوں۔ 15 اپریل کو نماز فجر کے لیے میرے والد محترم نے بستر کیا چھوڑا یہ دنیا ہی چھوڑ دی اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ شدید علالت میں ایک عرصہ گزارنے کے بعد وہ زندگی کی بازی ہار گئے اور میری اشکبار آنکھوں کے علاوہ 19 سال کی کچی عمر میں ہی ناتواں کندھوں پر ڈھیر ساری ذمہ داریوں کا بوجھ رکھ گئے (اللہ آپ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین) جس دن ان کی وفات ہوئی سسپنس بھی اسی دن موصول ہو گیا تھا۔ زیادہ لمبا تبصرہ نہیں کروں گا۔ جون صاحب کا انشائیہ ہمیشہ کی طرح سوچ و فکر پر مبنی تھا۔ ہمایوں سعید راج مجھے کسی بھی طرح صدارت کے حقدار نہیں لگ رہے تھے لیکن جیسے آپ ترتیب دیتے ہیں ہم قبول کرتے ہیں۔ روشنی رشید ذرہ نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ الحاج محمد اسحاق! آپ کا تبصرہ تھا تو مختصر لیکن جید درجید دلچسپ تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ بھرپور اور دلچسپ تبصرے کے ساتھ آیئے۔ رضوان تنولی کا تبصرہ بھی بہت اچھا تھا۔ حسنین عباس! آپ مسلسل لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں۔ فراز کا غصہ بجا! مصروفیت اور والد محترم (مرحوم) کی علالت کے باعث غائب تھا۔ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی تحریر پڑھنے کے بعد "واپسی" اور "اناڑی" پڑھی۔ ادارے اور مصنف کی جانب سے غیر فطری واقعات شامل کرنے پر معذرت تھی لیکن میں یہ کہوں گا کہ فرضی داستانوں میں ایسے واقعات دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ عمیر بن غازی کی محبوبہ کے انتقال پر ملال تھا۔ اناڑی میں نور پاکستان پہنچ گئی اور راجا بزمی شخصیات سے نکلے کو ملوا کر نئے نواب کو پیش پیش کرنے میں مصروف ہے۔ بقیہ تحریروں میں منظر امام کی "کون" انوکھی طرز تحریر تھی۔ سلیم انور کی "رہائی" میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ "سرد انتقام" میں محبت میں ناکامی کا بدلہ لینے والا اسیری بہت سفاک ثابت ہوا۔ معلوماتی مضمون "ابن خلدون" ڈھیروں معلومات پر مبنی مضمون تھا۔ "پانچ دریاؤں کی بیٹی" تڑپا دینے والی تحریر تھی۔ شوبز سے وابستہ "درمیانی حل" بھی تقریباً اچھی تحریر تھی۔"

✠ محمد اسماعیل اجاگر، پنڈی گھیب ضلع اٹک سے محفل میں تشریف لائے ہیں۔ "اس دفعہ اپنے شہر میں سب سے پہلے "سسپنس" ہم نے لیا۔ پہلے رسالے بہت لیٹ ملتے تھے۔ اب وقت پر ملتے ہیں۔ وقت کی پابندی سے معیار بڑھتا ہے چیزوں کا بھی اور انسانوں کا بھی۔ سب سے پہلے تحریر "کون" پڑھی۔ اگر ہم ادب کے ڈائریکٹر ہوتے تو اس کہانی پر منظر امام صاحب کو ایوارڈ دیتے۔ دوستی، چاہت، محبت اسی کا نام ہے۔ اس کے بعد "ہیرا کا تاج" پڑھی۔ بہت ہی عمدہ تحریر لگی۔ محبت چنگاری کی طرح سلگتی رہتی ہے بلکہ سلگاتی بھی ہے۔ "سرد انتقام" کچھ خاص کہانی نہیں تھی۔ ویسے کہانیوں کی تعداد کم ہوتی ہے البتہ "رہائی" مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ صاحب جب بھی



کوئی تحریر لے کر آتے ہیں۔ دکھی کر جاتے ہیں۔ "پانچ دریاؤں کی بیٹی" ایک ایسی ہی افسردہ تحریر تھی۔ جس معاشرے میں انصاف نہ ہو۔ وہ معاشرہ جنگل بن جاتا ہے۔ اللہ کی رحمت اٹھ جاتی ہے۔"

✠ ایم ڈبل اے، مانسہرہ سے آئے ہیں۔ "مئی 2011ء کا شمارہ خلاف معمول 20 اپریل کو ملا۔ اس دفعہ سرورق خوب رہا۔ جون ایلیا کے درس میں حاضر ہوئے جہاں انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ حالت زار کا بہترین نقشہ کھینچا۔ بلاشبہ آزادی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ آپ کے خط میں سب سے پہلے محترم مدیر اعلیٰ کا موجودہ بیماریوں پر تبصرہ۔ ایک ماہ کے لیے صدر محفل ہمایوں سعید راج تساں مبارکاں! اور رہی بات ایم ڈبل اے کی تو اسے سمجھنے کے لیے ڈبل ایم اے کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا نسرین صاحبہ کو جواب..... اچھا لگا اور آپ کا تبصرہ بھی شاندار رہا۔ روشنی رشید جی! ہم بھی آپ سے متفق ہیں۔ یقین جانیے جو جذبات آپ کے ہیں وہی ہمارے۔ جب سسپنس دیکھتے ہیں اور بالخصوص "آپ کے خط" پڑھتے ہیں تو دل سے سسپنس کی پوری ٹیم کے لیے دعا نکلتی ہے کہ انہوں نے اپنی کاوشوں اور انتھک محنت سے ہمیں سسپنس جیسا معیاری رسالہ فراہم کیا۔ ساقی جی! کافی سے بھی زیادہ خوش ہیں بھئی کون ہوگا جو محفل آپ کے خط میں حاضری لگوائے اور خوش نہ ہو۔ رضوان تنولی گریٹ دی جی! آپ کا تعلق مانسہرہ کے گاؤں گریڑے سے ہے شاید.....؟ اور میرا نام چھوڑو یار نام میں کیا رکھا ہے.....؟ قرۃ جی! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ طاہرہ جی، حلوہ اکیلے ہی کھا لیا، حصہ کہاں ہے.....؟ سعید عباسی صاحب وعلیکم! میرے پیارے نام سے پڑھا لکھا کوئی نہیں لگتا اگر لگتا ہے تو آپ ڈبل ایم اے رکھ لیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، حسب معمول اپنی فیورٹ "اناڑی" سے کی جس کے لیے اتنا ہی کہ قسط شاندار رہی۔ واپسی بھی اچھی رہی اور شاید رد و بدل کرنے سے کچھ اور بہتر ہو جائے۔ مختصر کہانیوں میں کاشف زبیر صاحب "مقدر آزما" لائے۔ پڑھ کر تقدیر پر ایمان اور مضبوط ہوا۔ منظر امام صاحب کی "کون" میں ہم یہ فیصلہ تو نہیں کر پائے کہ بڑا کون تھا وجاہت یا نصرت؟ لیکن اتنا ضرور کہیں گے دونوں نے سراسر نادانی اور غلط فیصلہ کیا۔ نظارت نصر کی "سرد انتقام" بھی زبردست رہی اور اینڈ توقع کے خلاف شاکنگ رہا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی "ابن خلدون" نے تاریخی معلومات میں اضافہ کیا۔ "ہیرا کا تاج" محمد زبیر سلیمانی کی اچھی کہانی تھی لیکن اینڈ بہت زیادہ مغموم کر گیا۔ اسٹوری آف دی منتھ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی "پانچ دریاؤں کی بیٹی" رہی۔ انسان کے بھیس میں شیطان نے ایک معصوم لڑکی کی خوابوں اور سپنوں بھری زندگی کو اجاڑ ڈالا۔ "حضرت المسیح" پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ مریم کے خان کی "درمیانی حل" بھی ٹھیک رہی۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی "فاصلوں کا قرض" لائے زبردست ڈاکٹر صاحب! واقعی کوئی انسان کسی بھی معاملے میں اگر انا کے خول میں بند ہو جاتے تو پھر لچک پیدا نہ کرنے کی وجہ سے فاصلوں کا قرض چکانا ہی پڑتا ہے۔"

✠ رضا دی گریٹ، سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ "سرورق کی حسینہ کو دیکھا لیکن ہم اس پر تبصرہ نہیں کر سکتے کیونکہ حسینہ ایک ہوتی ہے اور تبصرہ کرنے والے کئی لوگ اس لیے یہ کام نعمان پیارے کے سپرد کرتے ہوئے جون ایلیا کو کراس کیا اور سیدھا اپنی محفل یاراں میں پہنچے۔ کرسی صدارت پر ہمایوں سعید راج کو پایا۔ بھائی ہماری طرف سے مبارکباد وصول کرنا۔ تبصرہ اچھا تھا۔ مدیرہ جی آپ سے ایک درخواست ہے کہ اگر سرگودھا والوں کے خط اکٹھے اوپر نیچے شائع کر دیے جائیں تو کیا بات ہے۔ نعمان پیارے ہمیں اپنا ایڈریس لکھ دو میں آپ کو مٹھائی بھیج دوں گا۔ رضوان تنولی گریڑوی کا خط پڑھا۔ تو اس جملے پر بے اختیار ہنسی آئی جس میں انہوں نے ڈبل ایم اے سے سیدھا نام لکھنے کی درخواست کی تھی۔ پلیز ڈبل جی سیدھا سیدھا بتاؤ آپ کون ہو۔ حسنین بلوچ جی یہ کیا آپ ہر بات پر جنیل کا ذکر چھیڑ دیتے ہو۔ اللہ آپ کو ہاں نصیب فرمائیں۔ ماہا جی پھر غائب۔ بی بی کدھر ہو، آپ کے بنا محفل بہت خوبصورت لگتی ہے ادھری رہنا۔ (خبردار جو ایسی کوئی بات کی!) طاہرہ جی یہ لڑکیاں سچ کیوں نہیں بولتیں۔ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ آپ لڑکیوں سے جیلس نہیں ہوتیں۔ ذرا سی کسی لڑکی کے سامنے کسی اور لڑکی کی تعریف کرو تو پھر بس جلنے کی بو آنی شروع ہو جاتی ہے۔ اس بار سب سے اچھا تبصرہ نعمان پیارے اور رضوان گریڑوی کا تھا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ تو پہلے اناڑی میں بھاگے۔ بلاک بسٹر پرفارمنس راجا کی رہی۔ باقی کہانی اچھی تھی۔ ذرا اس کو رفتار دیں۔ اس کے بعد واپسی پڑھی۔ اس کے بعد فاصلوں کا قرض پڑھی مگر مدثر حسن سب کچھ پہلے بتا دیتا تو اپنے بیٹے کو نہ کھوتا۔ بہرحال کہانی اچھی تھی۔ تاریخی کہانی پڑھی تو دل خون کے آنسو رویا۔"

✠ سعید عباسی، بہاول پور سے تشریف لائے ہیں۔ "مئی کا شمارہ 17 تاریخ کی کڑاکے دار دھوپ کے ساتھ مارکیٹ میں آ گیا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ ٹائٹل پر موجود لڑکی بڑے ادب کے ساتھ شرمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلتے ہیں ہم اپنی گلابوں سے بھی محفل کی طرف جہاں ہم نے جلدی جلدی ورق گردانی کی اور ہم کامیاب رہے، ہمارا خط 16 نمبر پر تھا۔ یقین کریں بڑی خوشی ہوئی۔ اس بار کرسی صدارت پر ہمایوں سعید راج جو کہ راج کر رہے تھے۔ روشنی رشید جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ آپ کا اصل نام یہ نہیں کوئی اور ہے، ابرار احمد ساقی زیادہ خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی۔ حسنین عباس بلوچ تو کیا دلنشین نے۔ اپنی کوئی نشانی بتائی تھی کیا؟ یہ ضرور بتانا کیا نشانی تھی ان کی۔ طاہرہ یاسمین آپ نے تو خط میں پورے خاندان کی تفصیل بتا ڈالی۔ رضا دی گریٹ ایسا ہوتا ہے پوسٹ کی نااہلی کی وجہ سے۔ نعمان پیارے ہم نے جو بویا وہ تو کاٹنا پڑے گا جب حکمران صحیح نہیں ہوں گے تو عوام کیا کرے گی اب تو خدا ہی کوئی ایسا جلوہ دکھائے کہ کوئی نیک حکمران آئے اور

رعایا کو خوش حال کردے۔ ماہا ایمان کی کمی محسوس ہوئی۔ اب کچھ کہانیوں پر بھی نظرِ ثانی ہوجائے اس بار ہم نے جو سب سے پہلے پڑھا وہ ڈاکٹر شیر شاہ سید کا لکھا ہوا قصہ۔ پانچ دریاؤں کی بیٹی حالاتِ حاضرہ پر لکھی گئی کہانی اچھی تھی اور ہاں آج کل کے وکیل تو دعا مانگتے ہیں کہ ایسا کوئی کیس آئے جس سے ان کی جیبیں بھر جائیں۔ زبیر سلمانی کی ہیرا کانچ پڑھی۔ محبت نام ہی ایسی چیز کا ہے کبھی اس گھر تو کبھی اس گھر محبت تڑپاتی ہے اور کہیں محبت رلاتی ہے۔ دوستی کے نام پر جو کہانی منظر امام نے لکھی کیا خوب تھی۔ نصرت نے دوستی کا حق ادا کر دیا لیکن وجاہت کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اسے شادی کر لینی چاہیے تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی فاصلوں کا قرض پڑھی۔ اچھی کاوش تھی۔ شہلا اور فواد کا کردار اچھا لگا۔ اس بار محفلِ شعر و سخن میں جو شعر تھے سارے ہیرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے لیکن ہمیں جو شعر پسند آیا۔ وہ ہے محمد عقیل چیمہ حافظ آباد کا۔ اس بار کاشف زبیر نے بھی کیا خوب کہانی لکھی مقدر آزما سطر بہ سطر اپنے سحر میں جکڑ لینے والی کہانی تھی۔ تقدیر کے فیصلوں کو تقدیر والا ہی بہتر جانتا ہے۔ خدا جب وسیلہ کرتا ہے تو انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد بالی وڈ کی دنیا کے گرد گھومتی مریم کے خان کی درمیانی حل داستان پڑھی جو ایک انتھک محنت کے بعد کہانی کے روپ میں آئی۔"

✠ حمیرا رضا، لاہور سے آرہی ہیں۔ "بہت سے مصروفیت بھرے روز و شب گزرتے ہی جوں ہی فرصت کا احساس ہوا ایک بار پھر سسپنس کی دنیا میں قدم رکھنے کی جسارت کر دی۔ اس بار بے ساختہ ہی ٹائٹل دل کو چھو گیا۔ جون ایلیا سے ملاقات کی۔ محفلِ خطوط میں حسنین عباس بلوچ بھائی کا خط دیکھا اور پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی۔ بھیا آپ نے تو جیل کا حلیہ ہی بدل دیا جیسا کہ آپ نے بتایا ایسا ہی پرامن ماحول ہوتا ہے کیا؟ ڈاکٹر ساجد امجد کے ساتھ ایک بار پھر تاریخ کا سفر کیا وہی سازشیں، تخت و تاج کی ہوس اور انجام سب کے سامنے۔ منظر امام نے بہت ہی دلگداز تحریر کا تحفہ دیا بہت عرصہ تک یاد رہنے والی تحریر تھی یہ۔ مرزا امجد ایڈووکیٹ صاحب نے نظامی کی سچی توبہ کے باعث اس کا کیس لیا اور کیا خوب لیا۔ امین الدین کی کمینگی پر بہت افسوس ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی فاصلوں کا قرض لے کر آئے، کہانی بہت بہت شاندار رہی۔ فرحان نے موت کو گلے لگا کر والدین کو ایک بار پھر ملا دیا۔ بڑا ہی المیہ موضوع تھا۔ اعتماد، بھروسا، مان اب زندگی کے ہر شعبے سے ناپید ہوتا جا رہا ہے جیسا کہ فرحان کی فیملی کو بھگتنا پڑا۔ کاشف زبیر کی مقدر آزما زبردست رہی۔"

✠ امتیاز احمد زریاب، نامعلوم مقام سے لکھتے ہیں۔ "حسینہ ٹائٹل کو کسی کے تصور میں ہنستا چھوڑ کر ترتیب فہرست کو سراہتے ہوئے انشائیہ میں پہنچے جہاں جون ایلیا غلامی کا رونا رو رہے تھے، نصیحتوں سے مستفید ہوتے ہوئے انجمن کہکشاں میں پہنچے۔ ہمایوں سعید راج کرسیِ صدارت پر براجمان تھے جناب مبارک۔ تبصرہ بہت اچھا تھا خاص طور سے صنفِ مخالف کے لحاظ سے تو بہت ہی زبردست تھا۔ ہمایوں سعید، ابرار ساقی، رمضان پاشا، ایم ڈبل اے آپ سب کا شکریہ آپ نے ہمیں ویلکم کیا۔ روشنی رشید صاحبہ باتیں آپ کی سلجھی ہوئی لگیں، عادتیں بچوں والی جن سے بچپنا جھلکتا ہے۔ رمضان پاشا اور ابرار ساقی نے تبصرہ پسند کیا شکریہ۔ معاشرتی تقسیم والی بات دل کو چھو گئی۔ اسحاق صاحب کا تبصرہ تو راہٹ کے تھا اچھا اسٹائل تھا۔ رضوان بھائی آپ نے تو صنفِ مخالف کی واٹ لگا دی، مزہ آگیا۔ دلنشین بلوچ صاحبہ کا لگتا ہے پچھلا خط اس مہینے شائع ہوا جس میں وہ اپنی ہم صنف ماہا کا قصیدہ پڑھ رہی تھیں۔ قریشی صاحب صنفِ مخالف کی واٹ لگائی وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ صنفِ نازک کی خوشامد چنگی گل نہیں ذرا دھیان کرو۔ طاہرہ جی بھائیوں کی خدمت کی جاتی ہے کروائی نہیں جاتی۔ سعید عباس اچھا ہوا کہ آپ کو صرف گمان گزرا کہ حسینہ آپ کو دیکھ رہی تھی ورنہ شام کو گھر سے۔۔۔ نعمان پیارے کیا خوب یار آپ کی مردم شماری فارسیٹڈیز فنٹاسٹک، مزہ آیا۔ سب سے پہلے اناڑی پڑھی اچھی رہی مگر ابھی ابھی البتہ ناصر کی صورت میں ایک اور اچھا دوست رفیق کو مل گیا۔ واپسی بھی زبردست رہی مگر آخری لمحے بہت سسپنس ڈالا گیا۔ درمیانی حل، ہیرا کانچ سب کہانیاں اچھی تھیں۔ آخری صفحات پر فاصلوں کا قرض اچھی کہانی تھی مگر فرحان کی موت کی ذمہ داری مدثر حسن پر جاتی ہے اگر وہ اسی وقت یہ بات شیئر کر لیتے تو فرحان نہ مرتا۔ محفلِ شعر و سخن میں سحر ملتان کا شعر اچھا لگا۔"

✠ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ سے چلے آرہے ہیں۔ "دلکش رنگوں سے مزین سرورق نہایت دل آویز اور جاذبِ نظر تھا خوبرو حسینہ۔۔۔۔ یقیناً ہماری طرح کسی نہ آنے والے کی یادوں میں گم ہیں۔ جون ایلیا کا پراثر انشائیہ دعوتِ فکر دے گیا۔ آپ کے خط میں آپ کی فکر انگیز باتیں۔۔۔۔ پاکستان بصد خلوص ہار گیا۔۔۔۔ اب کیا پتا کہ چولی کے نیچے اور پردے کے پیچھے کیا ہے۔ بہرحال قبر کا حال تو قبر کا باسی ہی جانتا ہے۔ بنوں سے ہمایوں سعید، مسندِ خلافت پر براجمان تھے بہت زیادہ مبارکاں۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان بھلا ہمیں کیا ضرورت ہے آپ سے اپنی عمر چھپانے کی۔ آپ نے بھی پوچھا ہی نہیں جناب بہرحال آپ کے دل کی تسلی کے لیے تحریر کیا جاتا ہے کہ 12 مئی کو زندگی کی اس قید و بند میں ہمیں پورے 29 سال ہو جائیں گے اور پھر۔۔۔۔؟ لاہور سے سیدہ نسرین آپ اریقہ بخاری کو تمغۂ جرأت دے رہی ہیں وہ جو عجلت میں یوں جوتے جنگل میں چھپا کے بھاگیں کہ اب تک بھاگتی پھر رہی ہیں۔ مسندِ وزارت پر۔۔۔۔ لوڈشیڈنگ کے اندھیروں میں روشنی رشید کی آمد بھی خوب رہی آپ سے کس نے کہہ دیا کہ دوشیزہ سرورق سبزی والے سے بھاؤ تاؤ کر رہی ہیں یہ کام تو آپ جیسے بزرگ راہنما کرتے ہیں۔ کراچی سے پاشا جی ایسی آنکھوں کو احمد فراز کی طرح غور سے اور گھور کر مت دیکھا کریں آپ کسی کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوب گئے تو تبصروں کی یہ تاریخ کون رقم کرے گا۔ ادریس خان آپ بزمِ یاراں سے دامن بچا کر چل نکلے ہو سکتا ہے چلمن کی اوٹ سے کوئی آپ کا ہی منتظر ہو۔ سرگودھا سے حسنین عباس بلوچ ہم آپ کو ہمیشہ پرخلوص دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں آپ کے شب و روز کا احوال قابلِ تحسین ہے کہ آپ اس دارالاحساب میں



رہ کر بھی اخلاقی اقدار کے پابند ہیں۔ ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ آپ کے جواب نے ہمیں کافی سے زیادہ متاثر کیا۔ واقعی سیب کا بھاؤ سن کر منہ میں گھاؤ ہو جاتا ہے لیکن آپ احتجاج کے طور پر جتنے بھی شلجم کھالیں سیب سستا نہیں ہوگا۔ کھوڑہ سے قریشی بھی یا ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہو گیا۔ اب دوشیزہ سرورق ہوتی ہی ایک ہے تو کیا کریں یہ بے چارے دل جلے۔ رضوی گریٹ آپ نے گھٹنوں کے مسموم ماحول میں جینے کا عزم کیا اور اللہ نے آپ کی مدد بھی کی۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ خطبہ سے بہت پیارے نعمان پیارے دعوتِ فکر دے رہے تھے۔ اس ملت کا کیا ہوگا جس کے مقدر اور مستقبل کے فلک کا ستارہ ماہ وش ہوگا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے سب سے آخری تحریر فاصلوں کا قرض سے آغازِ مطالعہ کیا۔ یہ کوئی اتنی خاص اور ناقابلِ برداشت بات نہیں تھی جسے صیغۂ راز میں رکھ کر مدثر حسن نے اپنے گلشن کو نوچ کے رکھ دیا۔ فرحان کی دلخراش موت نے منتشر خاندان کو یکجا کر دیا لیکن کیا وہ کبھی اپنے آپ کو معاف و مطمئن کر پائیں گے؟ اناڑی کی 61 ویں قسط گویا پانچ سال اور ایک مہینا مکمل ہونے لیکن بلی ابھی تھیلے سے باہر نہیں آئی ہو سکتا ہے بلی تھیلے میں ہی دم گھٹنے سے وفات پا چکی ہو۔ سید صاحب کی درد انگیز تحریر پانچ دریاؤں کی بیٹی، ایک دلخراش واقعہ تھا۔ افلاس کے تپتے آنگن میں بکی ایک اور مجبور لڑکی پامال ہوئی۔ تاریخی تحریر کابل نا وکن، ڈاکٹر ساجد امجد کی بہترین تحقیق ثابت ہوئی۔ خونی رشتوں کی تذلیل کا جگر فگار قصہ مرزا امجد بیگ کی تحریر گئی تو بہ نہایت متاثر کن رہی۔ امین الدین جیسے لوگوں سے یقیناً انسانیت بھی دامن بچا کر چلتی ہے۔ حضرت المسیح ایک اور ذی مرتبت نبی کے شب و روز و ماہ و سال کا دلچسپ احوال، ایمان تازہ ہو گیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ابن خلدون معلومات میں گرانقدر اضافہ ثابت ہوئی۔ کاشف زبیر کی انتہائی موثر کاوش مقدر آزما بیشک وہی ربِ عظیم ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے۔ منظر امام کی سبق آموز تحریر کون خاص خالص اور بے لوث دوستی کا عمدہ و نایاب نمونہ۔ ہیرا کانچ راہِ محبت میں درپیش مسائل کا قصہ مغموم کر گیا۔ مریم کے خان کی درمیانی حل نارمل اور درمیانی سی مگر دلچسپ تحریر تھی۔ آخر میں بہت زیادہ مبارک، بہت پیارے دوست، این ایس آر عدیل ڈوگر کو جو کہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔" (مبارکاں)

✠ حسنین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تبصرہ کرتے ہیں۔ "مئی کا شمارہ بائیس تاریخ کی صبح آٹھ بجے جیل ملازم سے منگوایا۔ کیونکہ ہماری ٹیم میچ ہار گئی تھی غصہ اس بات کا بہت تھا تب ایک خوشی کی لہر بن کر سسپنس ہماری آنکھ کا تارا راج دلارا آیا۔ تمام غم بھول کے دوشیزہ پر سرسری نظر دوڑائی۔ اس کے بعد محفلِ یاراں میں اپنے قدم رکھے یہ جان کر اطمینان نصیب ہوا کہ ہمارا خط باخیر و خوبی ادارہ تک پہنچ گیا۔ تھینکس گاڈ، کرسیِ صدارت پر ہمایوں سعید راج صاحب براجمان تھے بھائی مبارک باد ہمیں تو کرسی لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دلنشین جی ساڈا وی لگا جیا سلم ہو وے آپ نے شلجم کب سے کھانے شروع کر دیے ہیں ویسے بی پی کو کافی حد تک کنٹرول رکھتے ہیں اپنی صحت کا خیال رکھا کریں اگر کہیں تو ایک عدد لوڈر ٹرک سرگودھا سے بھجوا دوں شلجم کا، سال بھر خوب گزرے گا۔ آپ کا شعر بھی دل کو بھا گیا آپ کا تبصرہ آپ کی طرح خوبصورت تھا۔ تعجب آپ کے نام کی طرح ماہا ایمان اس مرتبہ بلیک لسٹ میں بھی نظر نہیں آئی کیا بابر صاحب کا جادو چل گیا ہے محترم بابر صاحب آپ کے خط تو شامل نہ ہو سکے پر آپ کو میرا مودبانہ سلام عرض ہو۔ ماہا ایمان جی حافظ آباد میں گندم کی کٹائی شروع ہو گئی ہے شاید آپ مصروف ہوں، ہاں جی بہن حمیرا رضا جی تساں کتھے گئے ہو بلیک لسٹ میں بھی کوئی اتا پتا نہیں۔ داتا صاحب جا کے میرے لیے یعنی اپنے بھائی کے لیے دعا کرنا اور انشاء اللہ آزادی ملی تو میں خود حاضری دوں گا۔ طاہرہ یاسین جی اب تو آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ اے جے کیسانہ کیوں نہیں لکھ رہا وہ اب شاید بخیر و خوبی آزاد ہو کے گھر چلے گئے ہیں یہ میرا خیال ہے شاید ایسا نہ ہو امید یہی ہے۔ محمد فراز کاٹھیہ صاحب بھائی بہوں چنگا لکھیا نے۔ اوساڈا گریٹ بھائی آپ نے اپنے تبصرے میں یاد بھی نہیں کیا۔ بے رخیاں اچھا تو بھائی ڈبل اے ایم صاحب کیوں بھائی آپ حکومت کو مطلوب ہیں جو اپنا نام نہیں لکھا۔ محترم آغا فرید احمد خان تسی دی جی اس واری گنڈی تو راجہ ہو یاں دوچ پاے ایڈووکیٹ چودھری آصف میسیال صاحب محترم میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سوہنڑاں آپ کو اس بیماری سے نجات دلائے (آمین) روشنی جی آج کل تو دنیا پوری رات روشنی کے لیے ترستی ہے اللہ پاک ساڈے پاکستان نوں ہمیشہ تابندہ و درخشاں اور حفظ و امان میں رکھے۔ سب سے پہلے اناڑی پڑھی نواب صاحب کی جائداد ہماری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔ راجا صاحب دی تے رفیق صاحب مزاحیہ باتوں میں بڑا لطف آتا ہے۔ واپسی اپنے سفر پر رواں دواں ہے۔ اچھے ٹکڑوں زیادتی ہوگی غازی ساڈا شیر اے۔ مقدر آزما کاشف زبیر کے قلم سے لکھی گئی داستان کبھی نہ بھلانے والی ہے۔"

✠ سعید احمد، راولپنڈی سے محفل میں تشریف لائے ہیں۔ "میں عرصۂ دراز سے جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ گو کہ آج کل صرف سسپنس ہی کا مطالعہ کرتا ہوں۔ پچھلے تقریباً چار یا پانچ ماہ سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ قسط وار "اناڑی" کا رنگ پھیکا ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے سے اناڑی میں مزاح ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر گھسیٹا جا رہا ہے۔ مختار راجا کا رفیق کو "ٹھیکے پتر" کہنا۔ راجا یہ اندازِ بیان اختیار تو کرتا ہے لیکن بعض اوقات بے تکا محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح ریشم کے کردار کو خاصہ بدل دیا گیا ہے۔ اب نہ تو وہ شوخ و چنچل نظر آتی ہے اور نہ ہی۔۔۔ انگریزی بولتی ہے۔ اسی طرح غنی کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے اور تو اور خود رفیق کے کردار میں بھی پھیکا پن آ گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس ضمن میں ضرور کچھ تدابیر کریں گے۔ (آپ کی شکایت نوٹ کر لی گئی ہے) اب چلتے ہیں سلسلہ وار واپسی کی طرف۔ اس داستان کی رفتار تو ٹھیک ہے اور آہستہ آہستہ یہ داستان توسیع بھی اختیار کر رہی ہے لیکن کچھ واقعات، کردار کا بیان ادھورا رہ جاتا ہے جیسے عمیر کے دشمن بیٹوں کے متعلق گزشتہ معلومات یہ تھیں کہ وہ کوئی خزانہ تلاش کر رہے تھے اور کسی ملک میں گئے تھے اس کے بعد عمیر صاحب تو انڈیا ایسے معروف ہوئے کہ ان کو بیان کرنا ہی بھول گئے اور اچانک کسی دن وہ پھر زندہ ہو جائیں گے۔"

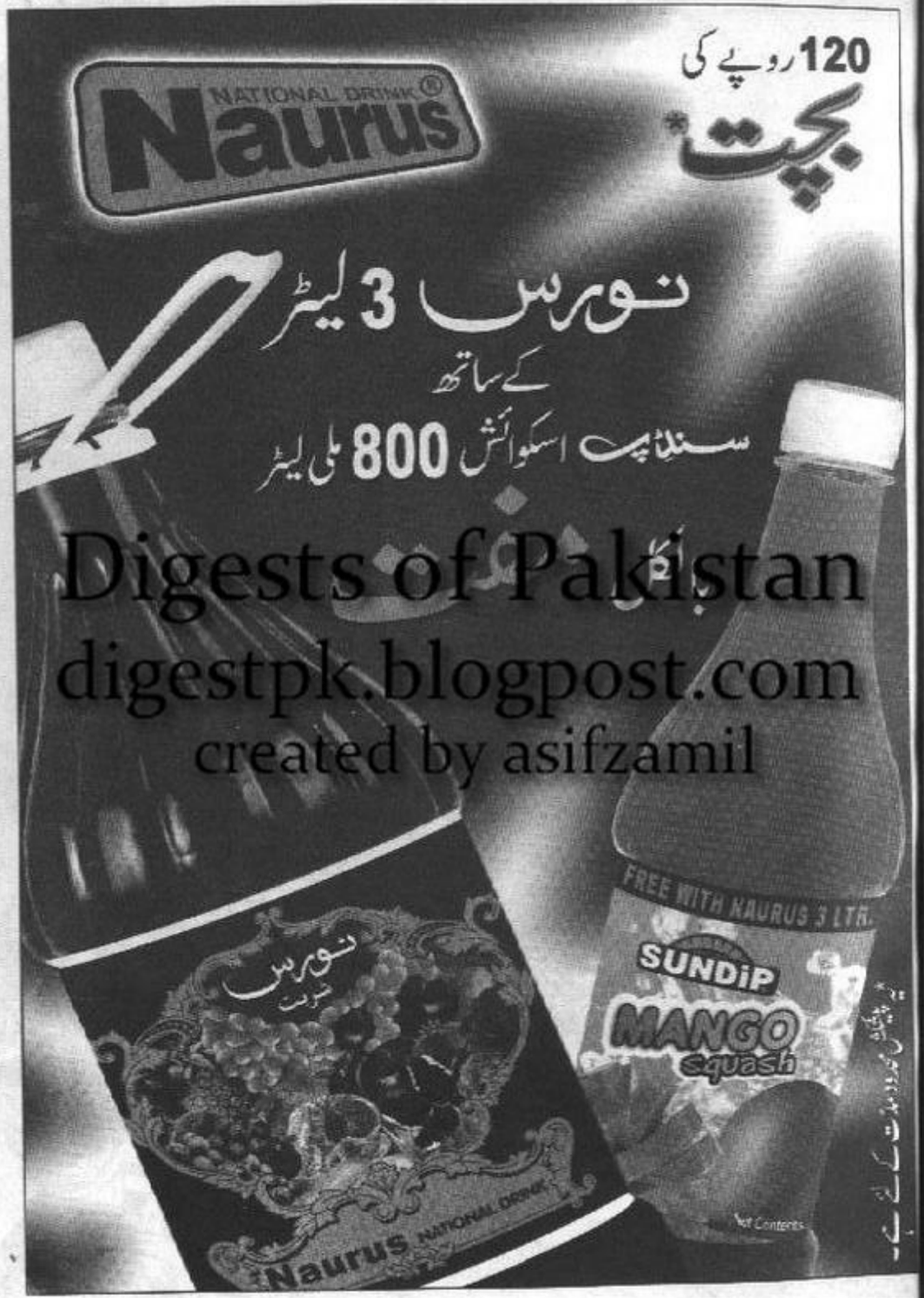

Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

✠ قمر تقی، کہوٹہ راولپنڈی سے کہتے ہیں۔ ''مئی کا شمارہ 17 اپریل کو خریدا۔ سرورق بس گزارے لائق ہی تھا۔ پچھلے چند مہینوں سے ایک ہی حسینہ مختلف پوز دے رہی ہے۔ محفل میں پہنچے تو ہمایوں سعید راج کو کرسی صدارت پر فائز دیکھا جو کہ خود اپنے آپ کو عقلمند ثابت کرنے پر بضد ہیں۔ روشنی صاحب نے آتے ہی وزارت پر قبضہ کرلیا اور سب صنف وجاہت کو دام کرنے لگیں۔ بہت مختصر وقفے کے بعد ادریس احمد صاحب بھی گھر کو لوٹ آئے۔ امتیاز احمد صاحب! پرنس و بادشاہت کا زمانہ گیا اب خیر سے ''جمہوریت'' کا دور ہے اور جہاں تک بات ہے پرنس تنویر کی! تو وہ ''ابھی بچہ ہے جی!'' رضوان تنولی! آپ نے واقعی غرور نہیں کیا بلکہ احسان جتلا دیا۔ دلنشین بلوچ کی توبا تمیں (عرف بیگمیاں) سن کر تو بڑے سے بڑا عقلمند انسان اپنے ہوش و حواس کھو دے۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ! خط تو آپ کا چھپا اور حلوہ بھائی نے بنایا؟ 9 بجے شمارہ لایا اور بارہ بجے اس نے آپ کو حلوہ کھلایا مطلب یہ کہ وہ تین گھنٹے تک حلوہ ہی بنا تا رہا؟ ایم ڈبل اے کا تبصرہ جاندار تھا۔ تفسیر عباس بابر کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سب سے پہلے ''کابل تا دکن'' پڑھی۔ شاہ عالم نے اچھی حکومت کی لیکن اس نے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اہمیت نہ دی جس نے آگے جاکر مسلمانوں سے حکومت چھین لی۔ ''مقدر آزما'' میں وکی نے بہت کوشش کی لیکن جب تک قدرت ساتھ نہ دے انسان کچھ نہیں کرسکتا۔ ''کون'' ایک بہترین کہانی تھی۔ ''واپسی'' میں غازی صاحب تو غار میں روپوش ہو گئے لیکن عمیر اور یعقوب پر لڑکیوں کی بارش بدستور جاری ہے جبکہ مشکلات بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ ''سرد انتقام'' ایک اچھی کہانی تھی جس میں بے چاری مصنفہ جس کو شہرت کا بے حد شوق تھا اپنی ہی موت کی کہانی لکھ بیٹھی۔ ''سچی توبہ'' ایک بہترین کہانی تھی لیکن اب بیگ صاحب کی کہانیوں میں یکسانیت سی لگتی ہے۔ ''ہرا کانچ'' اسٹوری آف دی منتھ تھی۔ دونوں کو ان کے حالات نے مجبور کردیا لیکن نور ین نے بھی بتا دیا کہ طوائف بھی ایک عورت ہوتی ہے جس کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ کہانی نے دل کے تاروں کو چھولیا۔ ''ابن خلدون'' بھی ایک معلوماتی تحریر تھی۔ ''اناڑی'' میں بھی ٹھیکے کی لاٹریاں لگ رہی ہیں۔ آخری صفحے ایک بار پھر تجسس چھوڑ گیا۔ میرے خیال میں فون زوہیب یا رابعہ کا ہوگا۔ ''پانچ دریاؤں کی بیٹی'' معاشرے کے تلخ ترین پہلو کو اجاگر کرتی ہوئی نظر آئی جسے ہم بھی جھٹلا نہیں سکتے۔ ''حضرت السیح'' پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ''درمیانی حل'' ان لوگوں کے لیے سبق تھا جو اپنا سارا کام ماتحتوں سے کروا کر کریڈٹ خود لے جاتے ہیں۔ ''فاصلوں کا قرض'' ایسی کہانی تھی جس میں والدین کی ہٹ دھرمی اور انا پرستی نے ایک حساس نوجوان کی خوش و خرم زندگی تاریک کردی۔ یہ کہانی تمام والدین کے لیے نمونہ عبرت ہے۔''

✠ سید شاہد علی شاہ، لاہور سے چھپے آ رہے ہیں۔ ''ماہ اپریل کا سسپنس میں نے بڑی چاہت اور توجہ سے پڑھا۔ قارئین کے خطوط پڑھنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اب سسپنس مقررہ تاریخ سے دس پندرہ دن پہلے ہی بک اسٹالوں پر آجاتا ہے۔ دراصل میں نے حال میں ہی لگ بھگ پانچ چھ سال کے وقفے کے بعد سسپنس سے دوبارہ ناتا جوڑا ہے۔ اس جریدے سے ہماری دیرینہ یادیں وابستہ ہیں۔ ''دیوتا'' نئی نئی شروع ہوئی تھی اور سیاسی اعتبار سے وہ پاکستان کا ایک پرآشوب زمانہ تھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد ان دنوں مغلیہ تاریخ پر کام کررہے ہیں۔ ہمارا شوق صرف پڑھنے کی حد تک تھا۔ خط لکھنے اور تبصرہ کرنے کی طرف رغبت نہ تھی۔ مئی کے شمارے میں ''پانچ دریاؤں کی بیٹی'' نم آنکھوں سے پڑھی اور نجانے کتنی دیر دل شکستگی کا عالم رہا۔ ''فاصلوں کا قرض'' ایک خوبصورت اور دلگداز کہانی ہے۔ خونی رشتوں کی باہمی چاہت و محبت کے ساتھ ساتھ انا پرستی سے مغلوب جذبات بیان کرتی یہ تحریر آخر میں المیہ رنگ اختیار کرگئی۔''

✠ سید محی الدین اشفاق، لیہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ ''مسلسل تین دن چکر لگا کر سسپنس ملا۔ اپنا نام بلیک لسٹ میں مل گیا۔ ہمایوں سعید بنوں کی سوار میرے والد صاحب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ مبارک باد قبول کریں۔ روشنی رشید صاحبہ! آپ کا تبصرہ پڑھ کر یوں لگا گویا کوئی نصیحت آموز سبق پڑھ رہے ہوں۔ ابرار احمد ساقی میرا مقصد صوبائیت یا علاقائیت پھیلانا نہیں ورنہ میرے بزرگ انڈیا سے ہجرت کرکے اس پاک وطن بھی نہ آتے۔ حسنین عباس ہوچ صاحب آپ جیل میں ہو دکھ ہوا۔ بھائی قمر تقی اصل میں یہ بات سچ ہے وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ اسی لیے ہم تو کسی حسینہ پر مرتے ہیں۔ طاہرہ یاسمین حلوہ کیسے ہی کھالیا؟ کچھ بزم میں بھی بھجوا دیتیں۔ نعمان پیارے، سوچ میں بھی نہیں پڑتا ہوں، دوسروں کو سوچنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ ایم ڈبل اے کیا انگریزوں والا نام رکھا ہے آپ کے گھر والے غصے میں کیا کہہ کر پکارتے ہیں آپ کو؟ ویسے آپ کی بات سے متفق ہوں۔ سب سے پہلے ''اناڑی'' پڑھی۔ کہانی ایک ہی جگہ گھوم رہی ہے۔ اگر نور کی جگہ ڈاکٹر شہلا کو کردیا جائے تو کہانی میں کچھ مشرقی پن آجائے گا۔ اینڈ میں آنے والا فون میرے خیال میں شاہی بادشاہ کا ہوگا۔ ''واپسی'' میں نواب انکل نے کمال کردیا تھری ایس کے نوجوان ہوتے ہوتے کہیں ہم نہ بوڑھے ہوجائیں۔ تھری ایس کا بیٹا یعقوب بھی میدان جنگ میں آچکا ہے۔ ''پانچ دریاؤں کی بیٹی'' پڑھ کر دکھ ہوا مگر یہ المیہ ہمارا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اس قسم کا ظلم ہو رہا ہے۔''

اور اب ان قارئین کے نام جن کے نامے شامل محفل نہ ہوسکے۔

ریحانہ ضمیر عباس، وچھپہ دھنی۔ فوجی اے ایس بیگی، آزاد کشمیر۔ سید شکیل حسین کاظمی، اسلام آباد۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔ غلام یٰسین، جناح کالونی۔ پرنس تنویر احمد، دادو۔ علی آتش، ملہ آباد، ضلع قصور۔ محمد نعمان پیارے، ایس اے کنگ، جہلم۔ راجا ثاقب نواز ثاقب مدنی، ساہیوال۔ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی۔ حسنین احمد مدنی، ابو سعید تنولی، نعمان سعید، شیر وان۔ راناادیب الرحمن، سینٹرل جیل فیصل آباد۔ ظفر عباس، سرگودھا۔ ڈاکٹر وسیم خالد گبیان، گجرات۔ ہمایوں سعید راج، بھوں۔ عبدالناصر مغل، ابو ظہبی۔ عطیہ کاظمی، گلشن اقبال، کراچی۔ طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔

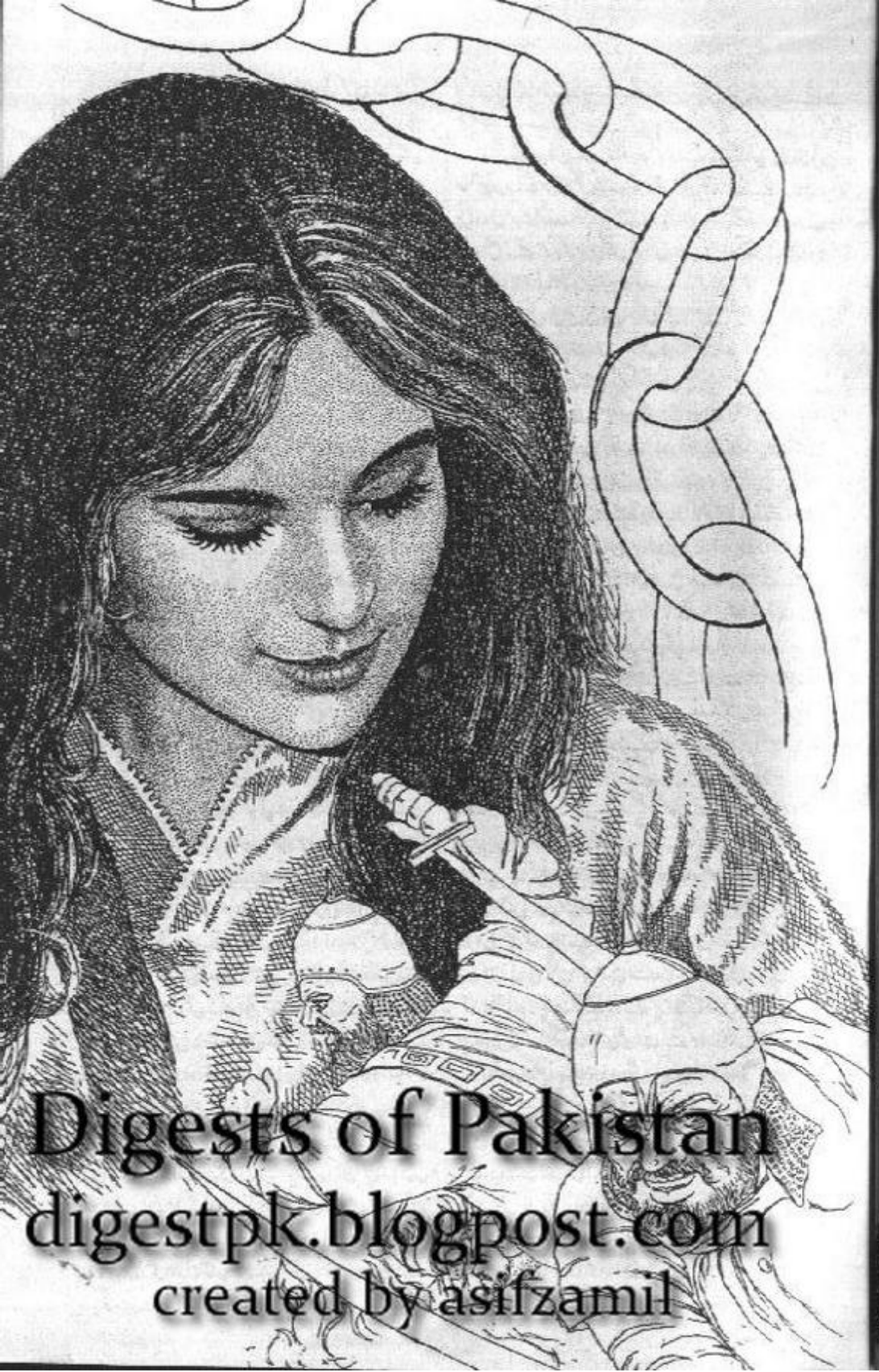

Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

# تدبیر بنی تقدیر

ڈاکٹر سید جداامجد

تاریخ کا ایک سنہری باب... شاہ جہاں جب دربار میں آتا تو رعبِ شاہی سکوت بن کر پہرا دیتا... بڑے بڑوں کے سر جھک جاتے... مگر وائے ری قسمت، جو کل تک شہنشاہِ ہند تھا، آج قیدیوں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ گویا شہنشاہوں کی بے بسی گردشِ زمانہ کی غماز ہوتی ہے۔ ممتاز محل کی آنکھیں جب داراشکوہ کے چہرے پر آئیں تو جانے کیوں ان سے پیار و خلوص روٹھ گیا... صرف معائلت رہ گئی... مشہور ہے کہ ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے... یہاں تو چار دعویدار تھے... اور پھر تدبیر نے تقدیر پر یوں تحریر کیا "اورنگزیب، دکن میں تمہارے کارناموں کو مغلیہ تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی... جاؤ ہم نے تمہیں بادشاہت دی..."

زندگی میں کچھ مقام ایسے بھی آتے ہیں جب تھکن دیوار سے دھوپ کے مانند اترتی ہے۔ لہٰذا جنگی چالیں چلتے چلتے بالآخر مخالفین نے بھی ایک دن تسلیم کرلیا کہ روشن وہی ہوتا ہے جو روشنی کے نیچے بیٹھا ہو۔ بادشاہت کے کھیل میں... سازشوں کی بھیڑ میں رشتوں کی بازیاں لگتی رہی ہیں... لگتی رہیں گی... ہار اور جیت کا فیصلہ نہ کبھی ہوا ہے... نہ کبھی ہو سکے گا۔ کیونکہ بادشاہت تو فقط ایک دائرہ ہے اور دائرے کا کوئی سرا نہیں ہوتا۔

**ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات**

شاہی جھروکے میں سونے کی بنی ہوئی کرسی صاحب نشست کے انتظار میں تھی۔ خوبصورت کنیزیں جن میں ہر ایک چندے آفتاب، چندے مہتاب تھی، دورویہ صفوں میں آنے والے کے استقبال کے لیے آنکھیں بچھائے کھڑی تھیں۔ آپس میں ہنسی تھی نہ ٹھٹول۔ سب کی سب گردنیں سینوں پر رکھے فرش کی نگرانی پر مامور تھیں۔ آنکھیں فرش پر کان آہٹ پر تھے۔ رعب شاہی سکوت بن کر پہرا دے رہا تھا۔ آنکھوں کو ڈر تھا کہ اٹھ نہ جائیں، سانسیں خوف زدہ تھیں کہ خاموشی آواز نہ بن جائے۔

دروازے پر موجود گرز بردار کی آواز گونجی۔

''جنبش مکن۔ ہوشیار باش، سجدے میں نگاہ رہے۔ تمام ہوش وخرد پیش بادشاہ رہے۔ آقائے ولایت ستاں تاجدار ہندوستاں۔ مالک تاج وتخت، خوش بخت ابوالمظفر شہاب الدین شاہ جہاں شہنشاہ والاشان کی سواری جلوہ افروز ہوتی ہے۔''

باہر نقیب کی آواز گونج رہی تھی، اندر سکوت مزید گہرا ہوگیا تھا۔

ٹمالِ حکومت اور امرا کے جھرمٹ میں شہنشاہ اندر داخل ہوا۔ اس کا میانہ قد تھا اور رنگ گندمی۔ پیشانی کشادہ اور بھویں ابھری ہوئی۔ ناک کسی قدر جھکی ہوئی مگر سیدھی، آنکھیں چمکدار اور پتلیاں سیاہ تھیں۔ چہرے پر متشرع مسلمانوں کی طرح دراز ڈاڑھی۔

شہنشاہ بے شمار زمرد، موتی اور دوسرے جواہرات سے آراستہ، کرسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ امرا کے زریں لباس عجیب دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ کنیزوں کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی، گردنیں تک خم ہوگئیں۔ یہ فرشی سلام تھے جو بادشاہ پر نچھاور ہو رہے تھے۔

دو خاص کنیزیں آگے بڑھیں۔ شہنشاہ کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں میں حمائل کیے اور سہارا دیتے ہوئے زرنگار کرسی تک لے آئیں۔ شاہ جہاں رونق افروز ہوا۔ اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کو ہوا میں بلند کیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ استقبال ہو چکا۔ غیر ضروری کنیزیں جھروکے سے باہر جاسکتی ہیں۔ یہ کنیزیں پشت کیے بغیر الٹے قدموں چلتے ہوئے جھروکے سے باہر چلی گئیں۔ صرف دو کنیزیں رہ گئیں جو شاہ جہاں کے دائیں بائیں کھڑی تھیں۔ کرسی کے پیچھے درباری امرا باادب کھڑے تھے۔ کرسی کے سامنے بڑی بڑی رکابیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں قیمتی زر وجواہر، ہیرے، نیلم، یاقوت اور سونے کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ یہ ان لوگوں پر نچھاور کیے جانے تھے جو اس جشن میں شریک تھے جو جھروکے کے نیچے میدان میں بپا تھا۔

نیچے میدان میں زربفت کم خواب کے شامیانے طلائی حاشیوں سے مرصع گل گشت کا منظر پیش کر رہے تھے۔ امرا، ہزاروں عام لوگ اور اراکین دربار اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع تھے جو کچھ دیر میں شروع ہونے والا تھا۔ بادشاہ کا انتظار تھا جواب جلوہ گر ہو چکا تھا۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی ہاتھیوں کی لڑائی کا جشن منعقد کیا گیا تھا لیکن اس مرتبہ کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام شہزادے، دور سے نہیں بلکہ گھوڑوں پر سوار ہو کر میدان میں اتریں اور قریب سے ہاتھیوں کو لڑتے ہوئے دیکھیں۔

مقابلے شروع ہوئے اور شہزادے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار میدان میں اترے۔ دیوہیکل ہاتھی یوں آپس میں ٹکرا رہے تھے جیسے دو پہاڑ گتھم گتھا ہو گئے ہوں۔ شہزادوں کے گھوڑے ان پہاڑوں کے اردگرد دائرہ بنا کر گھوم رہے تھے۔ یہ ہاتھی اس طرح سدھائے گئے تھے کہ صرف اپنے ہم جنسوں سے نبرد آزما تھے، کسی اور طرف دیکھنے کے روادار نہیں تھے یا فرصت نہیں تھی۔

شاہ جہاں کا تیسرا بیٹا اورنگزیب نہایت پھرتیلا اور نڈر تھا۔ ابھی نوجوانی اور لڑکپن کی سرحد پر تھا۔ مسیں تک نہیں بھیگی تھیں۔ شجاعت کی ترنگ نے ایسا اکسایا کہ ہاتھیوں کے بالکل قریب چلا گیا۔ ایک جگہ دو ہاتھی ایک دوسرے کی سونڈوں کو گرفت میں لیے گتھم گتھا تھے۔ ان کی مصروفیت دیکھ کر اورنگزیب نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بالکل قریب چلا گیا اور اس طرح دائرہ وار گھومنے لگا جیسے انہیں نرغے میں لے کر بھاگنے نہیں دے گا۔ یہ ہاتھی کسی اور ہی مزاج کا تھا یا اپنے حریف کی چوٹوں سے جھلا گیا تھا۔ شہزادے کی دخل اندازی اسے پسند نہیں آئی۔ اپنی سونڈ کو آزاد کیا اور پلٹ کر شہزادے پر حملہ آور ہوگیا۔ وہ گھوڑے پر تھا۔ بھاگ سکتا تھا لیکن غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ گھوڑے کو دو قدم پیچھے ہٹایا اور برچھی سیدھی کر کے ہاتھی کی مشک (پیشانی) پر ایسی ضرب لگائی کہ دستے تک پیشانی میں گھس گئی۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ لوگوں کی کچھ سمجھ ہی میں نہیں آیا اور جب سمجھ میں آگیا تو میدان مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھا۔ فیل خانے کے ملازموں کو معلوم تھا کہ زخمی ہاتھی برچھی کھا کر پیچھے ضرور ہٹ گیا ہے لیکن بھاگنے والا نہیں۔ وہ دوڑ پڑے۔ کوئی گرز مارتا تھا، کوئی آنکس چبھوتا تھا مگر وہ ٹلنے والا کب تھا۔ برچھی ابھی تک اس کی پیشانی میں پیوست تھی۔ وہ



اسے نکالنے کے لیے اپنے سر کو جھٹکے دے رہا تھا۔ جب ناکام ہوگیا تو ایک دلدوز چنگھاڑ بلند کی اور شہزادے کو مع گھوڑے کے اپنے دانتوں پر اٹھالیا۔ شہزادے کے حواس اس وقت بھی قائم تھے۔ اس نے خود کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ ہاتھی نے گھوڑے کو زمین پر پٹخ دیا، اتنی دیر میں اورنگزیب اپنی تلوار نکال چکا تھا۔ اس نے ہاتھی کی سونڈ پر وار کیا۔

ہاتھی کو بھگانے کے لیے آتش بازی چھوڑی جاری تھی۔ دھواں اتنا پھیل گیا تھا کہ اورنگزیب نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اورنگزیب کا بھائی محمد شجاع دھوئیں کے بادل ہٹاتا ہوا آگے بڑھا لیکن آتش بازی کے شور سے اس کا گھوڑا بدک گیا۔ شہزادہ شجاع خود کو سنبھال نہ سکا اور گھوڑے سے گر پڑا۔

شہزادہ اورنگزیب نہایت بہادری سے ہاتھی کی سونڈ کا ہر وار اپنی تلوار پر روک رہا تھا۔ ہاتھی ایسا بپھرا ہوا تھا کہ زخم کھا کر پیچھے ہٹتا تھا مگر پھر حملہ آور ہوتا تھا۔ اورنگزیب بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن اس کی مردانگی اسے روک رہی تھی۔ شاید ہی کسی نے ایسی لڑائی دیکھی ہو جو اس وقت ہو رہی تھی۔

گرز برداروں اور شاہی محافظوں نے ہاتھی کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ فیل خانے کے مہاوت (ہاتھی بان) بھی دوڑ پڑے۔ انہوں نے حریف ہاتھی کو زخمی ہاتھی کی طرف دوڑا دیا۔ چاروں طرف کے حملے نے اسے بدحواس کر دیا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ شہزادہ اورنگزیب کسی فاتح کی طرح گھوڑے پر سوار ہوا اور اس عجیب وغریب فتح کا تاج سر پر سجائے شامیانوں کی طرف لوٹ آیا۔

شاہ جہاں جھروکے میں بیٹھا اس تماشے کو ملاحظہ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ گھبراہٹ تھی، نہ پریشانی۔ وہ جھروکے سے اٹھا اور شاہی پالکی میں بیٹھ کر دیوانِ خاص میں پہنچ گیا۔ امرائے دربار لرزہ براندام تھے کہ جو حادثہ اس وقت ہوا ہے اس میں کوتاہی کا ذمے دار کس کس کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ کون کون عتابِ شاہی کی زد میں آتا ہے۔

شہزادہ اورنگزیب کو مسلسل کرنے اور پوشاک تبدیل کرنے کی بھی فرصت نہیں دی گئی۔ وہ فوراً باپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

''ہمارے بیٹے نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ اگر افراسیاب اس عمر میں ہوتا تو نہ کر سکتا تھا۔'' شاہ جہاں نے کہا اور تخت سے اتر کر شہزادے کو چمٹالیا۔

''ان تمام افراد کو جنہوں نے اس جشن کا اہتمام کیا تھا درجہ بدرجہ انعامات سے نوازا جائے۔ یہ جشن نہ ہوتا تو دنیا کو کیسے معلوم ہوتا کہ مغل شہزادے کتنے بہادر ہوتے ہیں لیکن ہم یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ ان لڑائیوں کو دیکھنے کے لیے شہزادے میدان میں نہیں اتریں گے تاکہ وہ بدنظروں کی نظر سے محفوظ رہیں۔''

یہ بھی اعلان ہوا کہ شہزادے کے وزن کے برابر اشرفیاں صدقہ کر دی جائیں۔ چنانچہ اشرفیوں کے پانچ تھیلے درویشوں اور مستحقین میں تقسیم کیے گئے۔

☆☆☆

شاہ جہاں کا بڑا بیٹا دارا شکوہ قندھار کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ اس نے اپنی حکمت عملی کے مطابق ضروری سمجھا کہ تسخیر قندھار سے پہلے اس کے ماتحت قلعوں کو فتح کر لیا جائے۔ اس میں اس کے امیروں نے کامیابی بھی دلائی لیکن دربار سے مسلسل تاکیدی پیغامات آرہے تھے کہ نواحی علاقوں کی طرف پیش قدمی کے بجائے قندھار کی تسخیر کے لیے کوششیں کی جائیں۔ شہزادے نے اس تاکید پر عمل کیا اور اپنے لشکر کا رخ قندھار کی طرف موڑ دیا۔

قندھار کے قریب پہنچ کر اس نے امرا کو طلب کیا اور ان سے حلف لیا کہ وہ قندھار کی تسخیر میں حیلہ سازی سے کام نہیں لیں گے۔

''مجھے محمد اورنگزیب مت سمجھنا جو اس قلعے کے نیچے سے دو مرتبہ ناکام واپس چلا گیا۔ اگر تم نے قلعہ فتح نہ کیا تو میں تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا کہ واپس جا کر اپنے بیوی بچوں کی شکلیں دیکھ سکو۔''

یہ دھمکی ایسی تھی کہ سب پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس کے ایک فوجی افسر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا۔ ''قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد میں محصوروں میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ آپ ان فریادوں سے متاثر ہو کر رحم فرمائیں اور ان کی جاں بخشی کر دیں۔''

''بادشاہوں کو دریائے رحمت کہا جاتا ہے۔ دشمن رجوع کرے تو اس پر رحم کرنا گزیر ہے۔''

اس کی اس دھمکی سے اس کے امرا نے اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکالا کہ وہ اورنگزیب کو پسند نہیں کرتا، حالانکہ وہ بہادری میں بے مثال ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کی رحم دلی ضرور رنگ دکھائے گی۔ بادشاہی لشکر نے مورچے باندھے، قلعے کے نیچے تک اور خندق تک پہنچانے میں بارہا کامیابی حاصل کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، قلعے والوں نے ان ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

محاصرہ کیے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران کئی خوں ریز جھڑپیں ہوئیں لیکن دارا شکوہ کو کامیابی کا منہ

دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

شاہی لشکر میں اکتاہٹ اور بے زاری دیکھی جارہی تھی۔ بہادر سردار اور جاں باز سپاہی محاصرہ چھوڑ کر واپس جانے کی باتیں کرنے لگے تھے۔ خفیہ اجلاس ہو رہے تھے کہ داراشکوہ کو واپسی پر کس طرح تیار کیا جائے لیکن کچھ سردار محاصرہ اٹھائے جانے کے حق میں نہیں تھے۔ اس طرح داراشکوہ کی فوج دو حصوں میں بٹ گئی تھی جس سے نقصان پہنچ رہا تھا۔

جب ایک گروہ کو یہ معلوم ہوا کہ خود داراشکوہ بھی واپسی کے لیے تیار ہوگیا ہے تو اس کا فیصلہ تبدیل کرنے کی تدبیریں کی جانے لگیں۔ توپ خانے کا داروغہ محمد جعفر نہایت شاطر اور داراشکوہ کے مزاج سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ داراشکوہ ضعیف الاعتقادی کی حد تک پیر فقیروں کا قائل ہے۔ تدبیر سے زیادہ تقدیر پر بھروسا کرنے والا ہے لہٰذا اس نے یہی ہتھیار استعمال کیا۔ ایک روز نہ جانے کہاں سے ایک آدمی کو پکڑ کر لے آیا اور اسے شہزادے کے سامنے پیش کردیا۔

''شہزادہ حضور، یہ شخص جنوں کی تسخیر میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ جنوں کو ان کے لشکر سمیت بلائے گا اور انہیں قلعہ والوں کی سرکوبی کے لیے مامور کردے گا۔''

''یہ عمل کتنے دن کا ہوگا؟''

''چالیس دن بعد اس کے اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔''

شہزادہ اس وقت قندھار سے آدھے کوس کے فاصلے پر ایک باغ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس آدمی کو دیکھ کر اس نے تو جیسے ہتھیار کھول دیے۔ محمد جعفر کو رخصت کیا اور اس آدمی کو لے کر خلوت میں آگیا۔ ایک دو روز اس کی صحبت میں گزارنے کے بعد اسے محمد جعفر کے حوالے کردیا کہ اس شخص کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے اور عمل کرنے کے لیے پورا موقع فراہم کیا جائے۔ اپنی طرف سے بیش قیمت انعامات بھی اسے عطا کیے۔

وہ آدمی تسخیرِ جن تو کیا کرتا، خلوت خانے میں عیش کرتا رہا۔ داراشکوہ اس سے اتنا متاثر تھا کہ روزانہ اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ ہر ملاقات میں یقین دلاتا رہا کہ بس جنوں کے لشکر آنے والے ہیں۔

چالیس دن پورے ہونے کو تھے۔ اس آدمی نے داراشکوہ سے کہا، جنوں کے لشکر آگئے ہیں۔ اپنے سپاہیوں سے کہو کمندیں ڈال کر اوپر چڑھ جائیں۔ جنوں کے لشکر کسی کو نظر نہیں آئیں گے لیکن وہ تمہارے لشکر سے پہلے ہی اوپر پہنچ چکے ہوں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قلعہ فتح ہوجائے گا۔ یہ خوش خبری سنانے پر داراشکوہ نے اپنے گلے سے ایک بیش قیمت ہار اتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ فتح کے بعد اور بہت کچھ دینے کا وعدہ بھی کیا۔

داراشکوہ نے یہ خوش خبری اپنے سرداروں کو بھی سنا دی اور قلعے پر دھاوا بولنے کا حکم دیدیا۔ وہ سب بھی خوش ہوگئے کہ اب تو جنات ساتھ ہیں، اب کیا پروا ہے۔

لشکری کمندیں ڈال کر اوپر چڑھنے لگے۔ یک بارگی قلعے کے توپ خانے کی گونج سنائی دی۔ ہزاروں گولے اور بڑے بڑے پتھر برسنے لگے۔ ہزاروں سوار اور پیادے خاک و خون میں نہا گئے۔ قلعے کے نیچے لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اتنا بھاری نقصان ہوا کہ سب کے ہوش اڑ گئے۔ کئی دن تک لاشوں کو جلایا اور دفنایا جاتا رہا۔

ادھر سے نجات ملی تو اس آدمی کی تلاش ہوئی جس نے جنوں کے لشکر کا وعدہ کیا تھا۔ وہ شخص غائب تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اب بھید کھلنے والا ہے لہٰذا وہ کہیں بھاگ گیا تھا۔ داراشکوہ کو اب بھی یقین تھا کہ جس طرح وہ اچانک غائب ہوا ہے اسی طرح واپس بھی آجائے گا۔ اس مرتبہ وہ جنات کا لشکر اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم محاصرہ جاری رکھیں۔

محاصرے کو پانچ ماہ گزر گئے تھے۔ گولہ بارود بھی ختم ہوگیا تھا۔ جاڑے کی آمد آمد تھی لہٰذا اب اس جنگل میں پڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بچی کھچی رسد کو ساتھ لیا اور داراشکوہ نے واپسی کا اعلان کردیا۔ اس نے کہا تھا، وہ اورنگزیب نہیں کہ ناکام واپس چلا جائے اور اب ناکام واپس جارہا تھا۔

دونوں بھائیوں میں یہی فرق تھا۔ ایک عاملوں اور درویشوں پر یقین کرنے والا تھا۔ دوسرا تلوار کی نوک سے اپنے ہاتھوں کی لکیریں بدلنے والا۔

☆☆☆

شاہ جہاں ان دنوں آگرہ میں مقیم تھا اور اس وقت ایوان خاص میں تھا۔ دو کنیزیں دائیں بائیں کھڑی مورچھل کر رہی تھیں۔ ایک کنیز اپنے زانو پر ستار رکھے ہلکے ہلکے سروں میں کوئی دھن بجا رہی تھی۔ اس کا محبوب فرزند داراشکوہ ابھی ابھی حاضر ہوا تھا اور اجازت ملنے پر اس کے بائیں جانب بیٹھ گیا تھا۔

کچھ دنوں سے شاہ جہاں کا یہ حال ہوگیا تھا کہ



داراشکوہ جب بھی اس کے سامنے آتا تھا وہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا بھول جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا یہی حال تھا۔ داراشکوہ کئی دن بعد اس کے پاس آیا تھا اس لیے یہ محویت اور گہری ہوگئی تھی۔

''داراشکوہ، تم اتنے دن کہاں رہے؟''

''جہاں پناہ! تصوف کی ایک کتاب ہاتھ لگ گئی تھی اس کے مطالعہ میں غرق تھا۔''

''ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مطالعہ کی عادت چھوڑ دو لیکن تمہارے اوقات میں کچھ ہمارا بھی حق ہے۔ ہم تم سے بہت مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ تمہاری آنکھیں دیکھ کر ہمیں تمہاری مرحومہ والدہ کی یاد آجاتی ہے۔ بالکل اسی کی طرح سوچتی ہوئی، کچھ سوتی کچھ جاگتی آنکھیں ہیں تمہاری۔ بس ایک ہی آرزو دل میں جگہ بنائی ہے کہ تمہاری آنکھیں بس ہمیں دیکھتی رہیں۔ اسی لیے ہم نے تمہارے دوسرے بھائیوں کو خود سے دور کرلیا ہے لیکن تمہاری جدائی ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''جہاں پناہ! ہم شرمندہ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود ہمارا یہی حال ہے۔ آپ کی خدمت میں رہیں یہی ہماری بادشاہت ہے یہی صوبے داری۔''

''دکن سے بہت اچھی خبریں آرہی ہیں۔ تمہارا بھائی اورنگزیب فتح پر فتح حاصل کررہا ہے۔''

''اہلِ دکن کا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے۔ وہ پسپائی اختیار کرلیتے ہیں۔ اورنگزیب بھی یہی سمجھ رہا ہوگا کہ اسے فتح حاصل ہورہی ہے۔ وہ ویسے بھی خوش فہم بہت ہے۔ یاد ہے آپ کو ایک مرتبہ ہاتھیوں کی لڑائی میں ایک ہاتھی اتفاقاً اس پر حملہ آور ہوگیا تھا۔ اورنگزیب اتنا گھبرا گیا تھا کہ بھاگنا بھول گیا تھا۔ بعد میں آتش بازی وغیرہ چھوڑ کر ہاتھی کو بھگا دیا گیا تھا۔ اورنگزیب کا خیال تھا کہ ہاتھی کو اس نے بھگا دیا۔''

''میں جانتا ہوں اس کے مزاج میں خودسری ہے۔''

''اس کے باوجود آپ اس کی حمایت کرتے ہیں۔''

''اس لیے کہ میں باپ ہوں۔ مجھے تم بھی عزیز ہو اور وہ بھی۔ تم مجھے زیادہ عزیز ہو لیکن یہ بات میں اس پر یا تمہارے دوسرے بھائیوں پر ظاہر نہیں کرسکتا۔''

''ہم اپنی اس گستاخی پر معذرت کے طلب گار ہیں کہ ہم نے اورنگزیب کی بعض کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا۔''

ابھی کچھ اور باتیں ہوتیں کہ اسی وقت حاجب وزیر نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ شہنشاہ نے سر کی جنبش سے اجازت مرحمت کی۔

''شہزادہ اورنگزیب شرفِ باریابی کی اجازت کے طلب گار ہیں۔''

''کیا خوب! ہم آگرہ میں ہیں یا دکن میں؟ ابھی شہزادے کا ذکر ہوا اور وہ دروازے پر ہے۔ اسے جلدی ہماری خدمت میں پیش کرو۔''

وزیر نے دروازہ پار کیا تھا کہ اورنگزیب اندر داخل ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا۔ زرہ بکتر تک جسم سے الگ نہیں کی تھی اور باپ کے پاس چلا آیا تھا۔ اس کے چہرے کو دکن کی دھوپ نے سنولا دیا تھا لیکن آنکھوں کی چمک پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر داراشکوہ پر پڑی جو باپ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ مزید سانولا ہوگیا جیسے دکن کی گرمی اس کے ساتھ ساتھ دیوانِ خاص میں چلی آئی ہو۔ میں ہندوستان کے نقشے میں اضافہ کررہا ہوں اور ظلِ سبحانی داراشکوہ کو عزیز رکھے ہوئے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ باپ کے سامنے تھا لیکن تعظیم کے لیے جھکنا بھول گیا تھا اور شہنشاہ کی آواز گونج رہی تھی۔

''آؤ شہزادے، آؤ۔ ہمیں تمہاری خیریت کا انتظار تھا مگر تم تو خود ہی چلے آئے۔''

اس آواز نے اورنگزیب کو نیند سے بیدار کردیا اور وہ شہنشاہ کی تعظیم کے لیے جھک گیا۔

''ہمیں خبریں مل رہی تھیں کہ تمہیں فتوحات حاصل ہورہی ہیں۔ جو سردار ان فوج ہم نے تمہارے ساتھ کیے تھے اور جو عظیم لشکر تم لے کر گئے تھے اس کے بعد تو یہ ہونا ہی تھا۔''

''ظلِ الٰہی، کیا اس میں ہمارا کوئی کردار نہیں؟''

''ہم تمہاری دلیری اور معاملہ فہمی کے قائل ہیں لیکن یہ بھی ہوا ہے کہ حاکموں کے ہٹتے ہی شورشیں پھر سر اٹھانے لگتی ہیں۔''

''حکمرانی معافی اور رحم سے نہیں ہوتی۔ میں اہلِ دکن کو یہ سمجھا کر آگیا ہوں کہ معافی کا لفظ میری لغت میں نہیں۔''

شاہ جہاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شہزادے کی زبان سے ادا ہونے والے یہ جملے اسے کسی اور ہی دنیا میں لے گئے۔ وہ اب بوڑھا بھی تھا اور بیمار بھی رہنے لگا تھا۔ وراثت کا مسئلہ اکثر اسے پریشان رکھتا تھا۔ اس کے بعد اس کا جانشین کون ہوگا؟ یہ فکر اسے اکثر رہتی تھی۔ اس لیے اس نے شہزادہ مراد کو گجرات اور شجاع کو بنگال کی طرف بھیج دیا تھا۔ داراشکوہ کو یہ سب محبت خود سے جدا نہیں کرتا تھا اور اب وہ اورنگزیب کی زبان سے یہ الفاظ سن رہا تھا۔ یہ الفاظ تو بادشاہوں کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اس وقت اس کے

سامنے اورنگزیب نہیں اس کے تخت کا حریف کھڑا تھا۔

''اورنگزیب، دکن میں تمہارے کارناموں کو مغلیہ تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ہم تمہیں دکن کے چاروں صوبوں کا بااختیار صوبے دار بنا کر بھیجتے ہیں۔''

''ہم جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔'' اورنگزیب نے کہا اور کورنش بجالایا۔

اورنگزیب نے یہ فرمان تسلیم ضرور کرلیا تھا لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ آگرہ سے دور ہونے کا مقصد آگرہ کی بساط کے ہر مہرے سے دور ہوجانا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے دارا کی طرف دیکھا۔ دارا کی آنکھوں میں شرارت کی چمک صاف نظر آرہی تھی۔ یہ وہی چمک تھی جو شکاری کی آنکھوں میں اس وقت ہوتی ہے جب تیر نشانے پر لگتا ہے۔

دارا کی راہ کے تینوں کانٹے نکل گئے تھے۔ مراد گجرات میں تھا، شجاع بنگال میں اور اب اورنگزیب کے لیے احکام جاری ہوگئے تھے کہ وہ دکن کی دور دراز منزلوں میں گم ہونے کے لیے چلا جائے گا۔

دارا کی آنکھوں میں یہ چمک یونہی نہیں ابھری تھی۔ کچھ دنوں پہلے اس کی حویلی میں ایک ننگ دھڑنگ ملنگ کہیں سے گھومتا گھامتا نکل آیا تھا اور جاتے جاتے کہہ گیا تھا۔ ''جا، ہم نے تجھے بادشاہت دی۔''

داراشکوہ اس وقت دیکھ رہا تھا کہ آخری جانشین بھی آگرہ سے رخصت ہورہا ہے۔ آگرہ سے دکن کا فاصلہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہے۔

''روضۂ تاج (تاج محل) مکمل ہوگیا ہے۔ کچھ دن آرام کرلو۔ پھر ہمارے ساتھ اس کے ملاحظہ کے لیے چلنا۔'' شہنشاہ نے اورنگزیب سے کہا۔

''ہم جب یہاں آرہے تھے تو ہماری نظر پڑی تھی۔ واقعی حسین ہے۔'' اورنگزیب نے کہا اور تعظیمی سلام کرنے کے بعد کچھ دیر رکا رہا تاکہ اجازت کا حکم ملے اور وہ جائے۔

''تم بہت تھک گئے ہوگے۔ جاؤ آرام کرو۔''

اورنگزیب کے چلے جانے کے بعد داراشکوہ کو موقع مل گیا۔ ''ظل سبحانی، آپ نے اورنگزیب کا احساسِ تفاخر ملاحظہ فرمایا؟ اسے یہ بھی گوارا نہیں ہوا کہ جھروکے ہی سے سہی، ایک نظر مقبرے کو دیکھ لیتا۔ وہ بدعقیدہ ہوگیا ہے۔ مزارات اور قبروں کا قائل ہی نہیں رہا ہے۔ بس اپنی نمازوں پر غرور ہے۔ اسی کو وہ تقویٰ کہتا ہے۔ ہم ایک ایسے ملک پر حکومت کررہے ہیں جہاں اہلِ ہنود کی کثرت ہے۔ ہمیں تو رواداری سے کام لینا ہوگا۔ میری حویلی پر برہمن بھی آتے ہیں اور مسلمان بھی۔ اورنگزیب کا کٹرپن ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دے گا۔ اگر حکومت اس کے ہاتھ میں آگئی تو بڑا فتنہ برپا ہوگا۔''

''میرے نورِ نظر، ولی عہد تو تم ہو۔ بس یہ خیال رکھنا کہ چھوٹے بھائیوں کو تم سے کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔ ان سے شفقت کا برتاؤ کرنا۔ آپس میں اتحاد رکھنا۔''

☆☆☆

کئی برس بعد دارالخلافہ آگرہ سے دہلی منتقل ہوگیا تھا۔ شہنشاہ ان دنوں دہلی میں تھا اور سخت بیمار تھا۔ بیماری کے اثرات آگرہ سے روانگی کے وقت ہی ظاہر ہونے لگے تھے لیکن دہلی پہنچتے ہی علالت نے خطرناک صورت اختیار کرلی۔ حاذق طبیب حاضر ہوئے۔ آنکھوں میں اندیشوں کے ڈورے جگہ بنائے ہوئے تھے لیکن علاج جاری تھا، ہر تدبیر الٹی پڑ رہی تھی۔ کوئی دوا کام نہیں کررہی تھی۔

شہنشاہِ ہندوستان تین دن سے غشی میں تھا۔ حکمائے وقت نے داراشکوہ کو اطلاع کردی کہ دوا کا وقت گزر چکا۔ شہزادوں کو اطلاع کر دی جائے کہ وہ حاضرِ بارگاہ ہوجائیں۔

شاہ زادہ داراشکوہ نے یہ اطلاع بغور سنی۔ وہ دن رات باپ کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ صحت یابی کے لیے دعا گو تھا، اب جو یہ مایوس کن اطلاع سامنے آئی تو اس کے کانوں میں آواز گونجی۔ ''جا ہم نے تجھے بادشاہت دی۔'' وہ باپ کے سرہانے بیٹھا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ اگر تینوں بھائی یہاں پہنچ گئے تو پھر وہ اکیلا نہیں رہے گا۔ اسے اس وقت تک اکیلا رہنا ہے جب تک طبیبوں کا کام ختم نہیں ہوجاتا۔ اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر نیم بے ہوش بادشاہ کی طرف دیکھا اور پھر کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔

اس نے ایک حکم کے ذریعے ڈاک کی ترسیل بند کرادی اور شہزادوں کے وکیلوں کو قید کردیا۔ یہ نادان حرکت اس نے صرف اس لیے کی تھی کہ بادشاہ کی علالت کی خبر دوسرے شہزادوں تک نہ پہنچ سکے لیکن سیلاب کو روئی کی گٹھریوں سے نہیں روکا جاسکتا تھا۔ فتنہ پردازوں نے یہ خبریں کسی اور رنگ میں پہنچادیں۔ یہ افواہیں بھی ہوا پر سوار ہوکر گجرات اور بنگال تک پہنچ گئیں کہ بادشاہ کا انتقال ہوچکا ہے اور نظم ونسقِ سلطنت داراشکوہ نے سنبھال لیا ہے۔ بادشاہ کے انتقال کی خبر کو اس نے مخفی رکھا ہے۔

یہ وحشت ناک خبریں دہلی سے نکلیں تو بنگال کے صوبے دار شہزادہ شجاع نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ احمد



آباد میں مراد بخش نے اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کردیا۔

بادشاہ نے تیسرے دن غشی سے آنکھ کھولی تو داراشکوہ کو سرہانے بیٹھے دیکھا۔ طبیبوں کی قطار اردگرد تھی۔ ایک طبیب نے آگے بڑھ کر پودینے کا پانی حلق میں ٹپکایا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں گردش میں تھیں جیسے کسی کو تلاش کررہی ہوں۔ جب اسے کوئی نظر نہ آیا تو اس کی نقاہت میں ڈوبی آواز ابھری۔

''ہمارے تینوں بیٹے؟''

''ظل سبحانی! قدرت کے کام نرالے ہیں۔ ادھر آپ موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا تھے ادھر میرے بھائیوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ شجاع نے خود مختاری کا دم بھرا ہے۔ مراد نے تو اپنے نام کا سکہ تک جاری کردیا ہے۔''

''اورنگ زیب؟''

''اس کی بابت مجھے کچھ علم نہیں لیکن یقین ہے کہ دونوں بھائیوں کو اسی نے اکسایا ہوگا۔''

''افسوس! ہمارے بیٹوں نے ہمارے مرنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔'' بادشاہ نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرلیں، پھر جیسے خواب سے چونکا ہو۔

''ہمیں شاہی جھروکے تک لے چلو۔ مخلوقِ خدا کو خبر کرو کہ ان کا بادشاہ ابھی زندہ ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے مجھے دیکھیں گے تو انہیں یقین آجائے گا۔ ممکن ہے یہ خبریں بدبخت شہزادوں تک بھی پہنچیں اور وہ اپنے ارادوں سے باز آجائیں۔''

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت اتنی تھی کہ وہ کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ احدی دستے اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھ چکے تھے لیکن طبیبوں نے ہاتھوں کے اشاروں سے انہیں روک دیا۔

طے یہ ہوا کہ ابھی شہر میں منادی کرادی جائے کہ بادشاہ کو ہوش آگیا ہے اور تاریخ کا اعلان کردیا جائے کہ فلاں تاریخ کو شہنشاہِ ہندوستان صاحب قران ثانی محمد شاہ جہاں عام درشن کے لیے جھروکے میں نمودار ہوں گے۔

تین دن بعد جب کچھ غذا پیٹ میں گئی تو اتنا ہوا کہ شہنشاہ اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ وہ تاریخ بھی آگئی تھی جب اسے جھروکے میں جلوہ افروز ہونا تھا۔

بادشاہ پالکی میں سوار ہوا جیسے کہ پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔ احدی دستوں نے چاروں طرف سے پالکی کو گھیر لیا۔ نقیبوں کی آواز گونجی۔

''سجدے میں نگاہ رہے۔ تمام ہوش وخرد پیش بادشاہ رہے.....''

لال قلعہ کے در ودیوار گونج اٹھے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ پالکی کو جھروکے میں رکھ دیا گیا۔ جھروکے کے نیچے خلقِ خدا کا اژدحام تھا۔ مبارک سلامت کا شور بلند ہورہا تھا۔ دیدار کے مشتاقوں کی دلی آرزو پوری ہوئی۔ افواہ سازوں کی زبانیں بند ہوگئیں۔ بادشاہ زندہ سلامت ان کے سامنے تھا۔

اس کی صحت کو گوارا نہیں تھا کہ جھروکے میں زیادہ وقت گزارے۔ آنکھوں کو پیاسا چھوڑ کر وہ جھروکے سے ہٹ گیا۔

امرائے نامدار کو حکم ہوا کہ خدمتِ والا میں حاضر ہوں۔ اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسے دیوانِ خاص میں لے جایا گیا۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا اور تخت کے قریب ایک طلائی کرسی پر دارا تشریف فرما ہوا۔ یہ ایسا اعزاز تھا جو دارا کے سوا کسی کو حاصل نہیں تھا۔ لوگوں کے قیاس جن باتوں کی نشاندہی کررہے تھے ان باتوں کی عملی تفسیر اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ پہلے بھی دیکھتے آئے تھے کہ داراشکوہ سے بادشاہ کی محبت جانب داری کا مظاہرہ کرتی ہے اور اس وقت تو صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ مستقبل کا بادشاہ ہے اور شاہ جہاں کے بعد اس کو مالک تاج وتخت ہونا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کا اظہار بھی ہوگیا جب بادشاہ نے امرا کو مخاطب کیا۔

''آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ ہم ابھی تک بادشاہ ہیں اور زندہ بھی ہیں لیکن گردشِ زمانہ نے تاج وتخت کی دلچسپی چھین لی ہے۔ حکومت کرنے کی آرزو دل سے نکل گئی ہے۔ بیماری نے ہمیں کمزور ونا تواں بھی کردیا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا محبوب بیٹا دارا شکوہ جس کی خدمت نے ہمیں نئی زندگی دی ہے، اس وقت تک ہماری جانشینی کے فرائض انجام دے گا جب تک ہماری صحت ہمیں اجازت نہیں دیتی یا جب تک ہم اس سے یہ اختیار واپس نہیں لے لیتے۔ آپ لوگ خدا کو حاضر وناظر جان کر عہد کریں کہ آپ ہر حالت اور ہر مقام پر شہزادے سے وفاداری ورفاقت پر کاربند رہیں گے۔ آج سے شہزادے کا حکم ہمارا حکم سمجھا جائے۔''

امیروں کے لیے یہ اعلان نیا نہیں تھا لیکن خود بادشاہ کی زبان سے وہ پہلی مرتبہ سن رہے تھے۔ یہ مجال بھی نہیں تھی کہ اس اعلان کی مخالفت کرتے لیکن ان کے چہرے چغلی کھا رہے تھے کہ انہیں یہ فیصلہ پسند نہیں آیا۔

امرائے دربار داراشکوہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ مذہبی امور میں وسیع الخیال ضرور تھا لیکن متلون مزاج اور چڑچڑا بھی تھا۔ باپ کی بے جا محبت نے کسی قدر غرور میں مبتلا

کر دیا تھا۔ خوشامدیوں کا ٹولہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ باپ کی محبت نے اسے سرد و گرم سے آشنا نہیں ہونے دیا تھا۔ انتظامی امور کا کچھ تجربہ نہیں ہونے دیا تھا۔ امرا دیکھ رہے تھے کہ اب جو مسائل پیش آنے والے ہیں، شہزادہ ان سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ شجاع اور مراد کا حال بھی ان سے مختلف نہیں تھا۔ مراد دلیر تھا لیکن عیش و عشرت کا بھی دلدادہ تھا۔ شجاع غیر معمولی ذہین تھا لیکن کمزور، کاہل اور بے پروا تھا۔ ایک اورنگزیب ہی ایسا تھا جس کے کردار و عمل یکساں تھے۔ نہایت متقی اور پاکباز تھا۔ جنگوں کی سختیوں نے اس کے بدن کو فولاد بنا دیا تھا۔ زیرک اور ذہین بھی تھا، نوجوانی میدان جنگ میں گزری تھی لہٰذا بہترین سپہ سالار اور انتظامی امور میں طاق تھا۔ امرا اسے یاد کر رہے تھے لیکن وہ آگرہ سے بہت دور دکن میں تھا اور اسے یہ جلدی بھی نہیں تھی کہ تخت کے لیے جنگ کرتا جبکہ اس کو یہ خبریں بھی مل چکی تھیں کہ شہنشاہ صحت یاب ہو چکا ہے۔ وہ بے جاپور میں مصروف جنگ تھا۔ فتح قریب تھی اس لیے بھی وہ اس اہم ذمے داری سے منہ موڑ کر آگرہ کی طرف رخ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

''دارا شکوہ انتظامات سنبھالنے کے لیے موجود ہے۔ اب ہم اکبر آباد جانا چاہتے ہیں۔ مرنے سے پہلے روضۂ تاج میں کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔''

شہنشاہ کا حکم جاری ہوا۔ اس کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ سفر کی صعوبت برداشت کرتا لیکن وہ بادشاہ تھا اور ایسا جلیل القدر بادشاہ! طبیبوں کے مشورے دھرے رہ گئے۔ اس موقعے پر دارا شکوہ اسے روک سکتا تھا لیکن شاید وہ خود چاہتا تھا کہ بادشاہ اکبر آباد چلا جائے۔

وہ اکبر آباد پہنچا تو آغاز بیماری سے اب تک دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ مسلسل بیماری اور سفر کی صعوبت نے اسے ایسا کمزور کر دیا تھا کہ نظم و نسق کے بارے میں سوچنا بھی اس کے لیے محال تھا۔

بادشاہ کے رخصت ہوتے ہی دارا شکوہ نے نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے معلوم تھا کہ امرا اس سے خوش نہیں ہیں۔ اس نے موقع ملتے ہی بہت سے امیروں کو ان کے عہدوں سے فارغ کر دیا۔ اپنی مرضی کے لوگوں کو سامنے لایا جو ہر گز ان عہدوں کے لائق نہیں تھے۔ یہ اہتمام سختی سے کیا کہ دکن جانے والے تمام راستے بند کر دیے۔ اب کوئی نہ یہاں سے وہاں جا سکتا تھا، نہ وہاں سے یہاں آ سکتا تھا۔ تینوں شہزادوں کے وکیل پہلے ہی قید کیے جا چکے تھے۔ اس دوران یہ بھی غلطی کر بیٹھا کہ اورنگزیب کے معتمد ساتھی میر جملہ کو وزیر کے عہدے سے ہٹا دیا۔ یہ فیصلہ ایسا تھا کہ تینوں شہزادوں کو اس کی نیت پر شک ہونے لگا۔ پہلا قدم شجاع نے اٹھایا۔

دارا شکوہ آگرہ میں تھا اور شاہ جہاں کے کان بھرنے میں مشغول تھا کہ اس کے جاسوسوں نے شجاع کی پیش قدمی سے مطلع کیا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ حالات کتنے ابتر ہو گئے ہیں۔ وہ اکبر آباد میں ہے اور شجاع بنگال سے دہلی کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔

شاہ جہاں تو مردہ بدست زندہ ہے۔ دارا شکوہ کی رائے کو وہ یوں بھی مقدم رکھتا تھا۔ اس بیماری کے بعد تو دارا شکوہ کی خوشنودی کے سوا اسے کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک ہلکا سا اختلاف ضرور کیا کہ وہ شجاع کو دل جوئی اور دل دہی کے منتر سے رام کر لے گا لیکن ولی عہد کی خوشنودی اس پر غالب آ گئی۔ دارا شکوہ نے جنگ کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاہ جہاں نے خاموشی اختیار کر لی۔

دارا شکوہ نے بیس ہزار بہادر سواروں اور دس ہزار پیادوں کا لشکر سلیمان شکوہ کی سرداری میں شجاع کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا۔

ادھر یہ لشکر روانہ ہوا ادھر اس نے راجا جسونت اور قاسم خاں کو اتنی جلدی میں طلب کیا کہ قاسم خاں پگڑی باندھے بغیر ننگے سر ہی چلا آیا۔ دارا شکوہ اس وقت اپنی حویلی میں تھا۔

''حضور، لشکر تو روانہ ہو گیا۔ ہمیں کس لیے طلب فرمایا ہے؟''

''ایک لشکر اور بھی روانہ ہونا ہے جس کے ساتھ تم دونوں جاؤ گے۔''

''حضور، یہ جنگی چال ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔''

''ضروری نہیں کہ آپ ہر بات سمجھ ہی لیں۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ شجاع کی مدد کے لیے مراد یا اورنگزیب میں سے کوئی ضرور باہر نکلے گا یا شاید دونوں۔ تمہیں احمد آباد اور دکن کے راستوں پر جانا ہے۔ قاسم خان، تم احمد آباد کے راستے پر جاؤ گے اور جسونت سنگھ دکن کے راستے پر۔ اگر مراد احمد آباد سے کوچ کرتا ہے تو قاسم خاں تم اس کے مقابلے پر پہنچو گے اور اگر دکن سے شہزادہ اورنگزیب مقابلے کے لیے نکلتا ہے تو جسونت سنگھ اسے روکیں گے۔''

دونوں سردار اس عجیب و غریب جنگی چال کو سن کر حیران تھے۔ کیا اورنگزیب کو اس نے بچہ سمجھ لیا ہے کہ چند ہزار کا لشکر اسے روک لے گا۔ جس جنگ کا کوئی وجود ہی نہیں



انہیں اس جنگ پر بھیجا جا رہا ہے۔ دونوں نہ صرف جانے کے لیے تیار ہو گئے بلکہ دارا شکوہ کی تعریف بھی کی کہ اس کے ذہن رسا نے کیا ترکیب سوچی ہے۔

جب وہ تیار ہو گئے تو دارا نے مزید تاکید کی۔ ''اس روانگی کو مخفی رکھنا ہے۔ یہ نہ ہو کہ ظل سبحانی کو اس کی بھنک پڑے۔ وہ نہ جانے کیوں نہ تو مراد کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں اور نہ اورنگزیب کے خلاف جبکہ میں ان دونوں کو مجبور کر دوں گا کہ وہ ظل سبحانی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں۔ ظل سبحانی کی آنکھیں اسی وقت کھلیں گی۔''

اپنا ذاتی توپ خانہ اور شاہی توپ خانہ دے کر انہیں احمد آباد و دکن کے راستے پر روانہ کر دیا۔ چند امیر اور چند ہزار سوار اس قافلے کے ساتھ متعین کر دیے۔

ابھی قافلے نے راہ پکڑی تھی کہ بادشاہ عازم دہلی ہوا۔ دارا شکوہ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اس کے کان بھر سکے اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرے۔ وہ مصنوعی فکرمندی سے حاضر بارگاہ ہوا۔

''شجاع کو حضور کے غلاموں نے شکست سے دوچار کر دیا ہے۔''

''شجاع تو خیریت سے ہے؟''

''وہ گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ بنگال کی طرف بھاگ گیا۔''

''اورنگزیب کے لیے کیا سوچا۔''

''وہ ابھی تو خاموش ہے لیکن شجاع کی شکست کے بعد مراد سے خط کتابت کر رہا ہے۔ خفیہ اطلاعات کے مطابق وہ حضور کی مزاج پرسی کے بہانے دارالخلافے کی طرف آنے کا ارادہ کر رہا ہے تاکہ یہاں فتنہ و فساد پھیلائے۔''

''اس کے پاس اتنی طاقت ہے کہ دارالخلافہ میں فتور پھیلائے؟''

''اس نے اپنے امیروں اور سرداروں کی دل جوئی کر کے بہت سوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا ہے۔ اسے دیر ہی اس لیے لگ رہی ہے کہ وہ اپنی طاقت بڑھانے میں مشغول ہے۔ بے جاپور کی تسخیر کے لیے حضور نے جو لشکر بھیجا تھا وہ آج کل اسی کے زیر فرمان ہے۔ اس کا ذاتی خزانہ اور جاگیر الگ ہے۔ وہ اس رقم سے اپنی طاقت اتنی بڑھا لے گا کہ پھر اس کا تدارک ممکن نہ ہو سکے گا۔''

''تمہارے خیال میں اس کا تدارک کیا ہے؟''

''مصلحت یہ ہے کہ دکن میں اس وقت جو امرا تعینات ہیں، انہیں ایک فرمان کے ذریعے واپس بلا لیا جائے۔ پیشکش کی رقم بھیجنے کے لیے شہزادہ پر سخت دباؤ ڈالا جائے۔ اس کی جاگیر ضبط کر لی جائے۔ جب اس کی جاہ و حشمت میں کمی واقع ہو گی تو اس کے رفیق جو اس کی حمایت میں سرگرم ہیں اس سے آنکھیں پھیر لیں گے۔''

''دارا میرے بچے، کیا اورنگزیب کو سمجھا بجھا کر اسے کسی غلط اقدام سے نہیں روکا جا سکتا؟''

''وہ بہت سرکش ہے۔''

''اسے معلوم ہے ہم زندہ ہیں۔''

''وہ اتنی طاقت اسی لیے بڑھا رہا ہے۔''

''اس کا یہ خوف بتا رہا ہے کہ ہماری دل جوئی اسے رام کرے گی۔''

''وہ اسے آپ کی کمزوری سمجھے گا۔''

''میں نہیں چاہتا کہ بھائیوں کے درمیان جنگ ہو۔''

''جنگ میں بھی نہیں چاہتا۔ اسی لیے حضور میں درخواست پیش کی ہے کہ چیدہ چیدہ امرا کو واپس بلا لیا جائے تاکہ اس کی طاقت کم ہو اور وہ شاہی افواج سے ٹکرانے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ اسے کمزور دیکھ کر مراد بھی اس سے اتحاد نہیں کرے گا۔ مراد اکیلا ہو گا تو ہم اس کی حوصلہ شکنی بھی کر سکیں گے۔''

''اورنگزیب کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ پہل ہم نے کی تھی۔''

''آپ فرمان تو جاری کریں۔''

''اگر اس نے ہمارے فرمان کی تعمیل نہ کی؟''

''آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ وہ آپ کا کتنا فرماں بردار ہے اور اس کی نیت کیا ہے۔''

شاہ جہاں کو اس کی ان تجاویز سے اتفاق نہیں تھا لیکن اس کو ان کے مزاج میں اتنا دخل تھا کہ وہ اسے منع نہ کر سکے اور نیم رضامندی ظاہر کر دی اور پھر بالآخر دارا شکوہ فرمان لکھوانے میں کامیاب ہو گیا۔

☆☆☆

اورنگزیب پوری جاں فشانی سے قلعہ بے جاپور کے محاصرے میں مشغول تھا۔ دارالخلافے سے طرح طرح کی خبریں آ رہی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس کے وکیل قید کر لیے گئے ہیں۔ یہ بھی علم میں آ چکا تھا کہ دارا شکوہ، ظل سبحانی کو اکبر آباد لے گیا ہے تاکہ خزانہ شاہی تصرف میں لا سکے لیکن اس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ وہ باپ کی وفات سے پہلے بغاوت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شاہ جہاں کی بیماری کی خبریں پہنچی تھیں تو وہ پریشان ضرور ہوا تھا لیکن اس نے مراد اور شجاع کی طرح اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کر دیا

تھا۔ پھر یہ خبر موصول ہوگئی تھی کہ بادشاہ تیزی سے صحت یاب ہورہا ہے۔ اس کے بعد وہ پوری طرح مطمئن ہوکر بے جاپور کے محاصرے میں مشغول تھا۔

تیز رفتار گرز بردار دکن کی طرف دوڑ رہے تھے۔ راستے میں انہیں شاہی توپ خانہ اور سوار دستہ نظر آیا جو داراشکوہ نے راجا جسونت سنگھ کی سربراہی میں اورنگزیب کو روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ جسونت سنگھ اور اس کے امرا اس ویرانے میں بڑی بے زاری کے دن گزار رہے تھے۔ گرز برداروں نے لمحے بھر کے لیے جسونت سنگھ سے ملاقات کی۔ جسونت سنگھ کو جب معلوم ہوا کہ امرا کی واپسی کے لیے پیغام بھیجا جارہا ہے تو اس کی جان میں جان آئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ اب اورنگزیب اپنی کچھار سے ضرور نکلے گا۔ وہ مقصد پورا ہوگا جس کے لیے وہ بھیجا گیا ہے۔ فیصلہ کچھ بھی ہو لیکن اس کے بعد یہاں سے واپسی کا پروانہ تو ہاتھ میں آئے گا۔ اس نے قاسم خاں کو جو مراد کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا گیا تھا، خبر پہنچ دی کہ تیار رہے۔ اب مراد بھی ضرور دارالخلافہ جانے کے لیے کوچ کرے گا۔

یہ گرز بردار جونہی بے جاپور پہنچے شہزادہ اورنگزیب کے دل میں اس خیال نے شور مچایا کہ شاید بادشاہ کا انتقال ہوگیا ہے جو یہ تیز رفتار قاصد یہاں پہنچے ہیں لیکن جب اس نے فرمان پڑھا تو اس کے غصے کی انتہا نہیں تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ جو امرا تمہاری مدد کے لیے بھیجے تھے، ان سب کو واپس بھیج دو۔ پیش کش کی رقمیں فوراً شاہی خزانے میں داخل کرو۔

''خدا کی قسم! یہ فرمان علی سجائی کے ہاتھ کی تحریر نہیں ہوسکتا۔ بے جاپور میرے ہاتھ آنے ہی والا ہے۔ اس نازک وقت میں وہ ایسی تحریر روانہ نہیں کرسکتے تھے۔''

وہ بڑی زور سے چیخا تھا لیکن اس کی آواز پر لبیک کہنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اس فرمان کو ٹھکرا بھی سکتا تھا لیکن یہ فرمان محاصرہ کرنے والے امرا کو نام بنام پہنچایا گیا تھا۔ شہزادے کو تو صرف اطلاع دی گئی تھی۔ وہ ان امرا سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی تعمیل نہ کی جائے۔

اس زمانے میں یہ مشہور ہورہا تھا کہ داراشکوہ نے ایسی مشق فراہم کی ہے کہ علی سجائی اور اس کے ''خط'' میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔

اس نے اپنے امیروں کو یہی کہہ کر قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ فرمان جعلی ہے۔ پہلے اس کی تصدیق کرلینی چاہیے لیکن اتنی تکلیف کون کرتا اور کیوں کرتا۔

ان امیروں کو بادشاہ کے حکم سے بھیجا گیا تھا اور اب وہی انہیں واپس بلا رہا تھا۔ وہ باپ بیٹوں کے جھگڑے میں فریق کیوں بنتے۔

ان امیروں نے ٹرائی سے ہاتھ اٹھالیا۔ مہابت خاں جیسا نامور امیر اسے بتائے بغیر آگرہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ پھر ایک ایک کرکے امرا ہٹنے لگے۔ اپنے ساتھ اپنے لشکر کو بھی لیتے جاتے تھے۔

اب اسی میں بہتری تھی کہ محاصرے سے ہاتھ اٹھالیا جائے۔ بے جاپور کا حکمراں عادل شاہ پیشکش کرچکا تھا کہ ایک کروڑ کی رقم تاوان میں وصول کرکے صلح کرلی جائے لیکن اورنگزیب طاقت کے نشے میں اس پیشکش کو ٹھکراتا رہا تھا۔ لیکن اب اس کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس نے صلح کرلی اور محاصرہ اٹھا کر اورنگ آباد چلا آیا۔

اورنگ آباد پہنچ کر اورنگ زیب کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا۔ وہ اپنے تین بھائیوں کی طرح جلد باز نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے نہ تو ابھی تک اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا اور نہ ہی کسی ردعمل کا اظہار ہونے دیا تھا لیکن اب اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس مہرے کو پہلے استعمال کرنا ہے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی مراد بخش کو خط لکھا۔

''اس برادر بے شکوہ (داراشکوہ) کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے ردعمل میں دوسرے بھائی جو کچھ سوچ رہے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل حق بہ جانب ہے اور بجا ہے۔ مجھے بھی اپنا شریک کار اور مددگار سمجھا جائے مگر والد بزرگوار ابھی بہ قید حیات ہیں اس لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں بھائی والد محترم کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کریں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے اس بے دین کی خیرہ سری کا تدارک کریں جو بادۂ غرور اور نخوت آرائی میں مست ہورہا ہے۔

تم ایک منظم و آراستہ فوج لے کر اس بے ادب کافر یعنی جسونت سنگھ کی تادیب کے لیے کوچ کردو اور بس سمجھ لو کہ ہم بھی دریائے نربدا کے اس کنارے پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے پاس جو لاؤ لشکر اور توپ خانہ ہے اسے تم اپنی فتح کا ہی وسیلہ سمجھو۔''

اس خط کو وارسال کرتے ہی شہزادہ اورنگزیب نے کوچ کی تیاری شروع کردی۔ اس کی بہادری بھی ضرب المثل تھی اور جنگ کا وسیع تجربہ بھی تھا۔ اس نے صوبہ داری کے زمانے میں بہترین جنگجو بھرتی کیے تھے۔ چند تجربہ کار امرا بھی ابھی تک اس کے ساتھ موجود تھے جنہوں نے شہنشاہ کے فرمان سے انحراف کیا تھا اور ابھی تک اورنگزیب کے رفیق و مددگار تھے۔ توپ خانہ بھی اس کے پاس تھا۔ تیس ہزار کی



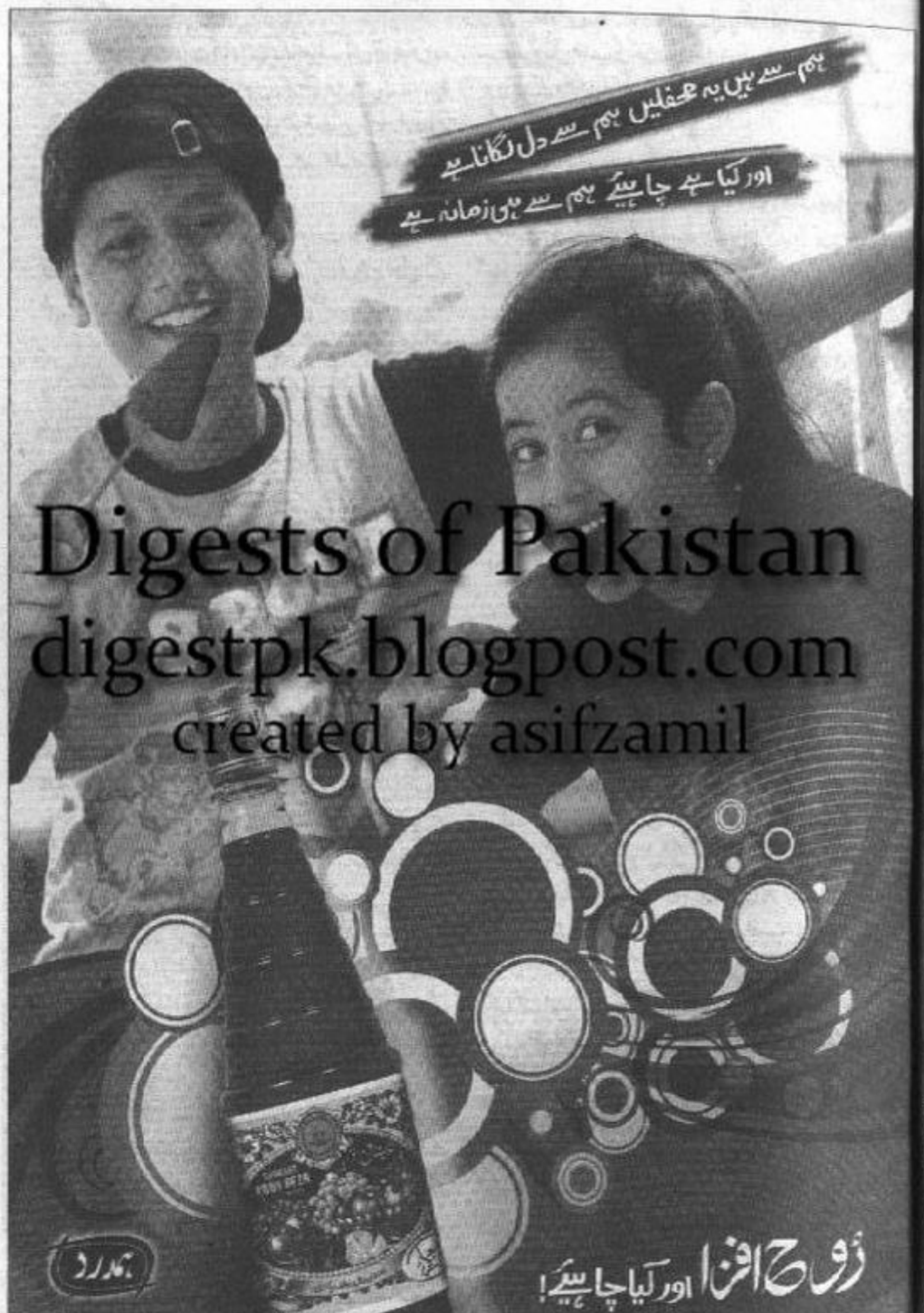


Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

فوج ایک معقول جنگ لڑنے کے لیے بہت ہوتی ہے جو اس کے پاس تھی۔

مضبوط قلعہ دولت آباد اس کے تصرف میں تھا جہاں وہ اپنے حرم کی خواتین کو محفوظ و مامون رکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد معظم کو اورنگ آباد کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ خواتین کو قلعہ دولت آباد میں بھجوا دیا۔ میر جملہ کو قلعے کی نگرانی پر مامور کر کے بے فکر ہوا۔

شہزادہ محمد سلطان کو طلب کیا۔ نجابت خان پرانا جنگجو تھا اسے شہزادے کا اتالیق مقرر کر کے ایک فوج ہراول کے طور پر روانہ کر دی۔ ہراول کے بعد اصل لشکر روانہ ہوا۔

اورنگ زیب برہان پور پہنچا تو شام کے سائے زمین پر اتر رہے تھے۔ خیموں کا بازار لگ گیا۔ شہزادے کا خیمہ برہان پور کے بالکل نزدیک تھا جبکہ لشکر دور تک پھیلا ہوا تھا۔

جب وہ اورنگ آبادی تھا برہان پور کے شیخ برہان کا نام نامی سنتا رہتا تھا۔ برہان پور پہنچ کر اسے خیال آیا کہ شیخ سے ملاقات کی جائے۔ رات بہت ہو گئی تھی لیکن اسے عجیب سی بے کلی تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کہیں اور جانے کے لیے نہیں نکلا تھا بلکہ برہان پور آنا ہی گوہر مقصود تھا اور برہان پور آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ شیخ سے ملاقات کی جائے۔ وہ رات اس نے بے چینی میں کاٹ دی۔ صبح ہوتے ہی شیخ کے پاس آدمی بھیجا اور ملاقات کے لیے پیغام بھجوایا لیکن شیخ نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ یہ انکار کسی بادشاہ کی جانب سے ہوا ہوتا تو وہ فوج لے کر چڑھ دوڑتا۔ یہ انکار تو ایک درویش کی جانب سے تھا۔ اس بارگاہ میں تو صرف اصرار ہی کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے دن اسی آدمی کو ایک مرتبہ پھر شیخ کی خدمت میں بھیجا۔ انکار کی سوغات پھر آ گئی۔

جب اسی اصرار و انکار میں پندرہ دن گزر گئے تو اسے فکر لاحق ہوئی۔ اسے کسی ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جو شیخ کی بارگاہ میں اثر رکھتا ہو۔ یہ آدمی اسے شیخ نظام کے نام سے مل گیا۔ شیخ نظام، شیخ برہان کے خاص مقرب تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس سے شیخ کی ملاقات کرا دیں گے۔

وہ شیخ نظام کے ہمراہ شیخ برہان سے ملاقات کے لیے گیا۔ یہ ملاقات تنہائی میں ہوئی۔ شیخ کا کوئی مرید اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھا۔ جب یہ ملاقات ختم ہوئی تو اورنگزیب نے ان سے اپنے لیے دعا کی درخواست کی۔

شیخ نے جواب دیا۔ ”تم بادشاہ ہو۔ تمہارے لیے ہم فقیروں کی دعا سے کیا ملے گا۔ ہاں تم عدل و انصاف اور رعیت پروری کے قصد سے دعا مانگو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیں گے۔“

اورنگزیب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اپنے خدا سے یہ توفیق طلب کی کہ اسے عدل و انصاف پر قائم رکھے۔ رعایا کے دکھوں کو سکھ میں تبدیل کرنے کی اہلیت دے۔ شریعت پر چلنے کی ہمت عطا کر......“

اورنگزیب دعا مانگتا جاتا تھا اور وہ بزرگ آمین، آمین کہہ کر مہر تصدیق ثبت کرتے جاتے تھے۔ جب وہ ان سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے اللہ حافظ کے ساتھ یہ بھی کہا۔

”جاؤ تیاری کرو۔“

خانقاہ سے باہر آتے ہی شیخ نظام نے مبارک باد دی۔

”حضور کو مبارک ہو۔“

”ہاں یہ ملاقات واقعی ایسی ہے کہ مبارک باد دی جائے۔“

”میرا اشارہ کسی اور جانب ہے۔“

”وہ کیا۔“

”شیخ نے فرمایا تم بادشاہ ہو۔ یہ نہیں کہا، تم شہزادے ہو۔ یہ کہہ کر انہوں نے آپ کو سلطنت کا مژدہ سنا دیا۔“

شہزادہ چپ چاپ سنتا رہا اور قیام گاہ تک آ گیا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ شیخ سے ملاقات کے لیے اتنا بے چین کیوں تھا۔ شاید اسے منزل تک پہنچنے کے لیے شیخ برہان کی اجازت کی ضرورت تھی۔

اورنگزیب اس رات سکون سے سویا۔ صبح ہوتے ہی بزرگ شیخ برہان کے ادا کردہ کلمات کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ وہ نماز سے فارغ ہوا تھا کہ ایک خبر نیک شگون کی صورت میں اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا وکیل عیسیٰ بیگ جسے دارا شکوہ نے قید کر دیا تھا کسی نہ کسی طرح بھاگ آیا تھا اور اس وقت لشکر میں تھا۔ اورنگزیب نے اسے طلب کیا۔ عیسیٰ بیگ کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ راجا جسونت سنگھ اور قاسم خاں اجین میں ہیں اور اس کے لشکر کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے پاس کتنی جمعیت ہے۔ اس کی مفصل رپورٹ پیش کر دی۔ اس کی زبانی دارالخلافہ کے حالات بھی معلوم ہوئے۔ عیسیٰ بیگ نے یہ بھی بتایا کہ فوجی افسران اور سردار، دارا شکوہ سے خوش نہیں ہیں اور اورنگزیب کو مستقبل کا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ وقت پڑا تو وہ سب اورنگزیب کی مدد کریں گے۔

”مغل بھائی خیریت سے ہیں؟“

”ان سے اب امید نہ رکھنا ہی بہتر ہوگا۔ دارا شکوہ کی محبت انہیں کچھ سوچنے نہیں دیتی۔ جو وہ کہتا ہے اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔“



”ہم جب ان سے ملیں گے تو ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔“

”دارا شکوہ اس ملاقات کا اہتمام نہیں ہونے دے گا۔“

”تو پھر مغل بھائی کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم اورنگزیب ہیں۔“

اورنگزیب نے یہ بات اتنے یقین سے کہی تھی کہ اس کے بعد عیسیٰ بیگ کو کچھ اور نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ اجازت لے کر اٹھ آیا۔ اس نے صرف اتنا سنا کہ اب برہان پور سے کوچ کا وقت آ گیا ہے۔

برہان پور کے قیام کے دوران اورنگزیب دارالخلافہ کی خبریں بہم پہنچاتا رہا تھا۔ ایک مہینے کے قیام کے بعد اس نے برہان پور چھوڑ دیا۔ نربدا عبور کرنے کے بعد شہزادہ مراد بخش اپنی فوج کے ساتھ دیال پور کے مقام پر اس سے مل گیا۔ دونوں بھائی نہایت گرم جوشی سے ملے۔ اورنگزیب نے اسے اپنے لشکر میں ضیافت پر بلایا۔ جواب میں مراد بخش نے بھی اس کی ضیافت کی۔ ایک مرتبہ پھر عہد و پیمان ہوئے اور یہ طے ہوا کہ دارا شکوہ جس پر بھی حملہ آور ہوگا دوسرا اس کی مدد کرے گا۔

دریا کے گھاٹوں اور خشکی کی گزرگاہوں پر ایسی سخت ناکابندی تھی کہ ہوا کا جھونکا بھی گزرتا تو جسونت سنگھ کو خبر ہو جاتی۔ اس کے باوجود اورنگزیب کا لشکر اجین سے سات کوس کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ راجا جسونت سنگھ لشکر کی آمد سے واقف نہ ہو سکا۔ یہ بات اورنگزیب خود نہیں سمجھ سکا تھا کہ کسی جاسوس یا قلعہ دار کی نظر اس پر کیوں نہیں پڑی۔ یہ کسی دعا کا اثر تھا یا محض اتفاق؟

جب لشکر نے ایک اور گھاٹ (اکبر پور) پار کر کے پڑاؤ ڈالا تو اس وقت جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو خبر ہوئی۔ راجا اور قاسم خاں دونوں مقابلے کے لیے نکلے اور اورنگزیب سے ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گئے۔

اورنگزیب کے لشکر میں ایک برہمن تھا جس کا نام کب کلس تھا۔ بھاکا میں شاعری کرتا تھا اور نہایت چرب زبان تھا اورنگزیب نے اسے راجا کے پاس بھیجا اور پیغام بھجوایا کہ ہم صرف حضرت ولی نعمت (شاہ جہاں) کی عیادت اور قدم بوسی کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ مخالفت اور لڑائی کا کوئی ارادہ نہیں۔ اگر یقین نہیں تو تم بھی ہمارے ہم رکاب خدمت والا میں چلو یا پھر راستہ چھوڑ دو۔ ہمیں جانے دو۔

راجا نے اس کے جواب میں صاف پیغام بھیجا کہ میں کسی کے حکم سے مجبور ہوں۔ نہ راستہ دوں گا نہ تمہارے ساتھ چلوں گا ہاں جنگ کر کے مجھے شکست دے سکتے ہو تو پھر جو مرضی چاہے کرنا۔

اورنگزیب نے تو حجت پوری کی تھی ورنہ وہ اپنا راستہ خود بنانا جانتا تھا۔ اس نے فوجوں کو صف آرائی کا حکم دیا۔

جب توپ خانہ آراستہ ہو گیا۔ ہاتھیوں کے صفیں بندھ چکیں۔ میسرہ اور میمنہ سج گئے تو خود ایک مہیب ہاتھی پر سوار ہوا اور جنگجو زور آزماؤں کے جھرمٹ میں قلب لشکر کی کمان سنبھال لی۔

مہاراجا جسونت سنگھ نے بھی صف آرائی کر لی۔ ادھر اورنگزیب قلب لشکر میں متعین تھا، ادھر راجا نے قلب لشکر سنبھالا۔ اورنگزیب کی طرف سے گولہ باری کا آغاز ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان آتش کدہ بن گیا۔ گولہ باری کے ساتھ ہی تیر دستاں کی نوبت آئی اور تلواریں ٹکرانے لگیں۔

راجا کے لشکر کے راجپوت ایسی بہادری کے مظاہرہ کر رہے تھے کہ اورنگزیب کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اسی وقت شہزادہ مراد اپنی فوج کو لے کر آگے بڑھا اور راجا کی لشکرگاہ پر ٹوٹ پڑا۔ یہاں بھی راجپوتوں سے معرکے کی جنگ ہوئی۔ آٹھ نو ہزار سوار لشکرگاہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان سواروں نے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن جلد ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

ادھر اورنگزیب کی فوجوں نے راجپوت سرداروں کو قتل کرنا شروع کیا۔ جب نامور سردار کھیت ہو گئے تو کھلبلی مچ گئی۔ جسونت سنگھ ایسا بے حواس ہوا کہ راجپوتی آن بان کو خیرباد کہہ کر جان بچائی اور بھاگ نکلا اس کے بھاگتے ہی قاسم خاں کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ اس کے بعد تو جس کا جدھر منہ اٹھا فرار ہو گیا۔

☆☆☆

شاہ جہاں پوری طرح صحت یاب ہو گیا تھا لیکن اکبر آباد کی گرم ہوا ناموافق آ رہی تھی اس لیے حکم شاہی ہوا کہ دلی کی طرف کوچ کیا جائے۔ بادشاہ کا جانا کیا ہوتا تھا، ایک شہر تھا جسے دوسرے شہر منتقل ہوتا ہوتا تھا۔ رتھوں کی قطاریں، ہاتھیوں کے غول، احدیوں کے دستے، خیمے، قناتیں، ایک برات تھی جو اکبر آباد سے نکلی۔ دو تین منزلیں طے ہو گئی تھیں کہ شاہی ساز و سامان سے دور ہوا میں غبار اڑتا نظر آیا۔ دارا شکوہ گھوڑے پر سوار تن تنہا اس قافلے کے تعاقب میں تھا۔ اس کا یوں چلے آنا غیر معمولی تھا۔ شاہ جہاں نے اپنے رتھ کو رکوانے کا حکم دیا۔

دارا شکوہ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا لایا اور گھوڑے سے کود کر انتظار کرنے لگا کہ بادشاہ اسے اپنے رتھ

پر سوار ہونے کا حکم دے۔ اشارہ ملتے ہی وہ رتھ میں سوار ہوگیا۔

"شہزادے، خیریت تو ہے؟"

"صوبے داروں کی عرض داشتوں سے معلوم ہوا ہے کہ اورنگزیب اور مراد کی متحدہ فوجوں سے شاہی افواج کا مقابلہ ہوا ہے۔ راجا جسونت اور قاسم خاں کو ہزیمت اٹھانی پڑی ہے اور اب اورنگزیب آگرہ کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔"

"ہم نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اورنگزیب کا راستہ روکنے کے لیے شاہی دستے نہ بھیجے جائیں۔ اورنگزیب ضدی ہے۔ اسے پیار سے سمجھایا جاسکتا تھا۔"

"اس کے بعد بھی وہ یہی کرتا جو اس نے اب کیا ہے۔ راجا جسونت سنگھ آپ کا نمائندہ ہی تو تھا۔ اس نے راجا کا لحاظ نہیں کیا۔ اس کے سپاہیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اسے آگرہ کی طرف بڑھنا تھا اور بس۔ وہ بغاوت کا اعلان کر چکا ہے۔"

"ہم خود اس کے پاس جائیں گے اور اسے سمجھائیں گے۔"

"ظل سبحانی، یہ باتیں اس جنگل میں کرنے کی نہیں۔ آپ قلعہ آگرہ واپس چلیے۔ اس طوفان کو دبانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"راستے سے واپس لوٹنا بدشگونی ہے۔ ہم دہلی جا کر اورنگزیب کو خط لکھیں گے۔ وہ ہمارا بیٹا ہے۔ ہماری بات ضرور مانے گا۔"

"ظل سبحانی، دہلی پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی۔ اورنگزیب یلغار کرتا ہوا آگرہ تک پہنچ جائے گا۔ آپ کا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔"

شاہ جہاں کسی طور واپسی کے لیے رضامند نہیں تھا لیکن دارا شکوہ منت سماجت کر کے اسے واپس لے آیا۔ اکبر آباد پہنچ کر بھی شاہ جہاں نے اسے (دارا شکوہ) سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ بھائیوں کے مقابلے پر نہ جائے لیکن وہ اپنی ضد پر ڈٹا ہوا تھا۔ شاہ جہاں اپنے ماضی میں گم تھا۔ اس کے ہاتھ بھی اپنے بھائیوں کے خون سے رنگے گئے تھے تب جا کر کہیں تخت ہاتھ لگا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ بعض غلط فہمیوں نے اسے بھی باپ کے خلاف لا کھڑا کیا تھا۔ پھر مراسلت نے دلوں کو صاف بھی کر دیا تھا۔ مراسلت کا خیال آتے ہی اس نے ایک شفقت آمیز خط اورنگزیب کو مخاطب کر کے لکھا۔

"..... مصلحت وقت کو نظر انداز کر کے لشکر کشی اور صف آرائی مناسب نہیں۔ بڑے بھائی سے جو ولی عہد سلطنت ہیں جنگ آزمائی اور مقابلہ حضرت قبلہ گاہی سے لڑنے کے برابر ہے۔ یہ بات حق پرستی و خدا شناسی سے بعید ہے اور دور اندیشی و سعادت کے خلاف ہے۔ مناسب یہ ہے کہ بڑے بھائی کو صدق و خلوص سے اپنی طرف مائل کرو اور تمام احکام کی تعمیل کر کے اخلاص کا ثبوت دو۔

جہاں پہنچ چکے ہو وہیں توقف کرو کہ ولی نعمت قبلہ گاہی کا مقابلہ کرنے سے پرہیز واجب ہے۔ اپنی خواہش اور ارادے سے اطلاع دو تا کہ حسب مرضی سب خواہشوں کا سرانجام کیا جائے۔"

یہ مراسلہ اس نے فاروق بخشی نامی ایک غلام کے حوالے کیا کہ اورنگزیب جس مقام پر بھی آ کر ٹھہرا ہوا سے یہ مراسلہ پہنچا دیا جائے اور اس کے جواب تک وہاں ٹھہرا رہے۔

اجین میں جشن فتح منانے کے بعد اورنگزیب اور مراد نے کوچ کیا۔ اٹھائیس منزلوں کے بعد دونوں بھائی گوالیار کی سرحدوں میں داخل ہوئے۔ دارا شکوہ کی طرف سے دریا کے گھاٹ پر کسی طرح کی ناکا بندی نہیں کی گئی تھی۔ لشکر نے دریائے چنبل کو عبور کیا اور خود اورنگزیب کی سواری دوسرے دن دریا کے اس پار پہنچ گئی۔

دارا شکوہ نے آگرہ پہنچتے ہی لشکر کی تیاری شروع کر دی۔ شاہ جہاں خوف اور اندیشوں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔ سلیمان شکوہ کو بار بار مصلحت سے کام لینے کی تلقین کر رہا تھا۔ کبھی اپنی بیٹی جہاں آرا کو اس کے پاس بھیجتا تھا کبھی خود سمجھاتا تھا۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ میدان جنگ میں گزرا تھا۔ وہ جنگ سے خوفزدہ ہونے والا نہیں تھا لیکن یہ دارا شکوہ کی محبت تھی یا اورنگزیب کی کہ وہ اس جنگ کو ٹالنا چاہتا تھا۔

جس رات کی صبح کو لشکر کی روانگی تھی شاہ جہاں نے دارا شکوہ کو خوب بھینچ کر سینے سے لگایا۔ "جان پدر، ہمیں معلوم ہے اس جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ اورنگزیب کو ہمارے سوا کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ میری شفقت ہی اسے شکست دے سکتی ہے۔ تم توقف کرو۔ میں خود جا کر اس فتنے کو فرو کیے دیتا ہوں۔"

"ظل سبحانی، ہمیں معلوم ہے آپ نے ہمیشہ اورنگزیب کو فوقیت دی ہے۔ اب وہ غداری پر اتر آیا ہے اس کے باوجود اس کے لیے آپ کے دل میں نرم گوشہ ہے۔ آپ کی یہ بے جا محبت سلطنت کو تہ و بالا کر دے گی۔ جنگ میں صرف مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن اگر اسے نہ روکا گیا تو یہاں کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔"

شہنشاہ نے اب اسے روکنا مناسب نہ سمجھا لیکن حکم دیا



کہ اس کا پیش خیمہ آگرہ کے باہر نصب کیا جائے۔ شاہی لشکر کے ساتھ وہ بھی جائے گا۔ دارا شکوہ اس پر بھی تیار نہیں ہوا۔ دارا شکوہ کی محبت نے اسے ایسا بے بس کر دیا تھا کہ اس کی ہر بات مانتا چلا جا رہا تھا۔

بے بسی کی نحیف آواز نے لشکر شاہی کو آگے بڑھنے کا حکم دیدیا۔ امرائے نامدار اور منصب داروں کو ان کے مرتبے کے مطابق ہاتھی، گھوڑے، مرصع خنجر اور تلواریں عطا ہوئیں۔

شہزادہ دارا شکوہ کو خلعت خاصہ، موتیوں اور لعل کے تکموں والی ناری مرصع تلوار عطا ہوئی۔ ایک رتھ بھی عطا ہوا۔ بادشاہان ہند جنوب کی طرف سفر کرتے وقت رتھ پر سوار ہونے کو نیک شگون سمجھتے تھے۔ دو اسپ خاصہ جن میں سے ایک کی زین مرصع اور دوسرے کی طلائی تھی۔ ایک ہتھنی اور نقرئی ساز والا ہاتھی جس کی جھول زربفت مخمل کی تھی مزید مرحمت فرمائی۔ بڑی دیر تک سینے سے لپٹائے رہے۔ دل کا ارمان نکل چکا تو دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ "پروردگارا! اس فرزند دلبند کو فتح و ظفر عطا کیجیو۔"

شہزادہ دارا شکوہ کورنش بجالایا اور رتھ پر سوار ہوا۔ امرائے ذی جاہ اور عالی مرتبت منصب دار اپنے اپنے درجے کے مطابق اس ماہ کامل کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھے۔ شاہ جہاں عصا سے ٹیک لگائے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا یہاں تک کہ سواری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

فاروق بخشی اس لشکر کی روانگی سے قبل روانہ ہو چکا تھا اور اس وقت اورنگزیب کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ اسی وقت یہ خبر ملی کہ دارا شکوہ ساٹھ ہزار کا عظیم لشکر لے کر دھولپور تک آپہنچا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور دریائے چنبل کو عبور کر لیا۔ مراسلے کا جواب لکھا اور فاروق بخشی کے حوالے کر دیا۔

"حضرت ظل سبحانی خلیفہ رحمانی کی خدمت میں عرض ہے کہ ملکی اور مالی امور کا انتظام اب جناب کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ بڑے شہزادے کا غلبہ اور تصرف امور مملکت میں اتنا بڑھا ہے کہ بیان ممکن نہیں۔ اپنے مستقل اقتدار و تسلط کی بدولت وہ ہمیشہ اس نیازمند کو نقصان اور ایذا پہنچانے کے درپے رہتے ہیں اور ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہیں۔

انہوں نے ہر طرف سے میری بہتری کے دروازے بند کر کے یہ ارادہ کر لیا کہ دکن کا مالیہ مجھے نہ مل سکے تا کہ میرا حال خراب اور لشکر پراگندہ ہو۔ چنانچہ عین کارگزاری کے دوران جبکہ حضرت کے حسب الحکم میں نے بے جاپور پر لشکر کشی کر کے ہزار تدبیروں سے والی ریاست کو بے دست و پا کر لیا تھا اور یہ صورت پیدا ہوگئی تھی کہ یا تو وہ مجھے پیش بہا پیشکش دے یا تباہ ہو جائے، ٹھیک اسی وقت شہزادہ کلاں نے بادشاہی لشکر کو واپس طلب کر لیا۔

مجھے جو مختصر سا علاقہ حضور نے عطا فرمایا تھا اسے چھیننے کے واسطے جسونت سنگھ کو لشکر کثیر دے کر بھیجا۔ مطلب یہ تھا کہ اس خیر خواہ کے قبضے میں بالشت بھر زمین باقی نہ رہے۔

جب نیازمند نے یہ دیکھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے اور شہزادہ دارا شکوہ مزاج عالی پر حاوی ہو کر آپ کو ایسا بے اختیار کر چکا ہے کہ حضرت اپنے تمام بیٹوں کو دشمن سمجھتے اور اس کی مرضی کے مطابق فرمان صادر کرتے ہیں تو مجھ پر فرض ہوا کہ خدمت والا میں پہنچ کر حقیقت عرض کروں۔ شہزادے کے گماشتے راجا جسونت نے میرا راستہ روکا۔ میں نے اسے شکست سے دوچار کیا اور آپ تک پہنچنے کے لیے آگے بڑھتا رہا۔ اب سنتا ہوں کہ شہزادہ، بلند اقبال عداوت و نفرت کا جھنڈا بلند کیے ہوئے میرے مقابلے کے واسطے دھول پور آپہنچے ہیں۔

ان کا مجھ سے جنگ کرنا بے سود ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ کچھ عرصے کے لیے اپنی جاگیر صوبہ پنجاب میں چلے جائیں اور حضور کی خدمت کا فریضہ مجھ غلام کے حوالے کریں۔ اس کے بعد جو کچھ حضرت کی رائے عالی میں آئے تعمیل کی جائے گی۔"

یہ عرض داشت بھیجنے کے بعد اورنگزیب فوجوں کو ترتیب دے کر میدان جنگ کی طرف بڑھا۔ اس عرضداشت کا کوئی فائدہ نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر شاہ جہاں نے صرف شفقت نامہ بھیجا ہوتا تو بات دوسری تھی۔ یہ خط بھی ملا اور دارا کی فوجیں بھی آمادۂ جنگ ہوگئیں۔ اب دو ہی راستے تھے یا تو اورنگزیب گرفتاری پیش کرتا یا جنگ کے لیے آگے بڑھتا۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

دوسرے دن جب دارا شکوہ سوار ہوا تو اس کا عظیم الشان لشکر اور بے شمار ہاتھی دو کوس کے رقبے میں پھیلے ہوئے تھے۔

اورنگزیب اور مراد نے بھی خوب تیاری کر رکھی تھی۔ لڑائی کا آغاز دونوں طرف کے توپ خانوں سے ہوا۔ گولہ باری کی چھاؤں میں جنگجو آگے بڑھے۔ تیروں کی بارش شروع ہوئی اور پھر تلوار چلی، خنجر چمکے۔ عفوں کی چیر پھاڑ شروع ہوگئی۔ گرمی اس غضب کی تھی کہ لوہے میں غرق سپاہی گرمی سے ابل رہے تھے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ گرمی سے مرنے سے بہتر ہے لڑتے ہوئے جان دے دی جائے۔ ہر سپاہی آگے بڑھ کر پہلے مرنا چاہتا تھا۔

اتنے بڑے لشکر کے لیے فتح و شکست کی منزلیں طے کرنے کے لیے دن بھر کی مدت کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن یہ جنگ جتنی جلدی میں شروع ہوئی، اسی برق رفتاری سے اپنے نتیجے تک پہنچ گئی۔ دوپہر تک دارا شکوہ کے بڑے بڑے سردار خون میں نہائے اور خاک میں مل گئے۔

دارا شکوہ نے اپنے سرداروں کو مقتول اور زخمی دیکھا تو سراسیمہ ہوگیا۔ اس کا ہاتھ اس کی تلوار سمیت ہوا میں بلند تھا اور وہ سراسیمہ ہوکر ادھر ادھر اپنے سرداروں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک آتشیں بان اس کی عماری پر آ کر لگا۔ وہ ایسا گھبرایا کہ ہاتھی سے نیچے کود گیا۔ بلا کسی ہتھیار کے دوڑ کر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ یہ اس کی ایسی فاش غلطی تھی جس نے جنگ کا پانسا بالکل ہی پلٹ دیا۔ اس کی فوج نے دیکھا کہ اس کی عماری خالی پڑی ہے تو سب کا جی چھوٹ گیا اور جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ دارا شکوہ کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ سلطنت کی حفاظت تو کیا ہوتی جان بچانی مشکل ہوگئی۔ گھوڑے پر سوار تو تھا چند بے سر و ساماں سواروں کے ساتھ اکبر آباد کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

شام ہوگئی تھی۔ اس بے دیار کے پاس مشعل تک نہیں تھی، کھڑا سوچتا رہا کہ کہاں جائے۔ اندھیرے نے اس کی مدد کی۔ اس نے سوچا میں یوں بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ باپ کے پاس جانے کے بجائے اپنی حویلی میں چلا گیا۔

چمبل کی وادیوں میں اورنگزیب نے دارا کو شکست دیدی۔ شاہ جہاں کے کانوں میں ان الفاظ کی گونج سنائی دی۔ وہ تڑپ کر دیوان خانے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت وہ پہلے سے زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ خبر لانے والا ان زخمیوں کے ساتھ کھڑا تھا جو دارا شکوہ کے ساتھ میدان چھوڑ کر آئے تھے۔ شاہ جہاں کی بوڑھی آنکھیں دارا شکوہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

"دارا شکوہ کہاں ہے؟"

"شہزادہ عالی جاہ خیریت سے ہیں اور آگرہ پہنچ چکے ہیں۔"

"وہ خود کیوں نہیں آیا۔ اس سے کہو ہم سے ملاقات کرے۔"

میدان جنگ میں اورنگزیب نے شکرانے کے دو نفل ادا کیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فتح سے ہمکنار کیا۔ یہاں شاہ جہاں نے مصلے پر قدم رکھا کہ یہ بھی جائے شکر تھی۔ جنگ کا فیصلہ کسی کے حق میں بھی ہوا ہو اس کے دونوں بیٹے زندہ تھے۔

"دارا شکوہ اب تک کیوں نہیں آیا؟"

"انہیں اس شکست پر اتنی خجالت ہے کہ وہ آپ سے ملنے سے گریزاں ہیں۔"

"ہم اورنگزیب کو شکست دینے کے لیے دوسری سپاہ بھیجیں گے۔ از سر نو تیاریوں کے لیے مشورہ کرتے چلے آؤ۔"

بار بار قاصد دوڑائے جا رہے تھے۔ دارا شکوہ عذر بہانے کر کے ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ وہ اس شکست پر استادل برداشتہ ہوا تھا کہ کسی صورت باپ کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ ہی دن جاتے ہیں اورنگزیب اکبر آباد میں داخل ہوجائے گا۔ اورنگزیب کا دشمن اس کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ یہی بہتر ہے کہ اکبر آباد چھوڑ دے۔ اس نے اسی رات ہاتھیوں، اونٹوں اور خچروں پر جواہرات، زیورات، اشرفیاں، سونے چاندی کا سامان بار کرا کے اکبر آباد سے باہر آیا اور لاہور کا ارادہ کر کے دہلی کی طرف روانہ ہوگیا۔

اورنگزیب کامیاب و کامران فتح کے شادیانے بجاتا آگرے کے نواحی باغ نور منزل میں اترا۔ اس کا ارادہ اب بھی یہی تھا کہ وہ کوئی سبیل نکالے گا اور باپ سے ملاقات کرے گا لیکن دنیا تو فاتح کا ساتھ دیتی ہے۔ ایک پہر نہیں گزرا تھا کہ امرا اور منصب دار اظہار اطاعت کے لیے حاضر ہونے لگے۔ شاہ جہاں بادشاہ کے نہایت معتبر اور بااعتماد سردار شہزادہ اورنگزیب کے سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ ان میں سے جو آتا تھا یہی مشورہ دیتا تھا کہ ملک ہندوستان کو اس جیسے بادشاہ کی ضرورت ہے۔ اگر اس نے دیر کی تو اس ملک کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

شہزادہ مراد جب گجرات کی صوبے داری پر متعین تھا اور شاہ جہاں کی علالت کی خبر مشہور ہوئی تھی، اس نے اسی وقت اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اپنا سکہ تک جاری کر دیا تھا۔ اب جو دارا شکوہ راستے سے ہٹ گیا تو اسے اپنا یہ خواب پورا ہوتا نظر آنے لگا۔ اسے یہ غلط فہمی بھی ہونے لگی کہ یہ معرکے اس نے سر کیے ہیں اور وہی تخت کا حق دار ہے۔ وہ اورنگزیب کی زبانی یہ بھی سنتا رہا تھا کہ اورنگزیب تاج و تخت کا خواہاں نہیں ہے بلکہ سلطنت کا بندوبست ٹھیک کرنے اور والد گرامی سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اورنگزیب تو بادشاہت کے حق میں نہیں۔ پھر یہ حق اسے ملنا چاہیے۔ اورنگزیب یہ حق دینے کو تیار ہوجائے گا؟ ہرگز نہیں۔ خاص طور پر اس حالت میں کہ ظل سبحانی ابھی حیات ہیں۔ میں کیا گجرات سے صرف اس لیے آیا ہوں کہ غلط فہمیاں دور کروں اور واپس چلا جاؤں۔ مجھے اپنا راستہ الگ کرنا ہوگا لیکن اس طرح کہ اورنگزیب کو اس کی بھنک بھی



نہ پڑے۔ پہلے تو مجھے یہ کوشش کرنا چاہیے کہ اورنگزیب اور ظل سبحانی کی ملاقات نہ ہونے پائے تاکہ حالات بگڑتے جائیں۔ ایک معرکہ اور ہو اور اس معرکے کے دوران میں اورنگزیب کو راستے سے ہٹا دوں۔ اس خیال کے پختہ ہوتے ہی اپنے ملازموں پر بے دریغ دولت لٹانا شروع کر دی تاکہ وہ اس سے وفادار رہیں۔ اورنگزیب کے بھی بہت سے ملازموں کو توڑ لیا اب اسے مناسب وقت دیکھ کر اورنگزیب سے ملحدگی اختیار کرنا تھی۔

☆☆☆

شاہ جہاں کو یقین آ گیا تھا کہ اورنگزیب باغی ہوگیا ہے۔ اسے شکست دینے کے لیے ایک اور کوشش کرے گا لیکن اسے یہ خبریں بھی مل رہی تھیں کہ اس کے نہایت بااعتماد و منصب دار، اورنگزیب سے خفیہ ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ جب اس امر کی تصدیق ہوگئی تو فرزند اقبال مند (اورنگزیب) کو ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ مقابلے کا خیال دل سے نکال کر ملاقات کا خواہاں ہوا۔ اپنے ایک سردار فاضل خاں کو طلب کیا اور اسے یہ مراسلہ دے کر اورنگزیب کے پاس بھیجا۔

"فرزند اقبال مند کی سواری دارالخلافہ آگرہ کے نزدیک آ کر اتری ہے۔ مابدولت کو بھی زمانہ فراق کی درازی کے سبب اس والا جاہ سے ملنے کا کمال اشتیاق ہے۔ دل بے تاب کا تقاضا ہے کہ فرزند کا جمال دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ فرزند کا یہ حال کہ اب تک زیارت کے لیے نہیں آیا۔ اسے سرد مہری اور بے توجہی سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اگر محبت کے تقاضے اور تعظیم و تکریم کی خاطر لشکر سے چل کر ہماری خدمت میں حاضر ہو تو مناسب ہے کیونکہ اس نیاز مند بارگاہ الٰہی نے سخت بیماری کے بعد شفا پائی ہے۔"

فاضل خاں یہ مراسلہ لے کر لشکر میں پہنچا۔ بہت کچھ زبانی بھی کہا۔ اورنگزیب نے باپ کی تحریر کو آنکھوں سے چوما، دل سے لگایا۔ باپ کی یاد ایسی آئی کہ آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ فاضل خاں سے کہا، ذرا ٹھہرو اس کا جواب لیتے جاؤ۔

"حضور کا فرمان جس سے حضور کی اس خاکسار سے ملاقات کا اشتیاق ٹپکتا ہے اور جس میں اس غلام کو حاضر بارگاہ ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔ میرے لیے باعث عزو افتخار ہوا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نیاز مند کی عقیدت و ارادت حضور کے ضمیر منیر پر روشن ہوگئی۔ اب جبکہ تمام ظاہری آداب و رسوم ادا ہو چکے ہیں اور حضور پرنور کے التفات کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہو کر جاں فزائی کر رہا ہے۔ امیدوار ہوں کہ کسی مبارک و مسعود گھڑی میں خاکسار کو حاضر ہونے کی اجازت دیں۔

ایک مدت سے یہی آرزو تھی اور اسی ساعت کا انتظار تھا تاکہ حضرت کا دیدار کر کے آنکھیں روشن اور تمام آرزوئیں پوری کروں۔"

جواب کیا تھا محبت نامہ تھا۔ ایک ایک لفظ سے سعادت مندی کی خوشبو آتی تھی۔ فاضل خاں خوش تھا کہ اب وہ بے پناہ انعام و اکرام کا مستحق ٹھہرے گا۔ اس نے صرف ایک ہی ملاقات میں باپ بیٹوں کے درمیان رنجش دور کرا دی تھی۔

فاضل خاں شاہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور خوش خبری سنائی تو شاہ جہاں کے چہرے پر اطمینان کی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ فاضل خاں کے اٹھتے ہی اس نے ناہر دل خاں چیلہ کو طلب کیا۔

"تمہیں اسی وقت دہلی کی طرف روانہ ہونا ہے۔ دارا شکوہ کے پاس جاؤ اور اس تک ہمارا یہ فرمان پہنچا دو۔ کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائے اور یلغار کرتے ہوئے دارا شکوہ کے پاس سے جواب لاؤ۔"

خط کا مطلب یہ تھا کہ تم (دارا شکوہ) مطمئن ہو کر دہلی سے آگے نہ بڑھو اور وہیں قیام کرو۔ ہم یہاں قصہ فیصل کیے دیتے ہیں۔

اورنگزیب نے اپنے امرا کو طلب کیا اور شاہ جہاں کا رقعہ ان کے سامنے رکھا۔ مراد بخش بھی حاضر تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ معاملہ ہاتھ سے نکلا جاتا ہے تو بادشاہ کی نیت پر شک ظاہر کیا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ بادشاہ کی نیت صاف نہیں ہے۔ اگر آپ اس سے ملاقات کے لیے گئے تو وہ آپ کو قید کر لیں گے۔

دوسرے امرا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ بعض نے دبے لفظوں میں یہ مشورہ بھی دیا کہ اسے بادشاہ سے ملاقات کے لیے جانا چاہیے۔

اورنگزیب بھی دونوں طرف کی باتیں سن کر تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ ناہر دل چیلہ جسے بادشاہ نے دہلی کی طرف روانہ کیا تھا، اورنگزیب کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور وہ فرمان اسے دکھا دیا جس میں دارا سے کہا گیا تھا کہ تم مطمئن ہو کر دہلی سے آگے نہ بڑھو اور وہیں قیام کرو۔ ہم یہاں قصہ فیصل کیے دیتے ہیں۔

امرا کا اختلاف ابھی دماغ سے نکلا نہیں تھا کہ یہ الفاظ آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ "ہم یہاں قصہ فیصل کیے دیتے ہیں۔"

شاہ جہاں کا مطلب کچھ بھی ہو اورنگزیب نے یہی مطلب نکالا کہ اسے دھوکے سے بلا کر قتل کر دیا جائے گا۔

شاہ جہاں بے خبر تھا کہ اس کے قاصد نے دارا شکوہ کے پاس جانے سے قبل اورنگزیب سے ملاقات کر کے کتنی بڑی الجھن پیدا کر دی ہے۔ اس نے اگلے دن فاضل خاں کو پھر طلب کیا۔ بیش بہا جواہرات اور انعموں تحفے ہمراہ کر کے زبانی پیغام بھجوایا کہ بادشاہ ملاقات کے لیے بے تاب ہے۔

فاضل خاں نے بڑی امیدوں کے ساتھ اورنگزیب کے لشکر میں قدم رکھا تھا لیکن ابتدا ہی میں اس کی فہم و فراست نے تاڑ لیا کہ اورنگزیب کے رویے میں گرم جوشی نہیں ہے۔ اس نے تحفے وصول تو کر لیے لیکن کہاں تو یہ حال تھا کہ رقعہ شاہی کو آنکھوں سے لگایا تھا اور کہاں یہ صورت کہ بے دلی سے تحفے ایک طرف رکھ دیے۔

"ظل سبحانی مشتاق ہیں کہ آپ کب تشریف لاتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"آپ کا انتظار قلعے میں ہے۔"

"لشکر کی مصروفیات سے جان نہیں چھوٹتی۔ کبھی ہوا تو ضرور آؤں گا۔ ویسے بھی ظل سبحانی کی آنکھ کا تارا تو دارا شکوہ ہے۔ میں نے بدخشاں، قندھار اور دکن کی مہمات سرانجام دیں اس کے باوجود ہمیشہ جانب داری کا ہی مظاہرہ دیکھا۔ حضور نے ہمیشہ بڑے بھائی کو اہمیت دی۔"

"انہی زیادتیوں کا ازالہ تو کرنا چاہتے ہیں، ظل سبحانی۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ بندوبست آگرہ سے فارغ ہولوں تو ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میں دارا شکوہ نہیں ہوں جس کی جدائی میں حضور اتنے بے چین ہوں گے۔ ان سے کہنا کچھ دن انتظار کر لیں، تفصیلی ملاقات ضرور ہو گی۔"

اس کی باتوں میں اتنی غیریت تھی کہ فاضل خاں جیسا فصیح البیان بھی لاجواب ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ مفسدوں کا داؤ چل گیا ہے۔ بات اتنی بگڑ گئی ہے کہ تدارک ممکن نہیں۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور شہزادے سے اجازت لے کر چلا گیا۔

اس کے اٹھتے ہی ایسا سناٹا چھا گیا جیسے فاضل خاں کے سوا یہاں کوئی اور تھا ہی نہیں۔ اورنگزیب نے اجازت باریابی دی اور اس کی محفل کے نکتہ سنج حاضر خدمت ہو گئے۔ اورنگزیب نے فاضل خاں سے ہونے والی گفتگو سے انہیں آگاہ کر دیا۔

"پیغامبر پر پیغام بر آ رہے ہیں۔ اگر ظل سبحانی کو دارا شکوہ کی زیادتیوں کا احساس ہوتا۔ اگر انہیں ہم سے پیار ہوتا تو خود بھی تشریف لا سکتے تھے۔ کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر یہ کیسے معلوم ہوتا کہ وہ شہنشاہ ہیں۔ وہ فقط شہنشاہ ہیں۔ اگر باپ ہیں تو دارا شکوہ کے ہیں۔ میں تو ہمیشہ ان کی آنکھوں میں کھٹکتا ہی رہا ہوں۔ اب بھی کھٹک رہا ہوں۔ اس لیے کہ میں نہ ہوتا تو دارا شکوہ ان کے پاس ہوتا۔ وہ مجھے راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ اب دارا شکوہ نہیں ہے تو جہاں آرا ان کے پاس ہے۔ اس خط کتابت کے پیچھے اس کا ذہن رسا کارفرما ہے۔"

جہاں آرا کی عمر بڑی تھی۔ ایک دن پہلے ہی اس کا ذکر ہوا تھا۔ دوسرے دن شور مچا کہ شہزادی جہاں آرا کی سواری لشکر میں پہنچی ہے۔ اورنگزیب کے دربار میں باریابی کی منتظر ہے۔ اس کی سواری کا رتھ چاروں طرف سے پردوں میں ڈھکا ہوا، اورنگزیب کے خیمے کے سامنے کھڑا تھا۔ شہزادی کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں نے رتھ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔

جہاں آرا کا نام سنتے ہی لہو نے جوش مارا۔ اورنگزیب ننگے پاؤں خیمے کے دروازے تک آیا۔ دونوں طرف قناتیں کھینچ دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود جہاں آرا نے خود کو سر سے پاؤں تک ایک بڑی کشمیری شال میں چھپایا ہوا تھا۔ بھائی پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم ساکت ہو گئے۔

"میرے بھائی، میں کتنے دن بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں اور وہ بھی اس حال میں کہ میں آئی ہوں تم نہیں آئے۔"

"میں تو یہ سمجھا تھا کہ ظل سبحانی بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔" اورنگزیب نے جہاں آرا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہاری باتوں سے یہ سمجھ لیا جائے کہ تم ظل سبحانی کو اپنے قدموں میں جھکانا چاہتے ہو؟"

"میں صرف یہ ثبوت چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

"ایک باپ سے اس کی محبت کا ثبوت مانگتے ہو۔"

"اس باپ سے جس نے ہمیشہ دارا شکوہ کو مجھ پر ترجیح دی۔ ولی عہد کے بیمار ہونے کے ساتھ ایسے انتظامات کیے کہ خبریں مجھ تک نہ پہنچیں۔ بنگال اور گجرات کے راستے بند کرا دیے۔ میرے وکیل کا گھر ضبط کر کے اسے قید کر دیا۔ میری تنخواہ روکی گئی۔ بیجاپور سے تمام افسروں کو بلا لیا گیا۔ میں نے کوئی پیش قدمی نہیں کی تھی پھر بھی میرے مقابلے کے لیے جسونت سنگھ کو بھیجا گیا۔ یہ سب ہوتا رہا اور مغل ہندوستان کا عظیم بادشاہ خاموش رہا۔ اور تم؟ تم بھی اس وقت کہاں تھیں جب یہ سب سازشیں ہو رہی تھیں۔ اب بھی وہ صرف اتنا چاہتے ہوں گے کہ میں دارا شکوہ کو معاف کر دوں اور دکن واپس چلا جاؤں۔"

"ایک باپ یہی چاہے گا کہ اس کے بیٹوں میں کشت وخوں نہ ہو۔ دارا شکوہ کا جرم یہ ہے کہ اس نے جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اسے اب معاف کر دو۔ جہاں پناہ یہ چاہتے ہیں کہ سلطنت کو چاروں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔"

"دارا شکوہ تو پھر بھی فائدے میں رہا۔ میرے ساتھ زیادتیوں کا صلہ اسے یہ ملے گا کہ سلطنت کا حصہ دار بن جائے۔ بڑا ہونے کے ناتے اسے یہ حصہ کچھ زیادہ ہی ملے گا اور تم کیا سمجھتی ہو۔ اس کے بعد وہ کینہ پروری سے باز آ جائے گا۔"

"اگر کچھ نہیں کر سکتے تو میرے سامنے وعدہ کرو کہ تم نے اسے معاف کر دیا۔ اب اس کا تعاقب نہیں کرو گے۔"

"میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"میں ایک بھکارن بن کر اس کی زندگی کی تم سے بھیک مانگتی ہوں۔"

"وہ اس وقت میری قید میں نہیں ہے۔ جہاں پناہ کے اشارے پر کہیں روپوش ہے۔"

"تمہارے عزائم بتا رہے ہیں کہ تم اسے ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کرو گے۔ کیونکہ بادشاہت تمہارا ارادہ ہے۔"

"میں نے جب کوچ کیا تھا تو واقعی یہ ارادہ نہیں تھا لیکن اب ہے کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ جہاں پناہ اب بھی جانب داری برت رہے ہیں۔"

"تم ایک مرتبہ ابا حضور سے مل کیوں نہیں لیتے تاکہ غلط فہمیاں دور ہوں۔"

"اس کی کیا ضمانت ہے کہ مجھے قید نہیں کر لیا جائے گا۔"

"اس کی ضمانت تمہاری بہن تمہیں دیتی ہے۔"

"یہ صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے کہ میرے جانے سے پہلے میرے آدمی قلعہ کا بندوبست سنبھال لیں ظل سبحانی اپنے تمام آدمیوں کو وہاں سے ہٹا لیں۔"

"تم کیسے دیر ہو۔" جہاں آرا کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ غصے کی جھلک آئی تھی۔ "اپنے بوڑھے باپ سے جو بیمار بھی ہے، اتنے خوفزدہ ہو۔"

"انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ صرف شہنشاہ ہیں اور کچھ نہیں۔"

"اور تم یہ ثابت کر رہے ہو کہ تم صرف باغی ہو اور کچھ نہیں۔"

یہ ملاقات ایسی ہی تلخیوں کو جنم دیتی رہی اور بالآخر جہاں آرا اٹھ کر چلی گئی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ یہ شبہ کیا جا سکتا تھا کہ اس ملاقات کے بارے میں بادشاہ کو علم ہی نہ ہو۔ جہاں آرا اپنے طور پر اس سے ملنے آئی ہو لیکن دوسرے ہی دن یہ شک دور ہو گیا جب ایک خواجہ سرا قلعے سے آیا۔ بادشاہ نے اس کے ہاتھ ایک قیمتی تلوار بھیجی تھی۔ اس تلوار کا نام "عالمگیر" تھا۔ تیموری خاندان میں اس سے اچھی تلوار دیکھی نہیں گئی تھی۔ اس خواجہ سرا نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتا دیا کہ جہاں آرا بادشاہ کے اشارے پر آئی تھی۔

جب یہ خواجہ سرا رخصت ہو گیا تو محفل کے نکتہ سنج لوگوں نے عالمگیر نامی تلوار کے آنے کو ایک اچھا شگون قرار دیا اور اورنگزیب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا لقب "عالمگیر" اختیار کرے۔ یہ مشورہ اتنا پسند کیا گیا کہ اس دن کے بعد سے اورنگزیب عالمگیر لکھا جانے لگا۔

شاہ جہاں ہر حربہ استعمال کو کے دیکھ چکا تھا لیکن اورنگزیب اس کے دام میں آنے والا نہیں تھا۔ وہ یوں بھی شہزادے کو باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ کوئی



## دس تمہارے

ایک رئیس نہایت قیمتی لباس پہن کر ایک فلسفی کے پاس گیا۔ فلسفی نے نیچے سے اوپر تک اُسے دیکھا۔ رئیس فلسفی کے اس انہماک پر بہت خوش ہوا اور پوچھا: "اگر آج میں خود کو تمہارے ہاتھ بیچوں تو کیا قیمت ادا کرو گے؟"

فلسفی نے جواب دیا: "چار سو دس روپے۔"

رئیس نے پوچھا: "چار سو دس کس حساب سے؟"

فلسفی نے جواب دیا: "چار سو روپے لباس کے اور دس تمہارے۔"

Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

محبت کی سزا کاٹ رہا ہے۔ اس نے اپنے آنسو ایک خط میں بند کیے اور شاہ جہاں کی خدمت میں بھیج دیے۔ اس نے اپنی نامرادی کی داستان لکھ کر سلیمان شکوہ کی شکایت کی تھی کہ ایسے نازک وقت میں کہ میں دربدر ہوں وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ ہزار خط لکھ چکا ہوں لیکن وہ آنے کا نام نہیں لیتا۔ اب میں لاہور کی طرف روانہ ہو رہا ہوں۔ لاہور کے خزانے میں مال و دولت بہت ہے جو نئے لشکر کی تیاری میں کام آئے گا۔ بہت جلد اورنگزیب پر نئی یلغار کروں گا۔ آپ کی نظر بندی کے دن بہت تھوڑے ہیں۔ میرا عزم ہے کہ نافرمان بیٹے کو اس کی نافرمانی کی سزا ضرور دوں گا۔

یہ خط کسی نہ کسی طرح شاہ جہاں تک پہنچ گیا۔ آنسوؤں نے یلغار کی۔ ڈاڑھی تر ہو گئی۔ داراشکوہ کی آنکھوں کو وہ ارجمند یا ممتاز محل کی آنکھوں سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا داراشکوہ کی آنکھیں بالکل اپنی ماں پر گئی ہیں۔ اسے دیکھ کر مجھے ممتاز محل کی یاد آجاتی ہے۔ اسی لیے میں اسے ایک پل کے لیے خود سے دور نہیں ہونے دیتا تھا۔ آج ان آنکھوں میں آنسو ہیں، وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے محبوب دارا کو بچانے کے لیے آخری کوشش کی۔ اس نے کابل کے صوبے دار مہابت خاں کو خط لکھا۔

"عقیدت مند مہابت خاں کو معلوم ہونا چاہیے کہ زمانے کے ہاتھوں اس سلطنت کو کتنا بڑا نقصان پہنچا ہے اور ان بے سعادت حرام خوروں نے کیا بدسلوکی کی ہے۔ اب مظلوم داراشکوہ شکست کھا کر لاہور چلا گیا ہے۔ اس آڑے وقت میں تم ہی ایسے مخلص اور عقیدت مند ہو کہ دنیا کے معمولی فائدوں کو خاطر میں لائے بغیر نام و ننگ کو پیش نظر رکھو گے۔

داراشکوہ بس لاہور پہنچ رہا ہے۔ لاہور میں خزانے کی کمی نہیں۔ آدمی اور گھوڑے کابل میں بہ کثرت ہیں۔ اس موقع پر مہابت خاں جیسا بہادر آدمی جس کی ہیبت سے زمانہ لرزاں ہے، شاہ جہاں کی طرح گوشہ نشیں بیٹھا رہے تو تعجب ہے۔ مناسب یہ ہے کہ وہ بہادر آراستہ لشکر لے کر عزیمت کرے اور لاہور پہنچ کر داراشکوہ بابا کی مدد و رفاقت کرے اور ان دونوں نابرخورداروں کو جزائے اعمال پر پہنچانے کی سعی کرے اور صاحب قران ثانی (شاہ جہاں) کو قید سے چھٹکارا دلائے۔

میں نے فرزند ارجمند (داراشکوہ) کو بھی لکھ دیا ہے کہ وہ خود کو تمہارے سپرد کر دے اور اس سپہ سالار کی اطاعت میں ہی اپنی فلاح و بہبود اور میری رہائی کو مضمر سمجھے۔"

اس خط کو اس نے خفیہ طور پر کابل بھجوا بھی دیا اور اس انتظار میں صبر سے بیٹھا رہا کہ مہابت خاں اور دارا دونوں مل کر اورنگزیب کا سر کچل دیں گے۔

اسے مہابت خاں کی مدد کا اتنا یقین تھا کہ جب ایام نظر بندی میں اورنگزیب نے اپنے قصوروں کی معافی چاہی اور ملاقات چاہی تو اس نے اس خواہش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اورنگزیب نے بار بار منت کی اور بار بار ٹھکرایا گیا۔ اورنگزیب کے دل میں اب بھی یہ کانٹا کھٹک رہا تھا کہ دارا کی محبت نے باپ کا دل میری طرف سے پتھر کر دیا ہے۔

"جس بھائی نے میرے اور باپ کے درمیان تفرقہ ڈال دیا ہے، دیکھتا ہوں وہ اب کیسے زندہ رہتا ہے۔ وہ اگر پاتال میں بھی ہوگا تو ڈھونڈ نکالوں گا۔"

اب اسے داراشکوہ کو تلاش کرنا تھا۔

☆☆☆

"کون ہے جو اتنے ناوقت بوڑھے قیدی کے پاس آیا ہے۔ کیا اسے نہیں معلوم کہ وہ قیدی اس وقت اپنے بیٹے دارا سے ہم کلام ہے۔"

"دادا جان، میں ہوں آپ کا پوتا شہزادہ محمد اعظم۔" شہزادے نے کہا اور کورنش بجا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"تو میرا پوتا ہے کم بخت۔ میں تجھے بہت چاہتا تھا۔ تیری پیدائش پر میں نے بڑی خوشی کی تھی لیکن تیرے باپ کی حرکتوں نے تجھے بھی میرے دل سے اتار دیا ہے۔ کیوں آیا ہے میرا مذاق اڑانے۔ یہ دیکھنے آیا ہے کہ میں کیوں زندہ ہوں؟ تو سن لے میں اس لیے زندہ ہوں کہ داراشکوہ آئے گا۔"

"ابا حضور نے پانچ سو اشرفی اور چار ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ قبول فرمائیں۔"

"نذرانے تو بادشاہوں کے حضور پیش کیے جاتے ہیں۔ کیا وہ اب بھی مجھے بادشاہ سمجھتا ہے۔"

"بادشاہ تو آپ ہی ہیں۔ انہوں نے ابھی تک اپنی تخت نشینی کا اعلان نہیں کیا۔"

"پھر یہ نظر بندی؟"

"تقدیر الٰہی۔"

"دارا سے جنگ؟"

"ابا حضور کے غلط فیصلے۔"

"لشکر لے کر قلعہ پر آنا؟"

"سازشوں کا خوف۔"

"اب کیوں آئے ہو؟"

"یہ التجا کرنے کہ ابا حضور کو ایک مرتبہ اپنے پاس آنے دیں۔"

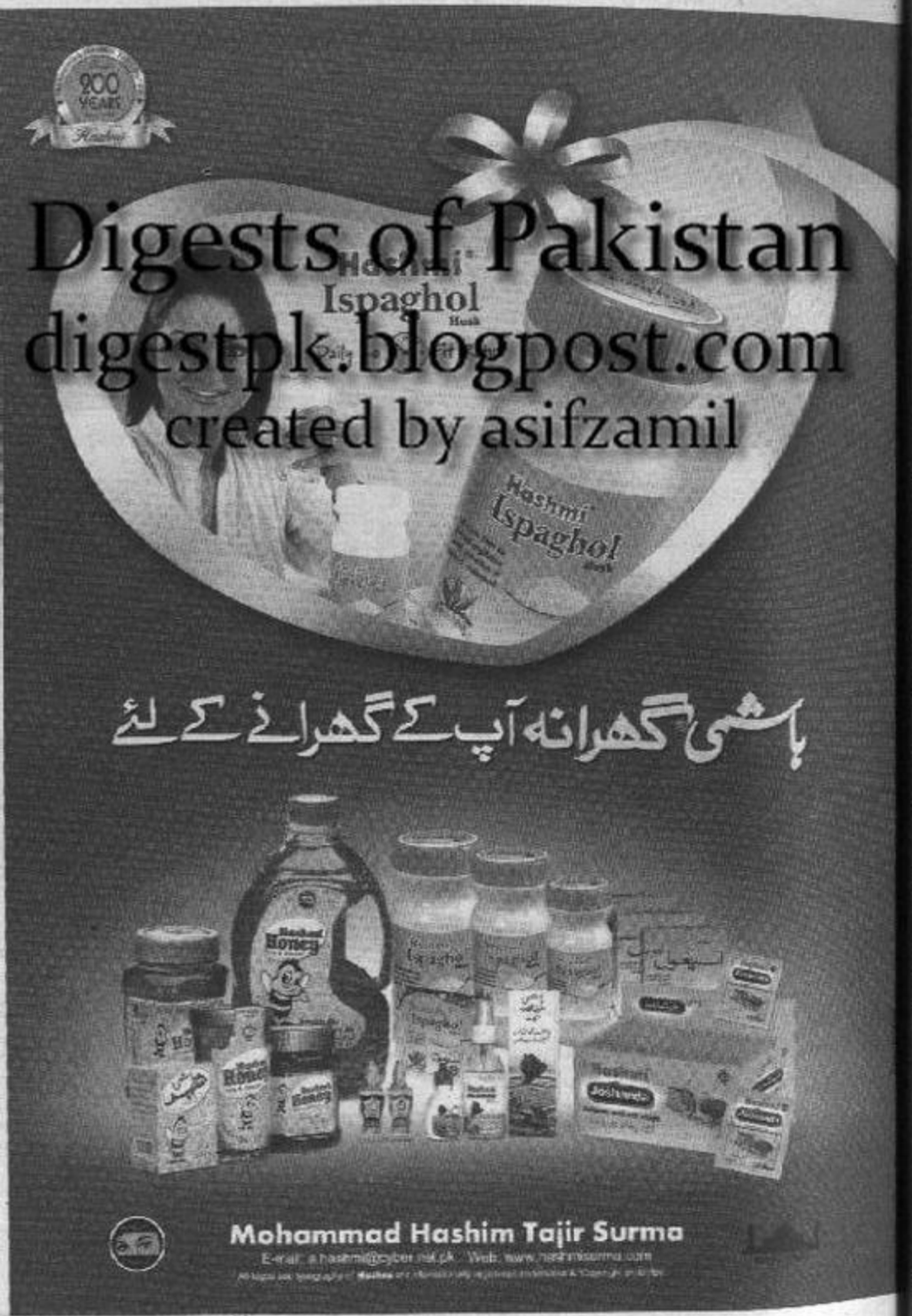

"ہرگز نہیں۔ اب ملاقات میدانِ جنگ میں ہوگی۔ داراشکوہ آتا ہی ہوگا۔ ہم خود اس کے ساتھ جنگ کے لیے نکلیں گے۔"

"دادا حضور، اب بھی وقت ہے۔ آپ کہیں گے تو وہ تایا جان کی جاں بخشی بھی فرما دیں گے۔"

ہم بزدلوں کی طرح داراشکوہ کی زندگی کی بھیک نہیں مانگیں گے۔ اورنگزیب سے کہنا کسی شرط کے بغیر دکن واپس چلا جائے۔ ہم اسے معاف کردیں گے۔"

"یہی بات آپ ان سے ملاقات میں بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"شاید اب کبھی ملاقات نہ ہو۔"

اورنگزیب نے بھی یہ رویہ دیکھا تو ملاقات کا ارادہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا دیا اور اپنے بیٹے شہزادہ سلطان، فاضل خاں اور چند دوسرے شاہی ملازموں کے ہمراہ شاہ جہاں کی خدمت کے لیے چھوڑ کر اکبرآباد سے نکل گیا۔ راستے میں اسے معلوم ہوا کہ داراشکوہ لاہور روانہ ہوگیا ہے۔

مراد بخش بھی اپنے لشکر کو ساتھ لے کر آگیا تھا لیکن یہ خیال اب اسے پریشان کرنے لگا تھا کہ اورنگزیب دہلی پہنچتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کردے گا۔ وہ گجرات میں تھا اسی وقت اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا تھا۔ داراشکوہ کی شکست کے بعد تو وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس معرکے کا فاتح وہی ہے۔ اس نے خاموشی سے فوج جمع کرنی شروع کردی تھی۔ اورنگزیب کے بہت سے ملازموں کو لالچ دے کر توڑ لیا تھا۔ اپنی نادانی میں کھل کر کہنے لگا تھا کہ اورنگزیب کو بادشاہت سے کوئی غرض نہیں۔ مستقبل کا شہنشاہ میں ہوں۔

اورنگزیب تک یہ باتیں پہنچتی رہی تھیں لیکن وہ اس کی تصدیق مراد بخش کی زبان سے بھی چاہتا تھا۔ اس کا موقع اس وقت مل گیا جب وہ پانچ منزلیں طے کرکے متھرا پہنچا اور وہاں پڑاؤ کیا۔ دونوں بھائیوں میں کھنچاؤ ضرور پیدا ہوگیا تھا لیکن بول چال بند نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مراد کو ملاقات کے لیے اپنے خیمے میں بلوایا اور بہت سی لگاوٹ کی باتیں کرنے کے بعد دہلی کے تخت کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"مراد، اس وقت ملک میں کوئی بادشاہ نہیں ہے جو بندوبست سنبھالے۔ ملک کا حال بہت ابتر ہے۔"

"آپ کے علم میں ہے کہ کل بھائی کی علالت کا سنتے ہی میں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا تھا۔"

"وہ تو شجاع نے بھی کردیا تھا۔"

"اسے سلیمان شکوہ کو شکست دے چکا جبکہ میں نے آپ کے ساتھ مل کر داراشکوہ کو شکست دی ہے۔ میں تخت پر بیٹھ کر شجاع کا کام بھی تمام کردوں گا۔ آپ دکن میں ہوں گے میں، دہلی میں۔ یہاں سے لے کر وہاں تک چین ہی چین ہوگا۔"

مراد تو اپنی سادگی میں سب کچھ بتا کر چلا گیا لیکن اورنگزیب پر اس کے عزائم ظاہر ہوگئے۔ مشہور ہے کہ ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ اس نے بہت غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر اس وقت تدارک نہیں کیا گیا تو فساد برپا ہوگا۔ مراد کے عزائم ٹھیک نہیں۔ وہ کسی دن میرے مقابل بھی آجائے گا۔ وہ اطلاعات درست نظر آنے لگیں جو اس تک پہنچی تھیں۔ مراد نئی بھرتیاں کررہا تھا۔ اگر اس کی طاقت بڑھ گئی تو پھر اسے سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔ اس کی بہادری سموگڑھ میں ظاہر ہوچکی تھی۔ اسے آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اورنگزیب نے ایک مرتبہ پھر اسے اپنے خیمے میں مدعو کیا۔ بہانہ یہی تھا کہ آئندہ کے لیے منصوبہ تیار کیا جائے گا۔ مراد یہی سمجھا کہ دہلی کے تخت کے بارے میں کوئی بات کی جائے گی۔ وہ اپنے لشکر سے بھائی کے پاس چلا آیا۔ اورنگزیب نے ضیافت کا اہتمام کیا ہوا تھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد یہ طے ہوا کہ قیلولہ کرلیا جائے اس کے بعد باتیں ہوں گی۔ مراد خواب گاہ راحت میں گیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اورنگزیب کے چند معتمد نوکر وہاں پہلے سے چھپے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی مراد کو نیند نے دبوچ لیا، وہ نوکر باہر نکلے اور مراد کو رسیوں میں جکڑ لیا۔ اس کے ہتھیار اس کے سرہانے دھرے تھے جو رکھے رہ گئے۔

پہلے سے طے ہوچکا تھا۔ ہاتھی تیار کھڑا تھا۔ مراد کو اسی حالت میں ہاتھی پر ڈال دیا گیا۔ ایک چھوٹی سی جمعیت ساتھ ہوگئی۔ یہ قافلہ دہلی کی طرف روانہ ہوا جہاں قید خانہ، مراد کا منتظر تھا۔

دوسرے دن اورنگزیب نے بھی کوچ کردیا۔

وہ دہلی تک پہنچا تھا کہ ہوا نے خاک اڑائی۔ وہ دونوں برق رفتار قاصد جو داراشکوہ کی خبر لانے کے لیے بھیجے گئے تھے، گھوڑے دوڑاتے پردہ غبار سے نمودار ہوئے۔

"داراشکوہ نے سرہند کو لوٹنے اور خزانوں پر قبضہ کرنے کے بعد سرہند چھوڑ دیا۔ اب وہ جس جگہ سے بھی پنجاب کے دریاؤں کو عبور کرتا ہے کشتیوں کو توڑ کر جلا دیتا ہے اور آگے کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس نے چند ہزار سواروں کو ملتان ندی کے گھاٹ پر جو مرکزی گزرگاہ ہے مقرر کردیا ہے۔

یہ خبریں سن کر اورنگزیب شہر میں داخل نہیں ہوا، شہر سے باہر ہی خیمے لگا دیے۔ خیمے لگتے ہی دہلی کے باہر شامیانہ باغ شہر کی رونقیں دکھانے لگا۔ امرائے نامدار، زمیندار، اہل ثروت جوق در جوق نذرانے لے کر پہنچنے لگے۔ حوصلہ دینے والے سب تھے، روکنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک مراد تھا جو اب کسی نامعلوم مقام پر منتقل کردیا گیا تھا۔ شجاع کو سوں دور تھا۔ دارا کے بعد اس کے بارے میں بھی سوچ لیا جائے گا۔ دارا کے تعاقب سے پہلے قانونی حیثیت تسلیم کرالی جائے۔ پہلی ذیقعدہ 1768ھ مطابق 1658ء تخت نشینی کا جشن منعقد کیا۔ وہ اب شہزادہ نہیں بادشاہ تھا۔ عظیم ہندوستان کا بادشاہ جس کی سرحدیں بنگال سے کابل تک پھیلی ہوئی تھیں۔

زروجواہر کے تھال بادشاہ کے سر پر سے نچھاور کیے گئے۔ نذرانے گزارے گئے۔ ارباب طرب حاضر ہوگئے تھے۔ ان کی تانوں سے باغ گونج رہا تھا۔ شعرا نے قصیدے پیش کیے۔

عیش وعشرت کے وہ تمام لوازم جو ایسے جشنوں کے موقع پر رائج ہیں کئی روز تک ادا ہوتے رہے۔ سرداروں کو منصب واعزاز دیے گئے۔ بتایا یہ تھا کہ نئی سرکار شاہ جہاں کے عہد سے مختلف نہیں بلکہ داد و دہش میں اس سے کچھ آگے ہی ہے۔

اورنگزیب ایسے جشن بچپن سے دیکھتا چلا آرہا تھا لیکن اس وقت جشنی جوش تھا یا کیا تھا۔ یہ سب جشن شاہانہ ناگوار خاطر ہورہا تھا، خصوصاً ارباب طرب کی نغمہ سرائیاں۔ اس نے سوچ لیا تھا جب وہ بندوبست کی طرف مائل ہوگا تو ان پر پابندیاں عائد کردے گا۔ نذر دینے کا طریقہ بھی اسے اس وقت عجیب سا لگا۔ اس نے کبھی اس پہلو سے نہیں سوچا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا۔ امرا جو نقد نذریں پیش کرتے ہیں یہ اپنی جیب سے نہیں دیتے ہوں گے۔ عوام سے وصول کرتے ہوں گے۔ اگر یہ رواج ختم کردیا جائے تو عوام کو اس بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ اس کے بجائے محاصل کے حصول کا نظام سخت کردیا جائے تاکہ شاہی کام چلتے رہیں۔

اس نے ایسی ہی کئی تبدیلیوں کے بارے میں سوچا لیکن ابھی ان پر پابندیوں کا وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی تو اس نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری نہیں کیا تھا۔ اس نے بہت سی باتوں کو دوسرے سن جلوس پر ملتوی کردیا۔

اب اسے داراشکوہ پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

خلیل اللہ خاں کو تجربہ کار امرا کی ایک جماعت کے ساتھ ہراول کے طور پر داراشکوہ کے تعاقب میں روانہ کردیا۔ اسے حکم ہوا کہ بہ سرعت تمام جا کر تمام گھاٹوں اور گزرگاہوں سے داراشکوہ کی فوج کی رکاوٹوں کو دور کردے اور کشتیوں وغیرہ کو اپنے تصرف میں لے لے اور عبور کے قابل گھاٹوں پر قبضہ کرکے وہاں کشتیوں کو جمع کرے۔

ان تیاریوں کی اطلاع مل گئی تو اورنگزیب نے داراشکوہ کے تعاقب کے لیے دہلی سے کوچ کردیا۔

برسات کا موسم تھا۔ ندی نالے طغیانی پر تھے۔ دریائے ستلج سے پار اترنا دشوار تھا۔ مناسب سمجھا کہ کشتیاں فراہم ہونے تک قیام کریں اور گھوڑوں کو آرام دیا جائے۔ کشتیوں کی فراہمی میں نو دن لگ گئے۔ اگلے دس دنوں میں پوری فوج ستلج پار کرگئی۔

☆☆☆

داراشکوہ لاہور پہنچ چکا تھا اور اورنگزیب سے مقابلے کے لیے لشکر کی... فراہمی کی فکر میں تھا۔ اسے ان بے بسی کے دنوں میں اپنے بھائی شجاع کی یاد آئی۔ ایک زمانہ وہ تھا جب داراشکوہ نے شجاع کے خلاف میدان جنگ آراستہ کیا تھا اور اسے شکست دی تھی۔ ایک وقت یہ آگیا کہ اس سے مدد کی درخواست پر آمادہ ہونا پڑا۔

سلیمان شکوہ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی، مجبوراً اس نے شجاع کے نام خط لکھا۔ اس خط میں شجاع سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اورنگزیب سے جنگ میں اس کا ساتھ دے۔ کلام اللہ کی قسمیں کھا کر عہد کیا کہ اورنگزیب پر فتح پانے کے بعد دونوں بھائی ملک کو باہم تقسیم کرلیں گے۔ اس سے پہلے اورنگزیب نے بھی اسی مضمون کا خط اسے لکھا تھا۔ اس نے دونوں خطوں کو برابر رکھا۔ داراشکوہ کے خط میں اسے زیادہ وزن نظر آیا۔ اس نے لشکر فراہم کرنے اور داراشکوہ کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

جسونت سنگھ اورنگزیب سے شکست کھا کر سیدھا جودھپور اپنے وطن پہنچا تھا۔ داراشکوہ نے اسے اورنگزیب کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اورنگزیب کا راستہ تو کیا روکتا خود اپنا راستہ بھول گیا۔ اس کا آقا داراشکوہ اورنگزیب سے شکست کھا چکا تھا اور اب دربدر تھا۔ جسونت سنگھ کس کے پاس جاتا۔ اپنے محل میں دبکا پڑا رہا۔ محل میں بھی اسے سکون نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اسے منہ لگانا چھوڑ دیا تھا اور اپنا بستر الگ کرلیا تھا۔ روز اس بات پر لڑتی تھی کہ اس نے اورنگزیب کو پیٹھ کیوں دکھائی، لڑتے لڑتے مرجاتا، وطن واپس نہ آتا۔ اس روز بھی وہ اس سے خوب لڑی تھی۔

"تو کیسا راجپوت ہے رے۔ گھر میں چوڑیاں پہنے بیٹھا ہے۔"

"دیکھتی نہیں۔ داراشکوہ خود چھپتا پھر رہا ہے۔"

"محمد سلطان کا لشکر تباہ ہوگیا ہے۔"

"حضور مدد فرما سکتے ہیں۔"

اورنگزیب، شجاع کے تعاقب میں فوج بھیجنے کی طرف سے تذبذب کا شکار تھا لیکن امرائے کبار کا مشورہ بھی تھا لہٰذا اس نے شہزادہ محمد سلطان کو طلب کیا۔ ضروری سامان سفر اور تین پوشاک والی خلعت خاصہ کی تلوار اور ایک سو گھوڑے عطا کیے اور اس کے ساتھ معظم خاں اور اسلام خاں کا تقرر کر کے شجاع کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔

☆☆☆

شاہی فوج کے دستے داراشکوہ کو چوروں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ زمین نے ایسی دشمنی باندھی تھی کہ کسی جگہ ٹک کر بیٹھنا نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ ملتان سے وہ "بکر" کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اپنے محل کی عورتوں کو یہاں سے آگے لے جانا دشوار ہو رہا تھا۔ باربرداری کے جانور ناپید تھے۔ بہت سے رفیق بھی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اس نے اپنی عورتوں کو کچھ خزانہ حلائی اور بھاری سامان کے ساتھ بکر کے قلعے میں چھوڑا، حسرت بھری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور خود گھنے جنگل میں اتر گیا۔ یہ راستہ عام گزرگاہ نہیں تھی۔ راستے ایسے تھے کہ چلنا دشوار تھا۔ کئی مقامات تو ایسے آئے کہ درختوں کو کاٹ کر آگے بڑھنا پڑا۔

اندازہ یہ تھا کہ اس جنگل سے جلدی چھٹکارا مل جائے گا لیکن راستے کا تعین نہیں ہو سکا۔ قدم کسی غلط راستے پر پڑ گئے۔ جنگل سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ غذا کا ذخیرہ بھی ختم ہونے لگا تھا۔ پانی کی الگ قلت تھی۔ تین ہزار کا لشکر لے کر چلا تھا۔ بھوک، پیاس اور بیماریوں سے اس کے لوگ تلف ہونے لگے۔ خدا خدا کر کے ایک جگہ سورج نے پوری روشنی دکھائی۔ اندازہ ہونے لگا کہ اب جنگل ختم ہونے والا ہے۔

جنگل سے نکلتے ہی اس کے بہت سے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اب اس کے ساتھ صرف ہزار سوار رہ گئے تھے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ بھاگم بھاگ سیوستان کی سرحد پر پہنچنے کے بعد اس نے احمد آباد کا رخ کیا۔

اورنگزیب، شہزادہ شجاع کو شکست دینے کے بعد اکبر آباد پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ راجا جسونت سنگھ اپنے وطن جودھپور کی طرف بھاگ گیا ہے۔

"لشکر شاہی جودھپور کی طرف بڑھے اور راجا کو بے ادبی و بے تمیزی کی پاداش میں عبرت ناک سزا دے۔"

راجا کو یہ خبر ملی تو بے حواس ہوگیا۔ شاہی فوجوں سے لڑنا اس کے اکیلے کے بس کا روگ نہیں تھا۔ نہایت اضطراب کے عالم میں اپنے آدمیوں کو داراشکوہ کی طرف دوڑایا۔

داراشکوہ ریگستان کی منزلیں طے کرتا ہوا، موسم حوادث کے تھپیڑے کھاتا ہوا، اپنے ساتھیوں کی بے وفائی کے صدمے سہتا ہوا "کچھ" کے علاقے میں پہنچ گیا۔

اس کا لشکر مختصر ترین سہی لیکن وہ دارا شکوہ تھا۔ شاہ جہاں کا ولی عہد دارا۔ آج وہ مشکل میں تھا، کل والی ہند بھی بن سکتا تھا چنانچہ "کچھ" کا زمیندار اس کی اطاعت کے لیے حاضر ہوا اور نہایت احترام کے ساتھ اپنی سرحد سے گزار کر اسے احمد آباد کی طرف رخصت کر دیا۔

داراشکوہ احمد آباد میں داخل ہوا تو صوبے دار شاہ نواز خاں اس کے استقبال کے لیے قلعے سے نکلا۔ شاہ نواز خاں، مراد بخش کا خسر تھا اس لیے بھی دارا شکوہ کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ تھا۔ وہ نہایت احترام کے ساتھ دارا شکوہ کو قلعے میں لے کر آیا۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جن سے وہ لاعلم تھا۔ دارا کی قسمت پر افسوس کرتا رہا۔ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اسے ضروری سامان فراہم کرے گا۔

احمد آباد میں شہزادہ مراد بخش کے دس لاکھ روپے اور حلائی سامان تھا۔ اس نے یہ سب دارا شکوہ کے نذرانے میں پیش کر دیا۔

"میں آپ سے ایک وعدہ چاہتا ہوں۔" شاہ نواز خاں نے کہا۔

"فرمائیے۔"

"مراد بخش میرا داماد ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اس کے بھی دشمن ہیں لیکن وہ بدنصیب ان دنوں اورنگزیب کی قید میں ہے۔ آپ وعدہ کیجیے کہ اگر آپ نے اورنگزیب پر غلبہ پا لیا تو آپ مراد بخش سے انتقام نہیں لیں گے۔ میں لشکر کی فراہمی کے لیے آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ میں آپ کے ساتھ مل کر اورنگزیب سے جنگ کے لیے بھی تیار ہوں۔ جب تک آپ کا جی چاہے احمد آباد میں رہیں۔ خود کو یہاں کا مالک و مختار سمجھیں۔"

جب سے وہ اکبر آباد سے نکلا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اسے تسلی کے دو بول سننے کو ملے تھے۔ اس کی تھکن دیوار سے دھوپ کی طرح اتر گئی۔

اتنا حوصلہ پا کر اس نے بندرگاہ سورت، کھنبایت بھڑوچ اور سیر حاصل پر گنوں پر اپنے آدمی مقرر کر دیے اور ایک ماہ کے وقفے میں بیس ہزار سوار فراہم کر لیے۔ بیجاپور اور حیدر آباد کے نام بھی اس نے نقد اور فوج کی صورت میں کمک بھجوانے کے لیے خطوط لکھے۔

اس کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں کہ راجا جسونت سنگھ کا قاصد احمد آباد پہنچ گیا۔ پیام یہ لایا تھا کہ شاہی فوجیں میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ میں اکیلا ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کسی طرح جودھپور تک چلے آئیں تو میں آپ کا استقبال کروں گا اور دونوں مل کر شاہی فوج کا مقابلہ کریں گے۔ جانباز راجپوت سر کٹانے کے لیے حاضر ہیں۔ اس نے گنگا کی قسمیں کھا کر یقین دلایا تھا کہ وہ داراشکوہ سے غداری نہیں کرے گا لہٰذا اسے یقین آ گیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت تھا۔ وہ ایک آراستہ فوج اور ایک بڑا توپ خانہ لے کر جس میں بندرگاہ سورت سے منگائی ہوئیں چالیس توپیں تھیں، احمد آباد سے نکلا۔

اورنگزیب کو معلوم ہوا تو اورنگزیب جسونت سنگھ کی سرکوبی کے لیے راجپوتانہ پہنچ گیا۔ اس مرتبہ نہایت بااثر راجپوت سردار اجے سنگھ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ راجپوتانہ میں شاہی لشکر کے خیمے ہوئے۔ یہ راجا جے سنگھ کا تعلقہ انبیر تھا۔ دوست کا علاقہ تھا۔ لشکر نے خوب پاؤں پھیلا کر آرام کیا اور آگے چلنے کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔

راجا جسونت سنگھ اپنے لشکر کے ساتھ جودھپور سے بیس کوس کے فاصلے پر نکل آیا تھا تاکہ داراشکوہ کا استقبال کر سکے۔

شاہی لشکر راجپوتانہ میں داخل ہوا تو وہ سراسیمہ ہوگیا اور دعا مانگنے لگا کہ جلد از جلد دارا شکوہ یہاں پہنچ جائے۔ اسے ڈر یہ تھا کہ کہیں اس کے آنے سے پہلے ہی شاہی لشکر حملہ آور نہ ہو جائے۔

اورنگزیب کے لشکر میں اس وقت خاموشی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں اور صرف پہرے والے جاگ رہے تھے۔ اس سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی تو پہرے دار کی آواز گونج اٹھی۔

"کون؟ شناخت کراؤ۔"

"راجا جے سنگھ۔" سوار نے آواز لگائی۔

"رک جاؤ۔"

مشعل بردار یہ دیکھنے کے لیے نزدیک آ گیا کہ آواز لگانے والا واقعی اجے سنگھ ہے یا کوئی اور ہے۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ گھوڑے پر اجے سنگھ ہے تو اس نے معذرت کی اور پیچھے ہٹ گیا۔

اجے سنگھ خیمۂ شاہی کی طرف جا رہا تھا لہٰذا قدم قدم پر اسے ان رکاوٹوں سے گزرنا پڑ رہا تھا بالآخر وہ منزل تک پہنچ گیا۔ اورنگزیب کو اس کی آمد کے متعلق بتایا گیا۔ اسے اندر بلا لیا گیا۔ اورنگزیب اس وقت اوراد و وظائف میں مشغول تھا۔ اجے سنگھ کو دیکھ کر جسم کی لکیر اس کے ہونٹوں پر ابھر آئی۔

"ہم تو سمجھے تھے ہمیں عبادت میں مشغول دیکھ کر رحمت کا کوئی فرشتہ اندر آ گیا ہے۔"

"رحمت کا فرشتہ ہی سمجھیں مہاراج۔ ایک تجویز لے کر آیا ہوں۔ ویسے تو آپ مالک ہیں مگر تجویز اچھی ہو تو ضرور مان لیجیے گا۔"

"کہو اجے سنگھ۔ ہم تمہاری باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔"

"اگر راجا جسونت سنگھ، داراشکوہ کا ساتھ چھوڑ دے تو داراشکوہ راجپوتانہ میں بے موت مارا جائے گا۔"

"کیا جسونت سنگھ اس سے الگ ہوگیا؟"

"الگ کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"جسونت سنگھ کو معافی دے دی جائے اور یہ دھمکی بھی دی جائے کہ اگر اس نے معافی نہیں لی تو اس سے جنگ کی جائے گی۔ وہ جنگ کے لیے اس لیے تیار ہوا ہے کہ اسے معافی کی امید نہیں ہے۔ یہ امید ہو جائے گی تو وہ داراشکوہ کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ داراشکوہ سے جنگ کرنا ہمارے لیے آسان ہو جائے گا۔"

اورنگزیب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اسے یہ مشورہ نہ صرف پسند نہیں آیا ہے بلکہ ناگوار بھی گزرا ہے۔

"مہاراج، اگر میں نے کوئی غلط بات کہی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

"اجے سنگھ، ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا جسونت سنگھ کا جرم ایسا ہے کہ اسے معافی دی جائے۔"

"ہرگز نہیں مہاراج لیکن آپ بادشاہ ہیں۔ بادشاہوں کے دل بڑے ہوتے ہیں۔"

"وہ غدار ہے۔"

"غدار سے غداری ہی کرائی جا سکتی ہے۔ وہی ہم کر رہے ہیں۔ ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ وہ داراشکوہ سے غداری کرے اور ایسے وقت کرے کہ دارا کے پاس بھاگنے کے لیے پاؤں نہ رہیں۔"

راجا اجے سنگھ نے اورنگزیب سے جسونت سنگھ کے نام فرمان لکھوا لیا۔ اس فرمان میں جسونت سنگھ کو ڈرانے دھمکانے

کے بعد چند عنایت آمیز جملے بھی تحریر کیے گئے تھے تاکہ اسے بادشاہ کی طرف سے امید بندھ جائے۔

وہ جودھپور سے بیس کوس پر پڑاؤ ڈالے پڑا تھا کہ اسے راجا اجے سنگھ کا خط اور شاہی فرمان ملا۔ اس نے داراشکوہ سے قطع تعلق کیا اور اپنے وطن کی راہ لی۔

وطن پہنچ کر اس نے راجا اجے سنگھ کو اپنا سفارشی بنایا اور اظہارِ ندامت کے لیے اورنگزیب کے حضور عرضداشت روانہ کی۔

"غلام سے جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں انہیں معاف کر کے جان و مال کی امان دیجیے اور میرے ننگ و ناموس کو محفوظ کیجیے۔"

اورنگزیب نے بھی اپنے وعدے کا پاس کیا اور اسے لکھ بھیجا کہ تمہیں ہر طرح امان دی جاتی ہے۔ خلعت خاصہ روانہ کر کے احمد آباد کی صوبے داری پر سرفرازی بخشی اور حکم دیا کہ حاضر بارگاہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جہاں ہو وہیں سے احمد آباد کے لیے روانہ ہو جاؤ۔

داراشکوہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں سے جسونت سنگھ واپس ہوا تھا۔ میدان خالی پڑا تھا۔ بس یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی لشکر یہاں ٹھہرا ضرور تھا۔

اسے معلوم ہو گیا تھا کہ قسمت اپنا ہاتھ دکھا گئی ہے۔ وہ اب تک یہی تو دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ باغ میں پاؤں دھرتا تھا تو ویرانہ بن جاتا تھا۔ کیسے کیسے معتمد ساتھی بے وفائی کا داغ لگا کر چلے گئے تھے اور اب جسونت سنگھ نے بھی یہی کیا تھا۔

اسے ان سرداروں، زمینداروں اور امیروں سے بھی شرمندگی تھی جنہیں وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ کیسی کیسی امیدیں دلائی تھیں لیکن اب صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر شاہی فوج سے ٹکرایا تو نامرادی مقدر ہو گی۔ وہ تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ جسونت سنگھ کی وجہ سے دوسرے راجپوت سردار بھی اس کے ساتھ آ کر مل جائیں گے مگر اب تو جسونت سنگھ ہی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ جودھپور بیس کوس کے فاصلے پر تھا لیکن اس میں اتنی ہمت کب تھی کہ اسے سزا دینے کے لیے اس کے علاقے پر حملہ آور ہو جاتا۔ وہ یہی کر سکتا تھا کہ اس کی خوشامد کر کے اسے ساتھ دینے پر تیار کرے۔ اس نے ایک معتمد آدمی دے چند کو ایلچی بنا کر جسونت سنگھ کے پاس بھیجا کہ جس طرح بھی ہو جسونت سنگھ کو ایفائے عہد کے لیے تیار کرے۔

اس کے پاس سے جواب آیا کہ میں اپنے قول پر قائم ہوں مگر فی الحال میرا آنا خلافِ مصلحت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اجمیر جا کر ٹھہر جائیں اور دوسرے راجپوتوں کو پیغام بھیج کر اپنے پاس طلب کریں۔ جب دو تین نامور سردار آپ کے پاس جمع ہو جائیں گے تو میں بھی چلا آؤں گا۔

اس جواب سے دارا کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ راجا ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ اس کی نیت میں فتور آ چکا ہے۔ بات صاف تھی لیکن جب قسمت خراب ہو تو عقل بھی ماری جاتی ہے۔ وہ جسونت سنگھ کا مشورہ مان کر اجمیر چلا گیا۔ یہاں پہنچ کر دے چند کو ایک مرتبہ پھر راجا کے پاس بھیجا اور بڑے سبز باغ دکھائے لیکن دے چند پھر خالی ہاتھ واپس چلا آیا۔ جسونت سنگھ نے مشورہ دیا تھا کہ داراشکوہ اجمیر میں ٹھہرا رہے اور راجپوت سرداروں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے۔

اس عرصہ میں یہ خبریں عام ہو گئی تھیں کہ اورنگزیب کی طرف سے جسونت سنگھ کو معافی مل گئی ہے بلکہ اسے اعزاز و التفاتات سے بھی نوازا گیا ہے۔ اس کے بعد داراشکوہ کو بالکل مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن امید تھی کہ دلاسے دیے چلی جا رہی تھی۔ داراشکوہ نے اپنے بیٹے سپہر شکوہ کو اپنی وکالت کے لیے جسونت سنگھ کے پاس بھیجا۔ ایک مرتبہ اسے پھر یقین دلایا کہ اگر اس کی مدد سے اسے تخت شاہی نصیب ہو جاتا ہے تو وہ اسے ایسے انعامات سے سرفراز کرے گا جو اس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتے۔ وہ اس کا احسان مند رہ کر بادشاہت کے دن پورے کرے گا۔ اسے وہ مظالم بھی یاد دلائے جو اورنگزیب نے مرہٹوں کے ساتھ دکن میں کیے تھے اور اب وہ راجپوتوں کے ساتھ کرنے والا ہے۔ اسے یاد دلایا تھا کہ وہ (داراشکوہ) مذہبی طور پر وسیع الخیال ہے۔ برسراقتدار آنے کے بعد ہندوؤں اور راجپوتوں کا خیال رکھے گا، وغیرہ وغیرہ۔

سپہر شکوہ جسونت سنگھ کے پاس گیا بھی۔ یہ سب باتیں اس سے کہیں بھی لیکن وہ آئندہ کے وعدوں پر بہلنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے جو کچھ اورنگزیب کی طرف سے مل رہا تھا وہی اس کے لیے سچ تھا۔ کل کس نے دیکھی تھی۔ اب ٹال مٹول کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہر پردہ درمیان سے ہٹ گیا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔

"بھیا، تم دونوں آپس میں لڑو، مجھے کیوں گھسیٹتے ہو۔ میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ کسی کی طرف سے نہ بولوں۔ تم میں سے کسی ایک بھائی کو بھاگتے ہوئے دیکھوں گا اور بس۔"

یہ صاف جواب سننے کے بعد داراشکوہ کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھ گئے۔ اب تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جسونت سنگھ کے بلانے پر چلا کیوں آیا۔ اسے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ غداری جسونت سنگھ کے خمیر میں شامل ہے۔ وہ اورنگزیب کے ساتھ ہے، کل اسے بھی چھوڑ جائے گا۔



وہ اس آدمی کی طرح کھڑا تھا جس کے پاؤں زمین پر ہوں لیکن آسمان سر پر نہ ہو۔ پورے ہندوستان میں اکیلا تھا۔ اس پر یہ وقت آن پڑا تھا کہ جسونت سنگھ جیسے معمولی راجا کی خوشامد کر رہا تھا۔ سب چڑھتے سورج کا ساتھ دیتے ہیں۔ اورنگزیب مٹی میں ہاتھ ڈال رہا تھا تو سونا بن رہی تھی۔ داراشکوہ سمجھ رہا تھا کہ قضا و قدر کا فیصلہ کچھ اور ہے لیکن دلاور تھا۔ تیموری خون رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ تقدیر کا فیصلہ بدل دے۔

"سلیمان شکوہ!" داراشکوہ اتنی زور سے چیخا تھا کہ لوگ یہ سمجھ کر دوڑ پڑے تھے کہ شاید سلیمان شکوہ کہیں سے ظاہر ہو گیا ہے۔

اس اکیلے پن میں اسے بڑے بیٹے کی یاد آئی تھی۔ اگر اس وقت وہ ہوتا تو اس کی کمر اتنی خم نہ ہوئی ہوتی۔ اس کے دو نہیں چار ہاتھ ہوتے۔ کیا میں اسے بھی ان بے وفاؤں میں شمار کر دوں جو اس کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔

سلیمان شکوہ، شجاع کو شکست دینے کے بعد واپس ہو رہا تھا کہ اسے داراشکوہ کی شکست کی خبر مل گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس شکست کا کیا مطلب ہے۔ اس لیے وہ باپ کے پاس حاضر نہ ہو سکا۔ داراشکوہ کی شکست کے بعد اورنگزیب نے اس کی گرفتاری کے لیے بھی دستے روانہ کر دیے تھے۔

سلیمان شکوہ گنگا عبور کر کے ہردوار کے راستے باپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتا تھا۔ ہردوار کی سرحد میں داخل بھی ہو گیا تھا لیکن شاہی امرا کی آمد کی خبر سن کر وہ سری نگر کے جنگل کی طرف نکل گیا۔ اس کی توقع کے برخلاف وہاں کے زمینداروں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ ایک زمیندار نے اس شرط پر پناہ دینے کا وعدہ کیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو رخصت کر دے۔ صرف اس کے اہل و عیال اس کے ساتھ کوہستان میں رہ سکتے ہیں۔


## نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

خری معرکہ 350/-
ھیری رات کے مسافر 325/-
ت کی تلاش 150/-
و کسریٰ 380/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
گمشدہ قافلے 350/-
داستانِ مجاہد 200/-
پردیسی درخت 325/-
یوسف بن تاشفین 325/-
معظم علی 325/-
خاک اور خون 350/-
کلیسا اور آگ 300/-
قافلۂ حجاز 350/-
محمد بن قاسم 300/-
پورس کے ہاتھی 180/-
انسان اور دیوتا 280/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-
آخری چٹان 325/-
سو سال بعد 150/-
سفید جزیرہ 225/-
شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781
022-2780128
051-35539609
021-2765086
042-37220879
041-2627568

اس کے ہمراہیوں نے جو پانچ سو سواروں سے زیادہ نہیں تھے اس شرط کو نہیں مانا اور اسے وہاں سے الٰہ آباد کی طرف نکال لائے۔ اس کا اتالیق بہادر خاں ایک جمعیت کو لے کر اس سے الگ ہوگیا۔ اب اس کے پاس دو سو سواروں سے زیادہ جمعیت نہیں رہی تھی۔ گھبرایا ہوا آدمی کچھ بھی سوچ اور کر سکتا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس سری نگر کے زمیندار کے پاس جائے گا۔ اس کی پناہ میں وہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ وہ واپس ہوا تو اس کے ساتھ کے باقی سواروں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اب اس کے رکاب میں ذاتی خدام رہ گئے تھے۔ سری نگر کے زمیندار نے زر و جواہر کی طمع میں اس کا استقبال کیا اور اسے قلعے میں ٹھہرا دیا۔ یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نظر بند ہو گیا ہے۔

اس نظر بندی کا بس اسے ایک فائدہ ہوا کہ اس کا تعاقب کرنے والے اس کی طرف سے مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ زر و جواہر لٹا کر اس نے خود کو بادشاہ کی قید میں جانے سے بچالیا۔ دارا شکوہ بھی اسی جدوجہد سے گزر رہا تھا۔

دارا شکوہ ابھی ایک ایک ہمدرد کو یاد کر ہی رہا تھا کہ اورنگزیب کے قریب پہنچ جانے کی خبر ملی۔ اس نے بھی تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق لڑنے کے لیے کمر باندھ لی۔ کھلے میدان میں جنگ کرنا اس کے لیے مفید نہیں تھا اس لیے اس نے اجمیر کے نواحی کوہستان میں مورچے باندھ کر محصور ہونے کا ارادہ کرلیا۔ راستوں پر پتھر اور گارے کی دیواریں کھڑی کر کے توپیں نصب کرادیں۔ بہت سے مورچے بنائے تھے جن پر بہادر امیروں کو متعین کیا تھا۔ ایک جمعیت مقرر کردی جس کا کام مختلف مورچوں تک سامان رسد پہنچانا تھا۔

اورنگزیب بلائے بے درماں کی طرح بڑھ چلا آرہا تھا۔ اس کے جاسوس اسے پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ اس کے جاسوسوں نے اسے ان دروں کی نشاندہی کردی تھی جہاں دارا شکوہ نے مورچے بنائے تھے۔ اس نے نصف کوس کے فاصلے پر اپنی لشکر گاہ قائم کی اور مورچے باندھنے کا حکم دے دیا۔ یہ اتنا فاصلہ تھا کہ توپ کا گولہ دارا کے مورچوں تک جاسکتا تھا۔

''صف شکن خاں!'' اورنگزیب کی آواز گونجی۔ ''دشمن کے مورچوں کے مقابل جگہ جگہ توپیں نصب کرادو۔ خبردار، یہ خیال ہرگز نہ آئے کہ دارا ہمارا بھائی ہے۔ وہ جہانگیر بادشاہ کا بیٹا ضرور ہوگا مگر ہمارا بھائی ہرگز نہیں۔''

''شیخ میر دلیر خاں!'' اورنگزیب کی آواز پھر گونجی۔ ''تمام بہادر افسروں کو حکم دو کہ جہاں جہاں مورچے لگائے جاسکتے ہیں، مورچے لگالیں۔ یاد رکھو، یہ آخری مقابلہ ہے۔ اس کے بعد اورنگزیب اور دارا کا کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔ یاد رہیں گے یا وہ رہے گا۔''

دارا شکوہ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ پہاڑوں کے قلب میں مورچہ بندی کیے بیٹھا تھا۔ شاہی توپ خانے سے جو گولہ سر ہوتا تھا وہ چٹانوں یا مورچہ بند دیواروں سے ٹکرا کر بے اثر ہو جاتا تھا جبکہ پہاڑوں کی طرف سے جو گولہ آتا تھا وہ کسی نہ کسی کو زخمی یا ہلاک ضرور کرتا تھا۔ دارا شکوہ کے سپاہی مورچوں سے نکل کر حملہ کرتے تھے اور پھر پہاڑوں میں روپوش ہوجاتے تھے۔

تین دن اور تین راتیں یہی صورت رہی بالآخر چوتھی شب کو اورنگزیب نے اپنے مخلص امیروں اور افسروں کو طلب کر کے ہدایت کی کہ نقصان کی پروا کیے بغیر یورش کرتے ہوئے پہاڑ پر چڑھ جائیں اور دارا کے مورچوں پر قبضہ کرلیں۔

صبح ہوتے ہی زمیندار راج روپ اپنے پیدل دستے لے کر آگے بڑھا۔ یہ وہی راج روپ تھا جو کبھی دارا کے ساتھ تھا مگر اب امان طلب کر کے اورنگزیب کے پاس آگیا تھا۔ اس کی بہادری ضرب المثل تھی۔ اس کے جانباز سپاہی ہتھیلی پر جان لیے آگے بڑھتے رہے۔ دارا شکوہ کا توپ خانہ آگ اگل رہا تھا مگر اس کی انہیں پروا نہیں تھی۔ مرتے جاتے تھے آگے بڑھتے جاتے تھے اور بالآخر پہاڑ کے اس حصے پر آگئے جو ''پہاڑی'' کے نام سے منسوب تھا۔

''پہاڑی'' پر راج روپ کا جھنڈا لہرایا تو دوسرے امیروں کو بھی جرأت ہوئی۔ ایک طرف سے دلیر خاں بڑھا دوسری جانب سے شیخ میر پہاڑ پر پہنچ گیا۔ بس پھر کیا تھا اورنگزیب کی کل فوج پہاڑوں میں گھس گئی اور دست بہ دست مقابلہ ہونے لگا۔

دارا شکوہ پہاڑ کی بلندی پر کھڑا جنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے لیے بھی یہ آخری جنگ تھی اور اسے ہزیمت کا سامنا تھا۔ وہ اپنے آدمیوں کو ترغیب دیتا پھر رہا تھا۔ اس کے لشکر پر اس ترغیب کا اثر بھی ہورہا تھا۔ سپاہی مورچوں سے نکل آئے تھے۔ دوبدو جنگ ہورہی تھی۔

اسی دار و گیر میں غروب آفتاب ہوگیا۔ اسی وقت ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا کہ نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اورنگزیب کا ایک امیر نہایت جانفشانی سے جنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ مخالف سمت سے ایک گولی اس کے سینے پر آکر لگی۔ عماری میں اس کے پیچھے اس کا خدمت گار بیٹھا تھا۔



امیر نے اس سے کہا۔ ''تم میرے کمر پٹے کو پکڑ کر مجھے اسی طرح سیدھا بٹھائے رکھو۔ بس ہماری فتح ہونے والی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمراہی میری ہلاکت سے واقف ہو کر ہمت چھوڑ دیں اور جنگ سے ہاتھ روک لیں اور دشمن بھی واقف ہو کر دلیری سے آگے بڑھے۔'' یہ کہہ کر اس کا انتقال ہوگیا۔ لوگ یہی سمجھتے رہے کہ شیخ میر عماری میں بیٹھا ہے۔ اس کے آدمیوں نے ایسا جان لیوا حملہ کیا کہ دارا شکوہ کو اپنی شکست کا یقین ہوگیا۔ اس نے فرار پر کمر باندھی۔ فرار کا وقت آیا تو اس نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ اپنی بیوی، بیٹی اور چند خواصوں کے ساتھ بہت تھوڑے سے زیورات اور جواہرات لے کر احمد آباد کی طرف روانہ ہوا۔

خزانہ اور منتخب قیمتی اشیا ہاتھیوں، خچروں اور اونٹوں پر لدا تیار کھڑا تھا۔ دارا شکوہ نے یہ انتظام پہلے ہی کرلیا تھا کہ جیسے ہی کوئی نازک وقت آیا وہ اس خزانے کو لے کر فرار ہوجائے گا۔ فرار کا وقت آگیا لیکن یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ اس خزانے کو اور محل کی دوسری عورتوں کو چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہوگیا کیونکہ باربرداری کے لیے جانور موجود نہیں تھے۔ اس خزانے کو اور محل کی عورتوں کو اپنے قدیم ملازموں کی تحویل میں دے دیا اور چند معتمد خواجہ سراؤں کو ان کے ساتھ کر کے تاکید کردی کہ وہ اس کے پیچھے جلدی سے روانہ ہوں۔

اس اندھیری رات میں جبکہ ہر طرف بارود کا دھواں بھرا ہوا تھا، دارا شکوہ کے فرار کی خبر کسی کو نہ ہوسکی۔ خود اس کے لشکر میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ دارا شکوہ بھاگ چکا ہے اور جب خبر ملی تو بھگدڑ مچ گئی۔ دارا کے ہمراہی مورچے چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ صبح تک تمام مورچے خالی ہوگئے۔

اورنگزیب فتح و ظفر کا شادیانہ بجاتا ہوا اجمیر شہر میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ لشکر و پیش خانہ داخل ہو وہ گھوڑے سے کودا اور ننگے پاؤں خواجہ غریب نوازؒ کے مزار پر حاضری دینے کے لیے پہنچ گیا۔

''داتا میں نے خداوند تعالیٰ کی تائید ایزدی کی بدولت چار جنگوں میں بہادر جنگجو دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ لوگ کہتے ہیں میں نے والد گرامی کو قید میں رکھا ہوا ہے اور ان کے ہوتے ہوئے تخت پر قدم رکھا ہے۔ آپ شاہد ہیں اگر میں ایسا نہ کرتا تو ملک میں افراتفری پھیلی ہوتی، اس دیارِ کفر میں اسلام کا نام لینے والا کوئی نہ رہ جاتا۔ دارا شکوہ کی فکر ہندوؤں کو زور آور بنا دیتی۔ وہ نادان اب بھی نبرد آزما ہے۔ ایک شکست کے بعد دوسری کی تیاری کرتا ہے۔ آپ مقرب بارگاہ الٰہی ہیں۔ دعا فرمائیے کہ مجھے دارا پر غلبہ ملے تاکہ مسلمانوں کا خون بہنا بند ہو۔''

یہاں سے نکل کر انا ساگر کے کنارے چھاؤنی ڈال دی۔ راجا جے سنگھ اور بہادر خاں کو خزانہ شاہی سے رقم دے کر دارا شکوہ کے تعاقب کے لیے مقرر کیا۔

راجا جسونت سنگھ اپنے قصوروں کی شرم سے حاضر بارگاہ نہیں ہوسکا تھا۔ بادشاہ نے اسے تسلی آمیز فرمان جاری کیا اور اسے احمد آباد کی صوبے داری عطا کی۔ سات ہزاری سات ہزار سوار کا منصب مع خلعت بحال کردیا۔

ان کاموں سے نمٹنے کے بعد راجا جے سنگھ اور بہادر خاں تو اپنے اپنے دستوں کو لے کر دارا شکوہ کی کھوج میں نکلے اور اورنگزیب دارالخلافہ کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کی تاج پوشی کے جشن کا انعقاد ہونا تھا۔

مختلف کارخانوں کے مہتمم جشن کا سامان ترتیب دینے پر مامور ہوئے۔ بارگاہ شاہی کے صحن میں رنگارنگ فرش بچھائے گئے۔ در و دیوار، چھتوں اور ستونوں پر دیبائے رومی، فرنگی مخمل اور چینی ریشم کے تھان اس طرح لپیٹے گئے کہ گلزار کا سامان دکھا دیا گیا۔

نجومیوں نے اس کے جلوس کی تاریخ 24 رمضان 1069ھ (15 جون 1609ء) کی تاریخ مقرر کی تھی۔

تخت نشینی کی ایک رسم سال گزشتہ ادا ہوچکی تھی مگر بادشاہ نے اصل جشن کو دشمنوں اور مخالفوں کے بعد ہی منعقد کرنا چاہا تھا۔ اب یہ مقصد پورا ہوگیا تھا۔

اس مبارک گھڑی میں اورنگزیب کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ رقاصوں اور مغنیوں نے اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا۔ اورنگزیب نے تخت مرصع پر جلوس کیا۔ ''ابوالمظفر محی الدین اورنگزیب بہادر عالمگیر غازی کے نعروں سے دربار گونج اٹھا۔ فرمان شاہی جاری ہوا۔

''اس تاریخ سے عیدالضحیٰ تک پورے ڈھائی مہینے تمام خیمے شامیانے فرش فروش اسی طرح قائم رکھے جائیں اور جشن و سرور کے قاعدے جاری رکھے جائیں تاکہ اللہ کی عنایت کے طفیل ساری خلقت ہمارے انعام و اکرام سے فیض یاب ہوتی رہے اور ہر شخص کی آرزو پوری ہوجائے۔''

☆☆☆

کوہستان اجمیر میں شکست کھانے کے بعد دارا شکوہ اپنی بیوی، بیٹی اور بیٹے سپہر شکوہ کے ہمراہ نکل تو گیا تھا لیکن اس کا خزانہ اور محل کی عورتیں اس کے نوکروں اور نگرانوں کے ہمراہ اس کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ ابھی بمشکل چار پانچ کوس کی مسافت طے ہوئی ہوگی کہ سرگوشیاں ہونے لگیں۔

"یارو، ہم کب تک اس بزدل شہزادے کے سازوسامان کی حفاظت کرتے پھریں گے۔"

"زندگی بھر اس کی خدمت کی ہے۔ جنگلوں صحراؤں میں اس کے ساتھ گھومتے رہے ہیں۔ اب اس کے خزانے پر ہمارا حق ہے۔"

"ویسے بھی یہ خزانہ اب داراشکوہ کو ملنے والا نہیں۔ اجے سنگھ پیچھے لگا ہوا ہے۔ ہمیں بھی قتل کرے گا اور خزانے پر بھی قبضہ کرے گا۔"

"دیکھو بھائی۔ ہم نے شہزادے کا نمک کھایا ہے۔ یہ نمک حرامی اچھی نہیں لگے گی۔"

"نمک حرامی کیسی، ہم تو خزانے کو لٹنے سے بچا رہے ہیں۔ کسی اور کے قبضے میں جانے سے اچھا ہے ہم غریبوں کے کام آجائے۔"

"شہزادے کے نوکر چاکر ساتھ چل رہے ہیں۔"

"ایک دھمکی کے ہیں سالے۔ خواجہ سرا کیا کریں گے ہمارا۔"

"عورتیں بھی تو ساتھ ہیں۔"

"خواجہ سراؤں سے کہیں گے لے جاؤ انہیں جہاں چاہو۔ ہمیں عورتوں کا کیا کرنا ہے۔"

"یار ان میں سے دو ایک عورتوں کو بھی ساتھ لے چلیں۔ محل کی عورتیں ہیں، بڑی خوبصورت ہوں گی۔"

"آگیا نا گھٹیا پن پر۔ یہ سوچ خزانے پر قبضہ کیسے کریں۔ ہمارے ساتھی ہمارے مقابلے پر آئے تو بڑی سخت خوں ریزی ہوجائے گی۔"

"ایسا کرتے ہیں سب آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔"

"بعض ایمانداری بھی تو دکھائیں گے۔"

"انہیں تلوار پر رکھ لیں گے۔"

یہ دو آدمی شہزادے کے نوکروں میں سے تھے جو اپنے آقا کے مال کو لوٹنے کی تیاری کررہے تھے۔ اتفاق سے یہی باتیں ایک دوسری جگہ بھی ہورہی تھیں۔ یہ تین لوگ تھے۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ باقی سب کو قتل کرکے خزانے پر ہم قبضہ کرلیں گے۔ پھر ایسا ہوا کہ یہ تینوں ہی آپس میں لڑ پڑے۔ شور سن کر دوسرے بھی آگئے۔ خزانے کا سن کر سب کے منہ میں پانی آگیا۔ سب آپس میں دست وگریباں ہوگئے۔ جو جس کے ہاتھ لگا وہ لوٹ کر فرار ہوگیا۔ عورتوں کے زیورات تک اتار لیے گئے۔ پھر ان کو ہاتھیوں سے اتار کر اونٹوں پر سوار کرکے جنگل کی طرف ہانک دیا۔ چند وفادار خواجہ سرا اب بھی ساتھ تھے۔ وہ صرف اتنا کرسکے کہ سواروں کے ان اونٹوں کو ہنکا کر نکل گئے اور ایک دن ایک رات مسلسل راستہ طے کرنے کے بعد بھوکے پیاسے داراشکوہ کے قافلے میں پہنچ گئے۔

داراشکوہ نے خوف سے تھرتھر کانپتی ہوئی عورتوں کو دیکھا۔ ان کے زیوروں سے محروم ان کے جسم دیکھے۔ ان طلائی سامان اور جواہرات کا خیال آیا جو راستے میں لوٹ لیے گئے۔ وہ سر پیٹنے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ اس نے عورتوں کو تسلی دی، اللہ پر شاکر رہنے کی تلقین کی اور سفر پھر سے جاری کردیا۔

وہ اب تک کسی سفر میں اپنی محبوب بیوی نادرہ بیگم سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کا سامنا کرے۔ اس نے ایک دوسرے ہاتھی پر قیام کیا۔ دو دن بعد جب ایک جگہ پڑاؤ کیا گیا تو اسے تاب نہیں رہی۔ وہ نادرہ کے پاس پہنچ گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ نادرہ نہ ہو کوئی اور ہو، وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ ان دو دنوں میں نہیں بلکہ مسلسل دھوپ نے اسے کالا کردیا تھا۔ دارا نے غور سے اسے آج دیکھا تھا۔ وہ گنگی باندی اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں سرتاج۔"

"دیکھ رہا ہوں ہم نے تو تمہارے سر پر تاج دیکھنے کا خواب دیکھا تھا۔ ہم نے کانٹوں کے سوا آپ کو کیا دیا۔"

"آپ خود بھی تو اسی صحرا سے گزر رہے ہیں جہاں ہم چل رہے ہیں۔"

"ہم کب تک بھاگتے رہیں گے نادرہ بیگم۔"

"ہمیں ہندوستان چھوڑ کر ایران جانا چاہیے۔"

"شاہی فوجیں تعاقب میں ہیں۔ وہ کب ایسا کرنے دیں گی۔"

"ایک بات طلعیہ بتایئے اگر ہم نے غلط نہیں سنا ہے۔"

"ہم آپ سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔"

"ہم نے سنا ہے اجمیر سے چلتے ہوئے جو خزانہ ساتھ آرہا تھا وہ لوٹ لیا گیا۔"

"جب قسمت یاور نہ ہو تو مصیبت کے سوا اور کیا آسکتا ہے۔"

"اسی لیے آپ ہمارے پاس تشریف نہیں لارہے تھے۔ آپ سمجھ رہے تھے ہمیں دکھ ہوگا۔ ہمیں دکھ ضرور ہے لیکن ہمارا خزانہ تو آپ ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہندوستان کے آخری کونے تک جائیں گے۔ سرتاج، ہمیں اپنی آغوش میں سر رکھ کر لیٹنے کی اجازت دیجیے۔ ہم کئی دن سے سو



نہیں ہیں۔"

نادرہ بیگم اس کی آغوش میں سر رکھ کر سو رہی تھی اور وہ ماضی کی سیر کو نکلا ہوا تھا۔

قافلہ اٹھا تو ایک مرتبہ پھر سفر کا آغاز ہوا۔ پانچ دن کے مزید سفر کے بعد تباہ حال داراشکوہ احمد آباد کے سامنے پہنچ گیا۔ فقیروں سے بدتر حال تھا۔ دو ہاتھی، چند اونٹ، چند ملازم یہ بھی اس کی کل کائنات۔ بیوی اور بیٹی کے زیورات، تھوڑا سا خزانہ ساتھ تھا۔ ناز ونعم میں پلا ہوا شہزادہ دھوپ کو چھتری بنائے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے چند گھوڑے اِدھر اُدھر سوکھی زمین پر منہ مارتے پھر رہے تھے۔

دارا نے اپنے آدمیوں کو شہر میں بھیجا اور اعلان کرادیا کہ خاندان مغلیہ کا چشم وچراغ ولی عہد سلطنت داراشاہ خلف شاہ جہاں بادشاہ شہر میں داخلے کا خواہاں ہے اس کے استقبال کا اہتمام کیا جائے۔ شہر کے امرا نے سنا تو اورنگزیب کی تلوار ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ داراشکوہ کا استقبال کرنا اورنگزیب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اگر اسے پناہ دی گئی تو شاہی عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ استقبال تو کیا کرتے شہر کے دروازے بند کرلیے اور عالمگیر بادشاہ کے نام کا نقارہ بجادیا۔

اس سے پہلے جب داراشکوہ احمد آباد آیا تھا تو شاہ نواز خاں یہاں کا صوبے دار تھا۔ اس نے نہ صرف اس کا استقبال کیا تھا بلکہ لشکر جمع کرنے میں بھی اس کی مدد کی تھی اور پھر اس کے لشکر میں شامل ہوکر اجمیر بھی گیا تھا جہاں اس نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ اب اس کا نائب یہاں تھا لیکن اس نے آنکھیں پھیر لیں۔

داراشکوہ سمجھ گیا کہ اس کی بدقسمتی اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی ہے۔ شہر کے دروازے نہیں قسمت کے دروازے اس پر بند ہوئے ہیں۔ اس نے کوچ کا حکم دیدیا۔

وہ احمد آباد سے دو کوس کے فاصلے پر پرگنہ کری سے گزر رہا تھا تو راہزنوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ان کا سردار کانچی کولی سامنے آیا۔

"تم تو کوئی شاہی آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"میں داراشکوہ ہوں، شاہ جہاں بادشاہ کا بڑا بیٹا۔"

"تم سے اچھے کپڑے تو میرے جسم پر ہیں۔ تم کیسے شہزادے ہو۔"

"وقت وقت کی بات ہے بھائی۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب میں سوار ہوکر نکلتا تھا تو بالاخانوں کی طرف زر وجواہر اچھالتا ہوا چلتا تھا۔ اب خزانہ تم جیسے کسی راہزن نے لوٹ لیا۔

تازہ شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

سرگزشت

ماہنامہ

جون 2011ء کے شمارے کی ایک جھلک

فسانہ ساز

اردو ادب کے ایک مایہ ناز ادیب کی سرگزشت جس کی کہانیوں میں انوکھا پن تھا

مھاچور

جعلسازی سے ارب پتی بن جانے والے فیس بک کے بانی کی سوانح حیات

زندہ دل

معین اختر کی زندگی کے مخفی وعیاں گوشے

مسلمان سائنس داں

دور حاضر کے مسلمان سائنسدانوں کا مختصر مختصر سا تعارف

گم شدہ محبت

ایک دوشیزہ کی آپ بیتی جو ہمیشہ کے لیے پاگل رہنے کی خواہشمند تھی

اور کئی شمارے

سراب جیسی طویل سرگزشت، معلوماتی اور دل دکھا دینے والی آپ بیتیاں جگ بیتیاں

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،

آپ یقیناً گرویدہ ہوجائیں گے،

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

جورہ گیا ہے وہ تم لے لو۔ اب تو مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ تم جیسے معمولی رہزن کے خلاف تلوار اٹھا سکوں۔"

"کیوں ہمیں بدنام کرتے ہو۔ لٹیرے تو آپ لوگ ہیں، سگے بھائی کے خوف سے بھاگتے پھر رہے ہو۔ جو خزانہ تمہیں ملنا تھا اس پر اورنگزیب قابض ہوگیا۔ اس سے بڑا ڈاکا اور کون سا ہوگا۔ کوئی سرکاری آدمی تمہیں اپنی پناہ میں نہیں لے گا۔ اگر پناہ دی تو تمہاری طرح وہ بھی بھاگتا پھرے گا۔ اگر تم چاہو تو میرے پاس رہ سکتے ہو۔"

"شاہی فوج سائے کی طرح میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میری وجہ سے تم پر بھی مصیبت آئے گی۔"

"کس کی مجال ہے جو تمہیں مجھ سے چھڑا کر لے جائے۔ میرا نام کانجی کولی ہے۔ میں لٹیرا ضرور ہوں لیکن جو پہلے ہی لٹ چکا ہو اسے کیا لوٹوں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ ایسا مجبور ہوگیا تھا کہ اس راہزن کا مہمان بننا قبول کرلیا۔ اس پر تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ کوئی صوبے دار، کوئی امیر پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اورنگزیب کا دشمن سب کا دشمن بن چکا تھا۔ وہ دشوار گزار منزلیں طے کررہا تھا۔ کبھی اس دشت میں کبھی اس صحرا میں۔ بھاگتے بھاگتے تھک چکا تھا۔ کانجی کولی کے گھر میں پاؤں پھیلا کر تھکن اتار رہا تھا۔ اس کی بیوی نادرہ بیگم اس کے دکھ درد کی ساتھی بنی ہوئی تھی۔ ہر سختی جھیل رہی تھی لیکن زبان پر شکایت نہیں تھی۔ ان دنوں وہ بیمار تھی لیکن اپنی بیماری ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی البتہ کچھ دنوں سے یہ ضد کرنے لگی تھی کہ داراشکوہ ٹھٹھہ کی طرف جائے اور دریائے سندھ عبور کرکے قندھار کے نواح میں، کچھ دن دم لے اور پھر شاہ ایران کی پناہ میں چلا جائے، جب سے کانجی کولی کے گھر آئی تھی اس مطالبے نے شدت اختیار کرلی تھی۔ اسے یہ گوارا نہیں ہو رہا تھا کہ ایک رہزن کے گھر میں رہے۔ داراشکوہ کا خیال تھا کہ یہ گم نام جگہ ہے۔ اس کا تعاقب کرنے والے اس طرف نہیں آئیں گے۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ یہاں کب تک رہوں گا۔ مستقبل کیا ہے۔ ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کی جائے۔ اسے "کچھ" کا وہ زمیندار یاد آیا جس کے پاس وہ پہلی مرتبہ احمد آباد آتے ہوئے ٹھہرا تھا۔ اس روز کانجی کولی کہیں سے ڈاکا وا کا ڈال کر آیا تو داراشکوہ نے اس سے تذکرہ کیا۔

"تم مجھے "کچھ" تک پہنچانے کا بندوبست کرسکتے ہو؟"

"کیوں، وہاں تمہارا کوئی خزانہ دفن ہے۔"

"وہاں میرا واقف کار ایک زمیندار ہے۔ بڑا بااثر ہے۔ پہلے بھی میں اس کا مہمان رہ چکا ہوں۔ کچھ دن اس کے پاس رہوں گا پھر وہ مجھے ایران بھیجنے کا بندوبست کردے گا۔"

"میں تمہیں "کچھ" کے قریب تک پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد تم جانو۔ زمیندار میرے نام سے نفرت کرتے ہیں۔ کوئی اور مصیبت نہ کھڑی ہوجائے۔"

"تم مجھے وہاں تک پہنچا دو۔ یہی تمہارا احسان ہوگا۔"

کانجی کولی اسے گجرات کی سرحد سے نکال کر "کچھ" کے تعلقہ میں لے گیا۔ داراشکوہ کو زمیندار کا سلوک اب تک یاد تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اب بھی اس کی پذیرائی کرے گا لیکن جب ملاقات ہوئی تو توقعات پر پانی پھر گیا۔ زمیندار نے اسے پہچاننے سے ہی انکار کردیا۔

"معاف کرنا، آپ کی حالت ہی ایسی ہو رہی ہے۔ آپ نے بتایا تو مجھے یقین آیا۔"

"میں کچھ دن کے لیے تمہارے پاس رہنے آیا ہوں۔"

"شہزادہ سلامت، جب کی بات اور تھی۔ اب بڑے بڑے صوبے دار آپ کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ میں معمولی سا زمیندار ہوں۔ شاہی فوجیں آپ کے تعاقب میں ہیں۔ میں غریب تو مارا جاؤں گا۔"

بات یہ تھی کہ وہ جب پہلے آیا تھا تو اس کا خزانہ اس کے ساتھ تھا۔ زمیندار کی طمع نے اسے اپنے پاس ٹھہرایا تھا۔ اب اس کے ہاتھ خالی تھے۔

داراشکوہ اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ نہ مانا، آخر مایوس ہوکر "بھکر" کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ ملتان کے قریب ایک علاقہ تھا۔

جب وہ سندھ کی حدود میں داخل ہوا تو جنگلی قبائل نے اس کا راستہ روک لیا مگر داراشکوہ ان سے لڑتا بھڑتا ملکشی قبیلے میں پہنچ گیا۔ ملکشیوں کے سردار مرزا ملکشی نے اس کا استقبال کیا۔ اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔

دارا کی پتا سن کر اس نے بھی مشورہ دیا کہ وہ ایران چلا جائے۔ اب اس کے لیے لشکر جمع کرنا اور اورنگزیب کی طاقت سے ٹکرانا آسان نہیں ہوگا۔ وہ خود بھی نادرہ بیگم کو مشورہ مان کر ایران جانے کا تہیہ کرچکا تھا۔ مرزا ملکشی قندھار تک ساتھ چلنے کی پیشکش کی تو وہ تیار ہوگیا۔ ابھی وہ کوس گیا تھا کہ اس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ ابھی تک کھوئے ہوئے تخت کو نہیں بھولا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اگر ایک مرتبہ ایران چلا گیا تو شاہ ایران کی مرضی کا پابند ہوکر رہنا پڑے گا۔ وہ بھی نہیں چاہے گا کہ میں اس کا مہمان ہوتے ہوئے ہندوستان پر حملہ کروں۔

اس نے مرزا ملکشی کی ترغیب کو ٹھکرا دیا۔ اسے اتنا



آیا کہ داراشکوہ کو وہیں چھوڑ کر لوٹ آیا۔ اس کی بیوی نادرہ بیگم ایسی نڈھال ہوئی کہ ہاتھوں میں آگئی۔ داراشکوہ کی تو دنیا ہی اندھیر ہوئی جارہی تھی۔ ساتھی سب ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ تھی کہ اب تک ساتھ تھی اور اب لگتا تھا وہ بھی چھوڑ کر جانے والی ہے۔ اسے یاد آیا کہ وہ قصبہ "دھاور" کے قریب آگیا ہے۔ یہاں کا زمیندار ملک جیون تھا جس پر شہزادے نے کسی زمانے میں بے حد عنایتیں کی تھیں۔ داراشکوہ کا ستارہ گردش میں تھا اور بیمار بیوی ساتھ تھی لہٰذا جیون پر اعتماد کرکے چند روز اس کے پاس ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

بدنصیبی کے ترکش میں ابھی ایک تیر اور باقی تھا۔ تیر بھی ایسا مہلک کہ اس کے بعد کسی اور زخم کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی۔ اس کی بیوی، سفر، حضر، رنج و راحت کی ساتھی، ہر تپتا ہی اور آفت میں شریک زندگی، آفتیں سہتے سہتے بیمار پڑ گئی تھی۔ وہ تک کر بیٹھتا یا بیٹھنے کو ملتا تو علاج ہوتا۔ مرض جڑ پکڑتا گیا۔ ملک جیون کے پاس آکر اس نے سوچا تھا کہ اب اطمینان سے بیٹھ کر نادرہ کا علاج کرائے گا لیکن وہ بھاگتے بھاگتے تھک گئی تھی۔ ملک جیون کی مہمانداری میں دو تین دن ہی بسر ہوئے تھے کہ نادرہ بیگم اسہال کے مرض میں مبتلا ہوئی اور اسی مرض میں فوت ہوگئی۔

داراشکوہ ہر تکلیف برداشت کرتا رہا تھا لیکن اس حادثے نے اسے زندہ زمین میں گاڑ دیا۔ اس کی حالت ایسی ہوگئی کہ وہ خود دو چار دن کا مہمان نظر آنے لگا۔ دل ایسا ٹوٹا تھا کہ گرفتاری کا خوف بھی دل سے جاتا رہا۔ وہ نادرہ بیگم کو اپنے پیر حضرت شاہ میرؒ کے مقبرے میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ملک جیون سے کہہ دیا کہ وہ تابوت لے کر لاہور جائے گا۔ اگر گرفتار ہوتا ہے تو ہوجائے۔

"اب میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ اگر گرفتار کرکے قتل کردیا جاتا ہے تو میں بھی نادرہ کے ساتھ ہی دفن ہوجاؤں گا۔"

"یہ خودکشی ہوگی۔ نادرہ بیگم کو اگر وہیں دفن کرنا ہے تو اپنے کچھ معتمد ملازموں کے ساتھ تابوت روانہ کردو۔ اگر قسمت نے یاوری کی اور کبھی تاج و تخت ملا تو فاتحہ پڑھ آنا۔"

شاہ جہاں نے اپنی محبت کی یادگار میں تاج محل بنوایا تھا۔ داراشکوہ اسی کا بیٹا تھا جو اپنی محبت نادرہ کے تابوت کے ساتھ جا بھی نہیں سکتا تھا۔ چند معمولی ملازموں نے تابوت لیا اور لاہور کی طرف روانہ ہوگئے۔

دارا کو یقین تھا کہ جب نادرہ کا تابوت لاہور پہنچے گا تو شاہی ہرکاروں کو یہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اس تابوت میں کون ہے اور یہ تابوت کہاں سے آیا ہے۔ میری گرفتاری عمل میں آسکتی ہے۔ اس نے تابوت کے روانہ ہوتے ہی اپنے شک کا اظہار ملک جیون کے سامنے کیا۔

"دوست اب میں چاہتا ہوں قندھار چلا جاؤں۔ وہاں سے ایران چلا جاؤں۔ جب تک نادرہ زندہ تھی مجھے ہندوستان کے تخت کی آرزو تھی۔ اب کس کے لیے جدوجہد کروں۔ باقی عمر یادِ اللہ میں گزار دوں گا۔"

"اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں بھی دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے ایران تک آپ کے ساتھ چلوں گا۔ میرا بھائی اپنے قبائلی لشکر کے ہمراہ آپ کی حفاظت کے لیے ساتھ ہوگا۔"

"ملک جیون، میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ کبھی میرے دن پھرے تو میں تمہارے دن پھیر دوں گا، اتنا کچھ دوں گا کہ تم اس علاقے کے مالک بن جاؤ گے۔"

"اب بھی آپ ہی کا دیا کھاتا ہوں حضور۔"

ملک جیون کے دل میں بے ایمانی آگئی تھی۔ اس نے برسوں کے احسانات پر پانی پھیر دیا اور اس فکر میں رہنے لگا تھا کہ کسی طرح داراشکوہ کو گرفتار کرکے اورنگزیب کی خدمت میں پیش کردے اور انعام و اکرام سے سرفراز ہو۔

اس کا موقع خود داراشکوہ نے فراہم کردیا۔ اس پر بھروسا کرکے وہ اس کے ساتھ قندھار جانے کے لیے روانہ ہوا۔ ملک جیون کا بھائی جنگلی قبائل کو لے کر حفاظت کی غرض سے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک جگہ موقع دیکھ کر ان جنگلیوں نے داراشکوہ اور اس کے بیٹے سپہر شکوہ پر قابو پالیا۔ ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیے اور گھوڑوں پر ڈال کر ملک جیون کے مکان پر لائے اور ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں قید کردیا۔

مال منڈی میں تھا، گاہک کی تلاش تھی۔ تلاش کیا تھی آواز دے کر بلانے کی دیر تھی۔ راجا جے سنگھ اور بہادر خاں اجمیر سے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ نادرہ کا تابوت لاہور پہنچا تو بہادر خاں کو شک ہوا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اس طرف روانہ کردیا۔ ادھر ملک جیون نے اپنی اس کارگزاری کی اطلاع راجا جے سنگھ اور بہادر خاں کے پاس بھجوا دی۔ ایک تیز رفتار قاصد میر کے فوج دار باقر خاں کے پاس بھیجا اور اسے اپنے کارنامے کی اطلاع دی۔ باقر خاں نے ایک شتر سوار کے ذریعے اپنی عرضداشت ملک جیون کے ہمراہ بادشاہ کے حضور روانہ کردی۔

دہلی میں تخت نشینی کا جشن جاری تھا کیونکہ بادشاہ نے

احکام جاری کیے تھے کہ عیدالضحیٰ تک جشن کی تقریبات جاری رکھی جائیں۔ شامیانے لگے ہوئے تھے، فرش بچھے ہوئے تھے۔ راتیں آتش بازی کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ راجے مہاراجے ان تقریبات کی رونق بڑھانے کے لیے دارالخلافہ میں مقیم تھے۔ اورنگزیب نے بھی تمام سرگرمیاں روک کر قلعہ دہلی کو اقامت گاہ بنا رکھا تھا۔

شام کا وقت تھا ایک شتر سوار دہلی میں داخل ہوا اور قلعے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ پہرے داروں کو اپنی شناخت کرائی۔ یہ شتر سوار بکھر کے صوبے دار کے پاس سے چلا آتا تھا۔ پہرے داروں نے دروازہ کھول دیا۔ کوئی خیال بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کتنا اہم پیغام لایا ہوگا۔ ان دنوں دہلی میں مہمانوں کی آمدورفت کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اسے بھی اس مہمانداری کا حصہ سمجھا گیا ہوگا۔

اس شتر سوار کو بادشاہ کے حضور پیش کردیا گیا۔ اس نے ملک جیون کا خط اور باقر خاں کا پیغام بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ خوشی اتنی بڑی تھی کہ بادشاہ کو اسی وقت شادیانے بجانے کا حکم دے دینا چاہیے تھا لیکن اورنگزیب متحمل مزاج بھی تھا اور احتیاط پسند بھی۔ اس نے اپنی کسی بات سے اپنی خوشی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ محرمان خاص کو آگاہ ضرور کیا لیکن اس خبر کو عام نہیں ہونے دیا۔ شتر سوار کو انعام واکرام سے نواز کر رخصت کردیا۔

داراشکوہ اندھیری کوٹھری میں اندھیرا بنا پڑا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ پھر وہ ہو کر رہا۔ اندھیرا دور ہوا۔ نور کا تڑکا پھیلا تو بہادر خاں اور راجا جے سنگھ قضائے آسمان کی طرح نازل ہوئے اور داراشکوہ کو اہل وعیال سمیت گرفتار کرکے دہلی کی طرف چلے۔

بہادر شاہ کی عرضداشت اورنگزیب کے حضور پہنچی جو مبارکباد پر مشتمل تھی۔ اس میں ملک جیون کی کوششوں سے داراشکوہ کی گرفتاری اور اسے ملک جیون کے ساتھ حضور میں روانہ کرنے کی اطلاع تھی۔ یہ سفارش بھی کی گئی تھی کہ ملک جیون کو اعزاز وانعامات سے نوازا جائے۔

بادشاہ کو اب تصدیق ہوچکی تھی۔ اس نے خبر کو عام کردیا اور شادیانے بجانے کا حکم دیا۔ اس خبر کا عام ہونا تھا کہ دہلی میں غصے اور افسردگی کی فضا طاری ہوگئی۔ لوگ سرعام ملک جیون کو گالیاں دیتے پھر رہے تھے۔ کشیدگی اتنی بڑھ گئی کہ شاہی سپاہی گلی کوچوں میں پھیل گئے کیونکہ بادشاہ کے حکم کے مطابق داراشکوہ کو جلوس کی شکل میں دہلی میں لایا جانا ہوا تھا۔

داراشکوہ کی آمد کا شور مچا تو مخلوق خدا نے اسے دیکھنے کے لیے ہجوم کیا۔ داراشکوہ اور سپہر شکوہ ایک ہی عماری میں بیٹھے تھے۔ جسموں پر میلے کچیلے لباس تھے۔ ننگے سر تھے، بال دھول سے بھرے تنکوں سے اٹے تھے۔ دارا کسی ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ندامت اور شرمندگی تھی کہ سر اٹھانے نہیں دیتی تھی۔ ادھر ادھر نگاہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ عبرت کا مقام تھا۔ نازنینوں کے بدن خزاں رسیدہ پھولوں کی طرح مرجھائے ہوئے تھے۔ مالک تھے، غلاموں سے بدتر تھے۔ لوگ وہ زمانہ یاد کررہے تھے جب شہزادہ داراشکوہ کی سواری گزرتی تھی تو وہ اشرفیاں لٹاتا چلا جاتا تھا اور آج آسمان نے اسے کیا دن دکھایا ہے۔

داراشکوہ کا ہاتھی لاہوری دروازے سے دہلی میں داخل ہوا اور چاندنی چوک، بازار سعداللہ خاں اور قلعہ ارک کے نیچے سے گزارتے ہوئے اس کی تشہیر کی گئی تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔ جب یہ تشہیر ہوچکی تو اسے پرانی دلی لے جا کر خواص پورہ کی عمارت میں مقید کردیا گیا۔

**22 ذی الحج 1069ھ (30 اگست 1659ء)** بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب تھی۔ برسات کی اندھیری رات تھی۔ ہولناک صورتوں والے چند جلاد قید خانے کی تاریکی میں داخل ہوئے۔ قیدی نے کروٹ بدلی۔ زنجیروں کے شور سے زنداں گونج اٹھا۔ اندھیرے میں خنجر چمکے اور دارا شکوہ کے گلے پر پھر گئے۔ حسن وجمال، جاہ وجلال کی تصویر خاک میں مل گئی۔ جلادوں نے اپنے کپڑوں سے خنجر صاف کیے اور باہر نکل گئے۔

ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھی کو بازار اور چوک سے گزارا گیا۔ اس مرتبہ عماری میں وہ نہیں اس کی لاش تھی۔ اس کا سر نیزے پر بلند تھا۔

گریہ وزاری کا شور بلند ہوا۔ اسی شور میں یہ ہاتھی ہمایوں کے مقبرے کی جانب چل دیا۔ اسی میلے خون آلود لباس میں جو وہ پہنے ہوا تھا، اسے مقبرۂ ہمایوں میں دفن کردیا گیا۔

سپہر شکوہ کے لیے حکم ہوا کہ اسے گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کردیا جائے۔

**مآخذات**

شاہجہاں نامہ، محمد صالح کنبوہ۔ منتخب اللباب (حصہ سوم)، خافی خاں۔
داراشکوہ، کالکا رنجن قانون گو۔ اورنگزیب عالمگیر، شبلی نعمانی





# فرار

کاشف زبیر

ہمارے اردگرد بے شمار کہانیاں جنم لیتی ہیں... ان گنت کردار ہماری زندگی کو براہِ راست متاثر بھی کرتے ہیں... اس کے باوجود وہ ہمارے نزدیک بس کردار ہی ہوتے ہیں، جو ہماری تصوراتی دنیا میں ہلچل مچاتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک تہلکہ خیز کردار جس نے بے شمار انسانوں کی زندگی میں تو سمت کا تعین کر ڈالا مگر اس کی اپنی زندگی میں کوئی رنگ نہ بھر سکا۔

**آسمان کی بلندیوں کو چھونے والی نگاہوں کے احساس کمتری کا قصہ**

میں نے عجلت میں کار پارکنگ میں روکی تو وہ ایک دوسری کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ تصادم نہ ہونے پر میں نے شکر کا سانس کھینچا اور کار سے اتر کر اس عمارت کے ہال نمبر دو کی طرف دوڑا جہاں آج ڈاکٹر میکس پائن کا لیکچر تھا۔ میکس پائن کا شمار چوٹی کے ماہرینِ نفسیات میں ہوتا تھا۔ اگرچہ نفسیات کے علم پر اب تک بہت ریسرچ ہوچکی ہے اور اب اس میں کوئی اہم نکتہ دریافت کرنے کے لیے کم ہی رہ گیا تھا لیکن میکس پائن ان ماہرین نفسیات میں سے تھا جو آج کے دور میں بھی نت نئی چیزیں پیش کرتے رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔

تقریباً پچپن سالہ میکس پائن کا اٹلانٹا سٹی سے باہر ایک بہت بڑا نفسیاتی امراض کا اسپتال تھا۔ اسی میں وہ رہائش پذیر تھا اور صرف مہینے میں ایک بار وہاں سے نکلتا تھا جب اسے کوئی لیکچر دینا ہوتا تھا۔ یہ لیکچر ہمیشہ کسی نئے موضوع پر اور ہمیشہ ایک خاص مریض کے حوالے سے ہوتا تھا۔ ڈاکٹر میکس پائن کے لیکچر میں شامل ہونے کی فیس ایک ہزار ڈالرز تھی اور عام طور سے اس کے ایک لیکچر میں کوئی ایک ہزار ماہرین نفسیات شریک ہوتے تھے۔ لیکچر میں شرکت کے لیے اولین شرط، ماہر نفسیات یا علم نفسیات کا طالب علم ہونا اور دوسری شرط ایک ہزار ڈالرز فیس ہیں۔ ایک ہزار ڈالرز اچھی خاصی بڑی رقم کے باوجود شرکت کے خواہش مندوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن میکس پائن ایک ہزار سے زیادہ افراد کو ٹکٹ نہیں دیتا تھا۔

اس برس ٹکٹ حاصل کرنے والے خوش نصیبوں میں ایک نام میرا بھی شامل تھا۔ لیکچر میں شرکت کے لیے نہ صرف امریکا بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے بھی ماہرین نفسیات شرکت کرتے تھے۔ طریقۂ کار یوں تھا کہ شرکت کے خواہش مند دو مہینے پہلے درخواست ای میل یا فیکس کرتے، اس کے ساتھ ہی انہیں ڈاکٹر میکس پائن کے اکاؤنٹ میں ایک ہزار ڈالرز جمع کرانے پڑتے اور قرعہ اندازی میں جن کا نام نکل آتا ان کو چھوڑ کر باقی خواہش مندوں کی رقم ری فنڈ کر دی جاتی۔ البتہ ڈاکٹر میکس پائن یہ سہولت بھی دیتا کہ اگر کوئی اپنی رقم واپس نہ لے تو اگلے لیکچر میں وہ بغیر قرعہ اندازی کے منتخب ہو جاتا۔ میں نے پچھلی ناکامی کے بعد اپنی رقم واپس نہیں لی تھی اس لیے میرا نام خود بہ خود شامل ہو گیا تھا۔

میرا تعلق نیویارک سے تھا۔ میں اچھا ماہر نفسیات اس لیے تھا کیونکہ میری پریکٹس ٹھیک ٹھاک ہے۔ میری آمدنی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سینٹرل پارک کے پاس میرا شاندار پینٹ ہاؤس ہے اور میرے پاس نئے ماڈل کی جیگوار اسپورٹس کار ہے۔ بینک بیلنس بھی اچھا خاصا ہے اور میں سال میں ایک بار بیوی بچوں کے ساتھ کسی تفریحی ٹور پر لازمی جاتا ہوں۔ میرا کلینک مین ہٹن میں ہے لیکن اس مقام تک میں بڑی محنت کے بعد پہنچا تھا اور شروع میں ایسا بھی ہوا کہ مہینے میں ایک سے زیادہ مریض نے میرے کلینک میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔

میں نے چند سال پہلے میکس پائن کے بارے میں سنا جب اس نے لیکچر دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا پھر میرے چند ساتھی ماہرین نفسیات نے اس کا لیکچر اٹینڈ کیا اور انہوں نے میکس پائن کی بہت تعریف کی۔ ان کا کہنا تھا انہیں لیکچر سے چند گھنٹوں میں جو سیکھنے کا موقع ملا وہ انہوں نے برسوں میں بھی نہیں سیکھا تھا۔ ان سے سن کر مجھے بھی اشتیاق ہوا اور میں نے میکس پائن کا لیکچر اٹینڈ کرنے کا فیصلہ کیا۔

میکس پائن اپنے کلینک میں مریضوں کا مفت علاج کرتا تھا اور لیکچرز کو اس نے کمائی کا ذریعہ بنایا تھا۔ مجھے لیکچر ہال میں داخلے کا ٹکٹ کوریئر کے ذریعے دیا گیا تھا۔ میں نیویارک سے طیارے کے ذریعے اٹلانٹا سٹی پہنچا اور ایئرپورٹ سے سیدھا اس ہال پہنچا جہاں لیکچر ہونے والا تھا۔

جب میں اپنا ٹکٹ دکھا کر ہال میں داخل ہوا تو وہاں دائرے میں لگی آرام دہ کرسیوں پر تقریباً تمام افراد موجود تھے۔ اس ہال میں ایک ہزار سے زیادہ افراد کی گنجائش تھی۔ میکس پائن چاہتا تو زیادہ افراد کو شرکت کا موقع دے سکتا تھا لیکن اس نے شروع سے صرف ایک ہزار کی تعداد مقرر کر رکھی تھی۔ میں اپنی نشست پر بیٹھا تو اسی لمحے اسٹیج پر میکس پائن نمودار ہوا۔ وہ سفید بالوں والا درمیانے قد و قامت کا صحت مند شخص تھا۔ اس نے اپنی چمک دار آنکھوں سے حاضرین کا جائزہ لیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

”مجھے امید ہے میرے تمام معزز دوست یہاں موجود ہیں۔“

اس نے مائیکرو فون سسٹم استعمال کر رکھا تھا۔ اس لیے اس کی دھیمی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”دوستو میں اپنے ہر لیکچر کو ایک عنوان دیتا ہوں اور آج کا عنوان ہے ”فرار“...... یہ ایک اہم لفظ ہے۔ خاص طور سے آج کے دور میں۔ فرار دیسے تو منفی لفظ ہے، اس سے بزدلی اور ناامیدی جھلکتی ہے لیکن اس کی بہت اہمیت ہے۔ میں آپ کو لفظی بحث میں الجھانے کے بجائے آپ کے سامنے اس کی افادیت ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کیونکہ میں اسے بہت اہمیت دیتا ہوں۔“

میکس پائن نے کہتے ہوئے ڈائس سے ایک ریموٹ اٹھایا اور اس کا رخ اپنے عقب میں موجود بڑی اسکرین کی طرف کر کے بٹن دبایا۔ فوراً ہی اسکرین روشن ہو گئی اور اس پر ایک کمرا نمودار ہوا۔ یہ ویسا ہی کمرا تھا جیسا نفسیاتی مریضوں کو رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک طرف فکس بستر تھا اور دیواروں پر ربر شیٹ چڑھی ہوئی تھی۔ کمرے میں کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس سے مریض خود کو نقصان پہنچا سکے۔ کمرے میں ایک کونے میں ایک ادھیڑ عمر عورت دیوار کے ساتھ سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنے گھٹنے سینے سے لگا رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں نیم وا ہو رہی تھیں۔ بھدے نقوش اور کسی قدر بھاری جسم والی اس عورت پر آدمی ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنا شاید ہی پسند کرے۔ وہ بالکل عام سی عورت تھی۔ میکس پائن نے کہا۔

”یہ عورت بد نصیبی کا شاہ کار ہے...... ہاں میں اسے شاہ کار کہنا پسند کروں گا کیونکہ بد نصیبی بھی تخلیق کار ہے اور اگر وہ تخلیق کار ہے تو یہ عورت اس کا شاہ کار ہے۔ پہلے میں اس کا بیک گراؤنڈ اور اس کی کہانی سنا دوں اس کے بعد آپ مجھ سے اس کے بارے میں سوالات کر سکتے ہیں۔ اس کا نام امیلڈا فوکس ہے۔“

☆☆☆

امیلڈا نسلاً پرتگیز تھی اور وہ صرف دو سال کی تھی جب اس کی ماں اسے لے کر پرتگال سے امریکا آ گئی۔ اس کا ناجائز باپ ایک اسپینش تھا اور وہ امیلڈا کی ماں کے ساتھ صرف دو دن رہا تھا اور اس کے بعد ایسا غائب ہوا کہ پھر اس نے امیلڈا کی ماں کو اپنی صورت بھی نہیں دکھائی تھی یا اسے پروا بھی نہیں تھی کیونکہ وہ ایک معمولی درجے کی طوائف تھی اور اس کا کام ہی آئے دن نت نئے آدمیوں کے ساتھ سونا تھا۔ مسئلہ اس وقت ہوا جب وہ امید سے ہو گئی، جس کا علم بھی تاخیر سے ہوا۔ مجبوراً اسے امیلڈا کو جنم دینا پڑا۔ پھر امیلڈا کی ماں کے حالات خراب ہوئے اور اسے ایک ہی راستہ نظر آیا کہ وہ اپنے کزن مرٹیز فوکس کے پاس امریکا چلی جائے۔ مرٹیز بیس سال پہلے امریکا چلا گیا تھا اور اس نے کئی بار رولڈا کو وہاں بلایا تھا لیکن رولڈا جوانی میں غلط چکروں میں پڑ کر منشیات استعمال کرنے لگی اور بالآخر اخراجات پورے کرنے کے لیے جسم فروشی کرنے لگی۔ امیلڈا کی پیدائش کی وجہ سے اسے اپنا کام کرنے میں دشواری پیش آنے لگی تھی کیونکہ اس کے گاہک بچی کی موجودگی پسند نہیں کرتے تھے۔ گاہک کم ہوئے تو حالات مزید خراب ہوئے اور فاقہ کشی کی نوبت آنے لگی۔ مجبوراً اسے امریکا جانے کا فیصلہ کرنا پڑا تھا۔

مرٹیز ایک چھوٹے سے قصبے میں کباڑی کا کام کرتا تھا اور اپنے ہی کباڑ خانے میں ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا کمرا تھا جس میں مرٹیز کی رہائش تھی اور اس نے رولڈا کو بھی اسی میں ٹھہرایا تھا۔ اصل میں اسے ایک عورت کی ضرورت تھی جو اس کی نفسانی خواہشات پوری کرنے کے ساتھ اس کے گھر کو بھی سنبھال سکے۔ امریکا میں ایسی عورت ملنا ذرا مشکل تھا اس لیے اس نے رولڈا پر ڈورے ڈالے اور اسے امریکا بلوانے میں کامیاب رہا۔ دوسری طرف رولڈا بھی اپنی زندگی سے تنگ آ گئی تھی جس میں ہر روز ایک نیا آدمی ہوتا تھا اور اسے بس اتنا ملتا تھا کہ وہ جسم و جاں کا ناتا برقرار رکھ سکے۔ اس لیے اس نے مرٹیز کی غلامی قبول کر لی۔

امیلڈا نے جب اس کباڑ خانے میں ہوش سنبھالا تو اس نے اپنی ماں کو مرٹیز کی غلامی کرتے ہی دیکھا تھا۔ مرٹیز نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے رولڈا اور امیلڈا کے کاغذات نہیں بنوائے تھے۔ وہ ویزے پر یہاں آئی تھی اور اب وہ چھپ کر رہ رہی تھی۔ مرٹیز نے رولڈا کو ڈرایا ہوا تھا کہ اگر وہ اس کے گھر سے نکلی اور پولیس کے ہاتھ لگی تو اسے سیدھا واپس پرتگال بھیج دیا جائے گا جبکہ رولڈا اب کسی صورت واپس نہیں جانا چاہتی تھی اس لیے مرٹیز کی تمام باتیں ماننے اور اس کی خدمت کرنے پر مجبور تھی۔

رولڈا اس کے گھر کا سارا کام کرتی۔ اس کے لیے کھانا بناتی اور اس کے کپڑے دھوتی۔ پھر وہ کباڑ سنبھالنے میں بھی مرٹیز کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ساتھ ہی وہ مرٹیز کی نفسانی خواہشات بھی پوری کرتی تھی یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی مرٹیز کا کوئی جاننے والا اس سے ملنے آتا تو مرٹیز رولڈا کو اسے پیش کر دیتا تھا۔ رولڈا مجبور تھی، انکار نہیں کر سکتی تھی اور اس کے خیال میں یہ پھر بھی اس وقت سے بہتر تھا جب اسے روز کسی نئے آدمی کے ساتھ سونا پڑتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس غلامی کے باوجود رولڈا امریکا آ کر خوش تھی تو یہ سچ تھا۔

البتہ امیلڈا بالکل خوش نہیں تھی کیونکہ اس نے اس جگہ ہوش سنبھالا تھا اور یہ کباڑ خانہ اس کے لیے کسی جہنم سے کم نہیں تھا۔ مرٹیز نے اپنا کباڑ خانہ آبادی سے دور ایک ویرانے میں قائم کیا تھا جہاں سوائے بجلی کے اور کوئی سہولت نہیں تھی۔ ٹین کی شیٹوں سے گھرے اس کباڑ خانے میں سوائے ٹوٹے پھوٹے کباڑ اور چیزوں کے کچھ نہیں تھا۔ مرٹیز کے پاس ایک خستہ حال پک اپ تھی۔ جس میں وہ کباڑ لاد کر لاتا اور لے جاتا تھا۔ رولڈا اور امیلڈا کی آمد سے پہلے وہ جس جھونپڑے میں رہ رہا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ حالانکہ اس کے پاس جگہ اور وسائل تھے اور وہ چاہتا تو اس جھونپڑے کو بہتر بنا سکتا تھا۔ درحقیقت یہ جھونپڑا بھی اس نے خود بنایا تھا اور یہاں فرنیچر کے نام پر جو چیز بھی تھی وہ اس نے کباڑ سے حاصل کی تھی۔ کمرے میں ایک ہی بیڈ تھا جس پر مرٹیز خود سوتا تھا۔ رولڈا اور امیلڈا کو فرش پر بستر بچھا کر سونا پڑتا تھا۔

رولڈا کے پاس گنے چنے کپڑے تھے جو مرٹیز اسے لا دیتا تھا اور یہ بھی زیادہ تر استعمال شدہ ہوتے تھے۔ جب یہ

مزید پرانے ہو جاتے تو رولڈا ان سے ہی امیلڈا کے لیے لباس تیار کر دیتی تھی۔ دو تین سال کی عمر میں امیلڈا نے جھونپڑے سے نکلنا شروع کیا اور جب وہ چار سال کی ہوئی تو رولڈا نے اسے سمجھایا کہ اسے کسی صورت احاطے سے باہر نہیں جانا ہے۔ ورنہ اسے پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ امیلڈا نہیں جانتی تھی کہ پولیس کیا ہوتی ہے لیکن ماں کی باتیں سن کر اسے یوں لگا جیسے پولیس کسی خوف ناک شے کا نام ہو۔ وہ احاطے کے قریب جاتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ احاطہ کوئی دو ایکڑ رقبے پر تھا اور اس میں ہر طرف ٹوٹی اور خراب اشیا کا ڈھیر تھا۔

مرٹیز کباڑ کو مزید توڑ پھوڑ کر اس سے دھاتیں اور پلاسٹک وغیرہ الگ کرتا اور پھر الگ کی جانے والی اشیا کو لے جا کر بیچ دیتا۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر اپنے کام میں لگ جاتا تو اس کی وجہ سے رولڈا اور امیلڈا کو بھی صبح ہی اٹھنا پڑتا تھا۔ کیونکہ جھونپڑے میں گنجائش نہیں تھی اور ان کو مرٹیز کے لیے فرش بھی خالی کرنا پڑتا تھا۔ اگر موسم ٹھیک ہوتا تو امیلڈا برآمدے میں جا کر لیٹ جاتی لیکن سردیوں میں یہ بھی ممکن نہیں تھا۔

سردیوں کے چار مہینے بہت اذیت ناک ہوتے تھے۔ ٹین کا بنا جھونپڑا یخ بستہ ہو جاتا تھا۔ مرٹیز خود تو گرم بستر میں گھس کر آرام سے سو جاتا اور وہ دونوں ماں بیٹی فرش پر نا کافی بستر اور میل میں ٹھٹھرتے رہتے تھے۔ مرٹیز ان کو آگ جلانے کی اجازت نہیں دیتا تھا کیونکہ اس کباڑ خانے میں ہر طرف ایسی اشیا بکھری ہوئی تھیں جو بہت آسانی سے آگ پکڑ لیتی ہیں۔ مرٹیز کے لیے یہ خطرہ مول لینے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ وہ رولڈا اور امیلڈا کو سردی میں ٹھٹھرنے دیتا۔ جب امیلڈا ذرا بڑی ہوئی تو اس نے ماں سے کہا۔ ”تم مرٹیز سے کہو وہ آگ جلانے دیا کرے۔“

”نہیں وہ ناراض ہو جائے گا۔“ رولڈا ڈر کر بولی۔ وہ مرٹیز سے بہت خوف کھاتی تھی۔

”مجھ سے سردی برداشت نہیں ہوتی۔“ امیلڈا نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”اتنی زیادہ بھی نہیں ہے۔“ رولڈا نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں مرٹیز سے نہیں کہہ سکتی۔“

امیلڈا نے دیکھا کہ ماں کہنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس نے خود مرٹیز سے کہہ دیا کہ وہ انہیں آگ جلانے کی اجازت دے دے۔ یہ سنتے ہی مرٹیز خود آگ بگولا ہو گیا تھا اور اس نے دانت پیس کر رولڈا سے کہا۔ ”اچھا تو تم اسے سکھا پڑھا رہی ہو کہ میں تمہیں آگ جلانے کی اجازت دے دوں اور تم اس جگہ آگ لگا دو۔“

”نہیں..... نہیں... میں نے نہیں کہا ہے۔“ وہ خوف زدہ ہو کر بولی لیکن اس سے پہلے ہی مرٹیز اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی رولڈا پر تشدد کرتا رہا تھا لیکن اس روز تو اس نے حد کر دی۔ مار مار کر رولڈا کو ہولہان کر دیا تھا۔ جب روتی ہوئی امیلڈا ماں کو بچانے آئی تو مرٹیز نے اسے بھی مارا۔ اس کا غصہ اس پر بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تو اس نے دونوں ماں بیٹی کو دھکے دے کر جھونپڑی سے نکال دیا۔

”تم دونوں کو بڑی آگ لگی ہوئی ہے۔ رات باہر رہو گی تو خود بہ خود ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

رولڈا کے ہوش اڑ گئے تھے۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ جھونپڑے سے باہر رات گزارنے کا تصور ہی اذیت ناک تھا لیکن جب انہوں نے یہ رات باہر گزاری اور جس طرح گزاری تب انہیں پتا چلا کہ خیال اور حقیقت میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دونوں ماں بیٹی ساری رات ایک دوسرے سے چمٹ کر کباڑ تلے سرد ہوا سے بچنے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔ انہوں نے مر مر کر یہ رات گزاری تھی اور اس کے بعد امیلڈا نے کبھی آگ جلانے کی بات نہیں کی۔

مرٹیز کی آمدنی ٹھیک ٹھاک تھی لیکن وہ ان پر اور گھر پر خرچ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ کھانے کا سامان بھی بہت کم لاتا تھا۔ خود تو وہ زیادہ تر باہر سے کھا لیتا تھا لیکن ان ماں بیٹی کو معمولی اشیا پر گزارا کرنا پڑتا تھا جو مرٹیز لاتا تھا۔ جب کھانے کی چیزیں ختم ہونے لگتیں تو رولڈا کے کئی بار بتانے پر وہ مزید سامان لاتا تھا اور مہینے میں کئی بار انہیں فاقے بھی کرنا پڑتے تھے۔ کباڑ میں بہت سارے ڈبا بند خوراک کے استعمال شدہ ٹن آتے تھے۔ جیسے ہی مرٹیز کسی کام سے باہر جاتا۔ امیلڈا اور رولڈا ٹنوں کے ڈھیر کے پاس پہنچ جاتیں۔ ٹنوں میں موجود بچی کھچی کھانے کی اشیا سے پیٹ کی آگ سرد کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ پھر مرٹیز آ جاتا تو انہیں ٹنوں کے ڈھیر سے دور ہونا پڑتا۔ کبھی کبھی کسی ٹن سے تو انہیں کھانے کو اچھا مال جاتا لیکن یہ موقع بھی بہت کم آتا تھا۔

دس سال کی عمر میں امیلڈا کے ذہن میں پہلی بار یہ خیال آیا کہ وہ یہاں کیوں رہ رہے تھے۔ وہ احاطے سے باہر نہیں گئی تھی لیکن یہاں آنے والے اخبارات اور رسائل میں تصویریں دیکھ کر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ باہر ایک وسیع خوب صورت دنیا تھی جو اس بدصورت احاطے سے بالکل مختلف تھی اور اس میں اس جیسے بچے اور اس کی ماں جیسی عورتیں خوش باش زندگی بسر کرتے تھے۔ اس نے رولڈا سے پوچھا



”ہم یہاں سے کہیں اور کیوں نہیں چلے جاتے؟“

”ہم کہیں نہیں جا سکتے۔“ رولڈا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”ہم یہاں غیر قانونی طور پر مقیم ہیں اور اگر باہر گئے تو پولیس ہمیں گرفتار کر لے گی۔“

”وہ گرفتار کر کے کیا کرے گی؟“

”وہ ہمیں جیل میں ڈال دے گی۔“

”جیل کیا ہوتی ہے؟“

رولڈا نے اسے ایک میگزین میں چھپی جیل کی تصویریں دکھائیں۔ ”یہ جیل ہوتی ہے۔“

صاف ستھری اور بڑی سی جیل امیلڈا کے لیے کسی محل سے کم نہیں تھی، اس نے رولڈا سے کہا۔ ”اگر یہ جیل ہے تو میں یہاں رہنے کے لیے تیار ہوں۔“

مگر خوف زدہ رولڈا کسی صورت جیل جانے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے امیلڈا کو جھڑک کر خاموش کرا دیا۔ ”بس چپ کر جاؤ اور یہ بات مرٹیز کے سامنے مت کرنا ورنہ وہ غصہ کرے گا۔“

امیلڈا کو اسکول جانے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ اس کی ساری دنیا احاطے تک محدود تھی اور اس احاطے سے باہر جھانکنے کے لیے اس کے پاس ایک ہی ذریعہ تھا، اخبارات اور رسالے جن میں تصویریں ہوتی تھیں اور یہ تصویریں اسے باہر کی سیر کراتی تھیں۔ اس کا سارا علم ان تصاویر تک محدود تھا۔ وہ تصویریں دیکھتی اور حیران ہوتی کہ باہر کی دنیا اتنی بڑی ہے۔ اس میں کتنا کچھ ہے۔ کتنی بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ لمبی سی ساخت والی اور بہت اونچی۔ جو چیز اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ رولڈا سے پوچھ لیتی اور اس کا موڈ اچھا ہوتا تو وہ بتا دیتی ورنہ اسے جھڑک دیتی تھی۔

اپنی اکلوتی اولاد کے ساتھ رولڈا کا رویہ عجیب تھا۔ اس نے بہت کم امیلڈا کو سینے سے لگا کر پیار کیا تھا۔ وہ اس سے عام طور سے درشتی سے بات کرتی اور اگر اس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو وہ اسے مارنے سے گریز نہیں کرتی تھی۔ اسے امیلڈا سے زیادہ مرٹیز کا خیال رہتا تھا کہ وہ اس سے ناراض نہ ہو جائے اور اس کو راضی رکھنے کے لیے وہ ہر جتن کرتی تھی۔ اس کے مقابلے میں اسے امیلڈا کا خیال نہ ہونے کے برابر تھا۔ نہ جانے کیسے اس نے امیلڈا کو دو سال کی عمر تک دودھ پلایا تھا۔

دس سال کی عمر میں امیلڈا مرد اور عورت کے تعلق کی نزاکتیں سمجھنے لگی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی ماں اور مرٹیز تھے جو اب تک اس کی پروا کیے بغیر اپنی تسکین کا سامان کرتے تھے۔ پھر رولڈا کو احساس ہوا تو وہ ایسے وقت میں امیلڈا کو کمرے سے باہر بھیج دیتی تھی۔ اگرچہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ امیلڈا جھونپڑی کے سوراخوں سے ان کو دیکھ سکتی تھی۔ مرٹیز کے پاس جو ردی آتی تھی اس میں عریاں تصاویر والے رسالے بھی ہوتے تھے اور ان سے امیلڈا نے جانا تھا کہ مرد اور عورت میں کیا تعلق ہوتا ہے اور عملی تشریح تو اس کے سامنے تھی۔ ایک دن اس نے رولڈا سے پوچھ لیا۔

”جب میں تمہاری طرح بڑی ہو جاؤں گی تو کیا مرٹیز میرے ساتھ بھی وہی کرے گا جو تمہارے ساتھ کرتا ہے۔“

رولڈا نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ ”بے شرم آئندہ یہ بات مت کرنا۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ رولڈا نے اسے بے شرم کیوں کہا۔ جو کام وہ خود کر رہی تھی اس کے لیے کیوں ناپسند کیا تھا۔ اسے تہذیب اور شرم و حیا کا پتا ہی نہیں تھا۔ اس نے اس احاطے میں ہوش سنبھالنے کے بعد صرف حیوانیت دیکھی تھی۔ جس کی انتہا اپنی خواہش پوری کرنا تھا۔ اسے پڑھنا نہیں آتا تھا اور امیلڈا کو انگریزی لکھنا اور پڑھنا نہیں آتی تھی اس لیے وہ نہیں جان سکی کہ ان رسالوں میں کیا لکھا ہوتا ہے جو اسے دنیا کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس کے لیے واحد زبان تصویریں تھیں۔

امیلڈا کو جو تصویر اچھی لگتی تھی وہ اسے نکال کر اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔ نہ جانے اسے کیسے احساس ہو گیا کہ مرٹیز اس بات کو پسند نہیں کرے گا، اس لیے وہ ان تصویروں کو چھپا کر رکھتی تھی۔ اس نے رولڈا کو بھی نہیں بتایا تھا لیکن اس نے امیلڈا کو کئی بار ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ البتہ اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

دھیرے دھیرے امیلڈا نے جوانی کی دہلیز کو بھی پار کر لیا۔ مرٹیز کو احساس ہوا تو اس نے عجیب نظروں سے امیلڈا کی طرف دیکھا۔ امیلڈا کو اس کی نظریں جیسے اپنے جسم میں اترتی محسوس ہوئی تھیں اور اس روز اسے صحیح معنوں میں مرٹیز سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ رولڈا نے بھی مرٹیز کی ان نظروں کو محسوس کر لیا تھا اور اس نے بعد میں امیلڈا کو سمجھایا کہ جب مرٹیز احاطے میں ہو کرے تو وہ اس کے آس پاس رہا کرے اور اکیلے میں کہیں جانے سے گریز کیا کرے۔ کہیں سے مراد احاطے میں کہیں دور جانا تھا لیکن امیلڈا نے اس کی ان باتوں پر خاص دھیان نہیں دیا تھا۔

مرٹیز کو شراب نوشی کا جنون تھا۔ فارغ دنوں میں وہ صبح سے شام تک پیتا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر رولڈا بھی پینے کی عادی ہو گئی تھی اور وہ اکثر مرٹیز کی بوتل سے چپکے سے شراب

نکال لیتی تھی اور اسے بعد میں استعمال کرتی تھی۔ اس روز بھی مرٹیز باہر گیا تو رولڈا نے چھپی ہوئی شراب نکالی اور پی کر بے سدھ ہو کر لیٹ گئی۔ امیلڈا نے موقع غنیمت جانا اور اپنی تصویریں نکال کر احاطے میں ایک جگہ بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ وہ تصویروں میں اتنی مگن تھی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ مرٹیز واپس آ گیا ہے۔ اس نے اچانک امیلڈا کے ہاتھ سے تصویریں چھین لیں اور زہریلے لہجے میں بولا۔

"اچھا تو تم چھپ کر تصویریں دیکھتی ہو۔"

امیلڈا کو خطرے کا احساس ہوا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن مرٹیز نے اسے پکڑ لیا اور اس کے چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر اسے کھینچ کر احاطے کے ایک دور دراز حصے میں لے گیا۔ امیلڈا نے بھرپور مزاحمت کی لیکن اس کی شیطانی طاقت کے سامنے بے بس ہو گئی اور مرٹیز اپنی ہوس پوری کر کے اسے نیم بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ گیا۔ کچھ دیر بعد امیلڈا کو ہوش آیا تو وہ بپھر کر اٹھی اس نے کباڑ سے ایک فولادی پائپ اٹھایا اور جھونپڑے کی طرف آئی رولڈا نشے میں دھت بے خبر پڑی تھی جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ امیلڈا پر کیا قیامت گزر گئی ہے۔ مرٹیز وہاں نہیں تھا۔ وہ اپنے کام والے شیڈ تلے کرسی پر بیٹھا اپنی کامیابی کا جشن منا رہا تھا۔ امیلڈا نے عقب سے اس کے سر پر پوری قوت اور نفرت سے وار کیا تھا۔ مرٹیز کی کھوپڑی چیخ گئی اور اس سے خون کے ساتھ اس کا مغز بھی بہہ نکلا۔ امیلڈا کو نہیں معلوم تھا کہ موت کیا ہوتی ہے لیکن اسے یقین ہو گیا کہ مرٹیز اب زندہ نہیں ہے۔

مرٹیز کے مرنے کے بعد امیلڈا کا جوش ٹھنڈا ہوا تو اسے خوف آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی جرم کرے یا کسی کا نقصان کرے تو اسے پولیس پکڑ کر سزا دیتی ہے اور سزا اس کے نزدیک یہی تھی کہ اسے مار اپیٹا جائے گا۔ وہ اتنی خوف زدہ ہوئی کہ چپکے سے پہلی بار احاطے سے نکل آئی۔ اس کا ایک ہی گیٹ تھا جس پر ہر وقت تالا ہوتا تھا اور مرٹیز جاتے وقت باہر سے تالا لگا جاتا تھا۔ امیلڈا کو اس کی چابی کا پتا تھا۔ اس نے مرٹیز کی جیب سے چابی نکالی اور باہر آ گئی۔ یہاں میلوں تک ویرانہ تھا۔

امیلڈا کچے راستے پر ہوتی سڑک تک آئی اور دو دن تک سڑک کے ساتھ سفر کرتی رہی۔ اس دوران میں اسے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ پھر بھوک سے مجبور ہو کر اس نے ایک اسٹور میں گھس کر کھانے کا کچھ سامان اٹھایا تو دکان والے نے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہ ڈر گئی کہ پولیس کو مرٹیز کے قتل کا پتا نہ چل جائے لیکن انہوں نے امیلڈا سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ البتہ جب اس نے ان کے سوال کے جواب میں چپ سادھ لی تو انہوں نے اسے اسپتال روانہ کر دیا جہاں اس کا طبی معائنہ ہوا اور ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ اب کنواری نہیں رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کنوارا ہونا کسے کہتے ہیں پھر ضروری کارروائی کے بعد اسے ایک جج کے حکم پر بے سہارا بچوں کی دیکھ بھال کے سرکاری ادارے میں بھیج دیا گیا۔

امیلڈا کے لیے یہ ایک اور احاطہ تھا۔ اگرچہ یہاں اس کے ساتھ بہتر سلوک ہوتا تھا اور اسے بہتر کھانے پینے اور لباس کے ساتھ تعلیم کی سہولت بھی ملی تھی۔ اس نے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود اسے اس جگہ سے نفرت تھی۔ وہ جیسے ہی اٹھارہ برس کی ہوئی اس نے ادارہ چھوڑ دیا اور یہاں سے اٹھ کر فٹ پاتھ پر آ گئی۔ اسے کوئی کام کرنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ بھیک مانگنے لگی۔ پھر وہ آوارہ گردوں کی ایک ٹولی کے ہمراہ ہو گئی اور ان کے ساتھ شہر شہر گھومتی رہی۔

امیلڈا خوب صورت اور پرکشش نہیں تھی اس کا جسم بھی سپاٹ تھا لہٰذا ٹولی میں شامل مرد اس کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ ہاں مجبوری میں وہ اس کے پاس آ جاتے تھے۔ ان کے ساتھ رہ کر امیلڈا نشے کی عادی ہو گئی تھی پھر کئی بار پولیس نے اسے گرفتار کیا اور وہ کئی سال جیل میں رہی جب باہر آتی تو کسی نئی ٹولی میں شامل ہو جاتی۔ اگرچہ کردار کے لحاظ سے ان ٹولیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ آخری بار امیلڈا دو سال پہلے کوئی چالیس سال کی عمر میں جیل گئی تھی، اس بار بھی اسے منشیات رکھنے کے الزام میں سزا ہوئی تھی، جب وہ جیل سے نکلی تو اس بار اسے کوئی ٹولی بھی نہیں ملی تھی کیونکہ کوئی اس بوڑھی اور بدصورت عورت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا جبکہ انہیں گھروں سے بھاگی ہوئی جوان اور حسین لڑکیاں میسر تھیں۔ پھر ایک صبح پولیس نے امیلڈا کو فٹ پاتھ پر اس حالت میں بیٹھے پایا کہ اس نے گھٹنے سینے سے لگا رکھے تھے اور اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔

☆☆☆

میکس پائن نے حاضرین کی طرف دیکھا۔ "آپ جان گئے ہوں گے کہ میں نے اس عورت کو بدنصیبی کا شاہکار کیوں کہا ہے۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں دیکھی اور کوئی غم ایسا نہیں ہے جو اس نے نہ دیکھا ہو۔ اسے نہ خاندان ملا، نہ تعلیم ملی اور نہ ہی نارمل زندگی کی کوئی خوشی ملی۔ یہ بری صحبت میں پڑ گئی لیکن اسے وہ خوشی بھی نہیں ملی جو ہمارے بالکل منفی زندگی گزارنے والوں کو مل جاتی ہے۔ دکھ سہتے سہتے اس



عورت کے اعصاب بالآخر جواب دے گئے اور یہ ایک مریض کی حیثیت سے میرے اسپتال میں داخل ہو گئی۔"

"اس سے پہلے کہ آپ اس کے بارے میں کوئی سوال کریں میں آپ کو ایک اور عورت کی کہانی سنانا چاہتا ہوں جو شاید اس دنیا کی سب سے خوش قسمت عورت ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ امیلڈا فوکس کے بالکل برعکس قسمت لے کر پیدا ہوئی اور اس کا نام میریا فالکن ہے۔"

☆☆☆

اس کا نام میریا فالکن تھا اور وہ پیدائشی خوش نصیب تھی۔ فالکن خاندان منی سوٹا کے ایک زرخیز علاقے میں دو صدی سے آباد ہے اور یہاں ان کی بہت بڑی زمین ہے جس پر تاحد نگاہ باغات اور فارمز ہیں۔ ان کے عین وسط میں اس خاندان کا بہت بڑا محل فالکن والا ہے۔ کئی ایکڑ پر پھیلی اس تین منزلہ عمارت میں بیک وقت کئی درجن افراد آباد تھے۔ ایک وصیت کے تحت فالکن خاندان کی جاگیر ناقابل تقسیم تھی اور اس کی آمدنی تمام ورثا میں برابر تقسیم ہوتی تھی۔ خاندان کے بڑے مل جل کر جاگیر اور اس سے متعلق دوسرے معاملات کی نگرانی کرتے تھے۔ پھر ان کے اور بھی بے شمار کاروبار تھے۔ درجنوں کارخانے اور کئی بینک اس خاندان کی ملکیت تھے۔ ایک جہاز راں کمپنی اور ایک ائر لائن بھی فالکن خاندان کی ملکیت تھی۔ اس خاندان میں پیدا ہونے کا مطلب کروڑ پتی پیدا ہونا تھا۔ یوں میریا سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔

اس خاندان میں ایک جوڑا سارہ اور اس کے شوہر جونز کا تھا۔ دونوں آپس میں کزن بھی تھے۔ ان کی محبت شادی کے بعد بڑھتی رہی تھی، لیکن وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ انہوں نے کئی بار اپنا طبی چیک اپ کرایا تھا لیکن ہر بار انہیں یہی بتایا گیا کہ وہ سو فی صد نارمل ہیں اگر تاخیر ہے تو قدرت کی جانب سے ہے۔ دونوں کی شدید خواہش تھی کہ وہ ماں باپ بنیں لیکن اس کے لیے وہ ٹیسٹ ٹیوب کا سہارا لینے کو تیار نہیں تھے۔ اول تو وہ دونوں ٹھیک تھے اور دوسرے ان کے خیال میں قدرت کے کاموں میں مداخلت کا انجام ٹھیک نہیں ہوتا اس لیے وہ صبر و سکون سے انتظار کر رہے تھے کہ کب ان کی ماں باپ بننے کی خواہش پوری ہوتی ہے۔

شادی کی پانچویں سالگرہ انہوں نے ہوائی میں منانے کا فیصلہ کیا تھا اور جب وہ اس تفریحی سفر سے واپس آ رہے تھے تب سارہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور انہوں نے واپسی پر ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے سارہ کے ماں بننے کی خوش خبری سنائی تھی۔ یہ عام خبر نہیں تھی کیونکہ جس طرح جونز خاندان کے

## استغفراللہ

مولویوں کی بس شہر سے گزر رہی تھی
ایک نے کہا۔ "جب کوئی لڑکی دیکھو تو استغفراللہ پڑھنا۔"
چند گھنٹوں بعد ایک مولوی نے کہا..... "استغفراللہ"
دوسرے پوچھنے لگے۔ "کہاں ہے؟ کہاں ہے؟"

❖❖❖

## مشورہ

شادی کے دن دولہا نے ایک دوست سے پوچھا۔
یار: "مجھے کوئی ایسی چیز بتاؤ جو میں اپنی بیوی کو دوں اور وہ حیران رہ جائے۔"
دوست: "اونہوں جاندیاں ای طلاق دے دے۔" (اسے جاتے ہی طلاق دے دو)

❖❖❖

## معصومیت

پوتا (دادی سے): "دادی، آپ، امی، ابو، میں اور میری بہن..... ہم گھر میں پانچ افراد ہیں کیا ہم پانچ ہی رہیں گے؟"
دادی: "نہیں بیٹا جب تمہاری شادی ہو گی تو ہم چھ ہو جائیں گے۔"
پوتا: "اور جب میری بہن کی شادی ہو جائے گی تو ہم پھر پانچ رہ جائیں گے۔"
دادی: "نہیں جب تمہیں اللہ کوئی بچہ دے گا تو ہم پھر چھ ہو جائیں گے۔"
پوتا: "اور دادی جب تم مر جاؤ گی تو ہم پھر پانچ رہ جائیں گے۔"
دادی غصے سے: "چپ کر کے سو جاؤ ناہنجار..... مجھے نیند آ رہی ہے۔"

تفسیر عباس بابر۔ اوکاڑہ

جوانوں میں سب سے زیادہ مقبول تھا اسی طرح سارہ عورتوں میں سب سے دل کش اور سب کی چہیتی تھی۔ فالکن خاندان میں شادی کے بعد کسی جوڑے کو بچے کے لیے اتنا طویل انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس لیے سب ہی بے حد خوش تھے اور اب سارہ کا بہت زیادہ خیال رکھا جانے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا رہا اور سب ٹھیک رہا۔ مقررہ وقت پر سارہ نے ایک بہت پیاری بچی کو جنم دیا تھا۔ اس کا نام انہوں نے میریا رکھا تھا۔

ماں باپ کی وجہ سے میریا پورے خاندان کی چہیتی بن گئی تھی جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ جب سارہ اسپتال سے واپس آئی تو میریا کی پیدائش کی خوشی میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں نہ صرف پورا خاندان بلکہ ان کے بے شمار جاننے والے دوست احباب بھی شریک تھے۔ اس ننھی میریا کو اتنے تحفے ملے تھے کہ ان سے پورا ایک کمرا بھر گیا تھا۔ اس کے دادا نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک مستقل گورنس رکھی تھی۔ اگرچہ گورنس کو اسے کم ہی سنبھالنا پڑتا تھا۔ کیونکہ سارا دن وہ ماں اور خاندان کے دوسرے افراد کے پاس ہوتی تھی۔

جیسے جیسے میریا بڑی ہوتی گئی اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا گیا لیکن اس اہمیت نے اس کے اندر غرور پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ اور سب سے محبت اور احترام سے پیش آتی تھی۔ اس کا مزید کوئی بہن بھائی پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے وہ سب کی توجہ کا مرکز بنی رہی اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی کسی محرومی سے دوچار ہونا نہیں پڑا تھا۔ اس کے ساتھ کے خاندان میں کئی بچے تھے لیکن جو اہمیت اس کو حاصل تھی وہ کسی اور بچے کو نہیں تھی لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ کوئی بچہ اس سے حسد نہیں کرتا تھا۔ سب اس کے دوست تھے اور اس سے پیار کرتے تھے۔ ماں باپ اور قریبی رشتے داروں کے علاوہ خاندان کے دوسرے بڑے بھی اس سے اسی طرح محبت کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ بہت خوش قسمت تھی۔

میریا عام بچوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین تھی۔ وہ جلد جان لیتی تھی کہ کس شخص سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔ اس کی ذہانت کی وجہ سے بھی سب اس سے پیار کرتے تھے۔ چار سال کی عمر میں اسے اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ یہ ایک عام سرکاری اسکول تھا جیسے کہ امریکا میں ہوتے ہیں اور یہاں اس کی حیثیت دوسرے بچوں سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا تھا جو باقی سب کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اگرچہ ٹیچرز سب ہی بچوں سے بہت پیار سے پیش آتی تھیں۔ میریا کے لیے یہ ذرا غیر متوقع بات تھی کیونکہ وہ اب تک خاص سلوک کی عادی رہی تھی۔

وہ شروع میں ڈسٹرب رہی لیکن اس کی ذہانت نے جلد اس مسئلے پر قابو پالیا۔ اس نے جان لیا کہ یہاں وہ ایک عام بچی تھی اور اگر وہ دوسروں سے کوئی خصوصی سلوک چاہتی تھی تو اسے خود کو خصوصی ثابت کرنا تھا اور اسکول میں اہمیت حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے۔ اس نے تعلیم پر توجہ دینا شروع کردی۔ ٹیچرز جو پڑھاتیں وہ اسے زبانی یاد کرلیتی تھی اور پھر اپنی ذہانت سے اسے مزید بہتر بنا کر ٹیچرز کو سناتی تھی۔ ٹیچرز حیران رہ جاتیں کہ یہ ننھی سی بچی ان کی سکھائی ہوئی چیزوں میں اس طرح سے بھی جدت کرسکتی ہے۔ جلد ہی وہ اسے سب سے زیادہ اہمیت دینے لگیں۔ پہلے سال وہ اپنی کلاس اور اسکول میں اول آئی تھی۔ اگرچہ اس درجے میں اول دوم اور سوم کا طریقہ نہیں رکھا گیا تھا لیکن اس نے اتنی غیر معمولی کارکردگی دکھائی تھی کہ اسکول انتظامیہ کو مجبوراً اس کی پوزیشن کا اعلان کرنا پڑا تھا۔

پہلے سال کے بعد میریا اسکول میں پھر کبھی دوسرے نمبر پر نہیں آئی تھی۔ صرف تعلیم ہی نہیں وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی سب سے آگے تھی۔ اسے سوئمنگ کا شوق تھا اور وہ چار سال کی عمر میں ہی ماہر تیراک بن گئی تھی۔ اسے اسکولوں کے درمیان ہونے والے تیراکی کے مقابلوں میں بھیجا جانے لگا اور یہاں بھی اس نے ہر مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ تیراکی کے ماہرین نے اسے غیر معمولی سوئمر قرار دیا تھا۔ صرف دس سال کی عمر میں اس نے پرائمری اسکولوں کی آل امریکا سوئمنگ چیمپئن شپ میں گولڈ میڈل جیت لیا تھا۔ وہ یہ کارنامہ انجام دینے والی کم سن ترین لڑکی تھی۔

جس وقت ماہرین سوئمنگ میں اس کے تابناک مستقبل کی پیش گوئیاں کررہے تھے۔ اس وقت ہائی اسکول میں اس نے سوئمنگ میں دلچسپی لینا بند کردی اور اس کے بجائے وہ زیادہ وقت مطالعے میں گزارنے لگی اس نے خصوصیت سے انگریزی ادب میں دلچسپی لینا شروع کردی پھر تیرہ سال کی عمر میں اس نے اپنی پہلی کہانی لکھی جو ایک رسالے میں چھپی اور اس نے سب کو حیران کردیا۔ اس پہلی کہانی کے بعد اس کی بعد دیگرے کئی کہانیاں چھپیں اور اس کا نام مشہور ہونے لگا۔ لوگ اسے پہلے بھی سوئمنگ چیمپئن ہونے کی وجہ سے جانتے تھے لیکن جب اس نے کہانیاں لکھنا شروع کیں تو پہلے سے بھی زیادہ مقبولیت ملنے لگی۔ اسے لکھنے کے حوالے سے بے شمار پیشکشیں موصول ہوئیں لیکن میریا نے زیادہ کچھ کرنے سے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ صرف اپنے شوق کے لیے



ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اہم اس کی تعلیم ہے۔

پہلے سوئمنگ اور پھر کہانیاں لکھنے کے باوجود اس نے اپنی تعلیم پر مکمل توجہ قائم رکھی تھی اور وہ اول کلاس کی طرح ہر کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کرتی آرہی تھی۔ اسے تعلیم اور دوسرے کاموں سے جو وقت ملتا اس میں وہ کہانی لکھتی تھی۔ اس کا موضوع عام طور سے بچے اور رشتوں کی نزاکتیں ہوتی تھیں۔ ناقدین اسے ایک پختہ کہانی کار قرار دینے لگے تھے۔ جس کی کہانیاں نہ صرف تحریر بلکہ موضوع کے لحاظ سے بھی مثالی ہوتی تھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے پہلا ناول لکھا جو دیکھتے ہی دیکھتے بیسٹ سیلرز کی فہرست میں آگیا۔ کہانی کا موضوع ایک بچی کی جذباتی کش مکش ہے جو وہ جوانی کی دہلیز پر محسوس کرتی ہے۔ اگرچہ میریا کہانیوں کا بھی اچھا خاصا معاوضہ لیتی تھی لیکن اس ناول نے اسے چند دن میں کروڑ پتی بنا دیا۔ پھر ایک فلم ساز نے دس ملین ڈالرز کے عوض اس ناول کو فلمانے کے حقوق حاصل کرلیے تھے۔ اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونے لگا تھا۔ پبلشر اس کے دوسرے ناول کا منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھے لیکن میریا نے اعلان کیا کہ اس کے ہائی اسکول کا آخری امتحان قریب ہے اور تب تک وہ کوئی اور چیز نہیں لکھے گی۔

میریا نے اپنی ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز کرلی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس بار اس نے کلاس یا اسکول میں نہیں بلکہ پوری ریاست میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کامیابی پر اسے امریکا کے دس ذہین ترین بچوں میں شامل کرلیا گیا تھا۔ اس کے اعزاز میں تقریبات منعقد کی گئیں اور اسے انعامات سے نوازا گیا۔ حالانکہ ان سب باتوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ چھوٹی سی عمر میں دولت، عزت اور شہرت سب کا مزہ چکھ چکی تھی۔ اسے لوگوں کو چونکانے میں مزہ آنے لگا تھا۔

وہ پبلشر اور رسالوں کے مالکان جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ ہائی اسکول کے بعد وہ مکمل طور پر لکھنے کی طرف آجائے گی ان کے لیے میریا کا اعلان ناقابل یقین تھا، اس نے کہا کہ اب اسے لکھنے سے دلچسپی نہیں رہی اور اس کے بجائے وہ اداکاری کرنا چاہتی ہے۔ سولہ سال کی عمر میں سنہری بالوں اور گلابی رنگت والی میریا ایک حسین لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔ اس کا اعلان سنتے ہی میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد اس پر ٹوٹ پڑے تھے اور اسے ٹی وی اور فلم والوں کی جانب سے ڈھیروں پیشکشیں ملنے لگی تھیں لیکن میریا نے خوب سوچ سمجھ کر ایک ٹی وی سیریز جوائن کرلی جس میں اسے مرکزی کردار ملا تھا۔ یہ سیریز اپنی پہلی قسط سے مقبول ہوگئی اور ایک مہینے کے اندر اس کا نمبر چارٹ پر اول آگیا تھا۔ دو مہینے بعد اسے باقاعدگی سے دیکھنے والوں کی تعداد دو کروڑ سے تجاوز کرگئی تھی۔ ٹی وی کی تاریخ میں اس سے پہلے کسی پروگرام کو اتنے ناظرین نہیں ملے تھے۔ سیریز کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کی ایک قسط کو ریکارڈ اشتہارات ملنے لگے۔

ایک سال بعد جب سیریز کی قسط عروج پر تھی، اچانک ہی میریا نے اس سے الگ ہونے کا اعلان کردیا اور اس نے ہالی وڈ کی ایک فلم سائن کرلی۔ سیریز سے میریا کے الگ ہوتے ہی سیریز کی مقبولیت دھڑام سے نیچے آگئی تھی۔ دوسری طرف فلم کو میڈیا نے ابھی سے کوریج دینا شروع کردی تھی جبکہ اس کی شوٹنگ بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ چھ مہینے میں یہ فلم مکمل ہوکر ریلیز ہوئی تو اس نے پہلے ہی ہفتے میں باکس آفس میں نئے ریکارڈ قائم کردیے تھے۔ اس سے پہلے کسی فلم نے اتنا بزنس نہیں کیا تھا۔ میریا کی اداکاری کو نقادوں نے ٹی وی سیریز میں ہی مان چکے تھے اور اب اس نے ثابت کردیا کہ نوجوان نسل میں اس سے بہتر اداکارہ کوئی نہیں ہے۔ ابھی اس فلم کی شوٹنگ ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میریا کو ایک اور بڑے بجٹ کی فلم میں سائن کرلیا گیا۔ اگلے چھ مہینے میں یہ فلم بھی تھیٹر میں آچکی تھی اور اس نے میریا کی پہلی فلم کا ریکارڈ توڑ دیا۔

میریا جسے ٹی وی سیریز کے دور میں امریکا جانتا تھا تو ہالی وڈ کی ان فلموں میں کام کرنے کے بعد اسے ساری دنیا جاننے لگی تھی۔ میریا کو ان فلموں میں کام کرنے کا وہ معاوضہ دیا گیا تھا جو اس سے پہلے کسی نوجوان اداکارہ کو نہیں ملا تھا۔ اسے صرف معاوضہ ہی نہیں بلکہ فلموں کے بزنس سے بھی حصہ ملا تھا اور اس کے بعد اس پر چاروں طرف سے فلم ساز ٹوٹ پڑے تھے، ان سب کی خواہش تھی کہ میریا ان کی فلم میں کام کرے۔ اس کے لیے وہ اسے منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھے۔ میریا کی اداکاری اور سحر انگیز شخصیت نے فلم بینوں پر جادو کردیا تھا اور اب وہ اس کو بہر صورت فلموں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک سروے کے مطابق وہ مقبولیت میں تمام اداکاراؤں سے آگے جاچکی تھی۔ امریکا میں عزت، شہرت اور دولت کی معراج ہالی وڈ ہے اور جو یہاں کامیابی حاصل کرلیتا ہے وہ کامیاب تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ یہاں کے اداکاروں اور فن کاروں کو ساری دنیا جانتی ہے۔ اس لیے نقادوں اور فلمی ماہرین کا خیال تھا کہ میریا فلموں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کرے گی جو وہ اس سے پہلے ان شعبوں کے ساتھ کرچکی تھی جن میں اس نے نام کمایا تھا۔

مگر میریا کی طبیعت کی افتاد یہاں بھی رنگ لائی اور ابھی اس کی دوسری فلم کی نمائش کو پہلا ہی ہفتہ گزرا تھا اور اسے آسکر

ایوارڈ کے لیے نامزد کرنے کی باتیں کی جارہی تھیں کہ اس نے ہاورڈ کے بزنس اسکول میں داخلہ لینے کا اعلان کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بزنس پڑھنا چاہتی ہے کیونکہ یہ اس کا خاندانی کام تھا۔ اس بار دوسروں کے ساتھ اس کے گھر والوں نے بھی اسے سمجھایا کہ وہ اداکاری ترک نہ کرے۔ اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے اداکارائیں کیا کیا جتن نہیں کرتیں اور انہیں کتنا عرصہ لگ جاتا ہے اور اسے یہ مقام بیٹھے بٹھائے مل گیا تھا۔ لیکن میریا نے ان کی بات ماننے کے بجائے ان کو قائل کرلیا تھا، اس نے اپنے خاندان والوں سے کہا۔

"مجھے یہ مقام خوش قسمتی کی وجہ سے نہیں ملا ہے بلکہ اس لیے ملا ہے کہ میں غیر معمولی ہوں۔ میں جس شعبے میں جاتی ہوں نمبر ون بن جاتی ہوں کیونکہ میں اس کی مستحق ہوں۔ اگر مجھ میں صلاحیت نہ ہوتی تو کسی بھی شعبے میں کامیابی ناممکن تھی اور کوئی میرے پیچھے اس طرح نہیں آتا جس طرح یہ لوگ آتے ہیں۔"

"لیکن بزنس ایک مشکل شعبہ ہے۔" جونز نے کہا۔

"پاپا... امریکا میں ایک کروڑ بزنس مین ہیں جبکہ کتنے ادیب، سنگر اور اداکار ہیں اس کا آپ کو بھی پتا ہے پھر بھی آپ بزنس کو مشکل قرار دے رہے ہیں۔"

"میرا مطلب ہے اس کی تعلیم حاصل کرنے میں تمہیں بہت عرصہ لگ جائے گا تب کہیں جا کر تم ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرو گی۔"

"تو کیا ہوا؟ میں ابھی صرف اٹھارہ برس کی ہوں اور یقیناً میرے پاس بہت وقت ہے۔"

سارہ اور جونز سمجھ گئے تھے کہ وہ اپنی یہ بات بھی پوری کرکے رہے گی پھر انہیں اپنی بیٹی سے بہت پیار تھا اور وہ اس کی صلاحیتوں پر اعتماد بھی کرتے تھے، اس لیے انہوں نے اس کی بات مان لی اور میریا اعلیٰ تعلیم کے لیے ہاورڈ چلی گئی۔ یوں وہ عارضی طور پر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی لیکن اس کا چرچا ہوتا رہا تھا۔ ماہرین نے اسے امریکا کی سب سے غیر معمولی لڑکی قرار دیا تھا۔ بلکہ ان کا کہنا تھا کہ اتنا باصلاحیت تو کوئی لڑکا بھی نہیں تھا جس نے تین الگ الگ شعبوں میں اتنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہو۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ہاورڈ کی خشک تعلیم کے دوران میریا کو اپنی کامیابیوں کی یاد ستائے گی اور ممکن ہے وہ تحریر یا اداکاری کی طرف لوٹ آئے لیکن وقت گزرتا گیا اور میریا کی طرف سے ایسی کوئی اطلاع نہیں آئی۔

اس کے برعکس ہاورڈ سے اس کی کامیابی کی خبریں آنے لگی تھیں۔ اس نے تین سال بعد نہایت اعزاز سے گریجویشن کر لیا تھا اور اس کے بعد ماسٹرز میں داخلہ لیا۔ ماسٹرز میں تعلیم کے دوران اس نے ایک نیا خیال پیش کیا۔ اس کے نزدیک وقت آگیا تھا کہ امریکا صنعت اور زراعت کے شعبے میں کا زیاں بند کردے کیونکہ یہ چیز دنیا کو تباہی کی طرف رہی تھی۔ اس نے خیال پیش کیا کہ اب زرعی اور صنعتی شعبے طرح مل کر کام کرنا چاہیے کہ ان کی توانائی ایک دوسرے کو دے کیونکہ امریکا توانائی کی ری سائیکلنگ میں دنیا دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے تھا اور یہی چیز اس کی معاشی کی وجہ بن سکتی تھی۔ میریا کے خیال میں توانائی کے اس میں عوام بھی برابر کے شریک تھے کیونکہ انہیں فی الحال توانائی میسر تھی اس لیے وہ بھی دل کھول کر اس کا زیاں کر تھے۔ میریا نے اپنے تھیسس میں لکھا کہ توانائی کا یہ زیاں والی نسل ہی روک سکتی ہے بہ شرطیکہ کہ اسے ابھی توانائی سائیکل کرنے کی تربیت دی جائے اور اس کے زیاں نقصانات سمجھائے جائیں۔

میریا کا یہ تھیسس ایک میگزین نے شائع کردیا، جس ایک ہنگامہ کھڑا کردیا تھا۔ توانائی کے ماہرین اسے سراہ تھے جبکہ صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں کی طرف سے شدید مخالفت کی جارہی تھی۔ ان کی مخالفت کی وجہ سمجھ میں تھی وہ اس شعبے میں سرمایہ لگانے کو فضول خیال کرتے تھے کے خیال میں جب ان کی سیاسی برتری کی وجہ سے انہیں بھر میں موجود توانائی کے ذخائر سے استفادہ کرنے کا مو رہا تھا تو انہیں توانائی کی ری سائیکلنگ میں سرمایہ ضائع کی کیا ضرورت ہے۔ دوسری طرف اس تھیسس کی حمایت کرنے والے ماہرین کا کہنا تھا کہ یہ صورت حال زیادہ برقرار نہیں رہے گی اور جلد دنیا کے توانائی کے ذخائر ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد امریکا کیا کرے گا اور امریکی عوام جو توانائی کے شاہانہ استعمال کی عادی ہو چکی ہے کیا وہ خود کو بدلے ہوئے حالات میں اتنی جلدی ڈھال سکے گی۔ اس لیے ضروری ہے اس مقصد کے لیے ابھی سے تیاری کی جائے اور ایسا وقت سے پہلے عوام کو توانائی کی بچت کرنے کی تربیت دی جائے۔

میریا نے اپنے تھیسس میں اس بات کی نشان دہی کی کہ امریکا کا تاجر طبقہ عوام کو فضول خرچ رکھنا چاہتا ہے مقصد کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر رہا ہے۔ اسے خوف اگر عوام نے کفایت شعاری سیکھ لی تو اس سے ان کے مفادات پر ضرب پڑے گی اور ان کا نفع کم ہو جائے گا۔ لیے وہ ہر ایسے رجحان کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جس سے کسی بھی معاملے میں بچت کی ترغیب ملے۔ اس کام کے میڈیا کو استعمال کرتے ہیں اور لوگوں کو فضول خرچی کی



دیتے ہیں۔ اس لیے صنعت کار اور تاجر اس کے تھیسس کی مخالفت کریں گے۔ میریا کا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا تھا۔ اس طبقے نے میڈیا کی طاقت سے میریا کے خیال کے خلاف ایک طوفان کھڑا کردیا تھا۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہے تھے اور ان کے زرخرید تجزیہ نگار میریا پر طنز کر رہے تھے کہ معیشت کوئی کہانی یا فلم نہیں ہے اس پر تروڑوں امریکیوں کی زندگی کا انحصار ہے۔ اس لیے وہ معیشت سے کھیلنے سے گریز کرے۔

میریا اپنے تھیسس کی حمایت میں ڈٹی رہی۔ رفتہ رفتہ دوسرے بھی اس کی حمایت میں آگے آنے لگے اور جب اس نے تعلیم مکمل کی تو اسے بے شمار بزنس فرمز کی جانب سے جاب کی پیش کشیں موصول ہونے لگی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنا خاندانی بزنس سنبھالے گی لیکن اس کے برعکس میریا نے اپنی ایک کمپنی قائم کی جو اس کے خیال کے مطابق امریکا میں توانائی کی ری سائیکلنگ کو فروغ دے گی۔ اس نے کمپنی کے شیئرز فروخت کیے اور اس سے حاصل شدہ رقم سے اس نے ایک صنعتی اور زرعی مشترک کمپلیکس قائم کیا جہاں زرعی اور صنعتی پیداوار بہت کم توانائی خرچ کرکے حاصل کی جارہی تھی۔ اس کمپلیکس میں کوئی بھی چیز ضائع نہیں کی جاتی تھی بلکہ ہر چیز کو استعمال کیا جاتا تھا اور اس وجہ سے اشیا پر آنے والی لاگت چالیس فی صد تک کم ہوگئی تھی۔ آنے والے دو سالوں میں میریا کی کمپنی نیویارک اور شکاگو کے اسٹاک ایکسچینجوں میں نمبر ون آ گئی تھی اور اس نے مائیکروسوفٹ اور ایپل جیسی رجحان ساز کمپنیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

آنے والے تین سالوں میں میریا کی فرم نے ایسے کئی کمپلیکس پورے ملک میں قائم کردیے جو توانائی کی بچت کرتے تھے اور ان میں کوئی بھی چیز ضائع نہیں کی جاتی تھی۔ توانائی کا ایک ایک قطرہ استعمال کیا جاتا تھا۔ کمپنی نے ایسے بجلی گھر بنائے جو کمبائنڈ ری سائیکل تھے اور ان میں بجلی کم خرچ سے پیدا کی جاتی تھی اور اس لیے آلودگی بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ کمپنی نے ایک تجربہ گاہ قائم کی جہاں ایسی صنعتی اشیا کی تیاری پر ریسرچ کی جانے لگی جو محفوظ توانائی کی مدد سے کام کرتی تھیں اور جن کے استعمال سے آلودگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس تجربہ گاہ میں دنیا کی پہلی سولر ائرجی استعمال کرنے والی کمرشل کار بنائی گئی۔ اسے میریا کی کمپنی نے صنعتی پیمانے پر تیار کیا اور صرف امریکا میں ایک سال میں اس کے چھ ملین یونٹ فروخت ہوگئے۔ اس تجربہ گاہ میں ایسی اشیا بھی تیار کی جانے لگیں جو آنے والے دنوں میں توانائی کے زیاں کو صفر کی حد تک لے جاتیں۔

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

کمپنی قائم کرنے کے پانچ سال بعد میریا دنیا کی امیر ترین فرد بن گئی تھی لیکن اس نے اپنی دولت نام نہاد فلاحی منصوبوں میں خرچ کرنے کے بجائے ان سے تیسری دنیا کے غریب افراد کو ان کے پیروں پر کھڑا کرنے اور انہیں بنیادی سہولتوں کی فراہمی میں استعمال کیا۔ اس نے نعرہ لگایا۔ چھت، خوراک، لباس اور تعلیم ہر فرد کے لیے۔ میریا فاؤنڈیشن نے بلا لحاظ رنگ، نسل اور مذہب کے دنیا کے سو غریب ترین ممالک میں اپنے مراکز قائم کیے اور وہاں پر لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے اور انہیں بہتر زندگی کی طرف لانے کے لیے کام کرنے لگی۔ اس دوران میں وہ سادگی اور کفایت شعاری کے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتی رہی تھی۔ جس سے عام طور سے مغربی فلاحی ادارے نابلد ہوتے ہیں اور ان کی اکثر امداد تشہیر اور فضول کاموں میں خرچ ہو جاتی ہے جس کا غریب ملکوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ میریا کی فاؤنڈیشن ہر سال ایسے کاموں پر دس ارب ڈالرز سے زیادہ خرچ کر رہی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ حکومت کی سیاست میں الجھے بغیر اپنا کام کرتی رہے۔

پچھلے سال میریا نے ایک اور اعلان کیا۔ اس نے کمپنی میں اپنے سارے شیئرز عوام کو بیچنے کا اعلان کر دیا اور یہ شیئرز صرف ایک ڈالر فی شیئرز کے حساب سے قرعہ اندازی کر کے امریکی عوام کو دیے جاتے جبکہ اسٹاک مارکیٹ میں ان کی ویلیو ساڑھے چار سو ڈالرز فی شیئر سے زیادہ تھی۔ اس طرح اس نے اربوں ڈالرز کے شیئرز چند کروڑ ڈالرز کے عوض قرعہ اندازی کے ذریعے امریکا کے ان غریب لوگوں کو دے دیے جنہوں نے کبھی کسی کمپنی کے شیئرز نہیں لیے تھے اور اس طرح اس نے ان لوگوں کو بھی سرمایہ دار بنا دیا جو محنت مشقت کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ اس نے صرف ایک شرط رکھی تھی کہ کوئی بھی یہ شیئرز پانچ سال سے پہلے فروخت نہیں کر سکے گا۔ میریا نے کمپنی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور میریا فاؤنڈیشن کے اختیارات ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے حوالے کر دیے۔ خود میریا نے اپنے مستقبل کے حوالے سے اعلان نہیں کیا تھا کہ وہ اب کیا کرے گی۔

☆☆☆

میکس پائن بولتے بولتے رک گیا تھا۔ اس نے میریا فالکن کی کہانی اسی جگہ چھوڑ دی اور حاضرین سے کہا۔ ”اب آپ مجھ سے سوال کر سکتے ہیں۔“

میں اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور کہا۔ ”سر میرا نام ایلن شاہ ہے اور میرا سوال یہ ہے کہ میریا فالکن کا کردار کس نے تخلیق کیا ہے؟“

میرے سوال پر لوگ مسکرانے لگے تھے اور بعض ... سا ... بھی تھے لیکن میکس پائن مکمل طور پر سنجیدہ رہا تھا ... نے مڑ کر اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس عورت نے... میریا فالکن کی خالق یہ عورت ہے۔“

”یہ عورت جو شاید اپنے حواس گنوا چکی ہے؟“ میں ... شک سے کہا۔

”بلاشبہ... لیکن اس نے حواس نہیں کھوئے ہیں بلکہ ... کا ذہن ایک ایسی دنیا میں جا چکا ہے جو اس کی اپنی بنائی ہے۔ اس دنیا میں یہ جو چاہتی ہے کرتی ہے۔ اس نے خود کو ... فالکن کے روپ میں ڈھال لیا ہے اور اس کے روپ کو ... فرار کا نام دیا ہے۔“

مجھے اور شاید دوسرے لوگوں کو میکس پائن کی بات ... مایوسی ہوئی تھی کیونکہ ہم تو کوئی غیر معمولی توقع لے کر آئے ... اور وہ ہمیں ایک عام سے نفسیاتی مریض سے بہلا رہا تھا ... نے کہا۔ ”لیکن سر، اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے ... عورت کا علاج نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میکس پائن نے کہا اور پلٹ ... ریموٹ کی مدد سے ایملڈا کا چہرہ واضح کیا جس پر خوشی ... طمانیت کا گہرا تاثر تھا۔ اس نے منظر کو روک دیا۔ ”یہ عورت ... جس کا آپ چہرہ دیکھ رہے ہیں اس کا علاج نہایت آسان ... ہے۔ کچھ دوائیں اور شاک ٹریٹمنٹ اسے ایک مہینے کے ... ہوش میں لا سکتا ہے۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد یہ کیسی ... یہ میں آپ کو ابھی دکھاتا ہوں۔“ اس نے پلٹ کر ریموٹ ... بٹن دبائے اور اسکرین پر ایک سلائیڈ شو چلنے لگا۔ یہ ... تصویریں ایملڈا فوکس کی تھیں اور اس کے ان دنوں کی ... جب وہ جیل میں یا پولیس کی تحویل میں تھی۔ ایک ٹوٹے ... اور مسخ سے چہرے والی ایملڈا کے چہرے پر کہیں بھی ... خوشی کی معمولی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ اس کے برعکس اس ... چہرے پر اذیت، دکھ اور نفرت تھی۔ یہ ایک درجن سے ... تصویریں تھیں اور انہوں نے ایملڈا فوکس کی شخصیت کو ... طرح واضح کر دیا تھا۔ سلائیڈ شو ختم ہوا تو میکس پائن ... پروجیکٹر بند کر دیا۔

”ایک مہینے کے علاج کے بعد ایملڈا یہ روپ دھار ... گی جو آپ نے ابھی تصویروں میں دیکھا ہے۔ تو میں ... دوستوں میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ کبھی کبھی علاج ... علاج کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ”فرار“ سامنے ... سے بہتر ہو جاتا ہے۔“





# تسلسل

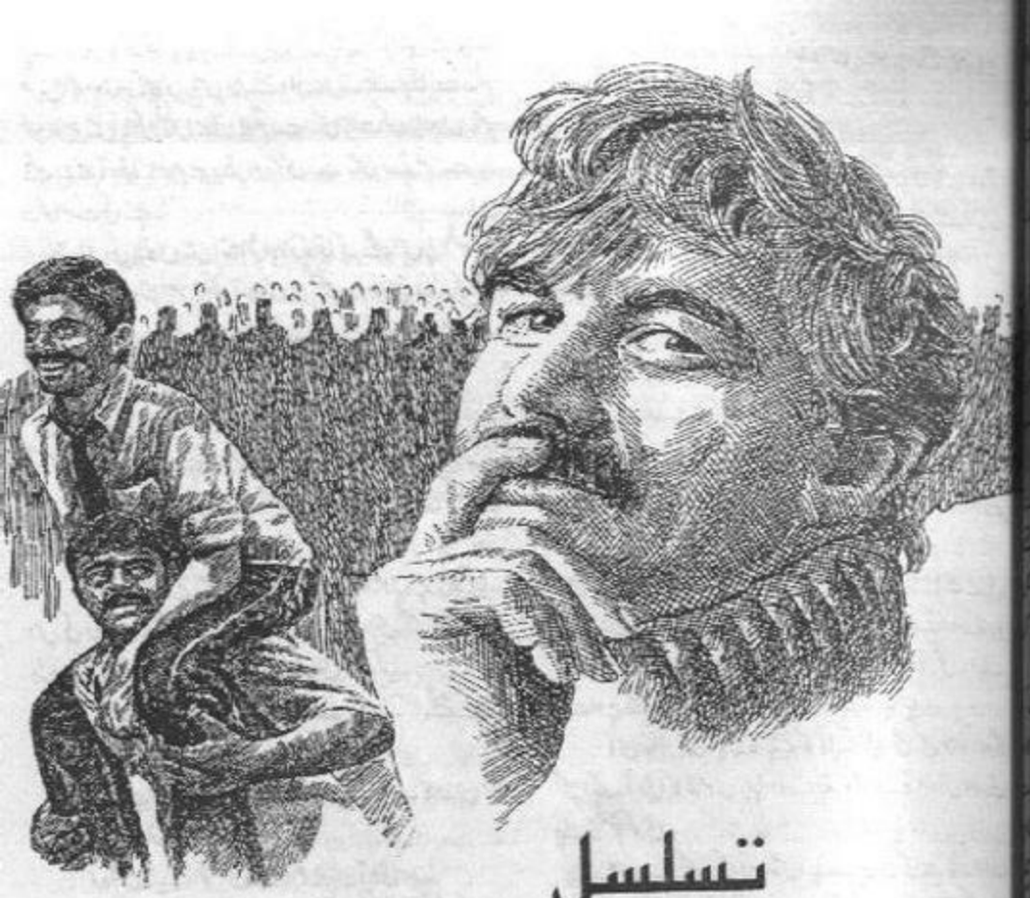

منظر امام

کبھی اعمال عذاب کو دعوت دیتے ہیں اور کبھی عذاب، آزمائش بن کر مسلط ہو جاتا ہے... اب خدا جانے یہ اعمال کا نتیجہ ہے یا آزمائش... جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بہرحال لازم ہے کہ اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی جائے... شاید کہ اس قوم کی حالتِ زار پر اس مالکِ مختار کو رحم آجائے۔

**اے قوم ترے غم پہ روؤں کہ ہنسوں...... سیاسی ابتری کا منظرنامہ**

مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی۔ کیونکہ باس نے کہا تھا کہ ٹھیک آٹھ بجے پہنچ جانا۔

یہ باس بھی بس اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ خیر...... تو میں جلدی جلدی بس اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”بھائی جان ذرا بات سنیں۔“

میں رک گیا کیونکہ وہ آواز بہت دردناک قسم کی تھی۔ وہ ایک صحت مند شخص تھا۔ سرخ و سفید چہرہ، لال آنکھیں، گھنی مونچھیں، بہترین لباس...... میں اسے دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ ”جی فرمائیں!“ میں نے دریافت کیا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”بھائی مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھا لو۔“ اس نے کہا۔

”کیا......!“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کاندھے پر بٹھا لوں۔“

”ہاں بھئی کاندھے پر۔“ وہ دوبارہ بولا۔ پھر اس نے

لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”پلیز میں چل نہیں سکتا، تم مجھے ایک طرح کا معذور سمجھ لو۔ بس سامنے والی سڑک تک جانا ہے۔ تم خود سوچو میں پاگل نہیں ہوں جو تم سے ایسی بات کر رہا ہوں۔ تم مجھے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو، اسی لیے میں نے تم سے یہ درخواست کی ہے۔“

اس کی باتوں میں اتنا اثر اور درد تھا کہ مجھے اس پر افسوس ہونے لگا تھا۔ اتنا معزز نظر آنے والا شخص اور اس حال کو پہنچ گیا۔ ”دیکھیں، کیا آپ کو سامنے تک پہنچانے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہوسکتا؟“

”اب اس وقت کون سا طریقہ ہوگا؟“ اس نے کہا۔ ”دس قدم کی تو بات ہے اور تم نیکی کرنے میں جھجک رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ میں کسی بچے کی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ”بیٹھ جائیں کاندھے پر۔“

وہ ذرا سی دیر میں میرے دونوں کاندھوں پر بیٹھ گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں سامنے کی طرف لٹک رہی تھیں۔ اس کا وزن اتنا تھا کہ دو منٹ تک مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا۔

”کیا ہوگیا ہے بھائی!“ اس نے پوچھا۔ ”اٹھتے کیوں نہیں؟“

”کیسے اٹھوں۔“ میں جھنجلا کر بولا۔ ”آپ کا وزن اتنا ہے کہ مجھ سے اٹھا نہیں جارہا۔“

وہ ہنس دیا۔ ”کوشش کرو، تم تو جوان آدمی ہو۔“

میں نے دونوں ہاتھ زمین پر لگا کر اٹھنے کی کوشش کی اور اس بار میں کامیاب ہوگیا لیکن اس کے وزن سے قدم لڑکھڑانے لگے تھے، تاہم ڈگمگاتے ہوئے اسے لے کر آگے بڑھنے لگا۔

بڑی مشکلوں کے بعد وہ سڑک آگئی، جہاں اسے اترنا تھا۔ ”یہ لیں جناب۔ آپ کی منزل آگئی۔“ میں نے کہا۔ ”اب آپ اتر جائیں۔“

”ارے نہیں میاں! تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ ایسے کس طرح اتر جاؤں۔“

”تو پھر کس طرح اتریں گے آپ؟“

”کوئٹہ ہوٹل کی چائے پلا کر اتر جاؤں گا۔“ اس نے کہا۔

”آپ پاگل تو نہیں ہوگئے۔“ میں غصے سے بولا۔ ”میرا کیا تماشا بنوانا ہے جو اس طرح کاندھوں پر اٹھائے کوئٹہ ہوٹل لے جاؤں۔ میں ایک معزز آدمی ہوں۔ سرکس کا مسخرہ نہیں ہوں۔“

”یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔“ اس نے کہا۔ ”میں احسان کا بدلہ ضرور دیتا ہوں۔“

”بس اب بہت ہوگئی۔“ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ ”اب اتر جاؤ ورنہ یہیں پھینک دوں گا۔“

”چلو کوشش کر کے دیکھ لو۔“

میں نے جھنجلا کر اسے اتارنے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح چپٹ کر رہ گیا تھا۔ میری ہر کوشش پر وہ ہنسنے لگ

”چاہے کچھ بھی کر لو میں اب تمہارے کندھوں سے نہیں اتر گا۔ ہوٹل تک لے چلو مجھے۔“

اس دوران میں کچھ لوگ آکر جمع ہوگئے۔ وہ سب تماشا بہت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور میں بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، میں اسے لے کر ہوٹل آ

”اب تو اتر کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ارے نہیں میاں، اسی طرح چائے پیوں گا۔ آرڈر دو۔“

ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی بڑی دلچسپی سے ہ طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی پروا نہ کرتے ہوئے چائے کا آرڈر دے دیا۔ ذرا سی دیر میں چائے آگئی۔ اسے اوپر پہنچا دی گئی، دوسرا کپ مجھے دے دیا گیا۔

اس عالم میں چائے پینے کا تجربہ شاید ہی کسی کو ہو کہ ایک آدمی کاندھوں پر سوار ہے۔ میں نے جلدی ج چائے ختم کرلی۔

اس نے بھی اتنی دیر میں چائے پی لی تھی۔ ”چلو، اب اترو۔“ میں نے ہوٹل سے باہر آکر کہا۔ ”چائے بھی پی چکے، مجھے دفتر کے لیے دیر ہورہی ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا، میں تمہارے ساتھ ہی دفتر چلوں گا۔“

”کیا!“ میں بھنا کر رہ گیا تھا۔ ”تم پاگل تو نہیں ہو گ اب میں اس طرح تمہیں کندھوں پر اٹھا کر دفتر لے چلوں؟“

”یہ تمہاری مجبوری ہے کیونکہ میں اترنے والا ہوں۔“

”خدا کے لیے اتر جا۔“ میری آنکھوں میں اپنی پر آنسو آگئے۔ ”کیوں نہیں اتر رہا؟“

”اتنے دنوں کے بعد اتنے اچھے کاندھے ملے اترنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“

”لعنت ہو تجھ پر۔“

”کچھ بھی کہتے رہو۔ میں نہیں اترنے والا۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

میں نے اچانک کسی پاگل کی طرح ایک طرف چھ لگادی، میرا خیال تھا کہ جھٹکا کھا کر وہ گر پڑے گا لیکن اس کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح چپکا رہا۔



پھر میں نے اچانک زمین پر لوٹ لگادی۔ میری ایسی کیفیت ہو رہی تھی جیسے میں پاگل ہوگیا ہوں۔ پورے کپڑے گرد میں اٹ گئے۔ چہرہ بھوت جیسا ہوگیا لیکن مجال ہے جو وہ کندھوں سے سلپ بھی ہوا ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی پیدائش اسی انداز میں ہوئی ہے۔ وہ اسی طرح میرے کندھوں پر سوار پیدا ہوا ہے۔

وہ ہنس رہا تھا۔ ”دیکھ لیا اپنی کوششوں کا نتیجہ۔“ اس نے کہا۔ ”تم چاہے کچھ بھی کرتے رہو، تم مجھے اتار نہیں سکو گے۔“

میں نے بے بسی اور جھلاہٹ کے احساس سے رونا شروع کردیا۔ میں رو رہا تھا اور وہ ہنس رہا تھا۔ ”ارے کیوں عورتوں کی طرح روئے جارہے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”حوصلہ پکڑو حوصلہ۔“

”خدا کے لیے مجھے معاف کردے بھائی۔ میں نے تیرا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں غریب آدمی ہوں، تو نے مجھے آج دفتر جانے کے قابل بھی نہیں رکھا۔ سارے کپڑے خراب ہوگئے ہیں۔ اب گھر جانا ہوگا۔“

”تو چلو تمہارے گھر چلتے ہیں۔“

”کیا... کمینے اب تو میرے گھر بھی جائے گا؟“

”ہاں، کیونکہ اب تو میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔“ اس نے کہا۔

”لعنت ہو تجھ پر مردود۔ اتر جا ورنہ جان سے مار دوں گا تجھے۔“

”کس طرح مارو گے؟“

”شوٹ کردوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”چاقو اتار دوں گا تیرے پیٹ میں۔“

”چلو یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لو۔“

”دیکھیں جناب۔“ میں نے اس کی خوشامد شروع کر دی۔ ”میں اس طرح آپ کو اپنے گھر کیسے لے جاؤں۔ پورا محلہ تماشا بنادے گا۔ گھر والے پردہ کرتے ہیں، وہ تمہارے سامنے کس طرح آئیں گے؟“

”فکر نہ کرو، تمہارے گھر میں داخل ہوتے ہوئے میں اپنی آنکھوں پر پٹی چڑھا لوں گا۔“

”کمینے تو اترے گا یا نہیں؟“

پھر میرے ذہن میں ایک خیال آگیا۔ گھر جا کر مجھے نہانا تھا۔ کم از کم غسل خانے کے باہر تو یہ کم بخت اتر ہی جاتا۔ بس صرف ایک بار اترنے کی دیر تھی۔ اس کے بعد میں جوتے مار مار کر جہنم رسید کردیتا۔ ”اب کیا سوچنے لگے؟“ اوپر سے اس کی آواز آئی۔

”چلو، پھر گھر ہی چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

میری توقع کے مطابق محلے میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ میرے جاننے والے مجھ سے پوچھنے لگے۔ ”ارشاد صاحب! کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ خیریت تو ہے۔ یہ آپ نے کس کو کاندھوں پر بٹھایا ہوا ہے؟“

”بس بھائی۔ یہ میری بدنصیبی ہے۔“ میں نے محلے والوں کو پوری کہانی سنادی۔

محلے والوں نے اس آدمی کو میرے کاندھوں سے کھینچنا شروع کردیا۔ وہ پورا زور لگا رہے تھے اور وہ اسی طرح چمٹا ہوا تھا، جیسے آکٹوپس کسی کو جکڑ لے۔ ذرا سی دیر میں محلے والے تھک گئے۔ ”بہت مشکل ہے ارشاد صاحب۔ یہ نہیں اتر رہا۔“

”تو پھر ایک کام کرو۔“ میں نے محلے والوں سے کہا۔ ”مجھے بچا کر اس کم بخت پر ڈنڈے برساؤ۔ اس طرح یہ اتر جائے گا۔“

محلے والوں کو ایک کھیل مل گیا۔

ذرا سی دیر میں وہ اپنے اپنے گھر سے ڈنڈے اور بیلٹ وغیرہ لے کر آگئے اور دھڑا دھڑ اس پر ڈنڈے برسنے لگے۔ لیکن مجال ہے جو اس پر کوئی اثر ہوا ہو۔ وہ اسی طرح ہنستا رہا۔ ڈنڈے اس پر پڑتے تھے اور اچٹ جاتے تھے جیسے ربر پر ڈنڈے برسائے جارہے ہوں۔

”بہت مشکل ہے ارشاد صاحب۔“ ایک آدمی نے کہا۔ ”یہ انسان نہیں، کوئی بلا ہے۔“

”کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ گھر چلو۔“ اس نے کہا۔ ”جب میں بتا چکا ہوں کہ میں نہیں اترنے والا تو پھر محلے والوں کو کیوں زحمت دے رہے ہو؟“

میں تقریباً روتے روتے اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے پیچھے محلے کے بچے تھے جو تالیاں بجاتے ہوئے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ ”ارشاد انکل کے کاندھے پر۔ دوسرا ارشاد ہے۔ زندگی برباد ہے۔“

گھر پہنچا تو دروازے ہی پر بیوی مل گئی۔ وہ ٹھیلے والے سے سبزی لے رہی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”معاف کرو۔ تم لوگ کیا سوانگ بھر کر بھیک مانگنے آجاتے ہو۔“

”نیک بخت۔ یہ میں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کون ہیں؟“

”تمہارا شوہر، ارشاد۔“ میں نے بتایا۔ ”ارشاد ظفر۔“

”یہ... یہ... آپ ہیں؟“ حیرت سے اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔ ”کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ یہ آپ کس کو کاندھے

پر بٹھا کر لے آئے ہیں؟"

"یہ میری شامت ہے۔" میں نے بتایا۔ "خدا کے لیے تم ہی اسے اپنے سہاگ کا واسطہ دے کر میرے کاندھوں سے اتار دو۔"

میری بیوی نے اسی وقت عورتوں والی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ کوسنے دیے۔ حد یہ ہے کہ بچے تک اندر سے چمٹے اور بیلن وغیرہ اٹھا کر لے آئے۔ سب نے مل کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد..... وہ اسی طرح میرے کاندھوں پر سوار ہنستا رہا۔ اس دوران میں ہم اندر آ گئے تھے۔ بچوں نے رونا دھونا شروع کر دیا تھا۔ بچے شور کیے جا رہے تھے لیکن اس پر ایسی باتوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بالآخر میں نے اس سے کہا۔ "بھائی میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تجھے دوبارہ کاندھوں پر بٹھالوں گا۔ تو بس کچھ دیر کے لیے اتر جا۔ تیری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں نہانے جا رہا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"تو کیا ہوا، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"ابے کیا تو بالکل پاگل ہو گیا ہے۔ میں نہانے جا رہا ہوں اور تو میرے ساتھ غسل خانے میں جائے گا؟"

"تو کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے بتایا نا کہ اب میں تمہارے کاندھوں سے اترنے والا نہیں ہوں۔"

"لعنت ہو تجھ پر۔ لعنت ہو۔"

"بولتے رہو۔ میرا کام صرف سننا ہے۔ وہ میں سنتا رہتا ہوں۔"

پھر یہی ہوا کہ مجھے اسی پوزیشن میں غسل خانے جانا پڑا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا تماشا میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ میری حالت قابلِ رحم ہو چکی تھی۔

پہلی بار کسی کو کاندھوں پر بٹھا کر نہانا پڑا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ وہ کم بخت بھی کپڑوں سمیت نہاتا رہا تھا۔ نہ جانے کیسی مٹی کا بنا ہوا تھا۔

بہر حال میں کسی نہ کسی طرح شرمندگی کے احساس کے ساتھ نہاتا رہا پھر کپڑے بدل کر غسل خانے سے باہر آ گیا۔ بیوی اور بچے میرے انتظار میں تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر اسے اتارنے کی کوشش کی لیکن وہ کہاں اترنے والا تھا۔

"اب کیا یہ کھانا بھی کھائے گا؟" میرے بیوی نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ بھوکا تو نہیں رہوں گا۔" میرے بجائے یہ جواب اسی نے دیا تھا۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے کھانا بھی کھایا تو ایک اسے بھی دے دی گئی۔ وہ بہت مزے لے لے کر کھاتا ساتھ ہی ذائقے کی تعریف بھی کرتا جاتا۔

غرضیکہ سارا دن اسی طرح گزر گیا اور وہ کاندھے پر سوار رہا اور جب رات ہوئی تو میں نے کہا۔ "ذلیل انسان۔ اب تو تجھے اترنا ہی پڑے گا۔"

"کیوں، اب کون سی خاص بات ہوئی ہے؟"

"میں اپنی خواب گاہ میں سونے کے لیے جا رہا ہوں۔"

"پھر وہی بات کی تم نے۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تم سے الگ تو نہیں ہو سکتا۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" میں غصے سے

"میرے کمرے میں میری بیوی سوتی ہے اور تو یہ چاہتا میں تجھے اپنے ساتھ خواب گاہ میں لے جاؤں۔"

"یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔" وہ ہنس پڑا۔

"بے شرم انسان!" میری بیوی چیخ اٹھی۔ "تیرا بہنیں نہیں ہیں کیا؟"

"سب ہی ہیں لیکن میرا اسٹائل سب سے الگ

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری رات میں نے ڈرائنگ گزار دی۔ عجیب مضحکہ صورتِ حال تھی۔ وہ میرے کا پر سوار تھا اور میں صوفے سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔

اس نے میرے کندھوں سے اترنے کا نام نہیں تماشا بن کر رہ گیا۔ میری اور اس کی تصویریں اتاری انٹرویوز ہوئے۔ طرح طرح کے سوالات پوچھے گئے۔ کہانی پورے ملک میں مشہور ہو گئی۔

ایک دن میری بیوی نہیں سے ایک حاذق کو بھی آئی۔ اس حاذق نے آتے ہی دم کرنا شروع کر دیا۔ طرح کے وظیفے پڑھے۔ فلیتے جلائے گئے لیکن اس پر کسی بات نہیں ہوا۔

بالآخر حاذق نے ہار مان لی۔ "یہ کوئی بہت خطرنا ہے۔" اس نے بتایا۔ "میرا علم اس کے سامنے بیکا ہے۔"

"تو پھر وقت کیوں ضائع کر رہا ہے۔" اس نے کہا کوئی اور کام کر۔"

وہ حاذق بے چارہ وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔

میں نے اس سے ہاتھ جوڑتے ہوئے "ایک بات بتا دے بھائی۔ آخر تجھ سے نجات ترکیب ہو سکتی ہے؟"



"کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی۔ میں مر جاؤں تو بات دوسری ہے۔"

اور اسی وقت سے میری بیوی نے اس کی موت کی بددعائیں شروع کر دیں۔ باقاعدہ کمرے میں چاندنی بچھا دی گئی۔ محلے کی خواتین بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو گئی تھیں۔ کئی دنوں تک یہی سلسلہ جاری رہا۔

آخر ایک دن میرا ایک دوست امریکا سے پاکستان آیا۔ اسے میری حالت کی خبر مل چکی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "ارشاد۔ تمہارا اس سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ میں پہچان گیا ہوں کہ یہ کون ہے؟"

"خدا کے لیے تو پھر یہی بتا دو کہ یہ کون ہے؟"

"یہ سیاست داں ہے۔" اس نے بتایا۔ "جو تمہارے شانوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوار ہو گیا ہے۔"

"تم نے بالکل ٹھیک پہچانا۔" اس آدمی کی آواز آئی۔ "میں واقعی سیاست داں ہوں۔"

"میرے دوست۔ میں اس سے کیسے نجات پاؤں؟" میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"میں نے بتایا نا کہ یہ بہت مشکل ہے۔" میرے دوست نے کہا۔ "ویسے اگر یہ خود رحم کرے تو بات دوسری ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد گھر والوں کی بددعائیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔

ایک صبح اس نے بتایا۔ "میاں۔ مجھے کل رات سے بہت تیز بخار ہے۔"

"اچھا۔" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں بھئی۔ لگتا ہے۔ اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ پورا بدن پھنک رہا ہے۔ تم میرے لیے دوا کا بندوبست کر دو۔"

"چلو۔ اگر میں نے تمہارا علاج کروا دیا تو کیا تم میری جان چھوڑ دو گے؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تم علاج کرواؤ یا نہ کرواؤ۔ میں تو اسی طرح تمہارے کاندھوں پر سوار رہوں گا۔"

"تو پھر لعنت ہو تم پر۔ پڑے رہو بخار میں۔"

اور وہ واقعی بخار میں ہنستا رہا۔ اتنا تیز بخار تھا کہ اس کی تپش خود مجھے محسوس ہونے لگی تھی۔ بالآخر ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "سنو۔ میرا خیال ہے کہ یہ میرا آخری وقت ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم چونکہ مرنے والے ہو اس لیے میں کچھ نہیں بولوں گا۔"

دوسری صبح میری بیوی نے مجھے خوش خبری سنائی۔ "سنیں شاید وہ مر گیا ہے۔"

"نہیں۔" اچانک اس کی کراہ سنائی دی۔ "مرا نہیں ہوں۔ مرنے والا ہوں۔"

"چلو۔ میرے کاندھے تو خالی ہو جائیں گے نا۔"

"کس گمان میں ہو۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "میرے بعد میری اولاد۔ میرا بڑا بیٹا تمہارے کاندھے پر آ کر بیٹھ جائے گا۔"

اور واقعی ہوا بھی یہی۔ ادھر اس کی لاش پٹ سے نیچے گری اور ادھر میرے دونوں شانوں پر کوئی اور آ کر بیٹھ گیا۔

"ارے۔ یہ تو کوئی جوان آدمی ہے۔" میری بیوی نے بتایا۔ "بالکل اسی کی صورت کا۔"

"وہ ڈیڈ تھے میرے۔" اوپر سے آواز آئی۔ "ہم لوگ تو اسی طرح نسل در نسل کاندھوں پر سوار رہتے ہیں۔"

"لعنت ہو تم پر بھی۔" میں غصے سے بولا۔ "اب تمہاری موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"اس سے بھی کیا ہوگا۔ میرے بعد میرا سب سے چھوٹا بھائی تمہارے کاندھوں پر آ جائے گا۔"

میں بے ہوش کر گر پڑا۔

میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، مرنے والا ہوں۔ لیکن وہ اب بھی میرے کاندھوں پر سوار ہے اور میں یہ سمجھ گیا ہوں کہ یہ سیاست دان اسی طرح نسل در نسل ہمارے کاندھوں پر سوار رہیں گے اور ہم انہیں خود سے جدا نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہمارا مقدر بن چکے ہیں۔

ایک دن میری بیوی نے روتے ہوئے بتایا۔ "آپ کو معلوم ہے ہمارے بیٹے نعیم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

"نہیں تو۔" میں گھبرا گیا۔ "مجھے نہیں معلوم۔ بتاؤ، کیا ہوا ہے؟"

"اس کے کاندھوں پر بھی اس کی عمر کا کوئی بچہ آ کر بیٹھ گیا ہے۔" بیوی نے بتایا۔

اسی وقت میرے شانوں پر سوار زور سے ہنس پڑا۔ "تم کیا سمجھتے تھے کہ تم مر جاؤ گے تو جان چھوٹ جائے گی۔ نہیں، تمہاری موت کے بعد تمہاری آئندہ نسل پر بھی ہم ہی لوگ سوار ہوں گے....."

اور اب ہم سب نے صبر کر لیا ہے۔ ہمیں ان کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہم اسی طرح جیے جا رہے ہیں۔ بس جیے جا رہے ہیں۔

**عکس در عکس حیرتوں کا سلسلہ، ایک صحرانورد کی طویل داستان**

کوئی اگر وقت کی صورت دیکھنا چاہے تو انسان کے بدلتے روپ دیکھے...... وقت کا کام بظاہر گزر جانا ہے مگر...... پھر سے کسی نئے روپ نئے پیراہن میں ڈھل کر پلٹ بھی آتا ہے۔ سمندر کا سکوت یہ یقین دلاتا ہے جیسے سب کچھ ٹھیک ہے لیکن...... اس کی گہرائی میں کتنے طوفان مچلتے ہیں کوئی نہیں جانتا...... اس کی زندگی بھی کسی طوفان بلاخیز سے کم نہیں تھی...... جس کا مشغلہ تلاطم و طغیانی اور جس کی شوخی بادوباراں جیسی تھی...... جس کی باغی فطرت اسے بے چین رکھتی...... فہم و فراست آسمان سے باتیں کرتی اور سماعت و بصارت ہمیشہ دور کی کوڑی لاتی تھی...... اس کی طلسماتی شخصیت کے آگے کیا تخت و تاج اور کیا سلطنت کی اوقات...... وقت بھی جیسے اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا تھا...... حسن اس کا غلام اور محبت اس کی کنیز تھی مگر...... اسے ایک طویل سفر درپیش تھا...... کیونکہ اسے صفحۂ قرطاس پر ایک طویل داستان رقم کرنے کے لیے جنگلوں سے بستی اور بستی سے صحرا کی سمت دشوار گزار حالات سے برسرِپیکار رہنا تھا

محی الدین نواب

قسط نمبر: 15

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں مجاہد اعظم، فاتح اعظم غازی صلاح الدین نہیں ہوں مگر نام میرا یہی ہے۔ میں انیس سو چھ 1906ء میں پیدا ہوا۔ 1935ء (انیس سو پینتیس) میں اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات بیان کرنے کے لیے داستان گوئی شروع کی۔ 1936ء (انیس سو چھتیس) میں صرف ایک برس بعد ہی اپنی رام کہانی سناتے سناتے گم ہوگیا۔ یہیں سے میری زندگی کو جھٹکا لگا۔ میں گم ہوگیا۔ کیا میری زندگی مجھ سے روٹھ گئی تھی۔۔۔۔۔؟ نہیں۔ زندگی روٹھ جاتی تو میں مرچکا ہوتا۔ میں تو زندہ ہوں۔

یہ 2006ء (دو ہزار چھ) ہے۔ ٹھیک ستر برس کے بعد میں اپنی داستان کے ٹوٹے ہوئے سرے کو جوڑ رہا ہوں۔ میری یہ روداد 1935ء (انیس سو پینتیس) کے پسماندہ دور سے شروع ہو رہی ہے۔ ایک برس کے بعد ہی اچانک ایسے واقعاتی جھٹکے پہنچیں گے کہ یہ نئے فتنے جگاتی، نئے ہنگامے برپا کرتی ہوئی 2006ء (دو ہزار چھ) کے جدید دور میں پہنچ جائے گی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نام کا مسلمان تھا۔ کبھی چھٹی لے کر اپنے والدین اور شریک حیات ساجدہ کے ساتھ کچھ دن گزارنے دہلی آتا تھا تو دو چار وقت کی نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ ورنہ ایک ہندو راجا کی خدمت گزاری سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ میں راج گڑھ کے راجا مہاویر چوہان کا انگ رکھشک یعنی باڈی گارڈ تھا۔ سب مجھے فولاد کا مجسمہ کہتے تھے۔ میں سینے پر لوہے کی سلاخ کا ایک سرا رکھ کر دوسرے سرے کو تھام کر سانس روک کر اسے موڑ دیتا تھا۔ میرا قد چھ فٹ گیارہ انچ ہے۔ میں انسان ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے جنگلی بلی جیسی بصارت دی ہے۔ میرے سونگھنے کی حس اتنی تیز ہے کہ کسی بھی دشمن کی بو پا کر قبر تک اس کا پیچھا کرسکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے غیر معمولی قوت سماعت بھی عطا کی ہے۔ میں ایک بار کسی کی آواز سن لوں اور وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی جا کر بولتا رہے تو میں اپنی اس غیر معمولی قوت سماعت کے ذریعے اس کی ایک ایک بات سن لیتا ہوں۔ پھر میری زندگی میں اس وقت انقلاب آیا اور میرے دشمنوں کی تعداد بڑھتی گئی جب راجا پرتھوی ولبھ کی راجکماری پھول وتی مجھ پر ہزار جان سے فریفتہ ہوگئی۔ وہ راجا مجھ جیسے ایک مسلمان سے اسے منسوب نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا اس نے بیٹی کو محل میں نظر بند کردیا۔ راجا کے سپاہیوں نے مجھ پر حملے کیے۔ میں زخمی ہوکر ایک ایسے غار میں پہنچ گیا جہاں بابا سائیں عبادت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ میں بری طرح زخموں سے چور دنیا سے دور جا رہا تھا لیکن بابا سائیں کی روحانی کرامات مجھے زندگی کی طرف واپس لے آئیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اسم اعظم پڑھتے رہنے سے کس قدر روحانی قوت حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے ایسی ہی روحانی کرامات کے ذریعے مجھے محل کے اندر پھول وتی کے پاس پہنچا دیا۔ کوئی پہریدار مجھے دیکھ نہ سکا۔ وہاں پھول وتی نے اسلام قبول کیا اور بابا سائیں نے ہمارا نکاح پڑھایا۔ میں بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ پھول وتی ماں بننے والی ہے۔ راجا اور اس کے خاندان والے حیران رہ گئے کہ ایک کنواری محل میں نظر بند رہی، کوئی مرد اس کے قریب نہیں گیا پھر وہ کیسے حاملہ ہوگئی؟ پھول وتی نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ ہندو خاندان کے لوگ یہ دھچکا برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا پرتھوی ولبھ نے فیصلہ کیا کہ پھول وتی کو لندن بھیجا جائے۔ وہاں رازداری سے بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

میں اپنی قوت سماعت کے ذریعے ان کے سازشی منصوبوں سے واقف ہوگیا تھا۔ جس ہوائی جہاز سے پھول وتی لندن جا رہی تھی میں بھی اسی جہاز میں گیا۔ وہاں دوستوں سے زیادہ دشمن سفر کر رہے تھے۔ مجھے کہیں بھی، کسی وقت بھی موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ جہاز حادثے کا شکار ہوکر قطب شمالی کی طرف برف میں دھنس گیا۔ وہاں کچھ مرگئے، کچھ زندہ بچ گئے۔ ہمارے حصے میں بھی موت آئی مگر عجب طرح سے آئی کہ میں مرنے کے بعد زندہ ہوں اور اپنی روداد سنا رہا ہوں۔ اس برفانی علاقے میں پھول وتی دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئی۔ میں بھی بری طرح زخمی ہونے کے بعد دو انگریزوں کے ساتھ برفانی زمین کی گہری تہ میں دھنس گیا۔ وہ جگہ میرے لیے قبر بن گئی تھی۔ تقریباً ستر برس کے بعد میں نے زندگی کی سانس لیتے ہوئے سورۃ اصحاب الکہف اور البقرہ کی تلاوت کی۔ پہلے اس بات سے منکر تھا کہ اللہ تعالیٰ صرف قیامت کے دن مرنے والوں کو اٹھائے گا۔ اس سے پہلے دوبارہ زندگی نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں لکھی باتیں کہی گئی ہیں وہ محض قصے کہانیاں ہیں اور میں تقریباً ستر برس تک مردہ رہنے کے بعد ایسے ہی قصے کہانیوں والی آیتوں کی تلاوت کر رہا تھا۔ یہ ثابت ہو رہا تھا کہ کلام پاک میں محض قصے کہانیاں نہیں ہیں۔ انسان کو سمجھانے کے لیے عبرتناک واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ دنیا والے حیران ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن والے اور دوسرے انتہائی تجربہ کار ڈاکٹرز میرا معائنہ کرچکے ہیں۔ ہندو دھرم والے یقین سے کہتے ہیں کہ یہ آواگون کا سلسلہ ہے۔ یہودی اور عیسائی پیشوا اپنی آسمانی کتابوں کے مطابق تسلیم کر رہے ہیں کہ میرے ساتھ دو انگریز جن میں ایک یہودی اور ایک عیسائی ہے انہوں نے بھی دوبارہ جنم لیا ہے۔ اخبارات اور مختلف ٹی وی چینلز کے ذریعے حیات بعد الموت کا تذکرہ اور بحث و مباحثہ جاری ہے۔

میں ہندوستان واپس آگیا ہوں۔ مجھے خفیہ خزانے کی فکر تھی۔ یہ خیال تھا کہ میری بیوی ساجدہ نے میرے بیٹے عمیر بن غازی کو خزانے کا راز بتایا ہوگا۔ [illegible] آتا ہوگا۔ وہیں بیٹے سے میری ملاقات ہوسکتی ہے۔ ہندوستان آکر معلوم ہوا کہ ستر برس پہلے میری بیوی ساجدہ میرے بیٹے عمیر اور بیٹی رابعہ کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھی۔ وہ سب لاپتا ہوگئے تھے۔ لیکن جب میں شکار گاہ کے تہ خانے میں پہنچا تو مجھے وہاں خزانے کے قریب ہی ایک چرمی بیگ ملا۔ جس میں اور بہت سے سامان کے ساتھ میرے بیٹے عمیر بن غازی کی لکھی ہوئی تین ڈائریاں بھی تھیں۔ ان کے علاوہ مجھے وہاں سے ایک لاوہ انگوٹھی اور ایک سوا چھ فٹ کا عصا ملا۔ ڈائری کے ابتدائی اوراق پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ عمیر کی اولادیں ناخلف ہیں۔ انہوں نے عمیر کا جینا محال کردیا ہے۔ لیکن میرا بیٹا بیماری اور انتہائی کمزوری کی حالت میں بھی حاضر دماغی سے کام لے رہا ہے۔ میں نے لاوہ انگوٹھی اور لاٹھی کو مصلحتاً اسی تہ خانے میں چھوڑ دیا ہے۔ میں وہاں سے گھر واپس آکر ڈائری کے اگلے صفحات پڑھ رہا ہوں۔ میں ان کے ذریعے اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچوں تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ڈائری کے ذریعے مزید معلوم ہوا کہ یہ میرے بیٹے کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بابا سائیں کا کرم بھی ملا اور وہ لاوہ اسٹون بھی۔۔۔۔۔ اور اب میرا بیٹا عمیر بن غازی حیرت انگیز طور پر ایک ایک دن کے حساب سے عمر گزشتہ کی جانب لوٹ رہا تھا اور شہرزادہ عمیر کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی تھی جس کا اصل نام حجاب تھا اور اب اسے اسی نام سے پکارا جا رہا تھا۔ ڈائری کے اوراق میرے بیٹے عمیر بن غازی کی زندگی سے متعلق الجھنوں کو دھیرے دھیرے مجھ پر کھولتے جا رہے تھے۔ حالات نے پلٹا کھایا اور عمیر کی زندگی کے رازوں پر مشتمل ڈائری اور ایک اہم فائل اس کے بیٹوں کے ہاتھ لگ گئی جس کے ذریعے ایک اہم راز افشا ہوجاتا ہے کہ عمیر بن غازی اور بہت بڑا اسمگلر سلمان سعدی دراصل ایک ہی چہرے کے دو روپ ہیں۔ اولاد کے لالچ کی وجہ سے ملک بدر ہونا پڑا۔ انڈیا آیا تو ایک مہان جیوتشی سے ملاقات ہوگئی جو پہلے سے ہی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ اس کی بیٹی منحوس تصور کی جاتی تھی لہٰذا اس



اور عصا کی کرامات کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کو عمیر سے بیاہنا چاہتا ہے مگر ناکام ہوجاتا ہے۔ ایک بار پھر لاوہ انگوٹھی اور عصا عمیر سے بہت دور ہوجاتے ہیں اور یہاں سی آئی اے والے اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس لڑکی یعنی نینی کی شادی ونود سے ہوجاتی ہے۔ مگر وہ بھی بالآخر مرجاتا ہے۔

ڈائری میں درج واقعات یہ بتا رہے تھے کہ سی آئی اے والوں نے ونود سے عصا اور لاوہ اسٹون انگوٹھی حاصل کرکے انہیں تباہ کردیا تھا جبکہ میں یہ دونوں چیزیں سلامت دیکھ چکا تھا۔ یہ معما ڈائری کے مزید مطالعے سے حل ہوتا لہٰذا میں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ عمیر نے لکھا تھا کہ ونود کی موت کے بعد نینی، ہوش و حواس سے بےگانہ ہوچکی تھی لیکن یہ حالت عارضی تھی۔ عمیر نے اپنے آلۂ کار کے ذریعے اس کی نگرانی رکھی جس نے اس کی خادمہ کے ذریعے عصا اور لاوہ اسٹون حاصل کرکے عمیر تک پہنچا دیے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ یہ اشیا اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ سی آئی اے والے مسلسل اس کے پیچھے تھے۔ دوسری جانب نینی کے علاج پر مامور ڈاکٹر اس سے شادی پر آمادہ ہوگیا لیکن انجام کار حادثے میں مارا گیا۔ نینی کی حالت دوبارہ بگڑ گئی۔ وہ عمیر کے محسن کی بیٹی تھی لہٰذا اس کی مدد ضروری تھی اور پھر یہ طے کیا گیا کہ عمیر وہ عصا اور لاوہ اس کے ذریعے اپنے ساتھ رکھے گا ادھر نینی کا کزن ورما جو اس سے شادی کا خواہش مند تھا اس سے ملا اور نینی سے اپنا مدعا بیان کیا۔ عمیر جو کہ ایک سادھو کے روپ میں نینی سے ملا تھا اسے ہدایت کی کہ وہ ورما سے شادی کرلے اور ہنی مون کے بہانے سمندری جہاز کے ذریعے لندن پہنچے اور عصا اور اسٹون اپنے ساتھ رکھے۔ عمیر بھی اسی جہاز سے سفر کر رہا تھا لیکن ورما جو کہ اصل میں سی آئی اے والوں کا آدمی تھا اس نے عمیر کے آلۂ کار کے ذریعے حقیقت جان لی تھی۔ آخرکار ایک خونی معرکے کے بعد عصا اور لاوہ اسٹون انگوٹھی عمیر سے چھین لی گئیں اور وہ زخمی حالت میں بے ہوش ہوگیا۔ یہاں تک پڑھنے کے بعد میں اپنی زمین پر ایک مندر کی موجودگی کے قانونی مسائل میں گھر گیا۔ ان سے فراغت کے بعد میں نے تیسری ڈائری پڑھنا شروع کی جس کے مطابق زخمی حالت میں عمیر مختلف خفیہ اداروں اور تنظیموں کی زیر نگرانی تھا جن میں کچھ اس کی جان کے درپے تھیں اور کچھ اس سے ریڈ مرکری حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ یہاں بھی ایک معرکہ وقوع پذیر ہوا اور آخرکار عمیر اپنے حریف میسونی تنظیم کے چیف راڈرِن کے ہتھے چڑھ گیا جس کی بیوی رانا عمیر کی بہن رابعہ کی ہم شکل تھی اور ان دونوں کے درمیان ایک پاکیزہ رشتہ استوار تھا۔ رانا کینسر کی مریضہ تھی اور اس کا روحانی علاج پاکستان میں ممکن تھا۔ راڈرِن عمیر کو بلیک میل کرکے رانا کی زندگی کی قیمت پر ریڈ مرکری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ عمیر بدستور اپنے دشمنوں کے نرغے میں تھا اور وہ اسے ہوش میں لانے کے لیے سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے۔ عمیر اس گھڑی رانا کے بارے میں فکرمند تھا۔ رانا جو اس کی بہن رابعہ کی ہم شکل تھی اور بین الاقوامی تنظیم کے گاڈ فادر کی بیٹی تھی اور راڈرِن کی محبت میں گرفتار تھی۔ عمیر نے ایک مشکل وقت میں ان کی جان بچائی تھی اور وہیں ان کا تعارف ہوا اور عمیر نے رانا کو اپنی بہن تسلیم کرلیا۔ راڈرِن رانا سے شادی کرکے گاڈ فادر بننا چاہتا تھا اور عمیر سے کینہ رکھتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان رسہ کشی جاری رہی۔ شادی کے موقع پر بھی راڈرِن نے عمیر کے خلاف سازش کی مگر وہ ناکام رہی۔ پھر رانا کے یہاں نامان پیدا ہوا اور رانا کے والد نے اعلان کیا کہ جوان ہونے پر آئندہ گاڈ فادر وہی ہوگا۔ راڈرِن اس فیصلے سے ناخوش ہوا اور نامان کے جوان ہونے پر ایک اور سازش کے ذریعے اسے ختم کرنے کی سعی کی مگر عمیر کی مداخلت کے باعث یہ سازش ناکام رہی۔ موجودہ حالت میں عمیر راڈرِن کی قید جھیل رہا تھا۔ دوسری جانب نینی اسپتال میں تھی اور عصا اور انگوٹھی عمیر کے پاس پہنچانا چاہتی تھی لہٰذا اس کے متعلق فکرمند تھی ایسے میں ایک اجنبی یہودی رائفل شمری نے اس سے ملاقات کی اور عمیر سے دوستی کی خاطر نینی کے ہمراہ اس تک پہنچنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

رائفل شمری کی نیت صاف نہیں تھی لہٰذا اس نے نینی کو دھوکا دے کر عصا اور انگوٹھی حاصل کرنے کی کوشش کی اور نتیجتاً جہنم واصل ہوا۔ بعدازاں نینی کی ملاقات اتفاقیہ طور پر نیچو سے ہوگئی اور وہ دونوں عمیر کی تلاش میں ترکی عازم سفر ہوئے۔ جہاں ایک قید خانے میں عمیر بےبسی کی زندگی گزار رہا تھا اور وہاں اس کی یہودی بیوی محالا نگراں کے طور پر موجود تھی اور ماضی میں عمیر نے اس کی مدد کی تھی اور انجام کار وہ عمیر کے بیٹے یعقوب کی ماں بنی جو راڈرِن کی زیر سرپرستی پرورش پا رہا تھا۔ راڈرِن نے رانا کو سامنے لاکر عمیر کو بلیک میل کرنا چاہا کہ وہ ریڈ مرکری کے بارے میں بتا دے لیکن اسی دوران نینی اور نیچو ڈرامائی انداز میں عصا اور انگوٹھی کے ساتھ اس قید خانے تک پہنچ گئے۔ ایک خونریز معرکے کے بعد راڈرِن اور محالا قیدی بنا لیے گئے۔ چاہنے کے باوجود یعقوب عمیر کو واپس نہ مل سکا۔ قید سے رہائی کے بعد انڈیا پہنچ کر نینی پہچان لی جاتی ہے۔ لہٰذا اسے الگ ہونا پڑتا ہے۔ یوں اب عمیر کے ساتھ سلوی رہتی ہے اور عصا کی پوشیدگی کا حل یہ نکالا جاتا ہے کہ اس کی تصویر ساتھ رکھی جائے جس کے باعث عوام کی اکثریت بھی ان اشیا کی تصاویر کو اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ دوسری جانب میں شکارگاہ کی ملکیت کے مسائل سے دوچار تھا۔ جہاں پولیس، پنڈت اور چیئرمین مندر میں خزانے کے حصول کے لیے بےچین تھے۔ بہرحال میں نے خزانہ اور عصا محفوظ بنانے کے لیے اسے سرنگ میں منتقل کردیا۔ دوسری جانب پولیس کمشنر میرے ذریعے خزانے تک پہنچنے کے لیے اپنی بیوی اور بیٹی کو چارے کے طور پر استعمال کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

عمیر کی ڈائری ختم ہوچکی تھی اور اب عمیر اور میری کہانی متوازی آگے چلے گی۔ عمیر ایک انٹرنیشنل رسالے دی لائٹ کے رپورٹر کی حیثیت سے ایک لیڈی فوٹوگرافر سلوی کے ساتھ ہندوستان آرہا تھا تاکہ مجھ سے ملاقات ہوسکے۔ اور دوسری جانب یعقوب بھی دادا سے ملنا چاہتا تھا جبکہ ہندوستان میں پولیس کمشنر دارا اکبر کی بیٹی ثنا جو کہ پھول وتی کی ہم شکل تھی میری محبت میں گرفتار ہوگئی۔ ایسا ہوتا نہیں ہے لیکن ملاپ کے نتیجے میں ثنا تین ماہ کی حاملہ ہوگئی جبکہ اس کا باپ پنڈت اور ایک منتری کے تعاون سے خزانہ حاصل کرنا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کیا تو انہوں نے اپنے طور پر کوشش کی نتیجتاً وہ تمام خزانے کی چاہ میں پہاڑ میں دفن ہوگئے۔ جبکہ میں چکمہ دے کر غار کی جانب روانہ ہوگیا۔ عمیر کے جاں نثار میرے ساتھ تھے۔ غار میں پہنچ کر میں نے اسم اعظم کے ذریعے کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اتنے میں فائرنگ شروع ہوگئی۔ میں نے ایک کوشش اور کی اور چٹان میں خلا نمودار ہوا بالآخر میرے داخل ہوتے ہی چٹان پھر بند ہوگئی میرا رابطہ بیرونی دنیا سے ٹوٹ چکا تھا۔

عمیر کا بیٹا یعقوب باپ سے ملنے انڈیا آنے کے لیے انڈین لڑکی رنجنا سے میل بڑھا لیتا ہے جس کے لیے وہ نامان کے ہندو ملازم ارجن ورما کا روپ دھارتا ہے۔ رنجنا انڈیا کے ہوم منسٹر ایشور لال کی منہ بولی بیٹی ہے جس کے بیٹے منوہر لال کو اماوس کی رات خطرناک دورے پڑتے ہیں جو کہ مہا پجاری کے کالے جادو کی وجہ سے ہیں جسے عمیر کے ملازم اغوا کرلیتے ہیں۔ جو رنجنا کے ذریعے تین انسانوں کی بھینٹ کالی دیوی کو چڑھانا چاہتا ہے۔ شادی کے بعد رنجنا کو یعقوب کی اصلیت کا علم ہوجاتا ہے پھر وہ بھی مسلمان ہوجاتی ہے۔ دوسری جانب ثنا جس کی حفاظت عمیر کے جاں نثار کر رہے ہیں ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے جس کے کان میں اذان اور نام حیرت انگیز انداز میں غازی صلاح الدین موبائل فون کے ذریعے تجویز کرتا ہے۔ جب کہ رانا، نیچو کے ساتھ علاج کی غرض سے پاکستان آتی ہے جہاں اس کا تسلی بخش علاج ہوتا ہے اور وہ دونوں نامان کی مشاورت سے شادی کا فیصلہ کرلیتے ہیں لیکن دوسری جانب حجاب جاں بر نہ ہوسکی اس کی وصیت اور پیش گوئی کے مطابق اب عمیر کی ذمہ داری ہے جسے اس کی بیوی بننا ہے۔ عمیر رانا اور نیچو کو الوداع کہنے ایئرپورٹ پر آتا ہے تو عمیر کا بیٹا رانا کو رابعہ کی حیثیت سے پہچان لیتا ہے اور وہیں خفیہ ایجنسی کا افسر بھی الرٹ ہوجاتا ہے۔

انٹیلی جنس کا چیف رانا دلشاد احمد ہماری طرف آتے آتے رک گیا تھا۔ دو افراد اس کے پاس آ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ یقیناً اس کے ماتحت جاسوس ہوں گے۔

رانا نے ان کی باتیں سن کر ہاتھ اٹھا کر ہماری طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے پہلے منور کو پھر مجھے دیکھا۔ وہ میرے ایک پاؤں سے لپٹا ہوا اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ آس پاس سے گزرنے والے رک کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ بھیڑ لگ رہی تھی۔

میں نے جھک کر اسے ایک جھٹکے سے الگ کیا' پھر غصے سے کہا۔ ''اے! اٹھو۔ کیوں میرے قدموں سے لپٹے ہوئے ہو؟ کیوں مجھے پاپا کہہ رہے ہو' اپنا باپ کیوں بنا رہے ہو؟''

میں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ سننے والوں کو جتا رہا تھا کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''مرنے کے بعد واپس آنا ہماری پرم پرا ہے۔''

رانا دلشاد اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہمارے قریب آ کر رک گیا تھا۔ میں نے جھنجلا کر منور سے کہا۔ ''تم کون ہو؟ اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''خاندان میں جو ہوتا آیا ہے' اُسے پرم پرا بولتے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں' انسان مرنے کے بعد سات بار جنم لیتا ہے' اس دنیا میں سات بار واپس آتا ہے۔ میرے دادا ستر برس کے بعد واپس آئے۔ آپ ان کے بیٹے ہیں' تین برس کے بعد واپس آئے ہیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں بھی مرنے کے بعد واپس آؤں گا۔ اسے خاندانی روایت کہتے ہیں۔''

اس بات پر سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''یہ تو پاگل ہے۔''

دوسرے نے مجھ سے پوچھا۔ ''بھائی صاحب! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟''

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''پتا نہیں' کون ہے؟ میرے پاس آتے ہی قدموں سے لپٹ گیا تھا۔ مجھے اپنا باپ بنا رہا ہے۔''

ایک بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ کو مرنے کے بعد زندہ کر رہا ہے۔''

منور نے کہا۔ ''میں پاگل نہیں ہوں' سچ کہہ رہا ہوں۔ میری پھوپی جان بھی اپنی وفات کے بائیس برس بعد واپس آئی ہیں۔ ابھی بورڈنگ کارڈ لے کر ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے لیے اندر گئی ہیں۔''

اس بات پر لوگ پھر قہقہے لگانے لگے۔ رانا نے قریب آ کر اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''تمہاری بیوی اور بچے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہمارے ساتھ چلو۔''

وہ بولا۔ ''رانا صاحب! اچھا ہوا' آپ آ گئے۔ میرے پاپا کو پولیس والے ڈھونڈ رہے ہیں ناں؟ یہ دیکھیں یہ آپ کے سامنے ہیں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ میں نے انہیں پہچان لیا ہے۔ صرف یہ ہی نہیں' پھوپی جان بھی واپس آ گئی ہیں۔ آپ نے آنے میں دیر کر دی۔ وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ گئی ہیں۔''

رانا نے اس کی پیٹھ کو تھپک کر کہا۔ ''شاباش! تم نے ایک خطرناک مجرم باپ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ ہم اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''میں نے گرفتار بھی کرایا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ لی ہے۔ آپ تو انعام دیں گے ہی۔ ان سے کہیں' یہ معافی دیں۔''

ایسے وقت منور کی بیوی یعنی میری بہو بلقیس ہانو اپنے جوان بیٹے اور بیٹی کے ساتھ آ گئی۔ اس نے منور سے کہا۔ ''توبہ ہے۔ آپ نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم پورے ائرپورٹ میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

منور نے خوش ہو کر کہا۔ ''اور میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ ہیں میرے پاپا' تمہارے سسر' بچوں کے دادا اور قانون کے مجرم عمیر بن غازی عرف شہزادہ سلمان سعدی...''

ندا کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ وہ میرے بازو سے لگ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں پہچان لیا گیا ہوں۔ میری بہو پوتے اور پوتی نے مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ پھر بہو نے کہا۔ ''آپ کے پاپا یہ نہیں ہیں۔ وہ تو ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہم انہیں گھر میں بٹھا کر آئے ہیں۔ گھر چلیں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ پاپا وہاں آ گئے ہیں؟ میں خواہ مخواہ اس آدمی کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔''

میرے پوتے نے منور سے کہا۔ ''ڈیڈ! آپ نے یہ تیسری بار کسی کو باپ بنایا ہے اور دو بار دو بوڑھوں کو دادا جان کہہ کر لپٹ گئے۔ پلیز کسی کو باپ دادا بنانے سے پہلے ہم سے پوچھ لیا کریں۔''



رانا نے بلقیس سے کہا۔ ''میں نے آپ کو سمجھایا تھا' انہیں گھر سے تنہا نہ نکلنے دیں اور فون کے قریب جانے نہ دیں۔ یہ کئی بار مجھ سے فون پر کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ شہزادہ سلمان سعدی کو دیکھا ہے۔ ہم اسے گرفتار کرنے آ جائیں۔''

منور نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''میں کبھی جھوٹ نہیں کہتا۔ ابھی آپ نے سنا ہے' میری بیوی نے پاپا کو پکڑ لیا ہے۔ گھر میں بٹھا کر آئی ہے۔ آ گئیں' ابھی چلیں اور انہیں گرفتار کریں۔ لیکن اس سے پہلے مجھے ان سے معافی مانگنے دیں۔''

رانا نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم بیوی بچوں کے ساتھ جاؤ۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔''

وہ بیوی اور بیٹی کے ساتھ جانے لگا۔ بیٹے یعنی میرے پوتے نے مجھ سے کہا۔ ''ڈیڈ نے آپ کو پریشان کیا۔ میں سوری کہتا ہوں۔''

میں نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ ایبنارمل ہیں۔ بائی دا وے ان کی یہ حالت کب سے ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ایک حادثے میں زخمی ہو گئے تھے۔ میجر آپریشن کے نتیجے میں زخم تو بھر گئے لیکن دماغ متاثر ہوا ہے۔ تب سے ایبنارمل ہو گئے ہیں۔''

میرے پوتے نے یہ نہیں بتایا کہ منور کس حادثے میں زخمی ہو گیا تھا؟ اس نے باپ کی عزت رکھنے کے لیے حقیقت چھپائی تھی اور حقیقت میں جانتا تھا کہ کتوں نے انہیں اچھی طرح بھنبھوڑ ڈالا تھا۔

میرے پوتے نے بڑے فخر سے کہا۔ ''میں بہت مشہور و معروف شخص صلاح الدین غازی کا پڑپوتا ہوں۔ آپ نے ٹی وی چینلز اور اخبارات کے ذریعے دیکھا ہوگا' پڑھا ہوگا' میرے دادا موت کے بعد پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں آئے ہیں؟''

میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔ میں نے تمہارے دادا کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہے۔ ان کا نام کیا ہے؟''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''عمیر بن غازی کہلاتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا لہجہ بدل گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے' دادا سے لگاؤ نہیں ہے؟''

رانا نے ذرا قریب آ کر کہا۔ ''ایک مجرم سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا۔ آپ نے ابھی دیکھا ہے' منور اگرچہ ایبنارمل ہے لیکن اسے بھی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ آپ کو باپ سمجھ کر گرفتار کرانا چاہتا تھا۔'' پھر وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں ایبنارمل نہیں ہوں۔ لیکن دور سے آپ کو دیکھ کر دھوکا کھا رہا تھا۔ آپ کا قد' آپ کی جسامت بالکل عمیر بن غازی جیسی ہے۔ ویسے آپ کی تعریف...؟''

''میرا نام عاقب محمود ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں۔ مجھ سے کوئی کام ہو تو خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''دعا کریں' ہم پولیس والوں سے کوئی کام نہ پڑے۔ ہم صرف مجرموں سے خدمات لیتے ہیں۔''

وہ مجھ سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔ میرا پوتا بھی جا چکا تھا۔ بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ میں نے اور ندا نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ پہچان لیے گئے ہیں۔ اتنی دیر سے ایک یتیم پاگل بیٹا ہمارا خون خشک کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے اندیشہ تھا کہ یہاں رانا کو کوئی رشتے دار دیکھ کر رابعہ سمجھے گا۔ اس کی وجہ سے ہم پر مصیبت آئے گی۔''

ندا نے کہا۔ ''اور آپ کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ منور نے رانا کو پھوپی سمجھ لیا اور آپ کی شناخت ہوتے ہوتے رہ گئی۔''

''خدا کا شکر ہے۔ انٹیلی جنس کے چیف رانا کو مجھ پر شبہ نہیں ہوا ہے۔ ویسے وہ آج بھی میری تلاش میں ہے۔ میری بہو اور پوتوں سے ملتا رہتا ہے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے پارکنگ ایریا میں آئے پھر اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ اسی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ میں نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ آدم ثانی کال کر رہا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہاں بولو...؟''

اس نے کہا۔ ''ہمارے ایک جاں نثار نے ساؤتھ افریقا سے انفارمیشن دی ہے کہ وہاں مورشش میں ہیرے جواہرات کا ایک تاجر ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمان ہے۔ دہلی میں اس کی ایک شاندار کوٹھی ہے۔ وہ آپ کی طرح صحت مند ہے۔ قد میں آپ کے برابر ہوگا۔ حسن پرست ہے۔ عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ' میں اس کی جگہ کیسے لے سکوں گا؟''

''ہم اسے ہمیشہ کے لیے غائب کر دیں گے۔''

''تم لوگ جانتے ہو' میں خواہ مخواہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

''وہ ایک ظالم درندہ ہے۔ بدترین سزاؤں کا مستحق ہے۔ اس نے پندرہ برس پہلے اپنے باپ کو ہلاک کرنے کے

انٹیلی جنس کا چیف رانا دلشاد احمد ہماری طرف آتے آتے رک گیا تھا۔ دو افراد اس کے پاس آ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ یقیناً اس کے ماتحت جاسوس ہوں گے۔

رانا نے ان کی باتیں سن کر ہاتھ اٹھا کر ہماری طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے پہلے منور کو' پھر مجھے دیکھا۔ وہ میرے ایک پاؤں سے لپٹا ہوا اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ آس پاس سے گزرنے والے رک کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ بھیڑ لگ رہی تھی۔

میں نے جھک کر اسے ایک جھٹکے سے الگ کیا' پھر غصے سے کہا۔ ''اے! اٹھو۔ کیوں میرے قدموں سے لپٹے ہوئے ہو؟ کیوں مجھے پاپا کہہ رہے ہو' اپنا باپ کیوں بنا رہے ہو؟''

میں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ سننے والوں کو جتا رہا تھا کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''مرنے کے بعد واپس آنا ہماری پرم پرا ہے۔''

رانا دلشاد اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہمارے قریب آ کر رک گیا تھا۔ میں نے جھنجلا کر منور سے کہا۔ ''تم کون ہو؟ اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''خاندان میں جو ہوتا آیا ہے' اُسے پرم پرا بولتے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں' انسان مرنے کے بعد سات بار جنم لیتا ہے' اس دنیا میں سات بار واپس آتا ہے۔ میرے دادا ستر برس کے بعد واپس آئے۔ آپ ان کے بیٹے ہیں' تین برس کے بعد واپس آئے ہیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں بھی مرنے کے بعد واپس آؤں گا۔ اسے خاندانی روایت کہتے ہیں۔''

اس بات پر سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''یہ تو پاگل ہے۔''

دوسرے نے مجھ سے پوچھا۔ ''بھائی صاحب! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟''

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''پتا نہیں' کون ہے؟ میرے پاس آتے ہی قدموں سے لپٹ گیا تھا۔ مجھے اپنا باپ بنا رہا ہے۔''

ایک بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ کو مرنے کے بعد زندہ کر رہا ہے۔''

منور نے کہا۔ ''میں پاگل نہیں ہوں' سچ کہہ رہا ہوں۔ میری پھوپی جان بھی اپنی وفات کے بائیس برس بعد واپس آئی ہیں۔ ابھی بورڈنگ کارڈ لے کر ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے لیے اندر گئی ہیں۔''

اس بات پر لوگ پھر قہقہے لگانے لگے۔ رانا نے قریب آ کر اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''تمہاری بیوی اور بچے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہمارے ساتھ چلو۔''

وہ بولا۔ ''رانا صاحب! اچھا ہوا' آپ آ گئے۔ میرے پاپا کو پولیس والے ڈھونڈ رہے ہیں ناں؟ یہ دیکھیں یہ آپ کے سامنے ہیں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ میں نے انہیں پہچان لیا ہے۔ صرف یہ ہی نہیں' پھوپی جان بھی واپس آئی ہیں۔ آپ نے آنے میں دیر کر دی۔ وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ گئی ہیں۔''

رانا نے اس کی پیٹھ کو تھپک کر کہا۔ ''شاباش! تم نے ایک خطرناک مجرم باپ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ ہم اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''میں نے گرفتار بھی کرایا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ لی ہے۔ آپ تو انعام دیں گے ہی۔ ان سے کہیں' یہ معافی دیں۔''

ایسے وقت منور کی بیوی یعنی میری بہو بلقیس بانو اپنے جوان بیٹے اور بیٹی کے ساتھ آ گئی۔ اس نے منور سے کہا۔ ''توبہ ہے۔ آپ نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم پورے ائرپورٹ میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

منور نے خوش ہو کر کہا۔ ''اور میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ ہیں میرے پاپا' تمہارے سسر' بچوں کے دادا اور قانون کے مجرم عمیر بن غازی عرف شہزادہ سلمان سعدی...''

ندا کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ وہ میرے بازو سے لگ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں پہچان لیا گیا ہوں۔ میری بہو' پوتے اور پوتی نے مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ پھر بہو نے کہا۔ ''آپ کے پاپا یہ نہیں ہیں۔ وہ تو ہمارے پاس آئے ہیں۔ ہم انہیں گھر میں بٹھا کر آئے ہیں۔ گھر چلیں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ پاپا وہاں آ گئے ہیں؟ میں خواہ مخواہ اس آدمی کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔''

میرے پوتے نے منور سے کہا۔ ''ڈیڈ! آپ نے یہ تیسری بار کسی کو باپ بنایا ہے اور دو بار دو بوڑھوں کو دادا جان کہہ کر لپٹ گئے۔ پلیز کسی کو باپ دادا بنانے سے پہلے ہم سے پوچھ لیا کریں۔''



رانا نے بلقیس سے کہا۔ ''میں نے آپ کو سمجھایا تھا' انہیں گھر سے تنہا نہ نکلنے دیں اور فون کے قریب جانے نہ دیں۔ یہ کئی بار مجھ سے فون پر کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ شہزادہ سلمان سعدی کو دیکھا ہے۔ ہم اسے گرفتار کرنے آ جائیں۔''

منور نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''میں کبھی جھوٹ نہیں کہتا۔ ابھی آپ نے سنا ہے' میری بیوی نے پاپا کو پکڑ لیا ہے۔ گھر میں بٹھا کر آئی ہے۔ آ گئیں' ابھی چھیں اور انہیں گرفتار کریں۔ لیکن اس سے پہلے مجھے ان سے معافی مانگنے دیں۔''

رانا نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم بیوی بچوں کے ساتھ جاؤ۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔''

وہ بیوی اور بیٹی کے ساتھ جانے لگا۔ بیٹے یعنی میرے پوتے نے مجھ سے کہا۔ ''ڈیڈ نے آپ کو پریشان کیا۔ میں سوری کہتا ہوں۔''

میں نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ ابنارمل ہیں۔ بائی داوے ان کی یہ حالت کب سے ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ایک حادثے میں زخمی ہو گئے تھے۔ میجر آپریشن کے نتیجے میں زخم تو بھر گئے لیکن دماغ متاثر ہوا ہے۔ تب سے ابنارمل ہو گئے ہیں۔''

میرے پوتے نے یہ نہیں بتایا کہ منور کس حادثے میں زخمی ہو گیا تھا؟ اس نے باپ کی عزت رکھنے کے لیے حقیقت چھپالی تھی اور حقیقت میں جانتا تھا کہ کتوں نے انہیں اچھی طرح بھنبھوڑ ڈالا تھا۔

میرے پوتے نے بڑے فخر سے کہا۔ ''میں بہت مشہور و معروف شخص صلاح الدین غازی کا پڑپوتا ہوں۔ آپ نے ٹی وی چینلز اور اخبارات کے ذریعے دیکھا ہوگا' پڑھا ہوگا' میرے دادا موت کے بعد پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں آئے ہیں؟''

میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں نے تمہارے دادا کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہے۔ ان کا نام کیا ہے؟''

وہ تھوڑی سے بولا۔ ''عمیر بن غازی کہلاتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا لہجہ بدل گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے' دادا سے لگاؤ نہیں ہے؟''

رانا نے ذرا قریب آ کر کہا۔ ''ایک مجرم سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا۔ آپ نے ابھی دیکھا ہے' منور اگرچہ ابنارمل ہے لیکن سے بھی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ آپ کو باپ سمجھ کر گرفتار کرانا چاہتا تھا۔'' پھر وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں ابنارمل نہیں ہوں۔ لیکن دور سے آپ کو دیکھ کر دھوکا کھا رہا تھا۔ آپ کا قد' آپ کی جسامت بالکل عمیر بن غازی جیسی ہے۔ ویسے آپ کی تعریف...؟''

''میرا نام عاقب محمود ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں۔ مجھ سے کوئی کام ہو تو خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''دعا کریں' ہم پولیس والوں سے کوئی کام نہ پڑے۔ ہم صرف مجرموں سے خدمات لیتے ہیں۔''

وہ مجھ سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔ میرا پوتا بھی جا چکا تھا۔ بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ میں نے اور ندا نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ پہچان لیے گئے ہیں۔ اتنی دیر سے ایک نیم پاگل بیٹا ہمارا خون خشک کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے اندیشہ تھا کہ یہاں رائنا کو کوئی رشتے دار دیکھ کر رابعہ سمجھے گا۔ اس کی وجہ سے ہم پر مصیبت آئے گی۔''

ندا نے کہا۔ ''اور آپ کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ منور نے رائنا کو پھوپی سمجھ لیا اور آپ کی شناخت ہوتے ہوتے رہ گئی۔''

''خدا کا شکر ہے۔ انٹیلی جنس کے چیف رانا کو مجھ پر شبہ نہیں ہوا ہے۔ ویسے وہ آج بھی میری تلاش میں ہے۔ میری بہو اور پوتوں سے ملتا رہتا ہے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے پارکنگ ایریا میں آئے پھر اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ اسی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ میں نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ آدم ثانی کال کر رہا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہاں بولو...؟''

اس نے کہا۔ ''ہمارے ایک جاں نثار نے ساؤتھ افریقا سے انفارمیشن دی ہے کہ وہاں مورشش میں ہیرے جواہرات کا ایک تاجر ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمان ہے۔ دہلی میں اس کی ایک شاندار کوٹھی ہے۔ وہ آپ کی طرح صحت مند ہے۔ قد میں آپ کے برابر ہوگا۔ حسن پرست ہے۔ عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ' میں اس کی جگہ کیسے لے سکوں گا؟''

''ہم اسے ہمیشہ کے لیے غائب کر دیں گے۔''

''تم لوگ جانتے ہو' میں خواہ مخواہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

''وہ ایک ظالم درندہ ہے۔ بدترین سزاؤں کا مستحق ہے۔ اس نے پندرہ برس پہلے اپنے باپ کو ہلاک کرنے کے

بعد اس کے کاروبار پر قبضہ جمایا تھا۔ ایک بھائی کو جان لیوا حادثے سے دوچار کیا۔ دوسرے بھائی کی موت کو خودکشی ثابت کیا۔ اب تمہا ہیرے جواہرات کا ارب پتی تاجر کہلاتا ہے۔"

"ہندوستان میں اس کا ریکارڈ کیسا ہے؟"

"بہترین ریکارڈ ہے۔ وہاں ہر الیکشن میں کروڑوں روپے سے ایک سیاسی پارٹی کی مدد کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں مقبول ہے۔ سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے اسے سلام کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان کی بھی مٹھیاں گرم کرتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو یہ بالکل مناسب رہے گا۔ مجھے اس کے قریب رہ کر اس کے لب و لہجے، چال ڈھال اور مختلف سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ یہ ضروری ہے۔ آپ مورشش میں رہ کر اس سے تعلق پیدا کر کے ملتے رہیں گے تو بہت کچھ معلوم ہوتا رہے گا۔"

"انڈیا میں ہمارے جاں نثاروں سے کہو کہ وہاں اس تاجر کی تمام سرگرمیوں سے تعلق رکھنے والی معلومات حاصل کریں۔ دہلی میں اس کی کوٹھی کے اندرونی حالات بھی معلوم کریں۔"

"اس کے بارے میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔ اس کے لیے کئی ماہ لگ جائیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میری اور ندا کی روانگی کا انتظام کرو۔ ہم مورشش میں عارضی رہائش اختیار کریں گے۔ اس تاجر کا نام کیا ہے؟"

"اس کا پیدائشی نام شیخ امیر الدین ہے لیکن وہ امیر خیری کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمارے پاسپورٹ اور ویزا تیار کراؤ۔ ہم جلد از جلد یہاں سے جائیں گے۔"

میں نے رابطہ ختم کیا۔ فون کو ڈیش بورڈ پر رکھ کر کار اسٹارٹ کی۔ پھر اسے پارکنگ ایریا سے نکال کر مین روڈ پر آ گیا۔ ندا بہت خوش تھی۔ اس نے پوچھا۔ "ہم مورشش جائیں گے۔"

"انشاء اللہ... کل یا پرسوں تک روانگی ہوگی۔"

"میں ابھی گھر پہنچ کر سفر کی تیاریاں کروں گی۔"

☆☆☆

لیبیا کے شہر طرابلس سے ستر کلومیٹر دور میرا ایک وسیع و عریض خفیہ اڈا تھا۔ میرے بیٹے مراد اور سلطان آستین کے ساتھ تھے۔ وہ میری ڈائری اور خفیہ اڈے کا نقشہ ... طرابلس گئے تھے۔ ان کا خیال تھا، میں نے وہاں ... سونا اور ہیرے جواہرات چھپا کر رکھے ہیں۔

حریکا نامی ایک یہودی عورت میری دشمن تھی۔ ... خیال تھا، میں نے ریڈ مرکری وہاں چھپائی ہے۔ مراد، سلطان، حریکا کے ساتھ اسی خفیہ اڈے کی طرف ... تھے۔ وہاں جگہ جگہ بارودی سرنگیں تھیں۔ ہم نے ایسے ... لیوا جدید آلات اور ہتھیار نصب کیے تھے، جو نظر نہیں آ... تھے، جان لینے کے بعد ظاہر ہوتے تھے۔

وہ تینوں خفیہ موت کے ظاہر ہوتے ہی جہنم میں ... گئے تھے۔ یہ نہ جان سکے کہ وہ میرے جاں نثاروں کی ... پناہ گاہ اور جدید اسلحہ کا گودام ہے۔ دنیا کے ایک سرے ... دوسرے سرے تک اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے ... خفیہ پیغامات پہنچانے کے لیے وہاں ایک بھرپور نیٹ ... قائم کیا گیا تھا۔

اور وہیں راڈ مین اور محالا کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا ... آئی اے اور میسونی تنظیم کے جاسوس انہیں تلاش کر... تھے۔ وہ خواب و خیال میں بھی میرے اُس خفیہ اڈے ... پہنچ نہیں سکتے تھے۔

ٹیپو نے رانا کے ساتھ اٹلی میں دو ... گزارے۔ وہاں نامان کی رضامندی سے یہ طے کیا گیا ... ایک ہفتے بعد رانا کی شادی کا جشن منایا جائے گا۔

وہ اپنی شادی خانہ آبادی کے معاملات طے کر... کے بعد طرابلس کے خفیہ اڈے میں آ گیا۔ اس ... جاں نثاروں سے کہا۔ "راڈ مین کو کال کوٹھری سے نکا... اس کا پہلا آپریشن کرو۔"

راڈ مین چار اسکوائر فٹ کی ایک تنگ کوٹھری میں ... رہتا تھا۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ پاؤں پھیلا کر سو ... سکتا تھا۔ سانسیں لینے کے لیے ایک ننھے سے روشندان ... ہوا آتی رہتی تھی۔

جاں نثار اسے چوبیس گھنٹوں میں دو بار کھانے ... کے لیے کچھ دیتے تھے، پھر کوئی اسے پوچھنے نہیں آتا تھا ... عرصے میں وہ بیمار اور کمزور ہو گیا تھا۔ ٹیپو کی ہدایت ... مطابق دو جاں نثار اسے کوٹھری سے نکال کر آپریشن تھیٹر ... لے گئے۔ وہاں ایک انجکشن لگاتے ہی وہ بیہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک بیڈ پر پایا ... کسی کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔ ٹیپو نے آ کر کہا۔ "ہیلو ... مین! تم نے تھری ایس کو قیدی بنا کر اسے انتہائی کمزور ...



طمانچہ مارا تھا۔ وہ طمانچہ مارنے والا ہاتھ کہاں ہے؟ ذرا دکھاؤ تو سہی۔"

اس نے بڑی بے بسی اور عاجزی سے کہا۔ "میں جانتا ہوں، اپنا سر پیٹ کر معافی مانگوں گا، تب بھی مجھے معاف نہیں کیا جائے گا۔ پلیز ایک بار شہزادہ سلمان سعدی سے بات کراؤ۔ صرف ایک بار بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی بات کراؤں گا۔ لیکن تم کس ہاتھ سے فون پکڑو گے؟"

وہ اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اس ہاتھ سے..."

پھر وہ ایکدم سے چونک گیا۔ صدمے سے چیخ پڑا۔ وہ ہاتھ کلائی تک تھا۔ اس کے بعد ہتھیلی غائب تھی۔ کلائی کے پاس پٹی بندھی ہوئی تھی۔

ٹیپو نے موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ تھری ایس سے بات کرنا چاہتے ہو۔ یہ لو فون دوسرے ہاتھ سے پکڑو۔"

اس نے دوسرا ہاتھ بیڈ پر سے اٹھایا تو اسے دیکھ کر پھر ایک دہنی جھٹکا پہنچا۔ وہ ہاتھ بھی کلائی تک تھا۔ وہ صدمے سے کراہنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ٹیپو نے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ "تھری ایس کو معلوم ہے کہ یہاں تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے رابطہ ہونے پر مجھ سے کہا۔ "ہیلو شہزادے! یہ ہوش میں آ گیا ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کا ماتم کر رہا ہے۔ لو باتیں کرو۔"

اس نے آگے بڑھ کر فون کو راڈ مین کے کان سے لگایا۔ میں نے کہا۔ "ڈیل راڈ مین! کس حال میں ہو؟ یاد ہے تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا اور میں نے کہا تھا، اپنے ہاتھوں کا بیمہ کرا لو۔ یہ نہیں رہیں گے۔"

وہ رو رہا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ تو تمہارے تمام دشمن کہتے ہیں کہ تم زبان کے دھنی ہو جو کہتے ہو وہی کرتے ہو۔ تم نے وعدہ کیا تھا، تمہارا بیٹا تمہیں مل جائے گا تو مجھے رہا کر دو گے۔"

"بیشک۔ رہائی ملے گی۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ تم اپنی میسونی تنظیم میں واپس جاؤ گے لیکن سزائیں پانے کے بعد۔"

"سزا تو دے چکے ہو۔ مجھے دونوں ہاتھوں سے معذور کر چکے ہو۔"

"ہاں۔ میں چشم تصور سے دیکھ رہا ہوں۔ تم نے جن ہاتھوں سے میری بہن کے لباس کو پھاڑ کر اسے برہنہ کرنا چاہا تھا، وہ ہاتھ اب نہیں رہے۔ آئندہ تم خود اپنا لباس اپنے ہاتھوں سے نہیں پہن سکو گے۔"

"تھری ایس! بہت ہو چکا۔ اب مجھے جانے دو۔"

"ابھی تو کچھ نہیں ہوا ہے اور بہت کچھ ہونا ہے۔ بستر پر پڑے رہو اور یاد کرتے رہو کہ تم نے ایک تہ خانے میں قیدی بنا کر مجھ پر کیسے مظالم ڈھائے تھے؟ میرا خدا مجھے نہ بچاتا تو تہ خانے سے میری لاش ہی نکلتی۔"

"نہ میں نے تمہاری جان لی، نہ تم میری جان لو۔ اب دشمنی ختم کرو۔"

"تمہارے جیسے یہودی اور دشمنی ختم کریں گے...؟ کبھی نہیں۔ تم تو مجھے ایک سانس بھی لینے نہ دیتے۔ اس تہ خانے میں مار ڈالتے لیکن ریڈ مرکری حاصل کرنے کی بے چینی تھی۔ اس لیے مجھے زندہ رکھا تھا۔"

"اب تو میرا خیال ہے، تم نے خواہ مخواہ ریڈ مرکری کا شوشا چھوڑا ہے۔ تمہارے پاس ایسا کوئی خطرناک جوہری مادہ نہیں ہے۔ تم ساری دنیا کو بیوقوف بنا رہے ہو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نے بیوقوف بنتے بنتے دو ہاتھ گنوا دیے اور پتا نہیں کیا کچھ گنوانے والے ہو۔ جب یہاں سے اپنے لوگوں میں جاؤ گے تو وہ تمہاری حالت دیکھ کر عبرت حاصل کریں گے اور شاید تمہاری طرح یہی سوچ کر صبر کریں گے کہ میں خواہ مخواہ ایک شوشا چھوڑ رہا ہوں، میرے پاس کوئی جوہری مادہ نہیں ہے۔"

ایسے وقت میرے دو جاں نثار محالا کو لے کر وہاں آئے۔ ٹیپو نے فون پر کہا۔ "شہزادے! تمہاری زوجہ محترمہ محالا صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ لو اب اس سے باتیں کرو۔"

ٹیپو نے محالا کو فون دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولی۔ "ہائے سلمان! میں تمہاری آواز سننے اور تم سے باتیں کرنے کے لیے ترس رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "میرے دین کے مطابق تم سے بہت پہلے ہی نکاح ٹوٹ چکا ہے۔ نہ میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا نہ تمہاری آواز سننے کا شوق ہے۔ مگر کیا، کیا جائے؟ تم میرے بیٹے یعقوب کی ماں ہو۔ اگر یہ بیٹا نہ ہوتا تو آج تم اس دنیا میں نہ ہوتیں۔ اگر ہوتیں تو تمہارے سامنے راڈ مین پڑا ہے، اس کا انجام دیکھو۔ تمہارا بھی یہی انجام ہوتا۔"

اس نے کمرے میں آتے ہی راڈ مین کے دونوں ہاتھوں کو دیکھا تھا اور سہم گئی تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہیں آج بھی اپنے حسن و شباب پر بڑا ناز ہے۔ میں راڈ مین کی طرح تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں

گا۔لیکن تصور کرو' ذرا سوچو! اگر میں تمہاری ایک آنکھ نکلوا دوں تو تمہارے حسن کا ایک چراغ بجھ جائے گا۔تم جوانی اور بڑھاپے کی دہلیز پر ہو۔بس دوسرے چراغ کی روشنی میں زندگی گزارتی رہو گی۔''

وہ گھبرا کر چیخنے کے انداز میں بولی۔''نہیں۔سلمان! تم ایسا ظلم نہیں کرو گے۔اوہ گاڈ! میں تمہیں اپنے اور تمہارے بیٹے کی قسم دیتی ہوں' میرا چہرہ نہ بگاڑنا۔میں مر جاؤں گی۔''

''میں نے ایک بات کہی تھی۔جو کہا ہے' وہ نہیں کروں گا۔اگر تمہیں ذرا سا بھی نقصان پہنچاؤں گا تو میرے بیٹے کے دل کو تکلیف پہنچے گی۔وہ محبت کرنے والا بیٹا ہے۔آج بھی تمہیں دل وجان سے چاہتا ہے۔''

وہ یکبارگی رو پڑی۔التجا کرنے لگی۔''ایک بار اس سے بات کرادو۔میں جانتی ہوں' تمہارے کسی بیٹے نے تم سے وفا نہیں کی۔سب دشمن تھے۔صرف میری کوکھ سے جنم لینے والا یہ بیٹا ہی سعادت مند ہے' تمہارا فرمانبردار ہے۔تم اسے دل وجان سے چاہتے ہو۔میں اس کا واسطہ دے کر کہتی ہوں' ایک بار میرے بیٹے سے بات کرادو۔''

''اس قدر جذباتی ہو کر نہ بولو۔تم سے بیٹے کی ملاقات کراؤں اور یہودی دشمنوں کو اپنے پیچھے لگالوں؟ میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔بس ایک ہی بار تمہارے فریب میں آ کر تم سے شادی کی تھی۔راڈ مین کی قید میں رہ کر اس کی سزا پالی اور میں جب وہاں قید تھا تو یاد کرو' تم مجھ سے کس بری طرح پیش آ رہی تھیں؟ اس انتظار میں تھیں کہ میں ریڈ مرکری کا راز راڈ مین کے سامنے اُگل دوں اس کے بعد مارا جاؤں۔تم خوش قسمت ہو کہ میں بیٹے کی وجہ سے تم پر تھوک بھی نہیں سکتا۔لعنت ہے تم پر....میں تمہارے لیے رہائی کا حکم دے رہا ہوں۔فون ٹیپو کو دو۔''

اس نے فون ٹیپو کو دیا۔میں نے اس سے پوچھا۔''راڈ مین کا دوسرا آپریشن کب ہو گا؟''

اس نے کہا۔''آج سے دو دنوں کے بعد دوسرا پھر دو دنوں کے بعد تیسرا آپریشن ہو گا۔اس کے بعد اس کی چھٹی کر دیں گے۔''

''اسے بڑی ہوشیاری سے میسونی تنظیم کے حوالے کرنا۔یہ کبھی شبہ نہ ہو کہ ہمارا خفیہ اڈا لیبیا کے کسی علاقے میں ہے۔''

ٹیپو نے محالا کو دیکھا۔پھر راڈ مین پر ایک نظر ڈالی۔اس کے بعد کمرے سے باہر آ کر بولا۔''ہم محالا اور راڈ مین کی ایک ساتھ چھٹی کریں گے۔یہاں سے بہت دور جنوبی افریقا کے آخری ساحل کیپ ٹاؤن کی طرف لے جائیں گے۔وہاں سے میسونی تنظیم کے موجودہ سربراہ کو اطلاع دیں گے کہ وہ انہیں وہاں سے لے جائے۔''

ٹیپو نے یہی کیا۔دوسرے آپریشن میں راڈ مین کا ایک گردہ نکال لیا۔تیسرے آپریشن میں ایک آنکھ نکلوا دی۔اسے ایسے بگڑے ہوئے شخص کو فضائی راستے سے یا بحری راستے سے کسی دوسرے ملک میں پہنچایا نہیں جا سکتا تھا۔میرے جاں نثار اسے اور محالا کو بیہوش کر کے ایک گاڑی میں ڈال کر وہاں سے ہزاروں میل دور کیپ ٹاؤن لے گئے۔

جب میسونی تنظیم کے موجودہ سربراہ کو اطلاع ملی کہ ان دونوں کو رہا کر دیا گیا ہے تو اس تنظیم کے جاسوس اور دوسرے کارندے بتائے ہوئے پتے پر کیپ ٹاؤن کے ایک علاقے میں پہنچ گئے۔

وہ دونوں ایک چھوٹے سے مکان میں تھے۔وہ تمام کارندے اپنے سابق سربراہ راڈ مین کا انجام دیکھ کر لرز گئے۔محالا رو رہی تھی' قسمیں کھا رہی تھی کہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔بہت جلد میری شرگ تک پہنچے گی۔جو شخص ہمیشہ ناقابل شکست بن کر رہا ہے' وہ ایک عورت کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

وہ انتقام کی آگ میں سلگ رہی تھی' غصے سے اینٹیں پیٹ رہی تھی' بالوں کو نوچ رہی تھی۔بہت کچھ بول رہی تھی۔کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہی تھی۔انہوں نے اپنے موجودہ سربراہ کو راڈ مین کی حالت بتائی۔پھر فون کے ذریعے اس سے بات کرائی۔

سربراہ نے فون پر پوچھا۔''ہیلو راڈ مین! کیا واقعی تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے؟''

وہ بستر پر پڑا ہوا تھا۔اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔''میرے دونوں ہاتھ نہیں ہیں۔میں سہارے کے بغیر کسی سے فون پر بات بھی نہیں کر سکتا۔اب آخری سانس تک ایک آنکھ سے دنیا کو دیکھتا رہوں گا اور میرا ایک گردہ بھی نکال لیا گیا ہے۔''

سربراہ نے کہا۔''او گاڈ! تمہری ایس انسان نہیں درندہ ہے۔اگر ہمیں ریڈ مرکری کا راز معلوم ہو جاتا تو اسے گولی مار دیتے۔ایک پل میں موت دے دیتے لیکن ایسا وحشیانہ سلوک نہ کرتے۔اب ہم قسم کھاتے ہیں' سلمان سعدی کے ساتھ اس سے بھی زیادہ وحشیانہ سلوک کریں گے' اس کے لیے زمین تنگ کر دیں گے' اسے جلد از جلد گرفتار کر کے دونوں ہاتھ' دونوں پاؤں کاٹ دیں گے۔دونوں آنکھیں' دونوں گردے نکال لیں گے۔اس کا انجام دیکھ کر دنیا کے تمام خطرناک مجرم عبرت حاصل کریں گے۔''



وہ بھی محالا کی طرح قسمیں کھا رہا تھا' چیلنج کر رہا تھا۔فی الحال میرے تمام دشمن قسمیں کھا سکتے تھے' چیلنج کر سکتے تھے اور ایسا کرتے وقت انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔

☆☆☆

منسٹر ایشور لال اور اس کی بیوی ہیم لتا اپنے بیٹے منوہر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔منوہر کو کالے جادو کے ذریعے دماغی مریض بنایا گیا تھا۔اس کا دنیاوی علاج ممکن نہیں تھا۔

ان کا خیال تھا' اس دماغی مرض کا توڑ صرف کالے جادو سے ہی ہو سکتا ہے۔ایسے وقت روحانی علاج کے ذریعے منوہر بالکل نارمل ہو گیا تھا اور مہا پجاری اپنے کالے جادو سمیت فنا ہو چکا تھا۔

ہیم لتا اور ایشور لال کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا چمتکار ہو گیا ہے اور وہ بھی مسلمانوں کے روحانی علاج کے ذریعے ہوا ہے۔وہ بیٹے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے لندن آ گئے۔

وہ اپنے ماتا پتا کے سواگت کے لیے ایئر پورٹ آیا تھا۔انہیں دیکھتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے نہیں کہا۔ایک ہاتھ پیشانی پر لے جا کر السلام علیکم کہا تو وہ دونوں چونک گئے۔

پھر وہ اپنی ہندوستانی تہذیب کے مطابق آگے بڑھ کر ماں باپ کے قدموں کو چھونے لگا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ماں نے پوچھا۔''تم ہمیں سلام کر رہے ہو۔کیا اپنے طور طریقے بھول گئے ہو؟''

وہ بولا۔''میں نے سلام کر کے آپ دونوں کی سلامتی چاہی ہے۔بحث نہ کریں۔میرے ساتھ چلیں۔''

ماں باپ نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر بیٹے کے پیچھے چلتے ہوئے عمارت کے باہر گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔وہ دونوں تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔بیٹا کار ڈرائیو کر رہا تھا۔وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے عقب نما آئینے میں اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ شگفتہ و شاداب نظر آ رہا تھا۔چہرے اور آنکھوں سے پہلے کی طرح فکر و پریشانی اور مایوسی نہیں جھلک رہی تھی۔ماں نے پوچھا۔''کیا پچھلی اماوس کی رات تم پر دورہ نہیں پڑا تھا؟''

اس نے کہا۔''بالکل نہیں۔اس رات میں آرام اور سکون سے رہا تھا۔جس کمرے میں تھا' اس کے دروازے اور کھڑکیاں لرز رہی تھیں۔مہا پجاری اپنے کالے جادو کے ذریعے حملے کر رہا تھا اور عالم صاحب اس کا توڑ کر رہے تھے۔مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔''

ایشور لال نے کہا۔''یعنی وہ عالم صاحب مہا پجاری سے بڑے جادوگر ہیں؟''

''وہ جادوگر نہیں ہیں۔آتما کی شکتی سے روحانی علاج کرتے ہیں۔''

''جو ناقابل علاج ہو' وہ دواؤں اور ڈاکٹروں کے بغیر صحت یاب ہو جائے تو اسے جادو ہی کہیں گے۔''

''نو ڈیڈ! جادو اور روحانیت میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ روحانیت میں بدن کے ایک ایک روئیں کی پاکیزگی لازمی ہوتی ہے۔اس کے بعد نیت کی پاکیزگی لازمی ہوتی ہے اور نیت کی پاکیزگی یہ ہے کہ روحانی عمل سے کسی دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔جبکہ جادو کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچتا ہے۔ان کی بلی دی جاتی ہے' ان کا خون بہایا جاتا ہے۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ماں باپ چپ رہے۔کچھ نہ بولے۔اس نے کہا۔''عالم صاحب نے اماوس کی رات سے پہلے مجھے نہا دھو کر صاف ستھرا رہنے کو کہا۔پھر یہ سمجھایا کہ بدن کے علاوہ نیت کو کس طرح پاک و صاف رکھا جاتا ہے؟ انہوں نے ہمارے دھرم اور ہمارے بھگوان کے خلاف کچھ نہیں کہا۔یہ سمجھایا کہ خدا ہر جگہ' ہر مذہب میں ہے۔اگر دل' دماغ اور نیت کی پاکیزگی سے اس کی وحدانیت کو تسلیم کیا جائے۔دینی اور دنیاوی معاملات میں کسی کو خدا کا شریک نہ کیا جائے تو یہ روحانیت کا ایسا پہلا مرحلہ ہے جہاں سے کالے جادو کا اور شر پسندوں کے کسی بھی عمل کا توڑ کیا جا سکتا ہے۔''

وہ دونوں خاموشی سے سن رہے تھے۔وہ ایسی نئی نئی باتیں کہہ رہا تھا جس میں اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

ماں نے پوچھا۔''تمہیں اغوا کرنے والے کہاں ہیں؟''

''میرے آس پاس اب کوئی نہیں رہتا ہے۔انہوں نے رہائش کے لیے مجھے ایک اپارٹمنٹ دیا ہے۔پرسوں اماوس کی رات ہے۔وہ اس روز میرے پاس آئیں گے۔عالم صاحب بھی احتیاطاً آ کر میری حفاظت کریں گے۔ہم سب کو اللہ تعالیٰ پر کامل یقین ہے کہ پرسوں رات بھی میں بالکل نارمل رہوں گا۔میرا دماغ ہمیشہ کی طرح صحت مند رہے گا۔''

ایشور لال نے ذرا ناگواری سے کہا۔''تم کہہ رہے ہو' اللہ تعالیٰ پر کامل یقین ہے۔تمہیں کہنا چاہیے' بھگوان کی کرپا سے نارمل رہو گے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔''میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی کہہ

رہا ہوں' آپ بھگوان کی کرپا کہہ رہے ہیں۔ آپ محض اس لیے پریشان ہیں کہ میرے بولنے کا انداز بدل گیا ہے۔''

وہ آگے کچھ نہ بول سکے۔ ان کی کار ایک اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ وہ تینوں کار سے اتر کر اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچے۔ اس وقت منوہر زیرلب کچھ پڑھ رہا تھا۔ ماں باپ نے توجہ سے سنا تو وہ عربی زبان تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔

عالم صاحب نے ہدایت کی تھی کہ اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ہمیشہ ورد کرتے رہا کرو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل ہوتی رہے گی۔

اس نے دروازہ کھول کر کہا۔ ''آئیں مام! کم آن ڈیڈ!''

وہ دونوں اس کے ساتھ اندر آئے۔ وہ لگژری اپارٹمنٹ بہت ہی ویل فرنشڈ تھا۔ گھر کی دیوار پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ان دونوں کی زبان سے نکلا۔ ''ہرے کرشنا ہرے رام...''

منوہر نے بے اختیار کہا۔ ''اللہ اکبر... اللہ اکبر...!''

ماں نے چیخ کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم مسلمان ہوگئے ہو؟''

ایشور لال نے پوچھا۔ ''ابھی تم عربی زبان میں کیا پڑھ رہے تھے؟''

''یہ تو میں اپنی دوا استعمال کر رہا ہوں۔'' منوہر نے جواب دیا۔

دونوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''دوا...؟''

پھر ماں نے پوچھا۔ ''کیا یہ کوئی منتر ہے جو جادو کرتے وقت پڑھتے ہیں؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا اور کہا۔ ''یہ روحانی نسخہ ہے۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔ میں سمجھاتا ہوں۔''

وہ بے چین ہوگئے تھے۔ پریشان ہو کر بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے ماں کا بازو تھام کر اسے ایک صوفے پر بٹھایا۔ پھر باپ کو بھی ماں کے پاس بٹھا کر کہا۔ ''میری بات ذرا صبر سے' دھیرج سے سنیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔''

وہ ان کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ باپ نے کہا۔ ''ہم کیسے صبر کریں' کیسے دھیرج رکھیں؟ ہمارے آتے ہی تم نے سلام کیا۔ پھر زیرلب نہ جانے عربی میں کیا پڑھ رہے ہو؟''

ماں نے کہا۔ ''ہم نے یہاں آکر ہرے کرشنا ہرے رام کہا تو تم مسلمانوں کی زبان سے خدا کا نام لینے لگے۔''

وہ بولا۔ ''یہی نام لیتا ہوں اور کلام پاک کی آیتیں پڑھتا رہتا ہوں تو ابھی آپ کے سامنے زندہ سلامت ہوں۔ کیا آپ میری زندگی نہیں چاہتے؟ یہ چاہتے ہیں کہ میں پھر سے دماغی مریض بن جاؤں اور اماوس کی رات مجھ پر دورہ پڑنے لگے؟''

ماں نے جلدی سے انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں۔ بھگوان تمہیں ہماری بھی عمر دے۔ اب تم اچھے ہوگئے ہو۔ کیا یہ سمجھتے ہو' پھر تم پر دورہ پڑے گا؟''

''میں نہیں جانتا کیا ہوگا؟ پرسوں اماوس کی رات ہے۔ اگر مجھ پر دورہ نہیں پڑے گا تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ میرا موجودہ علاج ہی میرے لیے شافی ہے۔ جو آیتیں پڑھتا رہتا ہوں' انہیں جاری رکھوں گا اور ایک وقت کی نماز نہیں چھوڑوں گا۔''

باپ ایکدم سے چیخ پڑا۔ ''تم نماز بھی پڑھتے ہو؟''

''ہاں۔ عالم صاحب نے کہا ہے۔ اگر اپنے بدن اور اپنی نیت کو پاکیزہ رکھوں گا تو میری نمازیں قبول ہوتی رہیں گی اور میں ہمیشہ اسی طرح صحت مند رہوں گا۔''

ماں نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہائے رام! تم تو اُدھر کے ہوگئے۔''

باپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم [illegible] ہو۔ ہمارے دھرم میں ہو لیکن دھرم میں کیسے رہو گے؟ ادھر پوجا پاٹ کرو گے اور ادھر نمازیں پڑھو گے؟''

''میں اس سلسلے میں بحث نہیں کروں گا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ جو دوا شفا دیتی ہے' نئی زندگی دیتی ہے' اس کا استعمال جاری رہتا ہے۔ میری دوا اسلام ہے۔ بولیں مام! بولیں ڈیڈ! کیا میں دوا چھوڑ دوں؟''

ایشور لال نے ایک ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ''اگر پرسوں اماوس کی رات تم پر دورہ پڑے گا تو ہم یہاں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کرائیں گے۔''

''اس سے پہلے آپ نے ایشیا اور یورپ کے بڑے بڑے تجربہ کار ڈاکٹروں سے علاج کرایا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ کوئی ڈاکٹر مہا پجاری کے کالے جادو سے مجھے نجات نہ دلا سکا۔''

ماں نے کہا۔ ''وہ پجاری مر چکا ہے۔ اب تم سے کوئی دشمنی نہیں کرے گا۔''

''ہماری دنیا میں اور خاص طور پر ہندوستان میں جادو کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ شیطان کبھی نہیں مرتا۔ وہ دوسرے روپ بہروپ میں آتا رہتا ہے۔''

باپ نے پوچھا۔ ''کیا تم نے قسم کھا لی ہے کہ مسلمانوں کے علاج کا ہی طریقہ اپنائے رکھو گے؟''



''ہاں۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ جس دوا سے شفا حاصل ہو رہی ہے' اسے ہمیشہ جاری رکھوں گا۔''

ماں پھر رونے لگی۔ ایشور لال نے کہا۔ ''ہیم لتا! تم رو رہی ہو اور میں رو بھی نہیں سکتا۔ مگر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ یہ ہماری اولاد ہے۔ اب تک اس کی دماغی پریشانی ہمیں پریشان کرتی رہی' نیندیں اڑاتی رہی۔ اب یہ دھرم سے نکل کر ہمارا سکون برباد کرتا رہے گا۔''

منوہر نے پوچھا۔ ''آپ کا سکون کیسے برباد ہوگا؟ اگر میں اسلامی روحانی دوا استعمال کر رہا ہوں تو آپ کا کیا بگڑ رہا ہے؟''

''نادان نہ بنو۔ کیا یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ ہمارے ساتھ ہندوستان چلو گے' وہاں رہ کر نمازیں پڑھو گے اور عربی زبان میں نجانے کیا کیا پڑھتے رہو گے تو ہماری ہندو جاتی کیا کہے گی؟''

ہیم لتا نے کہا۔ ''وہ تو صاف کہیں گے کہ بیٹے کو اپنے دھرم میں لاؤ یا پھر اسے گھر سے' خاندان سے' دل و دماغ سے اور اپنے دیش سے نکال دو۔''

ایشور لال نے کہا۔ ''میں سیاستدان ہوں۔ آج منسٹر ہوں' کل دو کوڑی کا ہو جاؤں گا۔ اگلے الیکشن میں کوئی ہندو مجھے ووٹ نہیں دے گا۔''

''مگر میں ہندوستان جاؤں گا اور روحانی دوائیں استعمال نہیں کروں گا' نمازیں نہیں پڑھوں گا' آیات نہیں پڑھوں گا تو مر جاؤں گا اور اگر مر جاؤں گا تو ہندوستان والوں کا کیا بگڑے گا؟ وہاں کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں اپنی جان سے جاؤں گا۔'' اس نے ماں باپ کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر آپ دونوں کو یہ معلوم ہو کہ بیٹا گڑھے میں گرنے جا رہا ہے تو کیا آپ اسے جانے دیں گے؟''

ہیم لتا نے کہا۔ ''ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ کیوں تمہیں کسی گڑھے میں گرنے دیں گے؟''

''تو پھر مجھے بچا لیں۔ میں ہندوستان نہیں جاؤں گا۔ وہاں کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ نمازیں پڑھنے لگا ہوں۔ آپ کو الیکشن میں ہندوؤں کے لاکھوں ووٹ ملیں گے۔ اپنی فتح کا جشن وہاں منائیں۔ اس بیٹے کو بھول جائیں۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہمارا خاندان انڈیا سے لے کر یورپ اور امریکا تک پھیلا ہوا ہے۔ سب ہی پوچھیں گے کہ تم انڈیا کیوں نہیں آرہے ہو؟ اپنے ماں باپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتے ہو؟ رشتے داروں سے کیوں نہیں مل رہے ہو؟ اگر کسی رشتے دار کے ہاں صبح سے شام تک جا کر رہو گے اور ایک وقت کی بھی نماز پڑھو گے تو سارا بھید کھل جائے گا۔''

ایشور لال وہاں سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے کے دوران پاؤں پٹخنے لگا۔ ''میں کیا کروں؟ اس لڑکے کو کیسے سمجھاؤں؟ اپوزیشن والے ہماری ٹوہ میں رہتے ہیں' کوئی نہ کوئی کمزوری تلاش کرتے ہیں پھر اس کمزوری کو الیکشن میں اچھالتے ہیں اور یہ تو بہت بڑی کمزوری ہو جائے گی۔ میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔''

وہ بیٹے کے سامنے آکر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مجھ پر دیا کرو۔ اپنے باپ کی عزت کا اور نیک نامی کا خیال کرو۔ صرف ہندو جنتا ہی نہیں' سارے برہمن اور پنڈت بھی ہمارے خلاف ہو جائیں گے۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں بھی ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا ہوں' ابھی فیصلہ سنا دیں۔ میری زندگی چاہتے ہیں یا موت؟ اگر موت چاہتے ہیں تو میں آپ کے ساتھ ہندوستان جاؤں گا۔ وہاں آپ کی سیاسی شہرت کی خاطر ہندو جنتا کو خوش کروں گا۔ نمازیں نہیں پڑھوں گا۔ آیتیں بھی نہیں پڑھوں گا۔''

وہ ذرا رک کر بولا۔ ''آپ منسٹر کے بعد پرائم منسٹر بن جائیں۔ خوب شہرت حاصل کریں' خوب نام کمائیں' خوب دولت حاصل کریں۔ لیکن آئندہ اماوس کی رات مجھ پر دورہ پڑے گا۔ میں دماغی مریض بن جاؤں گا تو پھر میرا علاج ممکن نہیں رہے گا۔ میں پلٹ کر عالم صاحب کے پاس نہیں آؤں گا۔ مسلمانوں سے رجوع نہیں کروں گا۔ نماز سے منہ پھیرنے کے بعد شرم سے مر جاؤں گا۔ آپ ابھی سے میرے کریا کرم کا انتظام کرلیں۔''

ایشور لال بری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ وہ بیوی کے پاس آکر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ہیم لتا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''یہ بہت ہی سنگین معاملہ ہے۔ یہاں آتے ہی بیٹھے بیٹھے اس کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ذرا صبر سے' سوچ سمجھ کر اپنے بیٹے کو اہمیت دینی ہے۔ یہی ہمارا سب کچھ ہے۔ اس کے سوا ہمارا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کی شہرت' نیک نامی اور دولت کس کام آئے گی' جب یہی نہیں رہے گا؟''

پھر یہی طے پایا گیا کہ پرسوں اماوس کی رات منوہر کی دماغی حالت دیکھی جائے۔ وہ اس رات بھی پوری طرح صحت مند رہے گا تو اسے پھر سے بیمار کرنے کے لیے ہندوستان نہیں لے جائیں گے' اگر لے جائیں گے تو اسے نماز پڑھنے اور آیات پڑھنے سے نہیں روکیں گے۔

ہیم لتا نے بیٹے کے پاس آکر اس کی پیشانی کو چوم کر

ایشور لال سے کہا۔ ”ابھی دل و دماغ سے ساری باتیں نکال دیں۔ بیٹے کو نئی زندگی مل رہی ہے۔ اچھی اچھی باتیں کریں۔ اماوس کی رات دیکھیں تو سہی کیا ہوتا ہے؟ ابھی ہمیں خوب ہنسنا بولنا اور انجوائے کرنا چاہیے۔“

ماں باپ نے فی الحال صبر کیا۔ موجودہ پریشانیوں کو عارضی طور پر نظر انداز کیا۔ وہ اوپری دل سے مسکرا کر باتیں کرنے لگے۔ پھر فریش ہو کر قریبی ریستوران میں گئے۔ وہاں لنچ کے دوران ہیم لتا نے کہا۔ ”میں اپنے بیٹے کی شادی جلد سے جلد کرنا چاہتی ہوں‘ بہولانا چاہتی ہوں۔“

ایشور لال نے کہا۔ ”بہولانے کا فائدہ کیا ہوگا؟ اگر ہمارا بیٹا انڈیا نہیں آئے گا۔ یہیں زندگی گزارے گا تو بہو بھی ہمارے آنگن میں نہیں آئے گی۔ نہ بیٹا ہوگا‘ نہ بہو ہوگی‘ نہ بچے آنگن میں کھیلیں گے۔“

ہیم لتا نے کہا۔ ”آپ پھر وہی بحث چھیڑ رہے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”ہمارے بیٹے کے معاملے میں جو بھی بات ہوگی‘ اس کی تان اسی سوال پر ٹوٹے گی کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان؟ جو بہو آئے گی‘ وہ ہندو ہوگی یا مسلمان؟ اگر ہندو ہوگی تو کیا وہ مسلمان پتی کو قبول کرے گی؟“

منوہر نے کہا۔ ”نہ وہ ہندو ہوگی‘ نہ مسلمان۔ ایک لڑکی سے میرا افیئر چل رہا ہے۔ دہلی میں اس سے دو بار ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ وہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آئی ہے۔ اس کا تعلق ایک انڈین عیسائی گھرانے سے ہے۔“

”کیا وہ بھی انڈیا جا کر یہ بھید نہیں کھولے گی کہ تم مسلمانوں کی طرح نمازیں پڑھتے ہو؟“

”میں اس سے بات کروں گا۔ اس نے مجھے فون کیا تھا کہ یہاں آچکی ہے۔ میں اس سے ملنے جاؤں گا۔“

ایشور لال نے پوچھا۔ ”وہ عیسائی لڑکی کون ہے؟ اس کا باپ کون ہے اور یہاں کہاں رہتی ہے؟ اس نے کچھ بتایا ہے؟“

”ہاں۔ آج صبح فون پر اس نے اپنا پتا بتایا ہے۔ لنچ کے بعد آپ کو اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر اس سے ملنے جاؤں گا۔ پھر اسے آپ کے پاس لاؤں گا۔“

ہیم لتا نے کہا۔ ”تم نے انڈیا میں بہو پسند کی اور یہاں بتا رہے ہو؟ میں ابھی اسے دیکھوں گی۔ تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”مام! جلدی کیا ہے؟ میں ابھی جاؤں گا اور شام تک اسے لے آؤں گا۔“

”نہیں۔ مجھ سے صبر نہیں ہوگا۔ میں دیکھنا چاہوں گی‘ وہ کیسی ہے؟ جیسی سوچتی ہوں‘ ویسی ہے یا نہیں؟“

”جیسی آپ چاہتی ہیں‘ ویسی ہی ہے۔ اسے دیکھیں گی تو دیکھتی رہ جائیں گی۔ بس ذرا صبر کریں۔“

وہ بڑی بے قراری سے بولی۔ ”اس کا نام تو بتاؤ۔“

”اس کا نام پوجا ایڈوانی ہے۔ باپ عیسائی ہے۔ ہندوستانی تھی۔ بیٹی اپنی ماں کا ناک نقشہ اور روپ رنگ کر آئی ہے۔“

وہ بیٹے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم ابھی جاؤ اور ابھی اسے لے آؤ۔“

وہ لنچ کے بعد انہیں اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر اپنی سے ملنے آگیا۔ اب وہ نمازیں پڑھتا تھا۔ پچھلی رات سے اب تک اس نے پوجا نہیں کی تھی۔ لیکن اپنی سے ملنے آگیا تھا۔ وہ پوجا دھرم کے مطابق نہیں تھی‘ مطابق تھی۔

وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”ہائے منو! تم پورے منٹ لیٹ ہو۔“

وہ بولا۔ ”وقت کے کانٹے سے کانٹا نہ ملاؤ۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ پیار میں انتظار بہت ضروری ہے۔ انتظار نہیں کر سکتے‘ وہ پیار نہیں کر سکتے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں تم سے پیار کرتی ہوں‘ لیے میں نے احسان کیا ہے‘ پانچ منٹ تک انتظار کیا ہے۔“

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ وہ بولی۔ ”آؤٹنگ کے لیے چلیں؟“

”میری مام تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہیں‘ بھی تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم پہلے وہاں چلیں گے۔ مام وغیرہ کے ساتھ آؤٹنگ ہوگی۔“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”پلیز۔ ابھی مام اور ڈیڈ نہ ملاؤ۔ میں انڈیا جاؤں گی تو وہاں ان کے پاؤں چھو آشرواد لینے تمہارے گھر آؤں گی۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟ وہ یہاں آئے ہیں‘ ان کے پاؤں چھو لو اور آشرواد لو۔“

”پلیز ابھی نہیں... میں نے تمہیں بتایا تھا‘ میں جیوتشی مہاراج کو بہت مانتی ہوں۔ انہوں نے میرے ریکھائیں دیکھ کر کہا تھا کہ اگلے الیکشن سے پہلے میں تمہارے مام اور ڈیڈ سے نہ ملوں۔ الیکشن کے بعد ان سے ملنے گھڑی آئے گی۔“

”میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ وہاں مہاپجاری نے بھی کہا تھا اور میرے مستقبل کے بارے میں بڑی پیشگوئیاں کی تھیں جو سب کی سب غلط ہوئیں۔“

”میں تمہارے مہاپجاری کو نہیں جانتی۔ اپنے مہاراج کو جانتی ہوں۔ ان کی ہر بات درست ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کی پیشگوئی کے مطابق کوئی گڑبڑ ہو اور میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو دوں... نہیں‘ ہرگز نہیں۔“

یہ کہتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی۔ آگ سے دور رہنا چاہیے‘ وہ تو شعلوں میں لپٹ گیا تھا‘ پگھلتا چلا گیا۔ بڑے ہی جذباتی انداز میں بولا۔ ”میں بھی تم سے بچھڑنا نہیں چاہتا۔ ساری زندگی تمہیں اپنی دھڑکنوں سے لگائے رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ پرابلم کیسے حل ہوگی؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیسی پرابلم؟“

”میری مام تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ ڈیڈ بھی تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب ان سے کیا کہوں گا؟“

وہ بیٹھ کر سوچنے لگے کہ کیا بہانہ کیا جائے؟ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں فریش ہو کر کے آتی ہوں۔ تب تک تم سوچو‘ میں بھی سوچ رہی ہوں۔ کوئی تو بہانہ کرنا ہی ہوگا۔“

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے ماں باپ نے اس کی رہائش کے لیے ایک اپارٹمنٹ کا انتظام کیا تھا اور ایک ہندوستانی گورنس رکھی تھی جو وہاں اس کے ساتھ تھی۔ اس نے آکر پوچھا۔ ”آپ کے لیے چائے یا کافی لاؤں؟“

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں۔ ہم باہر جا رہے ہیں۔ وہیں پئیں گے۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ماں ہونے والی بہو سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ آخر اس سے کیا بہانہ کیا جائے؟ وہ تو نہیں مانے گی۔ بہو سے ملنے کے لیے یہاں اس کے اپارٹمنٹ میں چلی آئے گی۔

ایک تدبیر یہ سمجھ میں آئی کہ ماں باپ سے جھوٹ بول دے کہ پوجا ابھی اچانک ہی انڈیا واپس چلی گئی ہے۔ وہاں اس کے خاندان میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ عالم صاحب نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے پورے بدن کی اور نیت کی پاکیزگی رکھے۔ کبھی جھوٹ نہ بولے ورنہ وہ جو نمازیں پڑھتا ہے اور دعائیہ آیتیں پڑھتا رہتا ہے وہ قبول نہیں ہوں گی۔

اس نے فوراً ہی کان پکڑ لیے۔ اپنے دونوں گالوں پر ہولے سے طمانچے مارے۔ جو جھوٹ بولنے کا ارادہ کر رہا تھا‘ اس کے لیے معافیاں مانگنے لگا۔ شر سے اور شیطانی ارادوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے لگا۔

جھوٹ بولنا ہی شیطانی ارادہ ہے۔ اب وہ اپنے ماں باپ سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا۔ پوجا لباس بدل کر ڈرائنگ روم میں آئی تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر سر جھکائے کچھ زیر لب پڑھ رہا تھا۔

پوجا نے پہلے کبھی اسے ایسے انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔ اس کے منہ سے بہت دھیمی گنگناہٹ کی آواز ابھر رہی تھی۔

وہ قریب آکر بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ اس کے قریب آنے کے باوجود وہ پڑھنے میں محو تھا۔ اس کی آمد پر اس نے ایک ذرا سی آہٹ نہیں سنی تھی۔ نہ ہی اس کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا پڑھ رہا تھا کہ اپنے آس پاس کی دنیا سے بے خبر ہو گیا تھا؟

پوجا نے ذرا جھک کر کان لگا کر سنا‘ وہ عربی زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ یہ اور حیران کرنے والی بات تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ منوہر عربی زبان نہیں جانتا پھر وہ اس زبان میں کیا پڑھ رہا تھا؟

وہ حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی‘ پھر اس کے شانے کو تھپک کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ پڑھتے پڑھتے چونک گیا‘ سر گھما کر دیکھا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے پڑھنے میں محو ہو گیا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ پوجا کے گھر میں ہے۔

اس نے پوچھا۔ ”یہ تم عربی زبان میں پڑھ رہے ہو ناں؟“

”ہاں۔ یہ عربی ہے۔“

”کیا پڑھ رہے ہو؟“

وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کیا سمجھاؤں؟ بس یہ سمجھ لو کہ عبادت کر رہا ہوں۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ تم ہندو ہو۔ تمہیں گیتا کا اشلوک پڑھنا چاہیے۔ مگر یہ عربی زبان میں کیا پڑھ رہے ہو؟“

وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا‘ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”پوجا! تم مجھ سے سچی محبت کرتی ہو ناں؟“

”اب میں کس زبان سے یقین دلاؤں کہ سچی محبت کرتی ہوں؟“

”تمہارے منہ میں جو زبان ہے‘ اسی سے کہہ دو کہ ہمیشہ میرے ساتھ زندگی گزارو گی‘ ہمیشہ میری رازدار بن کر رہو گی اور جو راز ابھی بتا رہا ہوں‘ وہ کسی سے نہیں بولو گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں۔ قسم کھاتی ہوں‘ ہمیشہ تمہاری رازدار بن کر رہوں گی۔ تمہارا جو بھی راز ہے‘ اسے اپنے سائے کے سامنے بھی زبان پر نہیں لاؤں گی۔“

Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں دماغی مریض تھا۔ ہر اماوس کی رات مجھ پر ایسا دورہ پڑتا تھا کہ پاگل ہو جاتا تھا' خودکشی کرنے لگتا تھا۔ ایسے وقت مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔''

''ہاں۔ تم نے مجھے بتایا تھا۔ آگے بولو۔''

وہ آگے بتانے لگا کہ کس طرح مہا پجاری نے اس سے دشمنی کی تھی اور عالم دین نے کس طرح اس کا روحانی علاج کیا ہے۔ اب وہ روحانی علاج کے مطابق نمازیں اور کلام پاک کی آیتیں پڑھتا رہتا ہے۔

وہ اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا؟ تم نمازیں پڑھتے ہو؟ اب پوجا نہیں کرتے؟ تم انڈیا جا کر ایسی باتیں کرو گے' نمازیں پڑھو گے تو کوئی تمہیں ہندو تسلیم نہیں کرے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ مسلمان ہو گئے ہو۔ کیا سارے ہندوؤں کو' پنڈتوں اور پجاریوں کو یقین دلا سکو گے؟ سب تمہیں ادھرمی کہیں گے۔''

''مام اور ڈیڈ بھی یہی کہتے ہیں۔ ان کو اندیشہ ہے کہ میں وہاں جاؤں گا اور مجھے ادھرمی کہا جائے گا تو ایک ہندو بھی میرے ڈیڈ کو الیکشن میں ووٹ نہیں دے گا۔ ان کی سیاسی شہرت اور تمام نیک نامی خاک میں مل جائے گی۔''

''کیا پھر بھی تم نمازیں پڑھو گے؟''

''مجھے اپنا علاج کرنا ہے' زندہ رہنا ہے۔ یہ زندگی ایک ہی بار انسان کو ملتی ہے۔ علاج نہ ہوا' زندگی گئی تو میں بھی گیا اور جب میں گیا تو دین بھی گیا اور دھرم بھی گیا۔ آخر جانا کہاں ہے؟ ہم سب کی آخری منزل کہاں ہے؟ لوٹنا تو خدا کی طرف ہی ہے۔''

''تمہاری باتوں سے سر گھومنے لگا ہے۔ چلو اٹھو۔ آؤٹنگ کریں۔ تازہ ہوا میں ذرا طبیعت بحال ہو جائے گی۔'' ...وہ جانے کے لیے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اور ہاں۔ تم نے کیا سوچا ہے؟ اپنے مام اور ڈیڈ سے میرے بارے میں کیا کہو گے؟''

''عالم صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ اگر ایسا کروں گا تو روحانی دوائیں اثر نہیں کریں گی۔''

''تم سچ بولو گے تو وہ مجھ سے ملنے کی ضد کریں گے۔''

''میں انہیں سمجھا دوں گا۔ ممی ناراض ہوں گی تو انہیں منا لوں گا۔''

''وعدہ کرو' وہ یہاں آنے کی ضد کریں گی' تب بھی تم انہیں میرا ایڈریس نہیں بتاؤ گے؟''

''میں وعدہ کرتا ہوں' وہ ادھر نہیں آئیں گے۔ اب یہاں سے...''

بہت دنوں بعد پوجا سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ تھوڑا وقت گزارنے لگا۔ یوں بھی ذہنی اذیتوں میں رہا تھا۔ زندگی کا حسن اور اس کی رعنائیاں دل و دماغ سے گئی تھیں۔ وہ مایوس ہو گیا تھا کہ شاید کبھی صحت مند زندگی گزار سکے گا اور نہ ہی اپنی پوجا کو پا سکے گا۔

وہ آؤٹ ڈور تفریح کے دوران بار بار اسے کریدتی تھی' پوچھ رہی تھی۔ ''سچ بتاؤ۔ اپنی پوجا سے کچھ نہ چھپاؤ۔ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے؟''

''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ عالم صاحب نے مجھ سے زبردستی اسلام قبول کروایا ہے' نہ میں نے ہے۔ وہ میرا علاج کر رہے ہیں اور میں روحانی علاج کے رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔''

''اگر کچھ ہے اور تم اس وجہ سے نہیں بتا رہے ہو کہ ناراض ہو جاؤں گی' تم دھرم بدل دو گے تو شادی نہیں کر گی.... ایسا ہرگز نہ سوچو۔ تم کسی بھی دھرم یا دین میں رہو زندگی کی آخری سانس تک تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم مجھے دل و جان چاہتی ہو' میرے ساتھ آخری سانس تک رہو گی۔ میں سچ رہا ہوں' روحانی علاج کی خاطر میں نے جھوٹ بولنا دیا ہے۔ چاہے مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ جائیں بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ کسی کو دھوکا نہیں دوں گا اور دھوکا دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

اس کے ماں باپ انڈیا سے اس کے پاس تھے۔ لہٰذا ان کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔ وہ دو گھنٹے بعد سے رخصت ہو گیا۔ وہ سیدھی اپنے فلیٹ میں آئی' اندر بہت بے چین تھی۔ اس نے اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر فون پر نمبر پنچ کیے پھر رابطے کا انتظار کرنے لگی۔

دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ''ڈیڈی جان! وہاں خیریت سے ہو؟''

''یس ڈیڈ! بالکل خیریت سے ہوں۔''

''کیا منوہر سے ملاقات ہوئی؟''

''ہاں ہوئی۔ اس کے بارے میں ایک بہت زبردست خبر ہے۔ آپ سنتے ہی چونک جائیں گے۔''

''تو پھر فون بند کرو۔ میں ایک ضروری میٹنگ ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد کال بیک کروں گا۔''

وہ فون بند کر کے ایک ایزی چیئر پر نیم

ہوگئی۔ چھت کی طرف تکتے ہوئے منوہر کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ اسے فریب دینے کے لیے محبت کا ناٹک رچا رہی تھی۔ لیکن اب محسوس کر رہی تھی کہ سچ مچ محبت ہوتی جا رہی ہے۔

آئیڈیل بننے کے لیے ایک مرد میں جو خوبیاں ہوتی ہیں، وہ تمام کی تمام منوہر میں تھیں۔ ایک تو وہ خوبرو اور اسمارٹ تھا۔ پھر یہ کہ اب سچ بولنے لگا تھا۔ سچ بولنے والے اپنی محبوبہ کو اپنی بیوی کو کبھی فریب نہیں دیتے، کبھی کسی دوسری کی طرف مائل نہیں ہوتے، اپنی دھرم پتنی سے جھوٹ نہیں بولتے، ساری زندگی اسی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ منوہر سے جھوٹ بول رہی تھی۔ اسے دھوکا دے رہی تھی۔ اس کا نام پوجا ایڈوانی نہیں بلکہ پوجا اگروال تھا۔ وہ اپوزیشن پارٹی کے بہت ہی معروف لیڈر لکشمن اگروال کی بیٹی تھی۔ اس پتا لکشمن اگروال نے اپنے مخالف ایشور لال ورما کی کمزوریاں معلوم کرنے کے لیے اپنی بیٹی کو اس کے بیٹے کے پیچھے لگا دیا تھا۔

پوجا نے دہلی میں اس سے دو بار ملاقات کی تھی۔ اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ لیکن لندن میں تیسری ملاقات ہوئی تو وہ بالکل بدل چکا تھا۔ آج اس نے قریب آ کر اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ رکھنے کے باوجود بے پناہ محبت کا ثبوت دیتا رہا تھا۔ اس کی اس مہذب اور شریفانہ محبت نے بھی پوجا کو بہت متاثر کیا تھا۔

وہ دل پر ہاتھ رکھ کر عہد کرنے لگی کہ منوہر جیسے آئیڈیل جوان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ اسے دل و جان سے اپنائے گی۔ پتا نہیں، وہ اپنا دھرم چھوڑ چکا ہے یا نہیں؟ اگر چھوڑ دیا ہے، تب بھی وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔

باپ نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ”ہاں۔ ڈیڈی کی جان! بولو کیا کہنے والی تھیں؟“

اس نے کہا۔ ”ڈیڈ! منوہر کا علاج یہاں مسلمانوں نے کیا ہے۔ کتنی حیرانی کی بات ہے، اس کے باپ نے ایشیا اور یورپ کے بڑے بڑے تجربہ کار اور معروف ڈاکٹروں سے علاج کرایا تھا۔ لیکن اس پر شیطانی دورہ پڑنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا تھا مگر اب مسلمانوں کے روحانی علاج سے ختم ہوگیا ہے۔“

”کیا تم یہی کہنا چاہتی تھیں؟ یہ تو کوئی زبردست خبر نہیں ہے۔“

”ڈیڈ! آگے بھی بہت کچھ ہے۔ ان مسلمانوں نے اسے کھانے پینے کے لیے کوئی دوا نہیں دی۔ وہ اس سے نمازیں پڑھواتے ہیں، ان کی جو آسمانی کتاب ہے، اس کے کچھ اشلوک پڑھتا رہتا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے ایسا کرتے رہنے سے پچھلی اماوس کی رات اس پر دورہ نہیں پڑا تھا۔ وہ بالکل صحت مند ہے۔“

وہ بولا۔ ”تعجب ہے۔ یقین نہیں آتا۔ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے اس پر کسی طرح کا جادو کیا ہوگا۔“

”وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ انہوں نے جادو نہیں کیا ہے۔ جادو اور روحانیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جادو میں ناپاکی اور غلاظت ہوتی ہے، خون خرابہ ہے، اس کے ذریعے کسی کی بھی جان لی جاتی ہے۔ روحانیت کے ذریعے دوسروں کی جان بچائی جاتی ہے۔ کہ انہوں نے منوہر کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ وہ اتنا ستھرا اُجلا اُجلا سا لگتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔“

باپ نے کہا۔ ”ٹھہرو۔ ذرا ٹھہرو۔ اتنی تیزی سے نہ بولو۔ ابھی تم نے کیا کہا ہے، وہ نمازیں پڑھتا ہے؟“

”ہاں۔ وہ بتا رہا تھا، دن رات میں پانچ وقت نمازیں پڑھتا ہے اور جب بھی تنہا ہوتا ہے تو مسلمانوں کی آسمانی کتاب کی وہ کیا کہتے ہیں...... ؟ ہاں۔ یاد آیا، قرآن پڑھتا رہتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہندو نہیں رہا، مسلمان ہوگیا ہے؟“

”نو ڈیڈ! وہ کہتا ہے، ہم سب خدا، بھگوان اور گاڈ کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ سر جھکانے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ طریقے الگ ہونے سے خدا نہیں بدل جاتا۔ اس نے جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ اس کا روحانی علاج ہے جس کے ذریعے اسے نئی زندگی مل رہی ہے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ نماز پڑھتا رہے گا۔“

لکشمن اگروال نے خوش ہو کر کہا۔ ”وہ مارا۔ اسے ہندوستان آنے دو۔ وہ روحانی علاج کے لیے نماز پڑھتا رہے گا تو ہم یہ حقیقت تمام میڈیا کے ذریعے اچھالیں گے کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے۔ تمام ہندو اسے برا بھلا کہیں گے۔ الیکشن میں ایک بھی ووٹ اس کے باپ کو نہیں ملے گے۔ اتنی بڑی کامیابی کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹی! تم نے تو کمال کر دیا۔“

”ڈیڈ! اتنی جلدی خوش نہ ہوں۔ آگے بھی سن لیں۔“

”ہاں۔ سناؤ۔ ویسے جتنی بھی کمزوری ہاتھ آئی ہے بہت ہے۔ پھر بھی آگے کیا ہے بولو؟“

”اس کا باپ اتنا نادان نہیں ہے کہ اسے ہندو ووٹرز کے سامنے نمازیں پڑھانے کے لیے انڈیا لے آئے گا۔



ماں باپ اور بیٹے میں بحث چل رہی ہے کہ آگے کیا کرنا چاہیے؟ ویسے منوہر یہ طے کر چکا ہے کہ ہندوستان واپس نہیں جائے گا اور جب نہیں جائے گا، وہاں نمازیں نہیں پڑھے گا تو آپ کس طرح ہندوستان کی جنتا کو بتائیں گے کہ منسٹر ایشور لال ورما کا اکلوتا بیٹا مسلمان ہوگیا ہے؟“

وہ ذرا چپ رہا، پھر بولا۔ ”اسے کسی طرح تو ہندوستان لانا ہی ہوگا اور بیٹی! تم ہی اسے پھانس کر یہاں لا سکتی ہو۔“

وہ بولی۔ ”یہ بھید جلد ہی کھل جائے گا کہ میں عیسائی نہیں ہوں، میرا نام پوجا اگروال ہے اور میں ہندو ہوں، اپوزیشن کے بہت بڑے لیڈر کی بیٹی ہوں اور ایشور لال کی کمزوریاں معلوم کرنے کے لیے اس کے بیٹے کو پھانس رہی ہوں۔“

”یہ بھید کھلنے سے پہلے تم اسے بہلا پھسلا کر یہاں لے آؤ۔“

”میں کس طرح بہلاؤں گی، پھسلاؤں گی؟ جبکہ اس کے ماں باپ یہاں پہنچے ہوئے ہیں؟ آپ تو جانتے ہیں، ہولی اور دیوالی جیسے کتنے ہی تہوار میں انہوں نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھا ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ آپ کی بیٹی ہوں۔ یہاں سامنا ہوگا تو فوراً ہی میرا بھید کھل جائے گا۔ ابھی منوہر مجھے ان سے ملانا چاہتا تھا مگر میں نے ٹال دیا ہے۔ یہ سوچیں، کب تک ٹالتی رہوں گی؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”یہ تو بڑی گمبھیر صورتحال ہے۔ میری بیٹی! تمہیں بہت ہوشیاری سے کام کرنا ہے۔ اس کے ماں باپ کا سامنا نہیں کرنا ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ کس طرح منوہر کو انڈیا لایا جا سکتا ہے؟ میرا دماغ تو گھوم پھر کر یہی سوچ رہا ہے کہ یہ کام صرف تم کر سکتی ہو۔“

”نو ڈیڈ! منوہر میری یہ بات نہیں مانے گا۔ اپنے باپ کو سیاسی طور پر کمزور بنانے کے لیے انڈیا نہیں جائے گا۔ آپ کوئی دوسری تدبیر سوچیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں سوچتا ہوں، تم بھی سوچو۔ آج رات کسی وقت تمہیں کال کروں گا۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ ادھر پیار کرنے والی بیٹی اور اُدھر سیاست کرنے والا باپ اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔ وہ منوہر کو چاہتی تھی، اس سے دل لگا تھا مگر اس کے باپ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے باپ کی سیاسی فتح کے لیے اس کے باپ کو مات دینے کی تدبیر سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

رنجنا کے متعلق یہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ منسٹر ایشور لال کی منہ بولی بیٹی تھی۔ وہ مہاکالی کے مندر میں نرتکی تھی، پوجا کے وقت رقص کرتی تھی۔ وہاں دیوی کے چرنوں میں جانوروں اور انسانوں کی بلی دی جاتی تھی۔

ایشور لال نے رنجنا کو اس لیے بیٹی بنایا تھا کہ وہ تین آدمیوں کو پھانس کر ان سے باری باری شادی کرے اور انہیں مہاکالی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھانے کے لیے مندر میں لے آیا کرے۔

رنجنا نے انٹرنیٹ کے ذریعے سب سے پہلے ارجن ورما کو پھانسا۔ یعقوب اپنی پلاننگ کے مطابق ارجن ورما بن کر اس کی زندگی میں آگیا۔ وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئی کہ پھر رنجنا نہ رہی۔ اس کی ایک مسلمان شریک حیات صنم بن گئی۔

یعقوب کو ہندو کے بہروپ میں آ کر ہندوستان میں رہنا تھا۔ اس لیے یعقوب اور صنم انڈیا آ کر ارجن ورما اور رنجنا کے نام سے رہنے لگے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ سپنا نام کی ایک فلرٹ کرنے والی لڑکی یعقوب کو پھانسنے میں ناکام رہی تو وہ اس کی دشمن بن گئی۔ اسے یہ راز معلوم ہوگیا کہ ارجن ورما بن کر رہنے والا یعقوب ہندو نہیں ہے مسلمان ہے۔

اس نے ایک پولیس افسر کو بتا دیا کہ رنجنا کا پتی ہندو نہیں ہے۔ اس کا لباس اتارا جائے گا تو ایک بہروپیا مسلمان سامنے آئے گا۔

یہ ایک سنگین چونکا دینے والی رپورٹ تھی۔ پولیس افسر نے سپاہیوں کے ساتھ آ کر اپنی معلومات کے مطابق رنجنا کے پتی کو حراست میں لیا۔ اسے بند کمرے میں لے جا کر بے لباس کر کے دیکھا تو وہ مسلمان نہیں، ہندو ارجن ورما ثابت ہوا۔

جاں نثاروں نے ارجن ورما کو اگلی سے بلا کر یعقوب کی جگہ پہنچا دیا تھا اور یعقوب نہیں دوسری جگہ جا کر روپوش ہوگیا تھا۔ اگرچہ بھید نہیں کھلا تھا۔ تاہم یہ خبر دور تک پھیل گئی۔ اخبارات میں شائع ہوئی تو انٹیلی جنس اور موساد والے ارجن ورما کے پیچھے پڑ گئے۔ انہیں شبہ تھا کہ کوئی پاکستانی جاسوس وہاں پہنچا ہوا ہے اور کسی طرح ہیرا پھیری کر کے خود کو چھپا رہا ہے۔

ایک جاں نثار نے خفیہ پناہ گاہ میں آ کر یعقوب سے کہا۔ ”ہماری چال کامیاب رہی ہے۔ پولیس والے ارجن ورما سے دھوکا کھا گئے ہیں۔ وہ اس بات سے مطمئن ہو کر گئے ہیں کہ ارجن مسلمان نہیں ہے۔“

یعقوب نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب کوئی مجھ پر شبہ نہیں کرے گا۔ مجھے وہاں اپنی وائف

کے پاس جانا چاہیے۔"

"آپ ابھی ادھر نہ جائیں۔ احتیاط لازمی ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں' یہ بات سی آئی اے اور موساد والوں تک نہ پہنچے۔ ہمیں صبح کا اخبار دیکھنا چاہیے۔ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے بھی خبریں سنتے رہیں گے۔ جب یقین ہوجائے گا کہ خطرہ ٹل گیا ہے' تب آپ یہاں سے جائیں گے۔"

یعقوب بے چین ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔ "میری صنم کو وہاں سے بلالیں۔ اسے آج رات کسی دوسری جگہ گزارنی چاہیے۔ اگر اس گھر میں رہے گی تو وہاں کی عورتیں یہی دیکھیں گی کہ ارجن کے ساتھ رات کو ایک کمرے میں ہے یا نہیں؟ میں نہیں چاہتا' وہ ایک کمرے میں رہیں۔"

جاں نثار نے کہا۔ "ہم نے سوچا نہیں تھا' ایسا مسئلہ پیدا ہوگا۔ آپ کی مسز وہاں ہندو گھرانے میں ہیں۔ ان کو ارجن ورما کے ساتھ پتی پتنی بن کر رہنا ہوگا۔"

"میں اپنی صنم کی پاک دامنی پر بھی شبہ نہیں کروں گا۔ وہ ایک کمرے میں رہ کر بھی اس سے فاصلہ رکھے گی۔ پھر بھی اسے ایک نامحرم کے ساتھ بند کمرے میں نہیں رہنا چاہیے۔ وہ بیچاری ساری رات الجھتی رہے گی' جاگتی رہے گی۔"

"ایک ہی رات کی بات ہے۔ ہم کل صبح کے اخبارات پڑھیں گے اور مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرتے رہیں گے۔ اگر کوئی خطرہ' کوئی اندیشہ نہیں ہوگا تو آپ کل شام تک پھر ارجن ورما بن کر وہاں پہنچ جائیں گے۔"

اسے صبر کرنا تھا۔ وہ بیٹھ کر سوچنے لگا۔ "میں یہاں اپنے پاپا..... اور دادا سے ملنے آیا تھا۔ کیسی بدنصیبی ہے' کسی سے بھی مل نہ سکا۔ پاپا اچانک پاکستان چلے گئے اور دادا کے متعلق یقین کیا جارہا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔"

اس نے سر اٹھا کر جاں نثار کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "آپ نے بتایا تھا' میری دادی (ثنا) کو اس دیس کے تمام جاسوس اور امریکی سی آئی اے والے پریشان کرتے رہے تھے۔ آپ لوگ روپوش رہ کر انہیں تحفظ فراہم کررہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ جو آرمی اور انٹیلی جنس والے آپ کی دادی کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے ہم نے ان دشمنوں کے ایک ایک' دو دو رشتے داروں کو ہمیشہ کے لیے ٹھکانے لگا دیا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ ہم نے دھمکی دی ہے کہ آپ کی دادی کو اور ان کے بچے کو ایک ذرا سا بھی نقصان پہنچے گا تو ہم ان کے پورے خاندان کو تباہ کردیں گے۔ یوں بھی وہ اس بات سے سہمے ہوئے ہیں کہ آپ کے پاپا نے ریڈ مرکری اسی دیس میں کہیں چھپا کر رکھا ہے۔ انہوں نے آپ کی دادی ثنا کو اور ان کے بچے کو نقصان تو پتا نہیں آپ کے پاپا اس ریڈ مرکری کے ذریعے کیا دھماکے کریں گے؟"

یعقوب اپنے پاپا اور دادا کے متعلق کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "میں ان سے نہ مل سکا۔ خدا کرے' میرے پاپا کہیں زندہ سلامت ہوں اور کبھی میں ان سے مل سکوں۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ کبھی ملاقات ضرور ہوگی۔ فی الحال میں اپنی دادی کے قریب ہوں' وہ اسی شہر میں کہیں رہتی ہیں۔ میں ان سے ملنے کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی؟"

"آپ یہاں ہندو ارجن ورما کی حیثیت سے رہیں گے۔ ایک مسلمان خاتون سے ملنے جائیں گے تو طرح طرح کے سوالات پیدا ہوں گے کہ ان سے کیوں ملنے گئے تھے؟ کیا رشتے سے ملنے گئے تھے؟"

دوسرے جاں نثار نے کہا۔ "اس وقت انڈین ڈیپارٹمنٹ کے' ملٹری انٹیلی جنس کے جاسوس' موساد اور امریکی سی آئی اے والے سب ہی آپ' آپ کے پاپا اور دادی کے سروں پر ننگی تلواروں کی طرح لٹک رہے ہیں۔ دانشمندی یہی ہوگی کہ اپنی دادی کی طرف فی الحال نہ کریں۔"

واقعی یعقوب کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ نہ تو صنم کے پاس نہ جائے' نہ ہی اپنی دادی (ثنا) سے ملنے والے بچے سے ملاقات کا سوچے۔

ادھر صنم کے لیے جو مسئلہ تھا' اس نے اسے بڑی آسانی سے حل کرلیا۔ ہر ماہ دو چار یا چھ دن ایسے ہوتے ہیں کہ عورتیں اپنے پتی کے ساتھ ایک کمرے میں رات نہیں گزارتیں۔ لہٰذا وہ ارجن ورما کی ایک بیوہ موسی کے آکر سو گئی تھی۔ حالات سازگار تھے۔ کسی نے کسی طرح کا شک نہیں کیا۔

لیکن دوسری صبح شبہات پیدا ہونے والے ظاہر ہونے لگے۔ کئی بڑے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مسٹر ایشور لال کی منہ بولی بیٹی رنجنا کے پتی ارجن پر شبہ کیا جارہا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور پاکستانی جاسوس ہے۔

پاکستان اور پاکستانی دونوں ہی متعصب ہندوؤں کے دلوں اور دماغوں میں چبھتے رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی امر کے خلاف کارروائیاں کرنے کا بہانہ ڈھونڈا جاتا ہے۔ کسی بات کا بتنگڑ اور رائی کا پربت بنا دیا جاتا ہے۔

موساد کا ایک افسر چند سپاہیوں کے ساتھ ارجن



گرفتار کرنے آگیا۔ اس نے کہا۔ "مسٹر ورما! ہم آپ کو حراست میں لینے آئے ہیں۔"

ارجن نے پوچھا۔ "میرا جرم کیا ہے؟ میں ایک منسٹر ایشور لال کا داماد ہوں۔ آپ مجھے کسی عام آدمی کی طرح گرفتار کرکے نہیں لے جاسکتے۔"

"ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ اگر منسٹر ایشور لال سے ہمارے دیش کو خطرہ ہو تو ہم اسے بھی گرفتار کرسکتے ہیں۔"

"مجھ سے دیش کو کیا خطرہ ہے؟ میں نے کیا، کیا ہے کچھ معلوم تو ہو؟"

"ابھی ہمارے ساتھ وہاں چلیں۔ آپ کا محاسبہ ہوگا تو معلوم ہوجائے گا کہ آپ نے کیا کیا ہے اور ہم کیا کررہے ہیں؟"

اسے دیس کے ان محافظوں کے ساتھ جانا پڑا۔ موساد کے ایک دفتری کمرے میں چند افسران اور بہت ہی بوڑھے تجربہ کار جاسوس بیٹھے ہوئے تھے۔ ارجن کو وہاں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا گیا۔ وہ حکم کے مطابق ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا۔

ایک دیوار پر بڑی سی ٹی وی اسکرین تھی۔ اس اسکرین پر ٹارچر سیل کا منظر دکھایا جارہا تھا۔ وہاں ایک مجرم کو ٹارچر کیا جارہا تھا۔ بڑی درندگی سے اذیتیں دی جارہی تھیں۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس ویڈیو فلم کی آواز بند کردی گئی تھی۔ اس لیے اس کی چیخیں اور فریادیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

ایک افسر نے ارجن سے کہا۔ "بہتر ہے' تم اپنے بارے میں سچ سچ اگل دو۔ جھوٹ کا انجام تم اسکرین پر دیکھ رہے ہو۔ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ اس ٹارچر سیل سے کوئی زندہ واپس نہیں جاتا۔"

ارجن نے کہا۔ "میں جو ہوں' جیسا ہوں' آپ کے سامنے ہوں۔ میرا معائنہ کیا گیا' مجھے بے لباس کیا گیا۔ یہ ثابت ہوگیا کہ میں جنم جنم کا ہندو ہوں۔ پھر میرے اسکول سے لے کر اب تک کے جو سروس ریکارڈز ہیں' وہ بھی میرے پاس موجود ہیں۔ آپ وہ سارے ریکارڈز دیکھ سکتے ہیں۔"

"ہم نے تمہارے کہنے سے پہلے ہی بہت کچھ دیکھ لیا ہے' سمجھ لیا ہے۔ ہم اپنے طور پر انکوائری کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے' تم ملازمت کرنے اٹلی گئے تھے۔ وہاں ایک شہر میں ملازمت کررہے تھے۔ پھر اچانک ہی وہ نوکری چھوڑ دی اور گاڈ فادر نامان کے محل میں چلے گئے۔"

دوسرے افسر نے پوچھا۔ "اس محل میں جاکر کہاں گم ہوگئے تھے؟ ہمارے تعلقات سی آئی اے اور دنیا کی دیگر تنظیموں سے ہیں۔ تم جس محل میں گئے تھے' وہاں گاڈ فادر کہلانے والے کی تنظیم کے ایک ایک رکن کو ہم جانتے ہیں۔ ہمارے مخبر نے رپورٹ دی ہے کہ کسی نے تمہیں وہاں نہیں دیکھا۔ پھر تم کہاں گم ہوگئے تھے؟"

ارجن ذرا پریشان ہوگیا۔ موساد والوں نے بڑی دور تک معلومات حاصل کی تھیں۔ دراصل یعقوب، ارجن کے بہروپ میں لندن گیا تھا اور لندن سے انڈیا آیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ارجن' یعقوب کے بہروپ میں رہنے لگا تھا۔ وہ نامان کے محل میں رہتا تھا۔ اپنی ملازمت کے مطابق فرائض ادا کرتا تھا۔ لیکن چہرہ اور حلیہ بدل گیا تھا کیونکہ اس کا چہرہ یعقوب لے گیا تھا۔

ایک اعلیٰ افسر نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "چپ کیوں ہو؟ جواب دو...؟"

وہ بولا۔ "آپ جانتے ہیں' گاڈ فادر کی تنظیم کتنی خطرناک ہے؟ ان کے معاملات زیادہ تر غیر قانونی ہوتے ہیں۔ میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔ اتنا بتا دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ایک اہم کام کے لیے مجھے اسپین بھیج دیا تھا۔ میں وہیں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس لیے..."

ایک بوڑھے خرانٹ جاسوس نے کہا۔ "بڑی مہارت سے باتیں بنا رہے ہو۔ چلو ہم یقین کرلیتے ہیں کہ تم گاڈ فادر نامان کے کسی خفیہ مشن کے لیے اسپین گئے تھے۔ تم نے ابھی تسلیم کیا ہے' ان کے خفیہ معاملات کو جانتے ہو۔ پھر تو یہ بھی جانتے ہوگے کہ نامان اور اس کی ماں رانا تھری ایس یعنی شہزادہ سلمان سعدی کے منہ بولے رشتے دار ہیں؟"

وہ خرانٹ جاسوس کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "شہزادہ سلمان سعدی نے رانا کو اپنی بہن بنایا ہے اور تقریباً بائیس یا چوبیس برس سے ان کے رشتے بہت گہرے ہیں۔ وہ سگے رشتے داروں سے زیادہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ تمہری ایس کے جاں نثار مختلف بھیس میں نامان کے محل میں آتے جاتے ہیں اور اس کے بہت کام آتے رہتے ہیں۔"

ایک افسر نے کہا۔ "تم اس گاڈ فادر کے تمام معاملات ہمیں نہ بتاؤ۔ صرف تمہری ایس کے معاملات کھل کر بتا دو اور اپنے دیش بھگت ہونے کا ثبوت دو۔ ہم تمہاری عزت کریں گے۔ تمہیں سر پر بٹھائیں گے۔"

وہ بولا۔ "گاڈ فادر اپنے تمام کارندوں پر بھروسا تو کرتا ہے مگر انہیں تمام معاملات نہیں بتاتا۔ میں نے چند کارندوں کی زبان سے تمہری ایس کا نام سنا ہے۔ لیکن یقین کریں' مجھے

اس کے متعلق کوئی خاص بات کبھی نہیں بتائی گئی۔"

دوسرے جاسوس نے کہا۔ "ہم جانتے تھے تم سچ نہیں بولو گے۔ تھری ایس اپنے جاں نثاروں کو اتنا کھلاتا پلاتا ہے ایسے عیش و آرام سے رکھتا ہے کہ وہ کبھی غداری نہیں کرتے۔ تم اپنے دیش سے غداری کرو گے لیکن تھری ایس سے کبھی نہیں کرو گے۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں؟"

"یو شٹ اپ۔ تھری ایس اور گاڈ فادر ایک ہی ہیں۔ تم اب تک تھری ایس کا نمک کھاتے آرہے ہو۔ تم یہاں سے ملازمت کے لیے گئے تو کنگال تھے۔ اب یہاں آئے ہو تو تمہارے پاس ایک مرسڈیز ہے' دہلی کے ایک مہنگے علاقے میں رہنے کے لیے زمین خرید رہے ہو۔ تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں' گاڈ فادر کے غلط دھندے میں تھا اور جہاں غلط دھندہ ہوتا ہے' وہاں چور دروازے سے کمانے کے کئی راستے نکل آتے ہیں۔ میں نے ایسے ہی راستوں سے دولت جمع کی ہے۔"

وہ بڑی ذہانت سے اور مستقل مزاجی سے جواب دے رہا تھا اور وہ لوگ پینترے بدل بدل کر اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ مشورے کیے۔ اس کے بعد اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم جا سکتے ہو۔"

وہ رہائی پا کر چلا آیا لیکن یہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ اسے گاڈ فادر نامان اور تھری ایس کا کارندہ سمجھا جا رہا ہے۔ لہٰذا اب چھپ چھپا کر اس کی نگرانی کی جائے گی۔ اس نے گھر آکر صنم کو ساری باتیں بتائیں۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ لوگ تو اب تم پر شبہ کرتے رہیں گے اور جب تک یہ سلسلہ رہے گا' یعقوب' ارجن بن کر میرے ساتھ نہیں رہ پائے گا۔"

"ہاں۔ موساد والوں کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ کس دن اُن کا سر پھرے گا اور وہ اچانک یہاں آکر مجھے پھر انکوائری کے لیے لے جائیں گے۔ اگر میری جگہ یعقوب ہوگا تو اُن کی حراست میں جاتے ہی بھید کھل جائے گا۔"

صنم نے اپنے فون کی سم بدل کر ایک جاں نثار سے رابطہ کیا۔ پھر اسے بتایا کہ ارجن ورما اور موساد والوں کے درمیان کیا باتیں ہو چکی ہیں اور وہ موساد والے اسے رہا کرنے کے باوجود اس پر شبہ کر رہے ہیں۔ آئندہ ارجن ورما کی کڑی نگرانی کی جائے گی۔

جاں نثار نے کہا۔ "ہمیں یہی اندیشہ تھا۔ اب کو ارجن ورما بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ موساد یا سی آ والے کسی وقت بھی اچانک محاسبے کے لیے پہنچ سکتے ہ

اس نے پوچھا۔ "اگر یعقوب یہاں ارجن بن کر نہ سکیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ میں اس گھر میں ان کے بغیر نہ رہ سکوں گی۔ باہر کہیں مل بھی نہیں سکوں گی۔ کسی اور حیثیت سے ساتھ اس ملک میں زندگی نہیں گزار سکوں گی۔ پھر ہوگا کیا

"آپ میری کال کا انتظار کریں۔ یہ کہ کریں۔ میں ابھی آپ سے بات کروں گا۔"

جاں نثار نے صنم سے رابطہ ختم کرنے کے مخاطب کیا۔ ان کے حالات بتائے پھر پوچھا۔ "اب چاہیے؟ کیا یعقوب بابا کو وہاں رہنا چاہیے؟"

میں نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ وہ وہاں مختلف بہروپ رہ سکتا ہے۔ لیکن صنم سے نہیں مل پائے گا اور صنم وہ گھر جائے گی' کسی اور بہروپ میں یعقوب سے ملتا موساد اور سی آئی اے والوں کی نظروں میں آجائے گی

"جی ہاں۔ اب یہ دونوں میاں بیوی بن کر نہیں رہ سکیں گے۔ وہاں سے نکل کر کسی دوسرے ازدواجی زندگی گزار سکیں گے۔"

"یعقوب سے کہو' اٹلی واپس آجائے۔ ادھر بہو رنجنا کی حیثیت سے ارجن ورما کے ساتھ واپس آ گی۔ ارجن ورما کو دوبارہ اٹلی آنے سے کوئی نہیں روک گا۔ کیونکہ وہ وہاں ملازمت کر رہا ہے۔"

جاں نثار نے فون پر صنم کو مخاطب کیا۔ پھر کہا نے آپ دونوں کے مسئلے پر آقا سے بات کی ہے نے ہدایت کی ہے کہ آپ ہندوستان چھوڑ دیں۔ ارجن کے ساتھ اٹلی آجائیں۔"

"میں یعقوب کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

"ہم آپ کو اُن سے جدا نہیں کر رہے ہیں وہیں آئیں گے۔"

پھر جاں نثار نے یعقوب کے پاس آکر فو ذریعے مجھ سے بات کرائی۔ وہ میری آواز سننے کرنے کے بعد بولا۔ "او پاپا! آپ کہاں ہیں؟ کب گے؟ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"بیٹے! وہاں انتظار نہ کرو۔ موساد اور سی آئی والے ارجن ورما پر شبہ کر رہے ہیں۔ اس کی کڑی جاری ہے۔ تم دوبارہ ارجن ورما بن کر میری بہو




Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

نہیں رہ سکو گے۔ بہتر ہے' انڈیا چھوڑ دو۔ اٹلی واپس آجاؤ۔ صنم بھی وہیں پہنچ جائے گی۔"

"اس کا مطلب ہے' اب آپ سے ہندوستان میں یا پاکستان میں ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میں پھر ناکام و نامراد جاؤں گا؟ یہ بھی کوئی نامرادی ہے کہ دادا جان سے بھی نہ مل سکا۔"

"بیٹے! وہ تقریباً ڈھائی برس سے لاپتا ہیں۔ اس دنیا میں ہیں بھی یا نہیں' یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ اگر ہوں گے تو کہیں نہ کہیں' کبھی نہ کبھی ہم سب ایک دوسرے سے ضرور ملیں گے۔ بہرحال تمہاری روانگی کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔"

"پاپا! جاں نثاروں سے کہیں' میں اُسی دن' اُسی فلائٹ سے جاؤں گا' جس فلائٹ میں میری صنم اٹلی تک سفر کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ جو چاہتے ہو' وہی ہوگا۔"

دوسرے دن سی آئی اے کے دفتر میں موساد کے افسران بھی تھے۔ ایک جونیئر افسر نے چند کاغذات پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ارجن ورما کی درخواست ہے۔ سفارت خانے میں آئی ہے۔ وہ اٹلی واپس جانے کے لیے ویزا حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ہم نے پرسوں ہی اسے حراست میں لے کر اس کا محاسبہ کیا تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے ہمارے تمام سوالوں کے جواب دیتا رہا تھا لیکن اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ اتنی جلدی اٹلی واپس جائے گا۔"

دوسرے افسر نے کہا۔ "جب واپس آ گیا ہے تو پھر وہاں کیوں جائے گا؟"

ایک اور نے کہا۔ "شاید ملازمت چھوڑ کر نہیں آیا تھا۔ اس لیے واپس جا رہا ہے۔ ہم اسے روک نہیں پائیں گے۔"

"ہم روکنا چاہیں گے تو اس کا باپ بھی نہیں جا سکے گا۔ ہمیں یہ سوچنا سمجھنا چاہیے کہ اچانک اس نے اٹلی جانے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

ایک بوڑھے خرانٹ جاسوس نے کہا۔ "سیدھی سی بات سمجھ میں آتی ہے' وہ وہاں گاڈ فادر نامان کے لیے کام کر رہا ہے اور نامان کی رشتے داری شہزادہ سلمان سے ہے۔ ہو سکتا ہے' یہ ارجن گاڈ فادر نامان کے زیر سایہ رہ کر تھری ایس کے لیے کام کرتا ہو۔ اسی کے کام سے شاید اچانک وہاں جا رہا ہو۔"

اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے' کیا اسے ویزا دے دیا جائے؟"

بوڑھے نے کہا۔ "ضرور دیا جائے۔ اگر ہم نے ٹھوس پلاننگ کے ساتھ کام کیا تو ارجن ورما کے ذریعے ہم تھری ایس تک ضرور پہنچ جائیں گے۔"

افسر نے پوچھا۔ "پلاننگ کیا ہو سکتی ہے؟ آپ کے ذہن میں اس کی کوئی آؤٹ لائن ہے تو ہمیں بتائیں؟"

بوڑھے جاسوس نے کہا۔ "ہم پرسوں ارجن کو حراست میں رکھ کر اس سے باتیں کرنے کے دوران ویڈیو فلم تیار کرتے رہے تھے۔ گفتگو کا انداز' اس کا لب اور اس کا اٹھنا بیٹھنا ہمیں معلوم ہے۔ ہمارا بہروپیا اس کی نقالی کرے گا۔"

ایک افسر نے پوچھا۔ "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ویزا جاری کیا جائے گا' اس پر ارجن کی جگہ ہمارا بہروپیا جائے گا اور ارجن ورما کو غائب کر دیا جائے گا؟"

"جی ہاں۔ ہمارا وہ بہروپیا بہت ہی تجربہ کار ہے۔ وہ ارجن ورما بن کر تھری ایس کے قریب پہنچ جائے گا اور اس کے متعلق ہمیں انفارمیشن پہنچاتا رہے گا۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "ہماری پلاننگ اس سے بھی آگے بہت کچھ ہے۔ ہمارے ڈپارٹمنٹ میں ایک ہی تیز طرار لڑکی ہے۔ وہ رنجنا کی جگہ لے سکتی ہے۔ ہم چاہیں گے' اصلی رنجنا کو بھی غائب کر دیں گے۔"

ایک افسر نے پوچھا۔ "کیا ہمارے ڈپارٹمنٹ کے بہروپیے ارجن ورما اور رنجنا کی جگہ کامیابی سے اپنے فرائض ادا کرتے رہیں گے؟ آپ کو یقین ہے' تھری ایس کو یا کسی کو ان پر شبہ نہیں ہوگا؟"

"مجھے اپنے ڈپارٹمنٹ کے بہروپیے جاسوس پر پورا بھروسا ہے۔ اگر وہ بدنصیبی سے پکڑے جائیں تو ہمارا کیا نقصان ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ ہمارے دو جاسوس کی جان جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے تھری ایس کے کام کرنے والی رنجنا اور ارجن ورما ہمارے ہاتھوں مارے جائیں گے۔"

ایک افسر نے پوچھا۔ "ہمارے جاسوس کتنے دن میں رنجنا اور ارجن کی جگہ لے سکیں گے؟"

"تقریباً چھ سات روز درکار ہوں گے۔ ویزا جاری کرنے سے پہلے یہ کہا جائے گا کہ وہ دونوں ہفتے تک موساد کی آبزرویشن میں رہیں گے۔ ہمارے جاسوس دن رات ان کے ساتھ رہا کریں گے۔ جب اطمینان ہو جائے گا' تب ایک ہفتے بعد انہیں ویزا دے دیا جائے گا۔"

ایک اور بوڑھے جاسوس نے کہا۔ "ان سات دنوں میں ہمارے دونوں بہروپیوں کی پلاسٹک سرجری ہوتی



گی اور وہ رنجنا اور ارجن ورما کی ایک ایک بات کی' ایک ایک حرکت کی نقل کرتے رہیں گے۔"

موساد والے میرے خلاف بہت ہی ٹھوس پلاننگ کر رہے تھے۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے رنجنا اور ارجن کی ڈمی بنا رہے تھے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے تو میری بہو ارجن کے ساتھ ان کے ہاتھوں ماری جاتی۔

اور اگر وہ بہروپنے ناکام ہوتے تو ہمارے ہاتھوں مارے جاتے۔ جرائم کی دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ اپنے لہو کے رشتے بھی قربان ہو جاتے ہیں۔ میرے پاپا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ دشمنوں سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے تھے۔

آئندہ میری بہو کے ساتھ بھی یہی ہونے والا تھا۔ اور ہم سب اس بات سے بے خبر تھے۔ موساد والوں نے ان دونوں کو اس طرح آبزرویشن میں رکھا تھا کہ ان کے ڈپارٹمنٹ کی دو جوان لڑکیاں اور دو جوان مرد صبح ارجن ورما کے گھر آ جاتے تھے۔ وہاں صبح سے شام تک صنم اور ارجن کے ساتھ ہنستے بولتے رہتے تھے۔ ان کے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں بھی ساتھ رہتے تھے۔ اگر وہ دونوں کہیں باہر شاپنگ کے لیے جاتے' کسی تقریب میں جاتے یا کسی رشتے دار سے ملنے جاتے تو وہ ہر جگہ ان کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔

دو دنوں کے بعد ان چار کی تعداد کم ہو گئی۔ صرف ایک جوان لڑکی اور ایک جوان مرد ان کے ساتھ رہنے لگے۔ جو غیر حاضر ہو گئے تھے' دراصل وہی دو بہروپیے تھے' جن کی اب پلاسٹک سرجری ہو رہی تھی۔ انہیں رنجنا اور ارجن ورما بنایا جا رہا تھا۔

یعقوب اپنی صنم سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ مگر دل کو اطمینان تھا کہ ایک ہفتے بعد وہ اٹلی جاتے وقت اس کے ساتھ ہوائی جہاز میں سفر کرے گا۔

اور جانے سے پہلے' انڈیا چھوڑنے سے پہلے اس کا دل اپنے دادا جان کے لیے تڑپ رہا تھا۔ شاید وہ اس دنیا میں نہیں تھے لیکن اس کی دادی نانی تھی اور اس سے ہونے والی اولاد بھی تھی۔ بدنصیبی ایسی تھی کہ وہ ان سے بھی نہیں مل پا رہا تھا۔

وہ ہر نماز کے بعد دعا میں مانگتا تھا کہ کم از کم لہو کے ایک رشتے کو ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

وہ تقریباً نیس برس تک یہودی ماں کے سائے میں یہودیوں کے ماحول میں پرورش پاتا رہا تھا۔ صرف ایک محالا لہو کے رشتے سے اس کی ماں تھی۔ اس کے بعد اب تک کسی رشتے نے اسے گلے نہیں لگایا تھا۔ مجھ سے بھرپور پیار اور میر پرستی مل رہی تھی۔ لیکن وہ بھی فون کے ذریعے مل رہی تھی۔ ہم باپ بیٹے اب تک ایک دوسرے کے روبرو نہیں آئے تھے۔

میری آواز کی اور میرے پاپا کی آواز کی ریکارڈنگ میرے جاں نثاروں کے پاس محفوظ رہتی تھی۔ وہ ان سے کبھی کبھی کہتا تھا کہ آج پاپا کی آواز سننا چاہتا ہوں۔ پھر کسی دن کہتا تھا' اپنے دادا جان کی آواز سننا چاہتا ہوں۔

تب وہ جاں نثار اسے فون کے ذریعے کبھی میری اور کبھی اس کے دادا جان کی آوازیں سناتے تھے۔ وہ لہو کے رشتوں سے محروم رہنے والا ہماری آوازیں سن کر بڑے ہی جذباتی انداز میں گم ہو جاتا تھا۔ تصور میں مجھے اور اپنے دادا جان کو دیکھتا رہتا تھا۔

ایک روز وہ جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔ بڑے جذبے سے کہہ رہا تھا۔ "اے پروردگار! میں نے اب تک اپنے پاپا اور دادا جان کو نہیں دیکھا ہے۔ لیکن یہاں جو موجود ہیں' انہیں تو ایک نظر دیکھ لوں۔ یا اللہ! میں جانے سے پہلے اپنی دادی کو اور اپنے دادا کے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ نماز پڑھنے کے بعد مسجد کے وسیع و عریض صحن میں آیا۔ اس کی نظر ایک بچے پر پڑی۔ وہ بہت دور سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ چار یا پانچ برس کا ہوگا۔ اس نے پاجامہ اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی صاف ستھرا اور اجلا اجلا سا تھا۔ اس کی طرف بے اختیار دل کھنچا جا رہا تھا۔

یعقوب نے سوچا' وہ تنہا کیوں ہے؟ اگر کسی کے ساتھ آیا ہے تو کوئی اس کے ساتھ نظر کیوں نہیں آ رہا ہے؟

وہ سوچتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا تو وہ پلٹ کر سیڑھیوں سے اترتا ہوا اس سے دور جانے لگا۔ جامع مسجد بہت اونچائی پر ہے۔ اس کے نشیب میں ایک بہت بڑا بازار ہے۔ وہ بازار کی طرف جا رہا تھا۔

یہ حیرانی کی بات تھی کہ ایک بچہ تنہا تھا اور بازار کی بھیڑ میں گم ہونے جا رہا تھا۔ یعقوب تیزی سے چلتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ واقعی بازار میں عورتوں مردوں کے درمیان کبھی نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا' کبھی اس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی اور یعقوب بھیڑ سے گزرتا ہوا اس کے پاس پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آخر وہ بچہ بازار کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ سامنے ایک شاہراہ پر گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ یعقوب نے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا' وہ فٹ پاتھ پر تھا اور اب زیبرا کراسنگ سے گزر رہا تھا۔

یعقوب دوڑتا ہوا فٹ پاتھ پر پہنچا تو سگنل گرین ہو گیا' گاڑیاں تیزی سے گزرنے لگیں۔ وہ سڑک پار نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑیوں کی بھیڑ کے اس پار وہ بچہ دوسرے فٹ پاتھ پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

پھر اپنے ننھے ننھے پاؤں سے ایک طرف چلنے لگا۔ یعقوب اس بچے تک پہنچنے اور اس کے متعلق جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وہ اتنے بڑے شہر میں اتنی بھیڑ میں تنہا کیوں ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟

سگنل سبز سے سرخ ہو گیا۔ گاڑیاں رک گئیں۔ وہ تیزی سے زیبرا کراسنگ پار کرتا ہوا دوسرے فٹ پاتھ پر آیا بچہ بہت دور تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف جانے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ فاصلہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا' وہ بچہ ایک اسپتال میں داخل ہو رہا تھا۔

یعقوب اسپتال کے اندر آیا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسپتال کے کسی دوسرے حصے میں چلا گیا تھا۔ یعقوب اسے ڈھونڈتا ہوا ایک لیڈی ڈاکٹر کے چیمبر کے قریب پہنچا۔ چیمبر کے باہر کئی خواتین لیڈی ڈاکٹر سے کنسلٹ کرنے آئی تھیں۔ وہاں بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔

وہ بچہ وہیں ایک خاتون کی گود میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ یعقوب وہاں پہنچا تو دونوں کی نظریں ملیں۔ اس بچے کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اور عجیب سی کشش تھی۔

اس عورت کے لباس سے پتا چل رہا تھا کہ مسلمان ہے۔ یوں بھی اس کا وہ بچہ جامع مسجد میں آیا تھا اور یعقوب کو اپنے پیچھے لگا کر اسپتال تک لے آیا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر خاتون کو سلام کیا۔ پھر کہا۔ "آپ نے اپنے بچے کو باہر جانے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ یہ بہت دور چلا گیا تھا۔"

وہ بولی۔ "جی ہاں۔ یہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا تھا۔ لیکن میں اسے روکتی ٹوکتی نہیں ہوں۔ یہ جہاں بھی جاتا ہے' خیر خیریت سے واپس آ جاتا ہے۔ حالانکہ عمر زیادہ نہیں ہے۔ ابھی بہت چھوٹا ہے۔"

یعقوب نے حیرانی سے پوچھا۔ "ماشاءاللہ قد اور جسامت سے چار پانچ برس کا لگتا ہے۔"

خاتون نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "ہاں۔ یہ اپنے باپ پر گیا ہے۔ اس کے پاپا بہت ہی قد آور تھے۔ ہاتھی جیسا ڈیل ڈول رکھتے تھے۔"

یعقوب نے پوچھا۔ "تھے کا مطلب کیا ہوا؟ کیا اب نہیں ہیں؟"

خاتون کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "اللہ کرے' وہ اس دنیا میں موجود ہوں۔ میرا دل کہتا ہے' وہ میرے بچے کے سر پر سایہ بننے کے لیے ضرور واپس آئیں گے۔"

اپنے شوہر کے لیے اس عورت کے دل میں اور لہجے میں اتنا درد و کرب چھپا ہوا تھا کہ سننے والے ضرور متاثر ہوتے ہوں گے۔ یعقوب بھی متاثر ہوا تھا۔ کیونکہ اس کا غم اس کا دکھ بھی یہی تھا۔ اس کے بھی دادا جان نہیں گم ہو گئے تھے۔ واپس نہیں آ رہے تھے۔

اس دوران وہ بچہ یعقوب کو ایسی لگن سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے چھونا چاہتا ہو' اس کے گلے لگنا چاہتا ہو۔ ایسے وقت لیڈی ڈاکٹر کے چپڑاسی نے آواز لگائی۔ "مسز ثنا غازی آ جائیں۔"

یعقوب ایکدم سے چونک گیا۔ ثنا نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

یعقوب کا دل اور دماغ اپنی دادی کی طرف کھنچ جا رہا تھا۔ وہ بڑے جذبے سے' بڑی لگن سے دیکھ رہا تھا۔ "یہی میری دادی ہیں۔ میرے دادا کی شریک حیات ہیں۔ کیا میں ان کے گلے نہیں لگ سکتا؟"

وہاں یہ ممکن نہیں تھا۔ نہ وہ خود کو ان پر ظاہر کر سکتا تھا اور نہ ہی ظاہر کرنا دانشمندی تھی۔ یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ آس پاس اسپتال کے اندر یا باہر سی آئی اے اور موساد کے جاسوس موجود ہوں گے' اس کی دادی کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔

وہ اپنی دادی کو چھو بھی نہ سکا۔ لیکن ثنا نے بچے کو پیار سے کرسی پر بٹھا کر وہاں سے جاتے ہوئے دوپٹے کو درست کیا تو اس کا ایک سرا یعقوب کو چھو کر گزر گیا۔ ان لمحات میں جیسے جنت کی مہک آئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی دادی لیڈی ڈاکٹر کے چیمبر میں چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی بچہ کرسی پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں بازوں پھیلا دیے۔ یعقوب نے لپک کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سینے سے لگا کر اس کے چہرے کو جگہ جگہ سے چومنے لگا۔ وہ بھی اسے پیار کر رہا تھا۔

پھر وہ بچہ اس کے گلے لگ گیا۔ اس طرح لگا کہ یعقوب کی نظروں سے اس کا چہرہ اوجھل ہو گیا اور بچے کی



نظروں سے یعقوب کا چہرہ اوجھل ہو گیا۔ ایک دوسرے کے گلے لگنے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ گلے لگنے والے ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے۔

تب ہی یعقوب نے وہ بھاری بھرکم' دل میں اتر جانے والی آواز سنی۔ جاں نثاروں نے کئی بار اسے دادا جان کی آڈیو ریکارڈنگ فون کے ذریعے سنائی تھی۔ وہ آواز اور لب و لہجہ اس کے دل میں اور دماغ میں نقش ہو گیا تھا۔

اب وہی بھاری بھرکم لہجہ اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ "ضمنم کو وہاں سے نکالو۔ میری بہو کو بچاؤ۔"

یعقوب ایکدم سے چونک گیا۔ اسے یوں لگا' جیسے دادا جان آ گئے ہیں اور گلے لگ کر اس سے بول رہے ہیں۔ اس نے بچے کو ذرا الگ کر کے دیکھا تو وہ ایک معصوم سا بچہ تھا۔ اس کے چہرے سے اور آنکھوں سے بڑی معصومیت جھلک رہی تھی۔ کوئی بزرگی نہیں تھی۔

اس نے پوچھا۔ "ابھی تم نے میرے کان میں کچھ کہا ہے؟"

وہ بڑی معصومیت سے بچوں جیسی آواز میں بولا۔ "آپ یہاں سے جائیں۔"

اس نے پھر پوچھا۔ "پلیز۔ اتنا بتا دو' ابھی تم نے میرے کان میں کچھ کہا ہے؟"

اس نے پھر اپنی بات دہرائی۔ "پلیز۔ آپ یہاں سے جائیں۔"

وہ زبردستی اس کی گود سے اتر گیا۔ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے ایسی بزرگی' ایسا رعب و دبدبہ جھلکنے لگا' جیسے اس کے دادا جان اسے دیکھ رہے ہوں۔

وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ حالانکہ آگے بڑھ کر پھر گلے لگنا چاہتا تھا۔ لیکن پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ذرا دور ہو کر اس نے دیکھا تو بچے نے آنکھیں بند کر لیں۔ یعقوب کی موجودگی سے بے نیاز ہو گیا۔

ایسے ہی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے فون کو کان سے لگایا۔ ایک جاں نثار نے کہا۔ "یعقوب بابا! آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ اپنی دادی کے پاس پہنچ گئے ہیں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے اور آپ اس وقت کتنے ہی دشمنوں کی نظروں میں آئے ہوئے ہیں۔ پلیز یہاں سے فوراً نکلیں اور میرا کالنگ نمبر فوراً ڈیلیٹ کریں۔ پلیز ہری اپ..."

رابطہ ختم ہو گیا۔ یعقوب نے اس نمبر کو اپنے فون سے مٹا دیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے اٹینڈ کیا تو کوئی لڑکی بول رہی تھی۔ "میں کوئی بھی ہوں۔ یہ نمبر نہ مٹانا۔ تمہارے کام آئے گا۔ ویٹس آل..."

اس نے سر گھما کر بچے کی طرف دیکھا۔ وہاں کرسی خالی تھی۔ وہ نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بچے نے بھی کہا تھا کہ اسے یہاں سے جانا چاہیے اور جاں نثار بھی یہی کہہ رہے تھے۔ لہٰذا وہ تیزی سے چلتا ہوا اسپتال سے باہر جانے لگا۔

ایسے وقت اس نے دیکھا۔ دو افراد اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے اور ایک شخص پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اسپتال کے باہر پہنچتے ہی انہوں نے اسے روک لیا۔ پھر ایک نے اپنا آئی ڈی کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی... پلیز اپنا فون ہمیں دیں۔"

یعقوب نے فون اس کے حوالے کیا۔ اس نے ریسیونگ کال کی لسٹ پر نمبر پڑھے۔ پھر اپنے ماتحت سے کہا۔ "یہ نمبر نوٹ کرو۔ ابھی تین بج کر پانچ منٹ پر کال آئی ہے۔ معلوم کرو' کس نے کال کی ہے؟ کسے کی ہے؟"

ماتحت نمبر نوٹ کر کے وہاں سے ذرا دور چلا گیا۔ پھر فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی نے یعقوب سے پوچھا۔ "تم مسز ثنا غازی کو کیسے جانتے ہو؟ کب سے جانتے ہو؟"

"میں اس خاتون کو نہیں جانتا۔ ہاں ان کا بیٹا نام سنا ہے۔ چپڑاسی انہیں ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہہ رہا تھا۔"

"تمہارا کوئی تو تعلق ان سے ہوگا۔ تب ہی ملنے آئے تھے۔"

"میں کہہ تو رہا ہوں' اس خاتون کو اب سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ اس بچے کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر پہلے اسپتال کے باہر فٹ پاتھ پر بالکل تنہا تھا۔ مجھے تجسس پیدا ہوا کہ وہ اکیلا کیوں ہے؟ اس کے ساتھ کوئی بزرگ کیوں نہیں ہے؟ اگر آپ یہاں بہت پہلے سے ہیں تو آپ نے بھی اس بچے کو باہر سے آتے ہوئے دیکھا ہوگا؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔ وہ بچہ باہر گیا تھا۔ پتا نہیں کب گیا تھا؟ جب واپس آیا تو تم اس کے پیچھے چلتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔"

"پھر تو آپ کو سمجھنا چاہیے کہ میں بچے سے متاثر ہو کر آیا تھا۔ اس کی ماں کو نہیں جانتا تھا۔ باقی دادے معاملہ کیا ہے؟ وہ خاتون کون ہیں؟ کیا اس سے کسی کو بات نہیں کرنا چاہیے؟"

اس ماتحت نے افسر کے پاس آ کر فون بڑھاتے

ہوئے کہا۔ ”سر! اس نمبر پر رابطہ ہو گیا ہے۔“

افسر نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو۔ تم کون ہو؟“

ایک سریلی سی آواز سنائی دی۔ ”ہائے۔ ابھی میں نے اس نمبر پر فون کیا تھا۔ مگر وہ مرغا پھنسا نہیں۔ میری آواز سن کر اس نے فون بند کر دیا۔ بائی دا وے تم کون ہو؟ تمہاری عمر کیا ہے؟ میری آواز سے اندازہ کر سکتے ہو کہ بھرپور ہوں۔“

آفیسر نے شٹ اپ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر اسے یعقوب کو دیتے ہوئے کہا۔ ”تم جا سکتے ہو۔“

وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوا پھر جامع مسجد کے قریب آ گیا۔ وہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسٹیرنگ سیٹ پر آ گیا۔ ایسے ہی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے ایک جاں نثار نے کہا۔ ”آپ نے دیکھ لیا‘ کس طرح آپ کی دادی جان کی نگرانی کی جا رہی ہے؟ میرا فون نمبر نہ ملاتے تو مشکل میں پڑ جاتے۔“

اس نے پوچھا۔ ”یہ مجھے فون کرنے والی کون تھی؟“

”ایک کال گرل ہے۔ ہمارے لیے بھی کبھی کام کرتی ہے۔ آج بھی کام آئی ہے۔“

”میں ابھی پاپا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بہت اہم بات ہے‘ جو آپ بھی سن لیں۔ میری صنم خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ مجھے ابھی خبر ملی ہے کہ صنم کو اس گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔ اسے وہاں سے نکالنا ہے اور انجانے خطرات سے بچانا ہے۔“

میرے جاں نثاروں نے مجھے یعقوب کا پیغام پہنچایا۔ میں نے اس سے فون پر بات کی۔ اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے بیٹے...؟ تمہیں یہ خبر کہاں سے ملی ہے؟“

”پاپا! کیا آپ یقین کریں گے کہ میں نے دادا جان کی آواز سنی ہے؟“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے معلوم ہوا ہے‘ تم میرے ننھے سے بھائی صلاح الدین ثانی کے پیچھے دوڑتے ہوئے اپنی دادی تک پہنچ گئے تھے۔“

”جی ہاں۔ دادی تو لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھیں۔ میں نے صلاح الدین ثانی کو پیار کیا تھا۔ اسے گلے لگایا تھا۔ گلے لگتے ہی مجھے اپنے کان میں دادا جان کی آواز سنائی دی تھی۔ جاں نثاروں نے اب سے پہلے کئی بار ان کی آواز فون کے ذریعے مجھے سنائی تھی۔ میں نے سننے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ دادا جان کی آواز اور ان کا لب و لہجہ میرے دل و دماغ میں نقش ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”انہوں نے کیا کہا تھا؟“

”انہوں نے کہا ہے کہ صنم کو وہاں سے نکالو۔ میری ... کو بچاؤ... اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ میں نے صلاح الدین ثانی کو بڑی توجہ سے دیکھا ہے۔ وہ بہت ... ہے۔ اس کی آواز میں بھی معصومیت ہے۔ لیکن آپ ... بتائیں‘ میں نے دادا جان کی آواز کیسے سن لی؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ یہ ایسا معما ہے‘ جو ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا۔ اب سے پہلے جب صلاح الدین ... ہوا تھا تو تمہارے دادا جان نے فون کے ذریعے اس کے ... میں اذان سنائی تھی۔ جبکہ وہ جسمانی طور پر کہیں نظر نہیں آ... ہیں۔ بابا سائیں کے غار میں جانے کے بعد پتا نہیں کہاں ... ہو گئے ہیں؟“

”پاپا! اپنی بہو کے لیے کچھ کریں۔ اسے ارجن ورما ... گھر سے نکالیں۔ اس پر دشمنوں کا سایہ تک نہ پڑنے دیں۔“

”تم اطمینان رکھو۔ میں اپنی بہو پر آنچ بھی نہیں آ... دوں گا۔ یہ سمجھ لو کہ اس کے قریب آنے جانے والے دشمنو... کا وقت پورا ہو چکا ہے۔“

ہم باپ بیٹے کے درمیان مختصر سی گفتگو ہوا کر... تھی۔ میں فون پر لمبی بات کرنے سے پرہیز کرتا تھا۔ اندیشہ رہتا تھا کہ ہماری کال پکڑی جائے گی اور یہ اطمینا... بھی ہوتا تھا کہ ہم تک پہنچنے والوں کو بڑے پاپڑ بیلنے ... گے۔ کیونکہ ہم سم بدل کر بات کیا کرتے تھے۔

میں نے جاں نثاروں سے کہہ دیا کہ صنم کو وہاں ... اس طرح نکالو کہ ہم پر کسی کو شبہ نہ ہو۔ دشمن یہی رائے قا... کریں کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ جب تک وہ اپنی مطلوب... کو تلاش کرتے رہیں گے‘ ہم اپنی صنم کو ہندوستان کی سرحد ... کرا دیں گے۔

☆☆☆

میسونی تنظیم کے مرکزی دفتر میں اعلیٰ افسروں ... یہودی جاسوسوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ سب محالا اور ... مین سے ملنے آئے تھے۔ راز مین کی دونوں ہتھیلیاں ... تھیں۔ پہلے دو آنکھیں تھیں‘ اب ایک چراغ گل ہو گیا تھا۔ ... کانا ہو گیا تھا اور یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کا ایک گردہ بھی ن... لیا گیا ہے۔

اس کی حالت دیکھ کر سب ہی کو تھوڑی دیر کے ... چپ لگ گئی تھی۔ کوئی سہم گیا تھا‘ کوئی غصے سے کھول ر... کوئی قسمیں کھا رہا تھا کہ تھری ایس کے ساتھ اس سے ... زیادہ برا سلوک کیا جائے گا۔ ایسی حالت کر دی جائے گی کہ ... لوگ اس کی لاش دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگیں گے۔

راز مین کو ایسا شاک لگا تھا کہ وہ بولنے کے قابل نہیں ... رہا تھا۔ اکثر ہوش و حواس میں نہیں رہتا تھا۔ بہکی بہکی باتیں ... کرتا رہتا تھا۔

محالا نے کہا۔ ”تھری ایس نے میرے ساتھ ایسا ... سلوک نہیں کیا۔ یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میرے بیٹے جے کوب (یعقوب) کے طفیل مجھے جسمانی اذیتیں نہیں دے رہا ہے‘ نہ ... ہی اپاہج بنا رہا ہے۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اس نے بہت ... زبردست دماغی صدمہ پہنچایا ہے۔ میرے بیٹے سے مجھے ... الگ کر دیا ہے۔ فون پر بھی اس سے بات کرنے نہیں ... دیتا۔ اگر وہ میرے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ میری بھی آنکھیں ... نکال دیتا تو مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی‘ جتنی اب ہو رہی ... ہے۔ میرا خدا ہی جانتا ہے‘ میں اپنے بیٹے کے لیے کیسے تڑپ ... رہی ہوں؟“

میسونی تنظیم کے موجودہ سربراہ ہوف مین نے ... کہا۔ ”تھری ایس ایک طویل مدت سے بے لگام ہوتا چلا ... رہا ہے۔ ہماری دنیا کی تمام خطرناک تنظیمیں اس کے ہو کی ... ہوئی ہیں۔ کئی بار اسے گولیوں سے چھلنی کیا گیا‘ بعد میں پتا ... چلا کہ اس کی ڈمی ماری گئی ہے‘ وہ زندہ و سلامت ہے۔“

”اکثر یہی ہوتا ہے‘ اس کی جگہ اس کے ہمشکل مارے ... جاتے ہیں اور ہم اپنے مشن میں ناکام رہتے ہیں۔ پتا نہیں ... اس کے کتنے ہمشکل ہیں؟ بڑی کامیابی سے ہمیں دھوکا دیتے ... رہتے ہیں۔“

”آخری بار راز مین نے اسے بڑے ہی آہنی شکنجے ... میں لیا تھا۔ ایک تہ خانے میں قید کر دیا تھا۔ وہاں سے ایک ... چیونٹی بھی باہر نہیں نکل سکتی تھی مگر وہ پھر ہاتھوں سے نکل گیا۔“

”ہمیں تو یقین نہیں ہے۔ مگر کہتے ہیں‘ اس کے پاس ... دو چیزیں ہیں۔ ایک عصا اور ایک انگوٹھی ہے۔ ان کے ... ذریعے وہ سمندر کی گہرائیوں سے بھی نکل آتا ہے۔“

محالا نے ہوف مین سے کہا۔ ”آپ نے دیکھا نہیں ... ہے اس لیے یقین نہیں کریں گے۔ لیکن میں نے اور راز مین ... نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہماری قید میں تھری ایس ... ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ بستر پر ... کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ پھر پتا نہیں وہ لاوہ انگوٹھی اور ... عصا کیسے اس کے پاس پہنچ گیا؟ اس کے ساتھ ہی اس میں ... غضب کی توانائی اور بلا کی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ لڑتا ہوا

## تشنج کا باعث

چوبیس گھنٹوں میں ہمارے جسم
میں جو توڑ پھوڑ اور جوڑ توڑ ہوتی ہے
اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ
- ہمارا قلب ۱۰۳۶۸۹ مرتبہ حرکت کرتا ہے۔
- ہمارا خون ۱۶۸,۰۰۰,۰۰۰ میل کا سفر کرتا ہے۔
- ہم ۲۳۰۴۰ مرتبہ سانس لیتے ہیں۔
- ہم ۳ء۲۵ پاؤنڈ غذا ہضم کرتے ہیں۔
- ۸۵ء۰ پنٹ (تقریباً ایک بوتل) پسینہ خارج کرتے ہیں۔
- ۸۵ء۴۰۵ درجے فارن ہائیٹ گرمی خارج کرتے ہیں۔
- ۵۰۰ ٹن توانائی اپنا خرچ کرتے ہیں۔
- ۴۸۰۰ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہیں۔
- دماغ کی ستر لاکھ رگوں کو استعمال کرتے ہیں۔

پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ ہم پر تھکاوٹ طاری ہو جاتی ہے۔

اور مسلح محافظوں کو مات دیتا ہوا ہمیں قیدی بنا کر وہاں سے لے گیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد ہم نے رہائی پائی ہے اور ہمارا یہ حال ہو گیا ہے۔“

ہوف مین نے کہا۔ ”انڈیا سے بھی یہ خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ وہ انگوٹھی اور عصا بہت ہی کمالات دکھا رہے ہیں۔ اب تو وہاں بیشمار لوگ انگوٹھی اور ایک لاٹھی اپنے ساتھ رکھنے لگے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ان دو چیزوں کی موجودگی سے ان کے بیشتر مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ جو بیروزگار ہوتے ہیں‘ انہیں ملازمت مل جاتی ہے۔ کسی کو غیب سے مالی امداد مل جاتی ہے‘ لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے۔“

ایک عہدیدار نے کہا۔ ”تھری ایس کی تنظیم انڈیا میں بڑے ہی منظم انداز میں غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کر رہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ انگوٹھی اور لاٹھی کے ذریعے معجزے ہو رہے ہیں۔ وہ بظاہر تماشے کرتا ہے مگر ان تماشوں کے پیچھے اپنا الو سیدھا کرتا رہتا ہے۔“

”وہ بلا کا مکار ہے۔ طرح طرح کی چالیں چلتا ہے۔ زبردست بہروپیا ہے۔ ایسے ایسے روپ بدلتا ہے کہ ہم اسے پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ بہت کم لوگوں نے اس کی اصلی پیدائشی صورت دیکھی ہے۔“

ہوف مین نے کہا۔ ”ہم نے خوب سوچ سمجھ کر اس کے بیٹے یعقوب کو اس کے حوالے کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے بیٹے کے ذریعے باپ تک ضرور پہنچ پائیں گے۔“

”میں نے اپنے بیٹے کی قربانی دی ہے۔ اس کی شہ

رگ تک پہنچنے کے لیے اپنے بیٹے سے محروم ہوگئی ہوں۔ مجھے یقین ہے' ایک ماں کی قربانی ضائع نہیں جائے گی۔''

ہوف مین نے کہا۔ ''تمہارا یقین درست ہے۔ ہم بڑی حد تک کامیابی حاصل کررہے ہیں۔''

محالا نے پوچھا۔ ''کیا میرا بیٹا آپ لوگوں کی نظروں میں ہے؟ وہ کہاں ہے؟ کیا کررہا ہے؟ میں اس کی آواز سننے کے لیے ترس گئی ہوں۔''

ہوف مین نے کہا۔ ''ہم تمہیں اس کی آواز بھی سنائیں گے اور شاید جلد ہی ملاقات بھی کرائیں گے۔''

''کیا وہ ہمارے جاسوسوں کی نظروں میں رہتا ہے؟''

''کبھی رہتا ہے' کبھی اوجھل ہوجاتا ہے۔ جب ہم نے اسے باپ کے حوالے کرنے کے لیے یہاں سے بھیجا تھا تو وہ اٹلی کے گاڈ فادر نامان کے محل میں گیا تھا۔ اس محل میں ہماری دو جاسوس عورتیں اور ایک مرد عیسائی بن کر رہتے ہیں۔ ان سے یعقوب کے متعلق اہم خبریں ملتی رہتی ہیں۔''

ایک عہدیدار نے کہا۔ ''ہمارے جاسوسوں نے وہاں یعقوب کو چھ ماہ تک دیکھا پھر وہ اچانک گم ہوگیا۔ ایک نوجوان ارجن ورما کے نام سے وہاں ملازمت کے لیے آیا۔ نامان نے اسے ملازم رکھا۔ لیکن اس کے ساتھ اس طرح ہنستا بولتا' اٹھتا بیٹھتا تھا کہ شبہ ہوا جیسے وہ ارجن ورما بہروپیا ہے۔ یہ بھی شبہ ہوا ہے کہ اس ارجن کے پیچھے یعقوب چھپا ہوا ہے۔''

''دو ہفتے بعد ارجن وہاں سے جانے کے لیے روانہ ہوا تو ہمیں اطلاع دی گئی کہ ہم لندن میں ارجن پر نظر رکھیں۔ وہ منسٹر ایشور لال کی حویلی میں گیا تھا۔''

ہوف مین نے کہا۔ ''ہمارے دو جاسوس اس کی نگرانی کررہے تھے۔ لیکن دوسرے ہی دن وہ دونوں مارے گئے۔ ہمیں معلوم نہ ہوسکا کہ کس نے ان پر گولیاں چلائی تھیں؟ لیکن یہ یقین ہے کہ انہیں تھری ایس کے جاں نثاروں نے ہی قتل کیا تھا۔''

''ہمارے آدمی محتاط ہوگئے۔ ان جاں نثاروں کو تلاش کرنے لگے' معلوم کرنے لگے کہ وہ کہاں چھپے رہتے ہیں اور کس بھیس میں رہتے ہیں؟ ان سے نمٹے بغیر ارجن پر یعنی یعقوب پر نظر نہیں رکھی جاسکتی تھی۔''

عہدیدار نے کہا۔ ''ہمارے آدمی منسٹر ایشور لال کے بیٹے منوہر لال سے دھوکا کھا گئے۔ وہ بھی یعقوب کی طرح قد آور تھا۔ ویسی ہی جسامت رکھتا تھا۔ پتا چلا' آدھی رات کے بعد منوہر کہیں چلا گیا ہے۔ منسٹر کی بیوی ہیم لتا کے ساتھ صرف رنجنا اور ارجن رہ گئے تھے۔ ارجن ورما نے رنجنا سے میرج کی تھی۔''

''جب دوسرے ہی دن رنجنا' ہیم لتا اور ارجن انڈیا چلے گئے' تب ان کی ہیرا پھیری سمجھ میں آئی کہ لال ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اسے لندن میں چھوڑ کر نہیں جانا تھے۔ ارجن کو ساتھ لے گئے تھے۔ دراصل ارجن ورما ان کا بیٹا منوہر لال تھا۔ انہوں نے بڑی رازداری سے میک اپ کے ذریعے چہرے بدل لیے تھے۔ ارجن ورما بن گیا تھا اور منوہر' ارجن ورما بن کر اپنی ماں اور رنجنا کے ساتھ انڈیا چلا گیا تھا۔''

محالا نے پوچھا۔ ''یعنی میرا بیٹا یعقوب وہ ہے' جو بن کر راتوں رات کہیں چلا گیا تھا؟''

ہوف مین نے کہا۔ ''ہاں۔ ہم نے تمہارے بیٹے کے بچپن سے یہودی بنائے رکھنے کی کوششیں کیں لیکن اس کے باپ کے پاس جاتے ہی اسلامی طور طریقے اختیار کرکے نماز پڑھنے لگا۔ وہ ہماری نظروں میں ہے۔ چیسس علاقے میں ایک اپارٹمنٹ ہے۔ وہاں رہتا ہے۔''

''ہمارے نگرانی کرنے والوں نے اسے جمعے کے ایک مسجد میں جاکر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اگر وہ منسٹر لال کا بیٹا منوہر لال ہوتا تو کبھی مسجد میں نہ جاتا۔''

محالا نے کہا۔ ''میں نے بیس برس تک اس کی پرورش کی۔ میری تمام تعلیم و تربیت ضائع ہوگئی۔ وہ باپ کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ میں کیا کروں؟ میرے اندر کھلبلی سی ہورہی ہے۔ میں اسے اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہوں۔''

ہوف مین نے کہا۔ ''ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ وقت تھری ایس کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس نے تمہارے بیٹے ہوف مین کے عوض اسے حاصل کیا تھا۔ لیکن حاصل کرنے کے بعد راڈ مین کی جو حالت کی' اس کے پیش نظر ہم انتقامی کارروائی ضرور کریں گے اور یعقوب کو واپس لائیں گے۔''

وہ بولی۔ ''دو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اسے کب تک واپس لائیں گے؟''

''تھری ایس کی چالبازیوں کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ جلد بازی کریں گے تو دھوکا کھا جائیں گے۔''

جاسوس نے محالا سے کہا۔ ''میڈم! آپ یہودی کی حیثیت سے تھری ایس کے بہت قریب رہ چکی ہیں۔ اس کی چالبازیوں کو سمجھ نہیں پارہی ہیں۔ یعقوب ارجن کے بھیس میں انڈیا سے لندن گیا اور ہم یہی دھوکا کھاتے رہے کہ وہی ارجن ورما یعقوب ہے۔ لیکن ایک رات اچانک



منوہر گم ہوگیا۔ کیا کوئی ماں اپنے بیٹے کو بے یارومددگار چھوڑ کر کہیں جاسکتی ہے؟''

محالا نے کہا۔ ''نہیں۔ میں ماں ہوں۔ میں سمجھتی ہوں' اپنے جگر گوشے کے بغیر کس قدر تڑپ رہی ہوں؟ میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں' ہیم لتا اپنے بیٹے منوہر کو ارجن ورما کے روپ میں انڈیا لے گئی ہے اور میرا بیٹا یعقوب منوہر بن کر لندن میں رہ گیا ہے۔''

جاسوس نے کہا۔ ''انڈیا سے ایک لڑکی تعلیم حاصل کرنے لندن آئی ہے۔ اس کا نام پوجا ہے اور منوہر لال سے یعنی یعقوب سے اس کا افیئر چل رہا ہے۔ ہم معلومات حاصل کررہے ہیں۔ وہ لڑکی ایک انڈین لیڈر لکشمن اگروال کی بیٹی ہے۔ پوجا اور منوہر ایک دوسرے کو انڈیا سے جانتے ہیں۔''

''اب یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ پوجا آپ کے بیٹے یعقوب کو منوہر سمجھ کر دھوکا کھا رہی ہے۔ یا پھر پوجا کو یہ معلوم ہوچکا ہے کہ وہ منوہر نہیں ہے' یعقوب ہے۔ اس لڑکی نے اسے یقیناً نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہوگا۔''

محالا نے کہا۔ ''میں عارضی میک اپ کے ذریعے بھیس بدل کر لندن جاؤں گی اور پوجا سے شناسائی پیدا کروں گی۔ اس کے ذریعے دور سے ہی سہی' اپنے بیٹے کو دیکھتی رہوں گی۔ میں ماں ہوں' دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ ہزار بہروپ میں بھی اپنے بیٹے کو پہچان لوں گی۔ اگر وہ میرا بیٹا ہی ہوگا تو آپ لوگ اسے اغوا کرکے یہاں لانے میں دیر نہیں کریں گے۔''

''بیشک۔ ہم جلد سے جلد تھری ایس کی کمزوری اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے ہیں۔''

محالا نے کہا۔ ''شہزادہ سلمان سعدی کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کا کوئی قابل فخر بیٹا نہیں ہے۔ لاہور میں تین بیٹے تھے' جن میں سے دو مارے گئے۔ تیسرے کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ ابنارمل ہے۔''

ہوف مین نے کہا۔ ''تھری ایس نے بے انتہا دولت کمائی ہے اور ناقابل شکست ہونے کی حیثیت سے خوب شہرت حاصل کی ہے۔ وہ دنیا کی تمام خوشیاں خرید سکتا ہے۔ بس ایک اولاد کہیں سے خرید نہیں سکتا اور وہ ایک قابل فخر اولاد تم سے ہونے والا بیٹا یعقوب ہے۔ ہم اسے اس کی بہت بڑی کمزوری بنا کر رکھیں گے۔ وہ ہمارے سامنے جھکنے اور ریڈ مرکری کا سودا کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔''

''میں کل کی فلائٹ سے لندن جاؤں گی۔ وہاں میرا چہرہ اس طرح تبدیل کرایا جائے کہ بیٹا مجھے پہچان نہ سکے۔ اگر منوہر کے بھیس میں میرا بیٹا ہی ہوگا تو میں اسے اپنے کی مہک سے پہچان لوں گی۔ وہ میرے پاس آکر سانس لے گا تو سانسوں کی آنچ کہہ دیں گی کہ وہ میری کوکھ سے نکلی ہیں۔''

وہ بیٹے کی دیوانی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا' اس کے لیے مرتا چلتی رہتی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن لندن کے لیے روانہ ہوگئے۔

اماوس کی دوسری رات آگئی۔ منوہر ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ اس کا ایک کمرا خالی کردیا گیا تھا۔ وہاں سفید چاندنی بچھادی گئی تھی۔ عود اور عنبر کی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی۔ منوہر، مولانا عبدالہادی کے ساتھ عبادت میں مصروف تھا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ اس کے ماں باپ ہیم لتا اور ایشور لال ڈرائنگ روم میں بیٹھے تجسس میں مبتلا تھے کہ کیا ہونے والا ہے؟ کیا آج رات اس پر دماغی دورہ پڑے گا؟ وہ پھر سے پاگل ہوجائے گا اور خودکشی کرنے کے لیے چیخنے چلانے لگے گا؟

پوجا بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی اماوس کی رات کیسے گزرنے والی ہے؟ اس نے کہا تھا۔ ''منوہر! کچھ ایسا کرو کہ میں اس رات تمہارے اپارٹمنٹ میں رہوں۔ تمہارے آس پاس رہ کر معلوم کروں کہ تم خیریت سے ہو یا نہیں؟''

اس نے کہا تھا۔ ''مجھے پورا یقین ہے' جس طرح میرا روحانی علاج ہورہا ہے اور میں عبادت کررہا ہوں' نمازیں پڑھ رہا ہوں تو مجھ پر کوئی شیطانی دورہ نہیں پڑے گا۔''

''میں یہی تو دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔''

''دیکھنے کے بعد کیا ہوگا؟ کیا تم اس علاج کو تسلیم کرلوگی اور اگر تسلیم کرلوگی تو میری زندگی میں آنے سے پہلے اسی طرح عبادت کروگی؟''

وہ منوہر کے بازو سے لگ کر بولی۔ ''تمہارے پیار نے مجھے الجھا دیا ہے۔ تم ہندو ہوکر مسلمانوں کا روحانی علاج قبول کررہے ہو اور اس سے ایک نئی زندگی بھی حاصل کررہے ہو۔ میں سوچ رہی ہوں' مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''یہی جو میں کررہا ہوں۔ شادی کے بعد پتنی اپنے پتی کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ اگر وہ نقش قدم اسے بھلائی کے راستے پر لے جارہا ہے تو ضرور پتی کے خیال اور عقیدے کے مطابق زندگی گزارنا چاہیے۔''

وہ اس ارادے سے منوہر کی زندگی میں آئی تھی کہ اس کی اور اس کے باپ کی کمزوریاں معلوم کرکے اپنے باپ کو سیاسی فائدہ پہنچائے گی۔

اور وہ ایسا کررہی تھی۔ اس نے اپنے باپ تک یہ خبر

پہنچادی تھی کہ منوہر نیم ہندو نیم مسلمان ہے۔

لکشمن اگروال خوش ہوگیا تھا۔ آئندہ الیکشن جیتنے کے لیے اپنے مخالف ایشور لال کی بہت بڑی کمزوری ہاتھ آگئی تھی۔ اگر منوہر ہندوستان جاتا تو وہاں کتنے ہی ہندو اسے نماز پڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔

لیکن وہ انڈیا جانے والا نہیں تھا۔ اس کا باپ ایشور لال وہاں جاکر اپنی کوئی کمزوری اپنی جنتا پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تب لکشمن اگروال نے اپنی بیٹی پوجا سے کہا۔ ''اس کی ایک ہی صورت ہے' جب منوہر نماز پڑھتا ہے۔ اس وقت اس کی چپ چاپ ویڈیو فلم بنائی جائے اور جب آیتیں پڑھے تو اس کی آڈیو ریکارڈنگ کی جائے۔ ہم تمام آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ اپنی جنتا کو دکھائیں گے۔''

منوہر کے انڈیا نہ جانے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے اس کے ادھرمی ہونے کا راز کھلنے والا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایشور لال کا سیاسی کیریئر خاک میں ملنے والا تھا۔ بیٹی نے وعدہ کیا تھا کہ منوہر کی ویڈیو اور آڈیو ریکارڈنگ تیار کرے گی۔

لیکن وہ صرف بیٹی نہیں تھی' محبوبہ بھی تھی۔ سینے میں دل تھا' دل میں دھڑکنیں تھیں اور وہ دھڑکنیں صرف منوہر کو پکارتی تھیں۔ وہ دوراہے پر تھی۔ جس منوہر کو چاہتی تھی' اس کے باپ کے سیاسی کیریئر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے باپ کو اس کے مقابلے میں کامیاب اور کامران دیکھنا چاہتی تھی۔

عقل سمجھا رہی تھی' جب منوہر کے سامنے یہ بھید کھلے گا کہ وہ عیسائی پوجا ایڈوانی نہیں' بلکہ ہندو سیاسی لیڈر لکشمن اگروال کی بیٹی ہے اور اب تک اسے دھوکا دیتی آرہی ہے تو اپنے محبوب کی نظروں سے گر جائے گی۔ وہ کبھی اسے قبول نہیں کرے گا۔

جوانی میں باپ سے زیادہ محبوب حواس پر چھایا رہتا ہے۔ دل میں صرف عاشق کی حکمرانی رہتی ہے اور وہ منوہر سے بہت متاثر تھی۔ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ سوچ رہی تھی' آئندہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ فی الحال یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اماوس کی رات اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

منوہر نے اس کی بے چینی دیکھی تو اسے بڑی رازداری سے اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ ماں باپ کو خبر نہیں ہوئی۔ اس نے پوجا کو اپنے بیڈروم میں چھپادیا۔ پھر جب مغرب کی نماز کے بعد مولانا عبدالہادی تشریف لائے تو وہ ان کے ساتھ عبادت کے کمرے میں آگیا۔ ایک طرف پوجا بیڈروم میں چھپی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ہیم لتا اور ایشور لال روم میں پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ دیکھنا چاہتے تھے کہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

مولانا نے ان سے کہا۔ ''اماوس کی رات بیٹے پر بھاری پڑتی ہے۔ آپ دونوں پریشان نہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری غسل کریں۔ سر سے پاؤں تک اچھی طرح پاک صاف ستھرا لباس پہن کر عبادت کے کمرے آجائیں۔ ہماری عبادت میں مداخلت نہ کریں تو خ موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

انہوں نے یہی کیا۔ مولانا کے بتائے ہوئے سے نہا دھوکر پاک صاف ہوکر اس کمرے میں آ طرف چپ چاپ بیٹھ گئے۔

پوجا نے دبے قدموں آکر کھڑکی سے دیکھا فرش پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کی محد اگربتی کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ منوہر' مولانا کے ساتھ کھڑا ہوا عشا کی نماز ادا کررہا تھا۔ ان کے پیچھے کمر ایک گوشے میں ہیم لتا اور ایشور لال خاموش بیٹھے انہیں کرتے دیکھ رہے تھے۔

منوہر عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد کلام پاک پڑھنے لگا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو بتایا تھا کہ پچھلی کی رات کس قدر ہنگامہ ہوا تھا؟ مہا پجاری شیطا کررہا تھا اور کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے ل تھے۔ شیطانی ہوا کے جھونکے دروازہ توڑ کر اند تھے۔ مگر آنہیں پارہے تھے۔

ایسے وقت مولانا ہادی منوہر کو سمجھاتے رہے کالے جادو اور شیطان کی گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ نقصان نہیں پہنچے گا۔ اپنے دماغ میں صرف یہ خیال کہ اس وقت تم خدائے ذوالجلال کے سامنے حاضر معبود' اس پروردگار کے سوا کوئی تمہارے آگے ہے۔ صرف وہی وہ ہے۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ہیم لتا اور ایشو دیکھ رہے تھے کہ جیسا پچھلی اماوس کی رات ہوا تھا نہیں ہورہا تھا۔ بہت ہی سکون تھا۔ یہ اندیشہ تھا رات کے بعد کچھ ہوگا۔

آدھی رات گزر گئی۔ مولانا بڑی ہی دھیمی آ کلام پاک کی تلاوت کرنے لگے۔ ایک تو عربی الفا تھا' اوپر سے ان کا میٹھا لہجہ تھا۔ ان آیات کے معنی



نہیں سمجھ رہی تھی۔ مگر وہ تلاوت اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ اس کے حواس پر ایک عجیب سا سحر طاری ہورہا تھا۔

اگر انسانی فطرت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس وقت پوجا شاید اس لیے کلام پاک کی تلاوت سے متاثر ہورہی تھی کہ آدھی رات گزرنے کے بعد بھی اس کا منوہر خیر خیریت سے تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس پر شیطانی دورہ نہیں پڑ رہا تھا۔

اس کے ماں باپ ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ ہیم لتا نے اپنے پتی ایشور لال کا ہاتھ تھام لیا۔ وہاں وہ ایک دوسرے سے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ لیکن لتا کی آنکھیں کہہ رہی تھیں ''میرا بیٹا جگ جگ جیوے اور یہ جیئے گا۔ صبح ہونے والی ہے۔ اس پر دورہ نہیں پڑا ہے۔ اس کی بیماری ختم ہوگئی ہے۔ اب یہ کبھی دماغی مریض نہیں رہے گا۔ ہے بھگوان! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تو ہمارے بیٹے کے سر سے بلائیں دور کررہا ہے۔ یہ نیک کام ہمارے پنڈت یا پجاری سے نہیں ایک مسلمان عالم سے کروا رہا ہے۔ یہ تو ہی جانتا ہے کہ ایسا کیوں کررہا ہے؟ تیری لیلا ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ تو جو بہتر سمجھ رہا ہے' وہ کررہا ہے اور جو کررہا ہے' وہ ہمیں منظور ہے۔ ہم تو اپنے بیٹے کی لمبی زندگی چاہتے ہیں۔ ہمارا یہی ایک بیٹا ہے۔ یہ پوجا کرے یا نماز پڑھے۔ مگر جیے اور جیتا رہے۔''

پوجا کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ سر جھکا کر بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے دل ہی دل کہنے لگی۔ ''منوہر! میں اپنے اور اپنے باپ کی سیاسی اڑان بھول گئی ہوں۔ عورت صرف محبت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ وہ ایک بار جس کی ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد پھر کسی کی نہیں رہتی۔ اس کا جیون اس کا سارا استمرار صرف اپنے چاہنے والے سے ہوتا ہے۔ میں تمہارے پیار میں بھیگ رہی ہوں۔ تمہارے رنگ میں رنگ رہی ہوں۔ تم ہندو ہو یا مسلمان... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ آج سے تم جو نہیں ہو' وہ میں نہیں ہوں۔ تم جو ہو' میں بھی وہی ہوں۔''

فجر کی اذان ہوگئی۔ منوہر مولانا کے ساتھ نماز ادا کرنے لگا۔ نماز اور دعا کے بعد وہ پھر سجدے میں گر پڑا۔ خوشی کے مارے روتے ہوئے اللہ اللہ پکارنے لگا۔ اسے تو پہلے ہی یقین تھا کہ علاج ہوچکا ہے' اماوس کی دوسری رات بھی اس پر دورہ نہیں پڑے گا اور واقعی وہ جنون میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ عام صحت مند انسانوں کی طرح بالکل نارمل تھا۔

وہ پچھلے کئی برسوں سے ذہنی اذیتوں میں مبتلا تھا' ان کی تکلیف دہی جانتا تھا۔ اب ان تکالیف سے نجات ملتے ہی وہ سجدے میں گر پڑا تھا۔ وہاں سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ تڑپ تڑپ کر اللہ کو پکار رہا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر ماں باپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مولانا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اس کی پشت کو تھپک کر کہا۔ ''برداشت سے زیادہ غم ہوں تو اسے برداشت کرو اور برداشت سے زیادہ خوشی ہو تو اسے بھی سمیٹ کر اپنے اندر رکھو۔ یہ خوشیاں' یہ غم آتے جاتے رہتے ہیں۔ صرف ایک نماز ہے' جو ہمیشہ اپنے وقت پر قائم رہتی ہے اور تا قیامت قائم رہے گی۔ اسے کبھی نہ چھوڑنا۔''

وہ سجدے سے اٹھ گیا۔ مولانا اس سے اور ایشور لال سے مصافحہ کرکے رخصت ہوگئے۔ ماں نے آگے بڑھ کر بیٹے کو گلے لگالیا۔ اسے جذباتی انداز میں چومنے لگی۔ باپ بھی اپنے بیٹے سے لپٹ گیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''بیٹے! یہ تو چمتکار ہوگیا۔ بھگوان نے چاہا تو اب بھی تم پر دورہ نہیں پڑے گا۔''

منوہر نے پوچھا۔ ''کیا آپ اب بھی مجھے نمازیں پڑھنے اور آیات پڑھنے سے منع کریں گے؟''

ماں باپ نے فوراً ہی انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بیٹا نہیں... ہم آتما شکتی کو مانتے ہیں۔ یہ روحانی علاج ہے۔ اسے جاری رکھو۔''

منوہر کا دھیان پوجا کی طرف تھا۔ اس نے مسکرا کر ماں باپ کو دیکھا پھر کہا۔ ''خدا کا شکر ہے' آپ دونوں مان گئے۔ اب اپنے کمرے میں جاکر آرام کریں۔ میں ابھی اپنے بیڈروم سے ہوکر آتا ہوں۔''

وہ انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے بیڈروم میں آیا تو پوجا دوسری طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ اس نے مخاطب کیا۔ ''پوجا...!''

پوجا نے اسے پلٹ کر دیکھا تو وہ چونک گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔ منوہر سے ملتے ہی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا تھا۔ جیسے شرم سے زمین میں گڑی جارہی ہو۔

منوہر نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر قریب آکر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟''

اس نے منہ پر سے ہاتھ نہیں ہٹائے۔ روتے ہوئے بولی۔ ''میں شرمندہ ہوں۔ تمہارے لائق نہیں ہوں۔ تمہیں دھوکا دے رہی تھی۔''

''دھوکا...؟ کیسا دھوکا...؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''سچ کہہ رہی ہوں۔ تم سے ایک بہت بڑا سچ چھپا رہی تھی۔ اب تمہیں دھوکا نہیں دوں گی۔''

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''میں

پوجا ایڈوانی نہیں ہوں۔ عیسائی نہیں ہوں۔"

یہ چونکا دینے والی حیران کر دینے والی بات تھی۔ اس نے پوچھا۔ "پھر کون ہو؟"

"میں اپوزیشن پارٹی کے سیاسی نیتا لکشمن اگروال کی بیٹی پوجا اگروال ہوں۔ تمہیں ٹریپ کر رہی تھی۔ تمہارے ذریعے تمہارے باپ کی سیاسی، سماجی اور گھریلو کمزوریاں معلوم کرنا چاہتی تھی۔ یہاں آتے ہی تمہاری یہ بہت بڑی کمزوری معلوم ہوئی کہ تم نماز پڑھتے ہو اور روحانی علاج کے ذریعے دماغی طور پر صحت مند ہو رہے ہو۔"

وہ چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ "آج میں نے اپنی آنکھوں سے تمہارا روحانی علاج ہوتے دیکھا ہے۔ یہ بیان نہیں کر سکتی کہ کس قدر متاثر ہوئی ہوں؟ اپنے جھوٹ اور فریب پر شرمندہ ہو رہی ہوں۔ تمہیں فائدہ پہنچ رہا ہے اور میں یہاں نقصان پہنچانے آئی ہوں۔ مجھے تو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اب تمہیں شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔"

اسی لمحے میں منوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مولانا عبدالباری نے سمجھایا تھا کہ کسی بھی نامحرم سے دور رہا کرو۔ جب تک شادی نہ ہو اسے ہاتھ نہ لگاؤ۔ صرف اپنے بدن کو ہی نہیں نیت کو بھی پاک رکھا کرو۔

اس نے فوراً ہی پوجا کے شانے پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ "کیا تم میری اتنی بڑی غلطی کو معاف کر رہے ہو؟"

"تم مجھ سے جھوٹ بول رہی تھیں نہ بول سکیں۔ دھوکا دے رہی تھیں نہ دے سکیں۔ اب سچ بول رہی ہو اور پہلے سے زیادہ میرا اعتماد حاصل کر رہی ہو۔ میں دل سے کہتا ہوں کہ میں نے تمہیں معاف کیا۔"

وہ خوشی سے جھومتے ہوئے آ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے فوراً ہی اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں پوجا! ہمیں شادی سے پہلے اس طرح ایک دوسرے سے لگنا نہیں چاہیے۔ میں نے پہلے بھی سمجھایا ہے کہ فاصلہ رکھو۔ ہم جلد ہی شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ آؤ۔ میں اپنے ممی اور ڈیڈی سے تمہیں ملاؤں گا۔"

وہ جانے لگا۔ پھر دروازے پر پلٹ کر اس نے دیکھا۔ وہ پیچھے نہیں آ رہی تھی۔ وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "تمہارے ممی اور ڈیڈی مجھے جانتے ہیں۔ تم مجھے ان سے ملانا چاہتے تھے اور میں اسی لیے کترا رہی تھی کہ وہ دیکھیں گے تو بھید کھل جائے گا کہ میں عیسائی نہیں ہوں۔ ایک سیاسی نیتا کی بیٹی ہوں۔"

"بھید کھلنے دو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمہیں دل و جان سے قبول کر رہا ہوں۔ تمہاری سچائی نے مجھے ... ہے۔ میری زندگی میں تمہارے سوا بھی کوئی نہیں آئے گی۔"

"مجھے تمہارے پیار پر اور اعتبار پر فخر ہے ... تمہارے ڈیڈی مجھے قبول نہیں کریں گے۔ مجھے ... سمجھ لیں گے کہ میرے ذریعے تمہاری کمزوری اپوزیشن والوں کو معلوم ہو گی تو کوئی ایک ہندو بھی انہیں ووٹ نہیں دے گا۔ وہ الیکشن میں ہار جائیں گے۔"

منوہر نے پوچھا۔ "کیا تم میری نمازوں اور روحانی علاج کے بارے میں اپنے ڈیڈی کو بتاؤ گی؟"

وہ سر جھکا کر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے۔ میں نے تمہاری تبدیلیوں کے متعلق انہیں بتا دیا ہے۔"

وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "او گاڈ! یہ تم نے کیا، کیا پوجا...؟"

"یہ بات ابھی صرف ڈیڈی کو معلوم ہے اور انہیں معلوم ہونے سے وہ ہندوستان میں اور ہمارے حلقے میں یہ بات پھیلا نہیں سکیں گے۔"

"لیکن اب تو وہ جی جان سے سرتوڑ کوشش کریں گے کہ اس بات کو پورے سیاسی حلقے میں پھیلا دیں گے۔"

وہ بولی۔ "جب تک کوئی تمہیں نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھے گا، تب تک یقین نہیں کرے گا۔ ڈیڈی نے کہہ دیا ہے کہ جب تم نمازیں پڑھتے ہو تو تمہاری ویڈیو فلم چپ چاپ تیار کروں اور آیتیں پڑھتے رہو تو آڈیو کیسٹ تیار کروں۔ اس طرح وہ الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے تمہیں آیات پڑھتے ہوئے سنائیں گے اور تمہیں نماز پڑھتے دکھائیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "تمہارے ڈیڈی زبردست پلاننگ کر رہے ہیں۔"

"مگر میں نے نہ تو تمہاری آڈیو ویڈیو تیار کی ہے نہ ہی کروں گی۔ تم سے دشمنی کروں گی تو اپنے آپ سے کروں گی۔ میں تم سے الگ نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی رہوں گی۔ سبھی لڑکیاں شادی کے بعد ماں باپ کو چھوڑ دیتی ہیں۔ میں ابھی سے انہیں چھوڑ دوں گی۔"

وہ بڑے پیار سے اور جذبے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آئی لو یو پوجا! میں آخری سانسوں تک تمہارا ... رہوں گا۔"

ایشور لال کی آواز سنائی دی۔ "اور ہم بھی پوجا کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتے رہیں گے۔"

انہوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ... کی ممی اور ڈیڈی کھڑے ہوئے تھے۔ لتا نے پوجا کے پاس آ کر کہا۔ "تم اچانک لندن کیسے آئی ہو؟ بہرحال اب ... آ گئی ہو تو سمجھ لو کہ ہمارے دل میں رہو گی۔ ہم نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں۔ ہمیں ایسی ہی بہو کی ضرورت ہے جو ہمارے بیٹے کی رازدار بن کر رہے۔"

منوہر نے پوجا کو بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔ "ایسا کیوں نہ کریں کہ یہ اپنے ماں باپ کے پاس بھی واپس ہی نہ جائے اور ایسا کورٹ میرج کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ میں کل ہی اسے اپنی دھرم پتنی بنا لینا چاہتا ہوں۔"

یہ طے ہو گیا۔ دوسرے دن ایشور لال اپنی سیاست کے ... اور لتا اپنے بیٹے کی مسرت سے اور بیٹا اپنی محبت سے نہ ٹوٹنے والے بندھن میں پوجا کو باندھ لینے والے تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن بہت کچھ ہونے والا تھا۔

دوسرے دن محالا اپنے بیٹے یعقوب کو ٹریپ کرنے کے لیے لندن پہنچ گئی۔ محالا اور میسونی تنظیم کے جاسوس بھی منوہر کو یعقوب سمجھ رہے تھے۔ اس غلط فہمی کے باعث ہونی انہونی ہونے والی تھی۔ جو نہیں ہونے والا تھا، وہ پیش آنے والا تھا۔ بہرحال جو بھی گڑبڑ ہونے والی تھی۔ اسے آگے چل کر بیان کروں گا۔

دوسرے دن میں خدا کے ساتھ مورشش پہنچ گیا۔ جاں نثاروں نے وہاں ہماری رہائش کا انتظام کیا تھا۔ امیر خیری کے ویڈیو اور آڈیو کیسٹ میرے سامنے لا کر رکھے گئے۔ ان کے ذریعے میں امیر خیری کو اسکرین پر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اور بولتے ہوئے دیکھ بھی سکتا اور سن بھی سکتا تھا اور اس کی صحیح نقالی کر سکتا تھا۔

بہرحال میں اپنا ذکر بھی آگے چل کر کروں گا۔

دوسرے دن ارجن ورما کے گھر سے صنم اغوا ہونے والی تھی۔ اسے رازداری سے بتا دیا گیا تھا اور وہ اغوا ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔

موساد کے اعلیٰ افسران اپنی ٹھوس پلاننگ پر عمل کر رہے تھے۔ انہی ایک بہترین بہروپیا عورت اور ایک بہروپیا جاسوس کو پلاسٹک سرجری کے ذریعے رنجنا اور ارجن ورما بنا رہے تھے۔

(رجسٹرڈ)
سٹار وائٹ
بیوٹی کریم

ستاروں جیسی سفید رنگت ہمیشہ کیلئے
کالی سانولی رنگت سے ہمیشہ کے لئے نجات
سٹار وائٹ (رجسٹرڈ)
بیوٹی کریم کے ساتھ
☆ سٹار وائٹ بیوٹی کریم جلد کو گورا بناتی ہے
☆ سٹار وائٹ بیوٹی کریم میں قیمتی وٹامنز اور تحقیق شدہ ہربل اجزا موجود ہیں۔ جو جلد میں موجود تمام بیکٹیریا کا فوری خاتمہ کرتی ہے
☆ سٹار وائٹ بیوٹی کریم میں شامل بہترین وٹامنز آپ کی جلد کو بنائیں تروتازہ اور شاداب
★ رنگت اتنا نکھر کہ آپ حیران رہ جائیں
ترکیب استعمال
صبح و شام اپنے چہرے کو کسی اچھے بیوٹی سوپ سے دھونے کے بعد سٹار وائٹ بیوٹی کریم کو آہستہ آہستہ اپنے چہرے پر لگائیں اور ہو جائیں گوری گوری
منی بیک گارنٹی کے ساتھ
ہیلپ لائن: 055-8230997 0300-4995889
starwhitembn@yahoo.com
Star White®
BeautY Cream
ہر اچھے میڈیکل اور جنرل سٹور پر دستیاب ہے
M.B Nasir Herbal Pharma
Karachi, Pakistan.

وہ اپنی پلاننگ کے مطابق رنجنا کو یعنی صنم کو اور ارجن ورما کو بڑی رازداری سے قتل کرنے کے بعد ان کی جگہ اپنے بہروپیے جاسوسوں کو انڈیا بھیجنے والے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میرا تعلق نامان سے اور اس کی والدہ رانکا سے ہے۔ وہ نامان کے محل میں جاکر مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرنے والے تھے۔

ایک جاں نثار نے ارجن ورما کو بھی رازداری سے یہ سمجھا دیا تھا کہ جب صنم کو اغوا کرلیا جائے گا تو وہ انڈیا جانے سے انکار کردے گا۔ یہ کہے گا کہ جب تک اغوا کرنے والے اس کی بیوی رنجنا کو واپس نہیں کریں گے۔ تب تک وہ انڈیا سے نہیں جائے گا۔

اس طرح موساد والوں کی پلاننگ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ اس کے بہروپیے جاسوس رنجنا اور ارجن کے بھیس میں نہ انڈیا جاسکیں گے۔ نہ وہ رنجنا کو یعنی صنم کو اور ارجن کو رازداری سے قتل کرسکیں گے۔

ارجن کی بہن شکنتلا نے دعوت دی تھی۔ اس کے دیور کی شادی تھی۔ ہنسنے بولنے اور ناچنے گانے کا پروگرام تھا۔ صنم خوب بن سنور کر ارجن کے ساتھ اس تقریب میں گئی۔ موساد کے جاسوس ان دونوں کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور ہمارے جاں نثار ان جاسوسی کرنے والوں کی جاسوسی کرتے آرہے تھے۔

جہاں شادی کی تقریب تھی۔ وہاں روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ رنگ برنگے قمقمے جل بجھ رہے تھے۔ اسپیکر کے ذریعے گانے کا شور دور تک گونج رہا تھا۔ ایسی بھیڑ ایسی ہلچل اور ایسی روشنی میں کسی کو اغوا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن واردات کرنے والے اپنا کام کرہی جاتے ہیں۔

اچانک ہی روشنی کا سیلاب تھم گیا۔ ایکدم سے تاریکی چھاگئی۔ کسی نے مین سوئچ آف کردیا تھا۔

ایسے ہی وقت صنم کے دائیں بائیں دو افراد آئے۔ انہوں نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر سرگوشی میں کہا۔ ”میڈم! آپ چیخنا چلانا شروع کریں اور ہمارے ساتھ چلتی رہیں۔“

وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے چیخنے لگی۔ ”بچاؤ بچاؤ مجھے بچاؤ۔ یہ کون لوگ ہیں؟ مجھے چھوڑو... چھوڑدو مجھے...“

وہ چیختے چیختے ایسے چپ ہوگئی‘ جیسے منہ بند کردیا گیا ہو۔ جبکہ ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ اسے ساتھ لے جانے والے تاریکی میں کبھی کبھی ٹارچ روشن کرتے تھے۔ پھر بجھا دیتے تھے۔ اس طرح وہ ان کے ساتھ کبھی چلتے ہوئے‘ کبھی دوڑتے ہوئے لگن منڈپ سے باہر آگئی۔

وہاں بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ ایک بڑی سی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی تیزی سے جانے لگی۔ اس کے اندر روشنی ہوگئی۔ اس نے آگے پیچھے کی سیٹوں پر دو دو جاں نثار بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے پاس ایک خاتون تھی۔ وہ بولی۔ ”بیٹی! تمہارے چہرے پر عارضی تبدیلی لانی ہے۔“

اس خاتون کو میک اپ میں مہارت حاصل تھی۔ وہ اس کے چہرے پر تبدیلیاں لانے لگی۔ ایک جاں نثار نے کہا۔ ”آپ کا پاسپورٹ اور ویزا تیار ہے۔ اسی کی مناسبت سے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی لائی جارہی ہے۔ یعقوب بابا ائرپورٹ پر انتظار کررہے ہیں۔ وہ بھی آپ کے ساتھ جانے والے ہیں۔“

صنم کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ جاں نثاروں نے بھاری رشوتیں دے کر صنم اور یعقوب کے پاسپورٹ تیار کروائے تھے اور ویزا بھی حاصل کیا تھا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ صنم کو اغوا کیا جائے گا تو موساد اور انٹیلی جنس والے سوچیں گے کہ اغوا ہونے والی جلد ہی ہوائی جہاز کے ذریعے کہیں جاسکتی ہے۔

موساد اور انٹیلی جنس والے یہ دیکھ رہے تھے کہ صنم اور ارجن ورما کی درخواست ویزا کے لیے سفارت خانے پہنچی تھی۔ وہاں سے موساد والوں کے پاس آگئی تھی۔ جب تک ویزا اجاری نہ ہوتا‘ ان دونوں میں سے کوئی بھی بحری راستے سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔

اور واقعی انہوں نے یہی سمجھا۔ جیسے ہی اطلاع ملی کہ رنجنا کو اغوا کیا گیا ہے تو انہوں نے راستوں کی اور ائرپورٹ کی ناکا بندی کرادی اور جب تک رکاوٹیں پیدا کی گئیں تب تک وہ ائرپورٹ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے تک عارضی میک اپ ہوچکا تھا۔ پاسپورٹ کی تصویر کے مطابق اس کی صورت تبدیل ہوگئی تھی۔ یعقوب اس کا منتظر تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ وہ دونوں بورڈنگ کارڈ لیے اندر چلے گئے۔

میرے جاں نثار ہمہ وقت مشین کی طرح حرکت میں رہتے تھے۔ ہنگامی حالت میں کام نکالنا ہوتو ڈالرز مارتے تھے۔ ڈالرز سے کام نہ بنے تو گولی ماردیتے تھے۔

ارجن ورما جانتا تھا کہ صنم خوشی سے گئی ہے۔ اس کے جانے کے بعد ڈراما پلے کرنا ضروری تھا۔ اس لیے وہ رو رہا تھا‘ چلا رہا تھا۔ اپنی دھرم پتنی کے اغوا ہونے پر ہائے ہائے کررہا تھا۔ موساد والے اسے اٹھا کر اپنی بلڈنگ میں لے آئے۔ اعلیٰ افسر نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”وہ اغوا کیسے ہوگئی؟“

ارجن نے کہا۔ ”یہ تو اغوا کرنے والے بتائیں گے کہ کیسے ہوئی؟ میں نے تو اتنا دیکھا تھا کہ گھپ اندھیرا ہوگیا تھا۔ وہ مجھ سے دور عورتوں میں تھی۔ وہیں سے اس کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی تھی۔ میں اسے آوازیں دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر اندھیرے میں عورتوں اور مردوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے پر گرتے پڑتے جارہے تھے۔ بعد میں پتا چلا‘ کسی نے مین سوئچ آف کردیا تھا۔ جب وہ آن ہوا اور روشنی ہوئی تو میری رنجنا وہاں نہیں تھی۔“

وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر روتے ہوئے بولا۔ ”ہائے رنجنا تم کہاں ہو؟ وہاں کتنے ہی سیکیورٹی گارڈز تھے لیکن ان سے بھی زیادہ وہ اغوا کرنے والے دیدہ دلیر تھے۔ وہ سینکڑوں مردوں اور عورتوں کے درمیان سے میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے۔“

”ہم یہی تو معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیوں اٹھا کر لے گئے؟“

”آپ انہیں پکڑ کر لائیں گے تو میں پوچھوں گا۔ آخر میری پتنی میں کیا خاص بات تھی جو اسے اٹھا کر لے گئے؟ وہاں تو اور بھی کتنی ہی حسین عورتیں تھیں۔“

ایک جاسوس نے پوچھا۔ ”کیا تمہاری پتنی نے قیمتی سونے کے زیورات پہنے تھے؟“

”ہاں۔ پہنے تھے لیکن وہاں کتنی ہی عورتوں نے میری پتنی سے بھی زیادہ بھاری بھرکم گہنے پہنے ہوئے تھے۔ ان مجرموں کو وہ عورتیں نظر نہیں آئیں‘ صرف میری بیوی ہی کیوں نظر آئی؟“

ایک افسر نے کہا۔ ”وہ منسٹر ایشور لال کی بیٹی ہے۔ ایک منسٹر سے بھاری رقم وصول کرنے کے لیے اسے اغوا کیا گیا ہے۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا‘ وہ رقم کا مطالبہ کرنے کے لیے ضرور فون کریں گے۔“

ارجن نے کہا۔ ”ہائے میری رنجنا۔ پتا نہیں‘ وہ کب فون کریں گے؟ کب اسے واپس کریں گے؟ میں انڈیا کب جاؤں گا؟ اس کے بغیر تو کبھی نہیں جاؤں گا۔“

اس بات نے افسران کو چونکا دیا۔ رنجنا کی واپسی ضروری ہوگئی تھی۔ اگر اغوا کرنے والوں سے اسے حاصل نہ کیا جاتا تو وہ اپنے بہروپیوں کو رنجنا اور ارجن بنا کر نامان کے محل میں نہیں بھیج سکتے تھے اور نہ ہی وہاں سے میرے متعلق معلومات حاصل کرسکتے تھے۔

افسر نے ارجن کو تسلی دی۔ ”فکر نہ کرو۔ ہم جلد سے جلد رنجنا کو واپس لائیں گے۔“

موساد والے مشکل میں پڑ گئے تھے۔ ان کی پلاننگ تھی کہ اپنے بہروپیے جاسوسوں کو انڈیا بھیجنے سے پہلے رنجنا اور ارجن کو ہلاک کردیں گے۔ ان کی لاشیں چھپادیں گے۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ وہ مرچکے ہیں۔ سب ہی ان بہروپیوں کو ارجن اور رنجنا سمجھتے رہیں گے۔

ایک جاسوس نے اعلیٰ افسر سے کہا۔ ”سر! ہمیں اس پہلو سے سوچنا چاہیے کہ رنجنا کو تھری ایس کے آدمی بھی اغوا کرسکتے ہیں۔“

وہ چند افسران دوسرے کمرے میں آکر آپس میں بولنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ ”تھری ایس کے آدمی رنجنا کو کیوں اغوا کریں گے؟“

جاسوس نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے اس ارجن نے وہاں کوئی گڑبڑ کی ہو اور وہ لوگ سزا دینے کے لیے اس کی پتنی کو اٹھا کر لے گئے ہوں۔“

”اگر ارجن وہاں کوئی گڑبڑ کرکے آتا تو تھری ایس کے آدمی اسے بھی زندہ نہ چھوڑتے۔ مار ڈالتے۔“

”ہوسکتا ہے ارجن کو مار ڈالنے میں ان کو نقصان ہو۔ اسے زندہ رکھ کر صرف سزا دینا چاہتے ہوں۔ اب اس کی بیوی کی ایسی کی تیسی کرتے رہیں گے اور وہ دماغی صدمہ اٹھاتا رہے گا۔“

ایک اعلیٰ افسر نے کچھ سوچتے ہوئے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہوں۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ ہمیں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تھری ایس کے آدمیوں نے رنجنا کو اغوا کیا ہے تو اب ہم اس کی ڈمی وہاں نہیں بھیج سکیں گے۔ ہماری جاسوس لڑکی رنجنا بن کر وہاں جائے گی تو بھید کھل جائے گا۔ وہ بولیں گے‘ ایک رنجنا کو تو ہم نے اغوا کیا ہے۔ یہ دوسری کہاں سے آگئی؟“

”بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ ہمیں جلد سے جلد معلوم کرنا ہوگا کہ رنجنا کو کس نے اغوا کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟“

میری بہو صنم کے گم ہوجانے سے یعنی رنجنا کے اغوا ہونے سے موساد والوں کی ساری پلاننگ چوپٹ ہوگئی تھی۔ انہوں نے بڑی محنت سے پلاسٹک سرجری کے ذریعے رنجنا اور ارجن کی ڈمی تیار کی تھیں۔ اب وہ ڈمی بننے والے بہروپیے کسی کام نہیں آسکتے تھے۔ ان کی تمام محنت‘ تمام سرمایہ ضائع ہوگیا تھا۔

بوڑھے جاسوس نے کہا۔ ”ہماری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ارجن کی جگہ ہمارا بہروپیا جائے گا۔“

اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ ''ہمارا بہروپیا وہاں جا کر یہ کیسے معلوم کرے گا کہ ارجن کے کوڈ ورڈز اور دوسرے خفیہ معاملات کیا ہیں؟''

''ہمارا بہروپیا ظاہر کرے گا کہ اس کی بیوی رنجنا کے اغوا ہونے کے باعث اسے دماغی صدمہ پہنچا ہے۔ اس کی یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ بعض معاملات کو تو وہ بالکل بھول ہی گیا ہے۔ انڈیا میں اپنی مغویہ بیوی کی یادیں ستاتی رہتی تھیں۔ اس لیے وہ اکیلا آ گیا ہے۔ یہ امید لے کر آیا ہے کہ گاڈ فادر زمان اس کا دماغی علاج کرائے گا اور اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے گا۔''

دوسرے افسران نے اس بات کی تائید کی۔ ان کا بہروپیا ارجن ورما وہاں ایک نیم دماغی مریض کی طرح رہ سکتا تھا اور ابنارمل رہ کر میرے متعلق بہت سی معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن محالا اپنے منصوبے کے مطابق لندن آ گئی۔ اس کے ماتحت دور ہی دور سے منوہر کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں اسے دور سے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ کہاں ہوگا؟''

ایک ماتحت نے کہا۔ ''آج اس نے ایک لڑکی پوجا کے ساتھ کورٹ میرج کی ہے۔ ابھی وہ پوجا اور اپنے والدین کے ساتھ گھوم پھر رہا ہے۔ تفریح کر رہا ہے۔ آخری بار ہم نے اسے ایک ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ شاید ابھی وہیں ہوگا۔''

اس نے حکم دیا۔ ''معلوم کرو وہ کہاں ہے؟''

ماتحت نے فون کے ذریعے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا پھر کہا۔ ''میڈم یہاں آ گئی ہیں۔ منوہر کے متعلق رپورٹ دو۔''

اس نے بتایا۔ ''وہ شیرٹن ہوٹل میں ہے۔ اپنی بیوی اور ماں باپ کے ساتھ کھانے پینے میں مصروف ہے۔''

وہ کار کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ماتحت ڈرائیو کرتا ہوا شیرٹن کی طرف جانے لگا۔ وہ یہ سن کر خوش ہو رہی تھی کہ اس کے بیٹے نے کسی لڑکی سے محبت کی ہے اور آج اس سے کورٹ میرج بھی کی ہے۔ وہ اپنی بہو کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

اس نے فون کے ذریعے اپنے دوسرے ماتحتوں سے پوچھا۔ ''تم لوگ کہاں ہو؟''

جواب ملا۔ ''ہم آپ کے ساتھ ہی ہیں۔ میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ آپ کے پیچھے آ رہا ہوں اور ہمارے باقی ساتھی آپ سے پہلے شیرٹن پہنچ جائیں گے۔''

محالا نے کہا۔ ''تم لوگوں کی ذمے داریاں [illegible] ہیں۔ اگر میں نے اسے پہچان لیا اور وہ میرا بیٹا ہی ہوگا تو [illegible] اسے نہیں اس کے ساتھ میری بہو کو بھی اغوا کیا جائے گا۔''

''آپ مطمئن رہیں۔ ہم تمام تیاریاں کر چکے [illegible] منوہر کے ڈرائیور کو دس ہزار پاؤنڈز میں خرید لیا ہے۔ [illegible] چاہیں گے وہ ڈرائیور اُدھر اسٹیرنگ موڑ دے گا۔''

منوہر پوجا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ اس ہال [illegible] جہاں کینڈل لائٹ ڈنر کیا جاتا ہے۔ اس کی میز کے قریب [illegible] ایک میز محالا کے لیے ریزرو کی گئی تھی۔ وہ ڈائننگ ہال [illegible] پہنچی تو ذرا مایوس ہوئی۔ اپنے بیٹے کو دیکھنے اور پہچانے [illegible] لیے خاطر خواہ روشنی نہیں تھی۔ ہر میز پر موم بتیاں روشن [illegible]

محالا نے اپنی میز پر آ کر وہاں سے منوہر کو دیکھا [illegible] کے چہرے کی بناوٹ یعقوب جیسی تھی۔ لیکن ناک نقشہ [illegible] نہیں تھا۔ یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ میک اپ کے [illegible] تبدیلی لائی گئی ہے۔

محالا کا ایک ماتحت بہت ذہین اور تیز طرار تھا۔ [illegible] کی قدر کرتی تھی۔ اس کا نام وکی تھا۔ اس وقت بھی [illegible] وکی کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا تھا۔ یوں [illegible] والوں کو دکھانے کے لیے ساتھی کی ضرورت [illegible] ہے۔ ورنہ اتنے بڑے ڈائننگ ہال میں وہ تنہا رہتی تو [illegible] سوالیہ نظریں اس پر اٹھتی رہتیں۔

وکی نے کہا۔ ''میڈم! اگر وہ آپ کا بیٹا ہے اور منوہر [illegible] ہے تو کیا منوہر کے ماں باپ اس سے دھوکا کھا رہے ہیں؟''

اس نے دور بیٹھے ہوئے منوہر پر ایک نظر ڈال [illegible] کہا۔ ''یقیناً دھوکا کھا رہے ہیں۔ میں ایک ماں ہو کر اسے [illegible] پا رہی ہوں۔ قریب سے دیکھوں گی اس کی باتیں سنوں [illegible] کے لب و لہجے پر غور کروں گی تو شاید پہچان لوں گی۔''

وکی نے کہا۔ ''ابھی وہ منوہر کے لب و لہجے میں [illegible] ہوگا۔ آپ اسے قریب سے سنیں گی تب بھی اس کی [illegible] پہچان نہیں پائیں گی۔''

''میں نے اسے اپنی دھڑکنوں سے لگا [illegible] دودھ پلایا تھا۔ میں اسے پسینے کی مہک سے [illegible] ہوں۔ شاید پہچان لوں گی۔''

''اگر آپ قریب جائیں گی تو کیا وہ آپ کو [illegible] گا؟''

''یہ اندیشہ ہے۔ وہ پہچان سکتا ہے۔ نہ پہچانے [illegible] ہے۔ بائی داوے۔ تم مجھے میک اپ کے بعد کل [illegible]



[illegible] آ رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے بیٹا مجھے پہچان لے گا؟''

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ میڈم محالا [illegible] دکھائی نہیں دیتی ہیں۔ مگر ایک ذرا سی جھلک ملتی ہے۔ شبہ ہوتا [illegible] ہے کہ آپ میڈم ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے' بیٹے کو بھی میری جھلک ملے [illegible] گی۔ وہ مجھ پر شبہ کرے گا۔''

''شبہ کرے گا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ وہ ہمارے قابو [illegible] میں نہیں آئے گا۔ فوراً ہی جاں نثاروں کو اطلاع دے گا۔ وہ [illegible] کہانی آفتوں کی طرح یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے' [illegible] ابھی دو چار اس کی حفاظت کے لیے یہاں موجود [illegible] ہوں۔ آخر وہ شہزادہ سلمان سعدی کا بیٹا ہے۔ اسے سیکیورٹی [illegible] کے بغیر تنہا نہیں چھوڑا گیا ہوگا۔''

منوہر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر اس نے پوجا کا ہاتھ [illegible] تھام کر اسے اٹھایا۔ وکی نے کہا۔ ''یہ کہیں جا رہے ہیں۔''

محالا نے کہا۔ ''یہ کھانا چھوڑ کر باہر کہیں نہیں جائیں [illegible] گے۔ ضرور واش روم کی طرف جا رہے ہیں۔ میں بھی ادھر [illegible] جاتی ہوں۔''

وکی نے کہا۔ ''میرا مشورہ ہے' منوہر سے فاصلہ [illegible] رکھیں۔ وہ یہاں آپ کو نہ پہچانے تو بہتر ہوگا۔ باہر کہیں [illegible] پہچانے گا تو ہم معاملات سنبھال لیں گے۔''

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں اس سے فاصلہ رکھوں [illegible] گی۔ مگر بہو سے کلوز ہونے کی کوشش کروں گی۔''

''پلیز۔ ابھی اسے بہو نہ کہیں۔ پوجا ہی سمجھیں۔ بہت [illegible] زیادہ خود اعتمادی نقصان پہنچاتی ہے۔''

وہ بولی۔ ''تھینک یو۔ تم بہت اچھے مشورے دیتے [illegible] ہو۔''

وہ وہاں سے جانے لگی۔ پوجا اور منوہر آگے آگے [illegible] جا رہے تھے۔ پھر منوہر لیڈیز ٹائلٹ سے کچھ دور رک [illegible] گیا۔ پوجا اندر جانے لگی۔ محالا منوہر کے پیچھے سے گزرتے [illegible] ہوئے واش روم میں گئی۔

منوہر سے نظریں بچا کر اس کے قریب سے گزرنے کا [illegible] مقصد یہ تھا کہ پسینے کی مہک مل جائے۔ اس کے سونگھنے کی حس [illegible] کسی حد تک تیز تھی۔ وہ ذرا قریب سے بیٹے کو پہچان سکتی [illegible] تھی۔ لیکن مایوسی ہوئی۔ منوہر کے لباس سے پرفیوم مہک [illegible] رہا تھا۔ پسینا کہیں گم ہو گیا تھا۔ یوں بھی وہاں اچھی خاصی [illegible] سردی تھی۔ ایسے موسم میں پسینے کی مہک بھی نہیں ملتی۔

وہ واش روم میں آئی۔ پوجا وہاں واش بیسن کے پاس [illegible] کھڑی ہاتھ دھو رہی تھی۔ محالا نے اسے بڑی لگن سے دیکھا۔ جیسے بہو کو دیکھ رہی ہو۔ پھر کہا۔ ''تم بہت خوبصورت ہو۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تھینک یو۔ تم بھی بہت خوبصورت ہو۔ تمہارے چہرے میں بڑی کشش ہے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''اب کشش کہاں رہی؟ میں تو بوڑھی ہو رہی ہوں۔''

پوجا نے حیرانی سے کہا۔ ''تم اور بوڑھی۔ تم تو بھرپور جوان دکھائی دے رہی ہو۔''

''نہیں بیٹی! میرا ایک جوان بیٹا ہے۔ سنا ہے' اس نے شادی کی ہے۔ میں اپنی بہو کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟''

پوجا نے بڑی خوشی اور فخر سے کہا۔ ''آج ہی ہوئی ہے۔''

''اچھا۔۔۔۔ وہ جو باہر کھڑا ہے' وہ تمہارا شوہر ہے؟''

پوجا نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں وہی میرے جیون ساتھی ہیں' وہی میری زمین ہیں۔ زمین کے بغیر میں کھڑی نہیں رہ سکتی۔ وہی میرے آسمان ہیں۔ میں دعا مانگتی رہتی ہوں کہ آخری سانسوں تک اس آسمان کا سایہ میرے سر پر رہے۔''

''تمہاری باتوں سے لگتا ہے' اسے دل و جان سے چاہتی ہو۔ کیا مسلمان ہو؟''

''نہیں۔ ہم ہندو ہیں۔''

محالا نے تعجب کا اظہار کیا۔ پھر کہا۔ ''اگر تمہارے کہنے کے مطابق جو شخص باہر کھڑا ہے۔ وہ تمہارا شوہر ہے تو پھر وہ مسلمان ہوگا؟''

پوجا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

محالا نے کہا۔ ''میں اپنے شوہر کے ساتھ آئی ہوں۔ انہوں نے تمہارے شوہر کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے عربی زبان میں کچھ پڑھتے ہوئے سنا ہے۔''

پوجا اور پریشان ہوگئی۔ ہاتھ دھونے کے بہانے اس سے کترانے لگی۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔ ''عربی پڑھنے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا۔ میرے شوہر کئی زبانیں جانتے ہیں۔ انہیں عربی سیکھنے کا بھی شوق ہے۔ اس لیے وہ اکثر تنہائی میں عربی زبان کا سبق یاد کرتے رہتے ہیں۔''

یہ کہتے ہی وہ ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس سے کترا کر چلی گئی۔ محالا نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی گھبراہٹ اور الجھن نے سمجھا دیا کہ منوہر نام کا ہندو ہے' درپردہ مسلمان ہے اور مسلمان ہے تو پھر اس کا بیٹا یعقوب ہے۔

اس کی ممتا بے چین ہوگئی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے واپس اپنی میز پر آگئی۔ وکی کو بتانے لگی کہ پوجا سے کیا باتیں ہوئی ہیں اور کیسے بھید کھل رہا ہے کہ منوہر ہندو نہیں، مسلمان ہے۔

وکی نے کہا۔ "آپ کے بیٹے کے متعلق ہمیں جو رپورٹ مل رہی ہے، اس کے مطابق وہ باپ کے سائے میں رہ کر مسلمان ہوگیا ہے۔ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا ہے اور یقیناً عربی زبان بھی سیکھ رہا ہوگا اور اس منوہر کے بھیس میں آپ کا بیٹا ہی ہوگا۔ مگر ذرا صبر کریں۔ صرف موم بتیوں کی روشنی میں بیٹے کو نہ پہچانیں۔ باہر تیز روشنی ہوگی، وہاں اسے دیکھ کر اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ ہماری نظروں میں ہے۔ ہم اسے اوجھل ہونے نہیں دیں گے۔"

وہ باتیں کرنے کے دوران منوہر، پوجا اور اس کے ماں باپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی سر گھما کر کبھی کبھی محالا کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ پوجا نے انہیں بتایا تھا کہ وہ خاتون جو دوسری میز پر بیٹھی ہوئی ہے، اسے منوہر پر شبہ ہوگیا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ اس کے شوہر نے منوہر کو عربی زبان میں کچھ پڑھتے سنا ہے۔

ایشور لال نے پریشان ہوکر کہا۔ "منوہر! یہ تمہاری کیا عادت ہے؟ تم گھر میں ہو یا باہر، ہر جگہ عربی پڑھتے رہتے ہو۔"

وہ بولا۔ "میں ہمیشہ نہیں پڑھتا۔ جب تیمار رہتا ہوں تو اللہ کی پناہ حاصل کرنے کے لیے آیات پڑھنے لگتا ہوں۔ جب یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہی میری دوا ہے اور مجھے شفا حاصل ہورہی ہے تو اس دوا کو جاری کیوں نہ رکھوں؟"

ہیم لتا نے کہا۔ "ہم تمہیں آیات پڑھنے سے منع نہیں کر رہے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچو، اسی طرح پڑھتے رہو گے تو بھید کھلتا رہے گا۔"

منوہر نے کہا۔ "میں آپ لوگوں سے بحث نہیں کروں گا۔ کھانا جلدی ختم کریں اور یہاں سے چلیں۔"

محالا اور وکی نے دیکھا کہ پندرہ منٹ بعد ہی وہ بل ادا کرکے وہاں سے اٹھ رہے تھے۔

محالا نے کہا۔ "میرے بیٹے نے سمجھ لیا ہے کہ یہاں بھید کھل سکتا ہے۔ اسی لیے فوراً ہی اٹھ کر جارہا ہے۔"

وکی نے فون کے ذریعے دوسرے ماتحتوں کو اطلاع دی کہ منوہر اپنی فیملی کے ساتھ باہر آرہا ہے۔ اس کی نگرانی جاری رہے۔ اسے کسی بھی حال میں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔

اس نے فون بند کرنے کے بعد محالا سے کہا۔ "آپ اطمینان سے یہاں کھاتی پیتی رہیں۔ ہمیں منوہر کی ر ملتی رہے گی۔"

وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر بولی۔ "میں ا ہوں۔ ذرا تیز روشنی میں اسے دور سے دیکھوں گی۔ کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ تیزی سے ادھر جانے لگی۔ منوہر، پوجا اور والدین کے ساتھ ٹی وی لاؤنج سے گزر رہا تھا۔ وہاں ایشور لال کا ایک شناسا مل گیا تھا۔ اس لیے وہ رک سے باتیں کرنے لگے۔

محالا وہاں پہنچ کر منوہر سے فاصلہ رکھتے ہوئے بڑی توجہ سے دیکھنے لگی۔ یعقوب میری طرح تھا۔ جسمانی طور پر باڈی بلڈر دکھائی دیتا تھا۔

وہ ذرا مایوس ہونے لگی۔ منوہر کا قد کچھ کم تھا۔ دل کو تسلی دینے لگی کہ بہت دنوں بعد بیٹے کو دیکھ رہی ہے لیے کچھ فرق محسوس ہو رہا ہے۔

منوہر اچھا خاصا صحت مند تھا لیکن یعقوب کی اس کا ایسا کسرتی بدن نہیں تھا جیسا کہ باڈی بلڈنگ میں ہوا کرتا ہے۔ محالا نے پھر دل کو تسلی دی کہ یعقوب باپ کے سائے میں رہ کر خوب کھانے پینے اور عیش کر ہے۔ اسی لیے اس کا بدن پھیل گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد منوہر پھر اپنی فیملی کے ساتھ وہاں جانے لگا۔ وہ اس کی چال پر غور کرنا چاہتی تھی۔ لیکن گئی۔ مولانا عبدالہادی کسی کام سے وہاں آئے تھے۔ کے ساتھ دو شاگرد تھے۔

منوہر انہیں دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھ کر سامنے پہنچا پھر ان کے آگے سر جھکا کر اس نے مولانا تھام لیا۔ ان کا ہاتھ چوم کر اپنی پیشانی سے لگایا۔

مولانا اسے دعائیں دے رہے تھے اور عقیدت سے کچھ بول رہا تھا۔

محالا بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور بڑے سمجھ رہی تھی کہ یہی اس کا یہودی بیٹا ہے جو باپ کے کر مسلمان ہوگیا ہے اور اب ہندو کے بھیس میں نہیں یہ باپ بیٹا کیا چکر چلا رہے ہیں اور یہ ہندوانہ زندگی گزار رہا ہے؟

مولانا عبدالہادی اس سے رخصت ہوگئے۔ ماں باپ اس کے قریب آئے۔ وہ ان کے ساتھ با ہوئے زیر لب کچھ پڑھنے لگا۔ جب وہ محالا کے قریب گزرا تو اس نے حیرانی سے سنا۔ اس کے پڑھنے کا ا



تھا، جیسے تلاوت کر رہا ہو۔ صاف سمجھ میں آرہا تھا، قرآنی آیات پڑھتا جارہا ہے۔

محالا کا دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔ دماغ چیخ چیخ کر سمجھا رہا تھا کہ یہ ہندو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ منوہر نہیں ہے۔ اس کا بیٹا یعقوب ہے۔

وہ تیزی سے چلتے ہوئے ڈائننگ ہال کی طرف جانے لگی۔ پوجا نے ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے منوہر سے اور اپنے سسر سے کہا۔ "وہ عورت جو واش روم میں ملی تھی اور منوہر کو مسلمان کہہ رہی تھی، وہ ابھی ویٹرز لابی میں تھی۔ منوہر کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔"

یہ سن کر وہ سب چلتے چلتے رک گئے۔ پلٹ کر ہوٹل کی طرف دیکھنے لگے۔ منوہر نے کہا۔ "تعجب ہے، وہ ہمارے ساتھ والی میز پر بیٹھی تھی۔ کھانے میں مصروف تھی۔ کیا کھانا چھوڑ کر میری جاسوسی کرنے آئی تھی؟"

ایشور لال نے پریشان ہوکر کہا۔ "آخر یہ عورت کون ہے؟ تمہارے پیچھے کیوں لگ گئی ہے؟ کیا اپوزیشن پارٹی والوں سے اس کا کوئی تعلق ہے؟"

پوجا نے کہا۔ "یہ کوئی انگریز عورت ہے۔ ہمارے انڈیا والوں سے اس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟"

ایشور لال نے کہا۔ "انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ دیا لیکن سیاست نہیں چھوڑی۔ آج بھی ہمارے سیاسی لیڈروں سے بڑا گہرا رابطہ رکھتے ہیں۔ اپنی سیاسی ضرورت کے مطابق ہماری راج نیتی میں مداخلت کرتے رہتے ہیں۔"

پوجا نے منوہر سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، تمہارے روحانی علاج کا بھید کھلنے والا ہے۔ پتا نہیں یہ عورت کون ہے؟ تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔ یہ بات اپوزیشن والوں تک پہنچ جائے گی تو کوئی نہیں مانے گا کہ تم اپنا علاج کررہے ہو۔ سب ہی ڈنکے کی چوٹ پر کہیں گے کہ مسلمان ہوگئے ہو۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "ہاں۔ ہوگیا ہوں۔ مجھے زندہ رہنا ہے۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور یہ مجھے روحانی علاج سے مل رہی ہے۔ یہ علاج آخری سانسوں تک جاری رہے گا۔ اب تو میں نمازیں پڑھنے والا مسلمان ہی کہلاؤں گا۔"

ماں باپ اسے فکرمندی سے دیکھنے لگے۔ پوجا کو کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ تو پہلے ہی منوہر سے کہہ چکی تھی کہ جو تم نہیں ہو تو میں نہیں ہوں اور جو تم ہو میں وہی رہوں گی۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ محالا نے ڈائننگ ہال میں آکر وکی کے پاس بیٹھ کر بڑے ہی جوش اور جذبے سے بتایا کہ اس نے اپنے کانوں سے منوہر کو قرآنی آیات پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ وہ منوہر نہیں ہے۔ اس کا بیٹا یعقوب ہے۔

وکی نے پوچھا۔ "آپ نے اسے روشنی میں اچھی طرح دیکھا ہے۔ کیا وہ قد و قامت میں یعقوب جیسا ہے؟"

اس کا جوش و جذبہ ذرا سرد پڑ گیا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "بہت عرصے بعد دیکھا ہے۔ اس لیے اس کے قد و قامت میں کچھ فرق سا محسوس ہوا ہے لیکن زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ ثبوت تو کھل کر ہمارے سامنے آگیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ ایک مسلمان عالم سے بڑی عقیدت سے مل رہا تھا۔ اس کا ہاتھ چوم رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کو پیشانی سے لگا رہا تھا۔ بڑی عقیدت سے کچھ بول رہا تھا اور عربی ایسے پڑھتا جارہا تھا جیسے مسلمانوں کی طرح تلاوت کر رہا ہو۔ وکی! میری بات مانو، وہ مسلمان ہے۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔"

وکی نے کہا۔ "آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، میرے مشورے پر عمل کرتی رہیں گی اور میرا ابھی مشورہ ہے کہ ذرا صبر کریں۔ کل دن کی روشنی میں پھر اسے ایک بار دیکھیں، سمجھیں۔ جب آپ کا دل اور دماغ بھی کہے گا کہ وہ یعقوب ہے تو ہم اسے اپنے خفیہ اڈے میں پہنچا دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل تک صبر کروں گی۔ لیکن اس کے ساتھ میری بہو کو بھی لایا جائے گا۔"

"جو آپ کہیں گی، وہی ہوگا۔"

وہ پھر کھانے میں مصروف ہوگئی۔

دوسرے دن دس بجے تک سوتی رہی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے فون کے ذریعے پوچھا۔ "میرے بیٹے کی رپورٹ سناؤ۔"

جواب ملا۔ "منوہر اپنے اپارٹمنٹ میں ہے۔ کل اس نے شادی کی ہے۔ سہاگ رات گزاری ہے۔ جاگتا رہا ہوگا۔ اس لیے ابھی تک سو رہا ہے۔ جب باہر نکلے گا، کہیں جائے گا تو ہم آپ کو اطلاع دیں گے اور اس پر نظر رکھیں گے۔"

پھر اس نے وکی سے فون پر کہا۔ "میں شاور لینے جارہی ہوں۔ ایک گھنٹے بعد یہاں آجاؤ۔ میرے ساتھ ناشتا کرو۔ آج میں اپنے بیٹے کو دن کی روشنی میں دیکھوں گی۔"

اگرچہ بیٹے کے لیے ممتا مچل رہی تھی۔ لیکن اسے حاصل کرنے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ مجھے اس کے ذریعے کمزور بنایا جائے۔ اسے پھر سے یہودی بنا دینے کی اور مار ڈالنے کی دھمکی دی جائے۔ انہیں یقین تھا کہ ایسی دھمکیاں مجھ پر اثر کریں گی۔

یہ حقیقت تھی کہ میرا وہی ایک بیٹا یعقوب سعادت مند، فرمانبردار، ذہین اور حاضر دماغ تھا۔ میری طرح خطرات سے کھیلنا جانتا تھا۔ میں کسی بھی حال میں اس سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

دشمنوں کو اندازہ تھا کہ میں اسے کس قدر دل و جان سے چاہتا ہوں۔ وہی میرا ایک وارث ہے۔ اسی کے ذریعے مجھے کمزور بنایا جاسکتا ہے۔ وہ بڑے ہی منظم طریقے سے میرے بیٹے کو اغوا کرنے پر تل گئے تھے۔

شاید ان کی مرادیں پوری ہونے والی تھیں۔ اسی دن میرا بیٹا میری بہو کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ صنم کو ارجن ورما کے گھر سے نکال کر یعقوب کے ساتھ لندن پہنچایا گیا تھا۔ آئندہ وہ دونوں کچھ عرصے تک لندن، پیرس اور سوئٹزرلینڈ میں اچھے دن گزارنے والے تھے۔ اس کے بعد کہیں مستقل رہائش اختیار کرنے کا ارادہ تھا۔

محالا کو دوپہر دو بجے اطلاع ملی کہ منوہر پوجا کے ساتھ کہیں باہر جارہا ہے۔ ایک ماتحت نے فون پر کہا۔ ”ہم آپ کو اطلاع دیتے رہیں گے کہ وہ کن راستوں سے، کن علاقوں سے گزر رہے ہیں اور کس مقصد کے لیے کہاں جارہے ہیں؟“

وہ وکی کے ساتھ اپنی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ وکی نے فون کے ذریعے ماتحتوں سے رابطہ قائم رکھا تھا۔ اسے اطلاع مل رہی تھی کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟ ایسی ہی ایک خبر کے مطابق وہ ایک بہت بڑے شاپنگ سینٹر میں پہنچ گئے۔

محالا نے کہا۔ ”وکی! اس بھاگ دوڑ سے بہتر ہے، منوہر کو اپنے خفیہ اڈے میں پہنچادو۔ میں وہاں قریب رہ کر اسے دیکھ لوں گی، سمجھ لوں گی۔ اگر وہ میرا بیٹا نہیں ہوگا تو ہم اسے جانے دیں گے۔ کل سے کشمکش میں ہیں کہ وہ ہمارا ہے بھی یا نہیں؟ یہ کشمکش ختم ہوجائے گی۔“

پارکنگ ایریا میں منوہر کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ پوجا کے ساتھ شاپنگ کے لیے گیا تھا۔ وکی نے اس کے قریب ہی اپنی کار پارک کی۔ پھر فون پر ماتحتوں کو حکم دیا کہ منوہر اپنی کار کے پاس آئے تو اسے گن پوائنٹ پر اغوا کیا جائے۔ ہم اس کی کار کے پاس ہی ہیں۔ اس کا انتظار کررہے ہیں۔

وہ انتظار ان کے لیے دردِ سر بن گیا۔ کیونکہ نئے دولہا دلہن تھے۔ جلدی واپس نہیں آسکتے تھے۔ دولہا اپنی دلہن کو جی بھر کر شاپنگ کرارہا تھا۔

محالا اور وکی کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا، پوجا دونوں ہاتھوں میں ڈھیر سارے پیکٹس اٹھائے ہوئے آرہی تھی۔ دکان کا ملازم بھی بہت سا سامان اٹھائے ہوئے تھا۔ انہوں نے ڈکی کھول کر سامان پھر پوجا نے ملازم سے کہا۔ ”جاؤ۔ منوہر سے کہو، آگئی۔ میں انتظار کررہی ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ پوجا اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر گئی۔ اسی وقت دو گن مین پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر آگئے۔ ایک نے اسے نشانے پر رکھ کر کہا۔ ”ذرا بھی آواز نکالو گی تو ماری جاؤ گی۔ یہ دیکھ رہی ہو کہ ریوالور سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ چیخنے سے پہلے ماری جاؤ گی۔“

وہ بولی۔ ”میں چیخنے چلانے کی غلطی نہیں کروں گی۔ یہ تو بتاؤ، تم لوگ کون ہو؟ ہم سے دشمنی کیا ہے؟“

”اپنی سلامتی چاہو اور خاموش بیٹھی رہو۔ ہم تمہیں، تمہارے شوہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“

پوجا اور محالا دونوں ہی اپنی اپنی کار میں اگلی سیٹ بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے منوہر کو دور سے آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی بہت سے پیکٹس تھے۔ اپنی کار کے قریب آتے ہی ٹھٹک گیا۔ اگلی سیٹ پر پوجا ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر دو اجنبی دکھائی دیے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، ایک شخص اس کے پاس بولا۔ ”میری جیب کو دیکھو۔ اس میں پستول ہے۔ ادھر تمہاری بیوی بھی گن پوائنٹ پر ہے۔ ذرا بھی منہ سے آواز نکالو گے تو مارے جاؤ گے۔“

تب منوہر کی سمجھ میں آیا کہ پوجا اسی لیے چپ بیٹھی ہے کہ وہ سہمی ہوئی ہے۔ کچھ بول نہیں پارہی ہے۔

منوہر نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”جو چاہتے ہیں، وہ بعد میں معلوم ابھی تم یہ تمام پیکٹس ڈکی میں رکھو گے۔ پھر اگلی سیٹ پر وائف کے ساتھ نہیں بیٹھو گے۔ پچھلی سیٹ پر جاؤ گے۔ جلدی کرو۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ کار کے پیچھے ڈکی کے آکر تمام سامان وہاں رکھا۔ محالا اور وکی اپنی کار کی سیٹ بیٹھے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایسے ہی وقت ایک سریلی سی فضا میں لہرائی۔ ”ہائے منوہر! تم یہاں ہو؟“

منوہر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رنجنا (صنم) اس کی آرہی تھی اور اس کے پیچھے یعقوب تھا۔ اب وہ ارجن کے بہروپ میں نہیں تھا۔ اپنی اصلی صورت کے ساتھ تھا۔ نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ ”یہ منوہر کو جاننے والی



کم بخت آگئی ہے؟“

اس نے سر گھما کر دیکھا تو حیرانی سے اچھل پڑی۔ اسے اپنا بیٹا، اپنا لختِ جگر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دبی سی چیخ کے ساتھ بولی۔ ”وکی! ادھر دیکھو۔ میرا بیٹا... او گاڈ! میرا بیٹا تو وہ ہے اور میں منوہر کو یعقوب سمجھ رہی ہوں۔“

وکی نے بھی سر گھما کر ادھر دیکھا۔ حیران ہوا پھر پوچھا۔ ”اب کیا کریں؟“

”فوراً اپنے آدمیوں کو فون کرو۔ ان سے کہو، وہ جو اس لڑکی کے ساتھ نوجوان ہے، اسے گن پوائنٹ پر رکھ کر اپنی گاڑی میں بٹھائیں اور یہاں سے لے چلیں۔“

وکی نے فون کے ذریعے اپنے ایک ماتحت کو مخاطب کیا۔ وہ ماتحت وہیں نگاہوں کے سامنے منوہر کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یس سر! کیا حکم ہے؟“

وکی نے کہا۔ ”وہ لڑکی جو منوہر کی طرف آرہی ہے، اس کے ساتھ جو نوجوان ہے، اسے گن پوائنٹ پر رکھو اور گاڑی میں بٹھا کر لے چلو۔“

ادھر منوہر نے رنجنا کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ گن پوائنٹ پر ہے۔ رنجنا کو یعنی صنم کو اس سے دور رہنا چاہیے۔ اس کے قریب نہیں آنا چاہیے۔

ماتحت نے فون پر کہا۔ ”سر! ہم اس آنے والے جوان کو گن پوائنٹ پر لے جائیں گے۔ لیکن ابھی جسے نشانے پر رکھا ہے، اس کا کیا کریں؟ ایسے ہی چھوڑ دیں گے تو یہ پولیس کو ہمارے پیچھے لگادے گا۔ ہمارے ایک ہی آدمی کی گن میں سائیلنسر لگا ہوا ہے اور اس نے پوجا کو نشانے پر رکھا ہے۔ ہم فائر کریں گے اور منوہر کو گولی ماریں گے تو ابھی بھیڑ لگ جائے گی۔“

وکی نے کہا۔ ”میں گولی مارنے کا حکم نہیں دے رہا ہوں۔ لہٰذا انہیں بھی ساتھ لے چلو اور جو نوجوان اس لڑکی کے ساتھ آیا ہے، انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جاؤ۔“

محالا کے چار ماتحت تھے۔ دو منوہر اور پوجا کے پاس رہ گئے۔ باقی دو نے یعقوب اور صنم کے پاس آکر انہیں گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ انہیں بھی یہی دھمکی دی کہ شور مچائیں گے، لوگوں کو مدد کے لیے بلائیں گے تو گولی ماردی جائے گی۔

یعقوب نے اسی وقت ایک ہاتھ اٹھا کر سر کھجایا۔ یہ جاں نثاروں کے لیے ایک سگنل تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے ساتھ کچھ ہورہا ہے۔ لہٰذا توجہ دو اور سمجھو کہ کیا ہورہا ہے؟

وہاں دو جاں نثار تھے۔ انہیں توجہ سے دیکھنے لگے۔ ایک نے فون کے ذریعے مزید جاں نثاروں کو وہاں بلایا۔ وہ سب بہت ہی تجربہ کار تھے۔ انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ دو افراد یعقوب بابا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر انہیں اپنی گاڑی میں بٹھانے لے جارہے ہیں۔

یعقوب نے ناماں کے محل میں رہ کر یہ ٹریننگ حاصل کی تھی کہ خطرے کے وقت مختلف حالات میں کس طرح ری ایکٹ کرنا اور مدد حاصل کرنا چاہیے؟

یعقوب مدد حاصل کرچکا تھا۔ جاں نثاروں کو سگنل دے چکا تھا۔ اب اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے گن مین سے کہا۔ ”جسٹ آمنٹ۔ میں نے تم لوگوں سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ مجھے کہاں لے جارہے ہو؟ لیکن یہ میری بیوی ہے۔ اپنے اُس بھائی سے ملنا چاہتی ہے۔ لہٰذا اسے منوہر کے پاس پہنچاؤ۔“

گن مین نے کہا۔ ”ہم تمہیں جہاں لے جارہے ہیں وہاں یہ اپنے بھائی سے مل سکے گی۔“

یعقوب نے کہا۔ ”میں تم سے بحث نہیں کررہا ہوں۔ تم بھی مجھ سے بحث نہ کرو۔ جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ میری بیوی کو اس کے بھائی کے پاس پہنچادو۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا۔ گولی چلانا ہے تو لو چلاؤ۔ مجھے مارو اور خود بھی کتے کی موت مرو۔ فائر کرنے کے بعد زندہ سلامت نہیں جاسکو گے۔ لوگوں کی بھیڑ ہے۔ ہیوی ٹریفک ہے۔ دور پولیس والے بھی نظر آرہے ہیں۔“

اسے گولی چلانے کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور یہ جانتا تھا کہ جسے لے جارہے ہیں، وہ محالا کا بیٹا ہے۔ وہ اسے نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اس نے مجبور ہوکر اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اس کی بیوی کو اس منوہر کے پاس لے جاؤ۔“

اس ساتھی نے کہا۔ ”اس گاڑی میں زیادہ لوگوں کی گنجائش نہیں ہے۔“

”نہیں ہے تو وہاں سے کسی ایک کو یہاں لے آؤ۔“

یہی کیا گیا۔ صنم ادھر منوہر کی طرف گئی تو پوجا کو یعقوب کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس طرح وہ دو گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔ ان کے پیچھے محالا کی گاڑی تھی۔

یعقوب نے انہیں تھوڑی دیر کے لیے الجھا دیا تھا۔ وہاں تھوڑا سا وقت گزرنے دیا تھا۔ تاکہ جاں نثاروں کی تعداد بڑھ جائے اور وہ پوری طرح مستعد ہوجائیں۔

انہیں یکجا اور متحد ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔ وہ فون کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے ہوئے مختلف راستوں سے محالا اور اس کے ماتحتوں کا تعاقب کر رہے تھے۔

انہوں نے یعقوب، صنم، پوجا اور منوہر کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی تھیں تاکہ انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ ان کا خفیہ اڈا کہاں ہے؟ انہیں یہ گمان تھا کہ ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی وہاں تک پہنچ نہیں پائے گا۔ مگر جاں نثار پہنچ گئے۔

جب ان کی آنکھوں کی پٹیاں کھولی گئیں تو انہوں نے خود کو ایک بڑے سے ہال میں دیکھا۔ وہاں مختصر سا سامان تھا۔ صوفے اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو ماتحتوں نے انہیں گن پوائنٹ پر رکھا تھا۔ باقی دو ماتحت باہر پہرا دینے چلے گئے۔

محالا ایک کمرے میں آئینے کے سامنے اپنا میک اپ اتار رہی تھی۔ وکی نے ہال میں آکر کہا۔ ''تم سب آرام سے بیٹھو۔ ہم تمہارے جانی دشمن نہیں ہیں۔''

اس نے منوہر اور پوجا سے کہا۔ ''ہم نے غلط فہمی کی بنا پر تمہیں اغوا کیا ہے۔ ابھی رہا کر دیں گے۔''

پھر اس نے یعقوب سے کہا۔ ''تم ہمارے لیے ضروری ہو۔ کیا یہ بتا سکتے ہو کہ ہم کون ہیں اور تم ہمارے لیے ضروری کیوں ہو؟''

یعقوب نے کہا۔ ''ہاں۔ اس چار دیواری کو دیکھتے ہی معلوم ہو گیا کہ تم لوگ کون ہو؟''

وکی نے حیرانی سے کہا۔ ''تعجب ہے۔ اس چار دیواری میں ایسی کیا بات ہے، جسے دیکھ کر ہمیں پہچاننے کا دعویٰ کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''یہ میسونی تنظیم کا سیکریٹ ہاؤس ہے۔ یہ تم نہیں جانتے، میری ماما جانتی ہیں۔ راڈمین اور دوسرے کئی پرانے عہدیدار جانتے ہیں کہ میں یہاں اکثر آتا جاتا رہا ہوں۔''

محالا وہاں آئی۔ پھر تیزی سے اپنے بیٹے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''ماما کی جان! تم ہماری تنظیم کے بہت سے خفیہ معاملات کو جانتے ہو۔ پہلے ماں کے کلیجے سے تو لگ جاؤ۔ پھر باتیں ہوں گی۔''

وہ آگے بڑھ کر ماں سے لپٹ گیا۔ اسے پیار کرنے لگا۔ محالا نے کہا۔ ''تم ماں کو بھول گئے تھے۔ مگر ماں بھلا کیسے بھول سکتی ہے؟ دیکھو میں نے پھر تمہیں بلا لیا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''بلانے کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ سمجھتی ہیں کہ میں پاپا کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ جاؤں گا؟''

''تم ماں کو چھوڑ کر باپ کے پاس گئے تھے۔''

''اس لیے گیا تھا کہ آپ ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ آپ میرے لیے دنیا کی سب سے عظیم ہستی ہیں، پاپا سے بھی کہتا ہوں کہ جیسی میری ماما ہیں، ویسی کسی کی ماں نہ ہوگی۔ لیکن آپ اس قابل نہیں ہیں کہ میرے پاپا کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔''

''کیا بکتے ہو؟ تمہارے پاپا اس قابل نہیں ہیں۔ ہوتے تو میں اپنی ساری زندگی ان کے نام کر دیتی۔''

''آپ میرے پاپا کی عظمت کو کبھی تسلیم نہیں کریں گی۔ انہوں نے راڈمین کو کس بری طرح سزا دی۔ وہ زندہ ہو کر بھی مردوں سے بدتر ہے۔ لیکن پاپا نے آپ کے بدن پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں ڈالی۔ اسی لیے کہ آپ میری ماں ہیں، مجھے دودھ پلایا ہے۔ اس کے برعکس آپ نے کیا، کیا؟ جب وہ راڈمین کی قید میں تھے تو آپ نے ان پر ظلم کی انتہا کر دی تھی۔''

''تمہارے پاپا میرے خلاف زہر اُگلتے رہے اور تم یقین کرتے رہے ہو۔ جبکہ میں ان کی بیماری میں رات ان کی خدمت کرتی رہی ہوں۔''

''اور ریڈ مرکری کا راز اگلوانے کی کوششیں کرتی رہیں۔ علاج کے بہانے پاپا کو جو دوائیں دیتی رہیں، وہ ان کو مزید کمزور کرتی رہیں۔''

''تم اپنے باپ کی زبان سے بول رہے ہو۔ اس میں بحث نہیں کروں گی۔''

''کرنی بھی نہیں چاہیے۔ جب آپ نے اپنے بیٹے کو گن پوائنٹ پر اغوا کرایا ہے تو میرے باپ کے ساتھ کیسی کیسی زیادتی کرتی رہی ہوں گی؟ یہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھے گا۔''

''میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ تم ماں کی محبت کو سمجھو گے؟ میں نے سوچا، تم سیدھی طرح نہیں آؤ گے۔ اس لیے گن پوائنٹ پر یہاں بلایا ہے۔''

''بہرحال بلا لیا۔ ہم ماں بیٹا مل رہے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا میں اپنے گھر جاؤں گا اور آپ اپنے گھر جائیں گی؟''

''نہیں۔ تم میرے ساتھ چلو گے اور اب میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے ممتا سے مجبور ہو کر مجھے یہاں نہیں بلایا ہے۔ بلکہ پاپا کو کمزور بنانے کے لیے میسونی تنظیم کی پلاننگ کے مطابق اغوا کرایا ہے؟''

''تم اپنی عقل سے جو بھی سمجھو۔ میں ماں ہوں، محبت سے مجبور ہو کر تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی۔''



''اور میں گن پوائنٹ پر نہیں جاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں، کسی دن اچانک آپ سے ملنے آؤں گا۔''

''پھر کسی دن آنے کی بات نہ کرو۔ اب آ ہی گئے ہو تو واپسی کا راستہ بھول جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔''

''میں نہیں جاؤں گا۔ میں مسلمان ہوں۔ یہودیوں کے ماحول میں نہیں رہوں گا۔ آپ کیسی ماں ہیں؟ پاپا کو کمزور بنانے کے لیے میسونی تنظیم کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے بیٹے کو اغوا کرا رہی ہیں؟''

''تم کچھ بھی سمجھو۔ میرے ساتھ شرافت سے چلو ورنہ میرے ماتحت شرافت نہیں دکھائیں گے۔ بے ہوشی کا انجکشن لگائیں گے پھر تمہیں آسانی سے لے جائیں گے۔''

''اگر میں یہاں سے آپ کو پاپا کے پاس لے جاؤں گا تو آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ پچھلی بار تو انہوں نے آپ کو معاف کر دیا تھا۔ دوسری بار انجام کیا ہوگا؟''

صنم، پوجا اور منوہر بہت پریشان تھے۔ چپ چاپ بیٹھے ماں بیٹے کی باتیں سن رہے تھے۔ یعقوب کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خوفزدہ نہیں ہے اور نہ ہی خود کو قیدی سمجھ رہا ہے۔ بلکہ اسے یہ یقین ہے کہ یہاں سے بخیریت واپس چلا جائے گا۔

یعقوب نے ان سے کہا۔ ''پریشان کیوں ہو؟ ہم یہاں قیدی نہیں ہیں۔ ہمیں اغوا نہیں کیا گیا ہے۔ میری یہ ماں بڑی بھولی ہے۔ سمجھتی ہے، شہزادہ سلمان سعدی عرف عمیر بن غازی کے بیٹے کی گردن بہت پتلی ہے۔ ہاتھ میں آ گئی ہے۔ جبکہ ان کی گردن میرے ہاتھ میں ہے۔''

محالا نے چونک کر بیٹے کو دیکھا۔ پھر وکی سے کہا۔ ''اس لڑکے کی غلط فہمی ختم کرو۔ جاؤ اور انجکشن لے کر آؤ۔ جب یہ بیہوش ہو جائے گا تو ان تینوں کی آنکھوں پر پھر سے پٹیاں باندھ کر انہیں کہیں لے جا کر چھوڑ دیا جائے گا۔''

وہاں دو گن مین تھے۔ انہوں نے خاص طور پر یعقوب کو نشانے پر رکھا تھا۔ محالا نے ان سے کہا۔ ''یہ میرا بیٹا ہے۔ میری جان ہے۔ مگر اس پر کڑی نظر رکھو۔ اس پر سے نظر نہ ہٹاؤ۔ یہ یہاں سے نکلنے کے لیے کچھ بھی کر گزرے گا۔ خبردار! اسے گولی نہ مارنا۔ مگر ہاں۔ زخمی کر دینا تاکہ بھاگنے کے قابل نہ رہے۔''

یعقوب نے کہا۔ ''ماما! یہ سمجھیں کہ اعلیٰ ظرفی کیا ہوتی ہے؟ میرے پاپا نے بدترین دشمنی کے باوجود آپ کے جسم پر خراش تک نہیں ڈالی اور آپ اپنے بیٹے کے لیے حکم صادر کر رہی ہیں کہ مجھے زخمی کر دیا جائے، یہاں سے بھاگنے یا چلنے

## بجٹ

ہماری تجویز ہے کہ آئندہ بجٹ بابوؤں کی بجائے ایسے لوگوں سے تیار کروایا جائے جو بابو نہ ہوں۔ مثلاً چند معمار حضرات کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ اس کی تعمیر صحیح طور پر کر سکیں۔ کہیں کچی نہ رہنے پائے۔ کیونکہ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

چند لوہار حضرات کو بھی بجٹ کی تیاری میں شریک کیا جائے۔ وہ بجٹ کو مضبوط سے مضبوط بنیادوں پر تیار کرنے میں مدد کریں گے اور آہنی بجٹ میں خامیوں کے لیے لچک نہیں رہے گی۔

کچھ بڑھئی کا کام کرنے والے بھی شامل کیے جائیں جو بجٹ کی چولیں درست طور پر بٹھا سکیں۔ چولیں درست ہوں گی تو بجٹ کا ڈھانچا بھی درست ہوگا۔

کچھ ایسے لوگ بھی بلائے جائیں جن کا تعلق طباعت کے فن سے ہو۔ وہ یہ بتا سکیں گے کہ بجٹ کے کونسے حصے سنہری حروف میں چھاپے جائیں اور کونسے عام سیاہی سے طبع ہوں؟

چند ایک جلد سازوں کی بھی ضرورت پڑے گی جو بجٹ کی مضبوط اور دلفریب جلد بندی کا اہتمام کریں اور اس طرح بجٹ ہر شخص کو خوبصورت دکھائی دے گا۔

ان میں دیگر پیشوں کے ہنرمند بھی شامل کیے جا سکتے ہیں مگر یہ بات ہم وزیر خزانہ پر چھوڑ دیتے ہیں وہ جس کو چاہیں شامل کر لیں۔ صرف ہمارا نام چھوڑ دیں کیونکہ ہم پہلے ہی ہر ماہ اپنے گھر کا بجٹ تیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں اس لیے ہمیں ان کی مدد کرنے کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ اگر ہماری ان تجاویز پر توجہ دی گئی تو کسی کو یہ اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملے گا کہ بجٹ بابوؤں کا تیار کردہ ہے۔ دوسرا یہ کہ ہنرمندوں کی شرکت سے واقعی بجٹ خالص عوامی ہوگا۔ اس طرح متوازن اور غیر متوازن کا چکر بھی ختم ہو جائے گا کیونکہ اس میں سرے سے توازن ہی نہیں رہے گا۔

شفیع عقیل کی کتاب ''سرخ سفید سیاہ'' سے اقتباس

پھرنے کے قابل نہ چھوڑا جائے؟ واہ ماما! واہ... کیا ممتا ہے آپ کی؟"

اس نے کلے کی انگلی اور انگوٹھے کو ریوالور کی شکل بناتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں! میرے پاس ہتھیار ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے' میں یہاں سے فرار ہونے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ ابھی اس ریوالور سے انہیں گولی ماروں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے دونوں گن مین کا باری باری نشانہ لیا اور پھر کہا۔ "ٹھائیں... ٹھائیں..."

یکبارگی دونوں گن مین اپنی جگہ سے اچھل کر پیچھے گئے۔ پھر فرش پر گر کر تڑپنے لگے۔ ایک کی پیشانی سے اور دوسرے کے سینے سے لہو ابل رہا تھا۔ محالا کے دیدے حیرانی سے پھیل گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیٹے کے اس ہاتھ کو دیکھ رہی تھی' جس کی انگلیوں سے ٹھائیں کہتے ہوئے گولی چلائی گئی تھی۔

یعقوب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ماما! اپنے پیچھے دیکھیں۔"

اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ دروازے پر دو جاں نثار کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ریوالور میں سائیلنسر لگے تھے۔ انہوں نے وہاں سے گولیاں چلائی تھیں۔

محالا نے گھوم کر دوسرے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کا دروازہ ایک زور دار آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ وہی اس دروازے سے ٹکراتا ہوا آکر اندر فرش پر گرا پڑا تھا۔ اسے بھی گولی لگی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر محالا کی طرف دیکھا' کچھ کہنا چاہا۔ مگر بے دم سا ہو کر فرش پر چاروں شانے چت ہوگیا۔

یعقوب نے کہا۔ "ماما! یہ جاں نثار باہر سے آئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باہر جو آپ کے آدمی تھے' وہ جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔ اب بتائیں' آپ کا کیا بنے گا؟"

محالا پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کسی شک و شبے کے بغیر حاصل ہونے والی کامیابی یوں اچانک ہی ناکامی میں بدل جائے گی۔

یعقوب نے کہا۔ "آپ شروع سے ہی پاپا سے دشمنی کرتی آئی ہیں۔ آج بیٹے سے بھی دشمنی کی۔ پہلی بار قیدی بننے کے بعد پاپا نے معاف کردیا تھا۔ اب دوسری بار کیا وہ معاف کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ وہ تو آپ کو لٹکوی' لولی اور کالی بنا کر ہاتھ میں کانسہ دے کر فٹ پاتھ پر بٹھا دیں گے۔ ذرا سوچ کر بتائیں' آپ کا انجام کیا ہوگا یا کیا ہونا چاہیے؟"

وہ ایک کرسی پر گم صم بیٹھی وکی کے علاوہ دو ماتحتوں کی لاشیں دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ باہر بھی کے مسلح ماتحت مارے گئے ہیں۔ وہاں جاں نثاروں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ وہ اس عمارت کے مختلف حصوں میں جا تھے۔ یعقوب انہیں بتا رہا تھا کہ یہاں جو تہ خانہ ہے' راستہ کہاں ہے اور وہاں جا کر انہیں کیا کرنا چاہیے؟

محالا تڑپ کر بیٹے کے پاس آگئی۔ اسے جھنجھوڑتے کہنے لگی۔ "تم اپنے آدمیوں کو تہ خانے میں جانے سے روکو۔ گھر کے بھیدی نہ بنو۔ میں نے تمہیں کٹر یہودی بنانے کے اور میسونی تنظیم کا وفادار بنانے کے لیے یہاں کے راز تھے۔ تم یہاں سے خفیہ دستاویزات نہیں لے جاؤ گے۔"

وہاں فرش کے نیچے ایک وسیع و عریض تہ خانہ تھا۔ صرف میسونی تنظیم کا ہی نہیں' دنیا کی بیشتر یہودی تنظیم ریکارڈ روم تھا۔ وہاں بہت سی اہم آڈیو' ویڈیو اور تحر دستاویزات تھیں۔ ان میں بیشتر دستاویزات بر اور امریکا کے خلاف تھیں۔ جرمنی' فرانس' برطانیہ اور ام اسرائیل کے زبردست حامی اور اتحادی ہیں۔ اس باوجود یہودی ان بڑے مددگار سپر پاور کہلانے والے کی بہت سی کمزوریاں اپنے ریکارڈ روم میں چھپا کر رکھے اور وقتاً فوقتاً ان کے ذریعے انہیں بلیک میل کر کے زیادہ زیادہ مالی اور عسکری امداد حاصل کرتے ہیں اور زبر سیاسی حمایتیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔

بہر حال جاں نثار وہاں اپنا کام کر رہے تھے۔ دستاویزات نکال کر لے جا رہے تھے۔ یعقوب نے جاں نثار سے ہتھکڑیاں لیتے ہوئے محالا سے کہا۔ "ماما! ہاتھ پیچھے کریں اور یہ ہتھکڑیاں پہن لیں۔"

وہ غصے سے بولی۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ اپنی کی توہین کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"توہین اس وقت ہوگی' جب میرے ہی جاں زبردستی آپ کو ہتھکڑیاں پہنائیں گے اور یہاں سے لے جائیں گے۔ پلیز۔ ایسی نوبت نہ آنے دیں۔"

اس نے ماں کے دونوں ہاتھ پیچھے لا کر ہتھکڑیاں دیں۔ اس نے پوچھا۔ "تم کیا کر رہے ہو؟ کیا مجھے کہیں جا رہے ہو؟"

"آپ خاموش رہیں۔ صبر اور سکون سے دیکھتی کہ کیا ہو رہا ہے؟ بیٹا آپ کی طرح آپ سے بدترین نہیں کرے گا۔"



وہ وہاں کو عمارت سے باہر لے آیا۔ صنم' پوجا اور منوہر کے ساتھ ایک ویگن کار میں بیٹھ گئی۔ دوسری گاڑی میں اس کے جاں نثار تھے۔ اور بھی کئی جاں نثار عمارت میں رہ گئے تھے۔ وہاں اپنے طور پر کارروائیاں کر رہے تھے۔ وہ گاڑیاں ڈرائیو کرتے ہوئے اس عمارت سے دور ایک دو منزلہ بنگلے میں آئے۔ بیٹا اپنی ماں کو دوسری منزل کی بالکونی میں لے آیا۔ وہاں سے دور وہ عمارت دکھائی دے رہی تھی' جہاں سے وہ ابھی آئے تھے۔ اس نے ماں کے ایک ہاتھ کی ہتھکڑی کھولی۔ پھر اسے لوہے کی ریلنگ سے پھنسا دیا۔ اس طرح وہ ریلنگ سے بندھ گئی تھی۔ ہل نہیں سکتی تھی' کہیں جا نہیں سکتی تھی۔

پھر اس نے کہا۔ "ماما! آپ کا ایک ہاتھ آزاد ہے۔ آپ فون کے ذریعے اپنی تنظیم کے سربراہ سے بات کرسکتی ہیں۔ اپنی حالتِ زار بتا سکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے' یہودیوں کا لشکر آپ کی مدد کے لیے یہاں آجائے۔ چلیں کوشش کریں۔"

اس نے ماں کے ہاتھ میں اس کا فون تھما دیا۔ وہ نمبر پنچ کرنے لگی۔ پھر اس نے فون کو کان سے لگایا۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ "ہیلو مسز ہوف مین! میں بول رہی ہوں۔"

یعقوب نے اس کے ہاتھ سے فون چھین کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اور میں بھی بول رہا ہوں۔ آپ نے میری ماں کی آواز سنی ہے۔ اب بیٹے کی آواز سنیں۔"

ہوف مین نے پوچھا۔ "کیا تم جے کوب بول رہے ہو؟"

"مجھے جے کوب نہیں' یعقوب بولیں۔ آپ کی یہ دست راست میڈم محالا مجھے ٹریپ کر کے آپ کے پاس پہنچانے آئی تھیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں ناں۔ خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا..."

وہ ماں کے کان سے فون لگا کر بولا۔ "اب آپ بولیں۔"

وہ بولی۔ "مسٹر ہوف مین! میں بری طرح پھنس گئی ہوں۔ ہمارے تمام آدمی مارے گئے ہیں۔ جے کوب نے اپنے جاں نثاروں کو تہ خانے کے ریکارڈ روم تک پہنچا دیا ہے۔ ہم بہت بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پلیز فوراً اپنے آدمی بھیجیں۔ میں یہاں سے دیکھ رہی ہوں۔ اس عمارت کے احاطے میں اس کے جاں نثاروں کی گاڑیاں موجود ہیں۔ وہ وہاں ہیں۔ انہیں گھیرا جاسکتا ہے۔ پلیز جلدی کریں۔"

یعقوب نے فون کو اپنے کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں۔ جلدی کرو۔ ایک بار تم سے پہلے والے سربراہ راڈ مین نے غلطی کی تھی۔ پاپا کو تہ خانے میں قید کیا تھا۔ آج وہ قید کرنے والا ٹوٹے پھوٹے' چپکے ہوئے کھلونے کی طرح تمہارے پاس پڑا ہے۔ اب تم نے اور ماما نے دوسری بار مجھے ٹریپ کرنے کی غلطی کی ہے۔ اس کی بھی ناقابلِ برداشت سزا تم لوگوں کو ملے گی... کم آن جلدی کرو۔ یہ جاں نثار تمہارے خفیہ اڈے کے ریکارڈ روم سے انتہائی اہم دستاویزات نکال کر لے جا رہے ہیں۔ تم چشم زدن میں اندازہ کر رہے ہو گے کہ تمہیں کیسا ناقابلِ برداشت نقصان پہنچ رہا ہے؟ انہیں روکو۔ اپنا لشکر بھیجو۔ جلدی کرو۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم ہوگیا۔ یعقوب نے کہا۔ "ماما! تمہارے سربراہ ہوف مین نے رابطہ ختم کر دیا ہے۔ کھلبلی پیدا ہوگئی ہے۔ اب وہ اپنا لشکر یہاں بھیج رہا ہوگا۔"

وہ عاجزی سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "بیٹے! تم نادانی کر رہے ہو۔ ابھی دودھ پیتے بچے ہو۔ تمہارا باپ تمہیں الو بنا رہا ہے۔ اپنی ماں سے بدظن کر رہا ہے۔ انسانی رشتوں کی تمام ہسٹری پڑھ کر دیکھو' سمجھو کہ ماں سے زیادہ اہم اور عظیم ہستی کوئی نہیں ہوتی۔"

"بیشک۔ میں نے پڑھا ہے' سنا ہے اور دیکھا ہے' مائیں اتنی عظیم ہوتی ہیں کہ ان کے سامنے سر جھکتا ہے۔ اگر خدا اجازت دے تو ہم ماں کے آگے سجدہ کریں گے۔ لیکن ہماری شرافت' ہماری تہذیب پوچھتی ہے کہ ایسی ماں کا کیا کریں' جو گن پوائنٹ پر اپنے ہی بیٹے کو اغوا کراتی ہے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے' جب پیدا ہوا تھا تو گن پوائنٹ پر مجھے دودھ پلایا تھا۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گی۔ باپ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔"

یعقوب نے فون کے ذریعے جاں نثاروں کو مخاطب کیا۔ پھر کہا۔ "فوراً پاپا سے بات کراؤ۔"

میں نے دس منٹ کے بعد بیٹے سے کہا۔ "ہیلو یعقوب! مجھے پل پل کی رپورٹ مل رہی ہے۔ تم ماں کو اس خفیہ اڈے سے دور کسی بنگلے میں لے گئے ہو۔ بیٹے! تمہاری ماں کو اور میسونی تنظیم کو زبردست سزا مل رہی ہے۔ ان کی اہم دستاویزات ہمارے ہاتھ لگ گئی ہیں۔ اب وہاں سے نکلو۔ زیادہ دیر نہ کرو۔ محالا کو جاں نثاروں کے حوالے کردو۔"

"نو پاپا! یہ جیسی بھی ہیں۔ میری ماں ہیں۔ میں جانتا ہوں' آپ انہیں قیدی بنا کر اس بار معاف نہیں کریں گے۔ راڈ مین کی طرح سزا دیں گے اور میں یہ نہیں چاہتا۔"

"تم باپ کی جان ہو۔ جو چاہو گے' وہ مجھے منظور ہے۔ مگر جو کرنا ہے' فوراً کرو اور وہاں سے نکلو۔"

"آپ فون بند نہ کریں۔ میری ماما سے کچھ بولیں۔"

"بیٹے! میں اس عورت کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اس سے بات کرنے کو نہ کہو۔"

"پلیز۔ یہ صرف ایک عورت ہی نہیں ہیں۔ میری ماں بھی ہیں۔"

وہ اب بھی ایک بچہ تھا۔ ماں سے زخم کھا کر اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ میں نے کہا۔ "اچھا فون اسے دو۔"

اس نے فون کو محالا کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "کم آن میرے پاپا سے بات کریں۔"

وہ ذرا دیر چپ رہی۔ پھر یکبارگی رونے لگی۔ میں نے کہا۔ "میں کئی بار یہ مگرمچھ کے آنسو دیکھ چکا ہوں۔ بہت زبردست ڈراما پلے کرتی ہو۔ تمہارے آنسو بیٹے کے دل پر ٹپک رہے ہوں گے۔ وہ تمہاری موجودہ حالت پر تڑپ رہا ہوگا۔ جبکہ اس نے خود ہی تمہیں ہتھکڑیاں پہنائی ہیں۔"

وہ روتے اور سسکتے ہوئے بولی۔ "میرا بیٹا مجھے دے دو۔"

"گن پوائنٹ پر نہ ملا تو آنسو بہا کر مانگ رہی ہو۔ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ ابھی تمہارے پاس ہے۔ اسے لے جاؤ۔ نہ جانے تو سمجھو تم نے ماں کے تقدس کو، اس کی عظمت کو کیسے پامال کیا ہے؟ آج بھی وہ تمہاری عزت کر رہا ہے۔ لیکن وہ دن جلدی آئے گا، جب تمہاری ممتا پر تھوک دے گا۔ میں تو تم پر تھوک چکا ہوں۔ فون بیٹے کو دو۔"

محالا نے فون کو اپنے کان سے ہٹا دیا۔ یعقوب نے کہا۔ "پاپا! میں ماما کو ایک اور موقع دے رہا ہوں۔ یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ان کے یہودی رشتے دار آئیں گے اور انہیں یہاں سے لے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم وہاں سے فوراً نکلو۔ مجھے معلوم ہے ابھی کیا ہونے والا ہے۔"

اس نے فون کو یعنی مجھے بوسہ دے کر رابطہ ختم کر دیا۔ جس نمبر پر رابطہ ہوا تھا۔ اسے مٹا دیا۔ اچانک ہی محالا خوشی سے اچھل پڑی۔ "وہ آگئے۔ میری مدد کے لیے آگئے۔"

یعقوب نے دور اس عمارت کی سمت دیکھا۔ وہاں ایک درجن سے زیادہ گاڑیاں آگئی تھیں۔ بیشمار مسلح افراد گاڑیوں سے نکل کر اس عمارت کا محاصرہ کر رہے تھے اور بڑے محتاط انداز میں اندر جا رہے تھے۔

محالا نے کہا۔ "میرا فون دو۔ میں ان سے بولوں گی۔ وہ مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔ تم نے اپنے باپ سے کہا ہے کہ مجھے واپس جانے دو گے۔"

اس نے ماں سے کچھ فاصلے پر فون کو فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے جانے کے بعد آپ کو ذرا تکلیف ہوگی۔ لیکن کوشش کرتے کرتے فون تک پہنچ جائیں گی۔"

وہ غصے سے بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟ فون دو۔ اب میں تمہاری محتاج نہیں ہوں۔ میرے مددگار آگئے ہیں۔ وہاں دیکھو! تمہارے جاں نثاروں کی شامت آگئی ہے۔ حرام موت مارے جائیں گے۔ ریکارڈ روم سے ایک فائل بھی نہیں لے جاسکیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک زوردار دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا۔ محالا نے کانپتے ہوئے دل سے دیکھا، خفیہ عمارت کا کچھ حصہ تباہ ہو رہا تھا۔ وہاں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا۔ تیسرے دھماکے کے ساتھ پوری عمارت آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں آگئی۔ چند افراد جان بچانے کے لیے بھاگتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ باقی دھماکوں کی نذر ہو گئے تھے۔

محالا پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اس کے دیدے کھل گئے تھے۔ منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنکھیں کھول کر نہیں، منہ کھول کر دیکھ رہی ہو۔

"میری بیچاری ماما...!" یعقوب نے ماں کو دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگالیا۔ "میرا بچپن میرے رات اسی سینے سے لگے رہے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ باقی عمر اپنی ماں سے لگا رہتا۔"

اس نے ماں کی پیشانی کو چوما۔ پھر اس کے دونوں رخساروں کو چوم کر کہا۔ "پلیز۔ واپس جا کر سوچیں۔ کیا میرے اور پاپا کے ساتھ رہ سکتی ہیں؟ میں روز صبح اٹھ کر آپ کا چہرہ چومنا چاہتا ہوں۔"

اس نے فرش پر گھٹنے ٹیک دیے۔ ماں کے پیروں کو چھو کر کہا۔ "یہاں سے جنت کا دروازہ کھلتا ہے۔ اسے کھولنے کے لیے آپ کو ماں بننا پڑے گا۔ آپ میرے پاپا کی شریک حیات تو نہ بن سکیں۔ میری اچھی ماں تو بن جائیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے الگ ہو کر دیکھا۔ ماں نے پہلے بیٹے کو پھر تباہ ہونے والی عمارت کو دیکھا۔ وہاں آگ کے شعلے اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتا نہیں وہ بیٹے کی بات سے متاثر ہو کر رو رہی تھی یا خفیہ اڈے اور ریکارڈ روم کی تباہی پر رو رہی تھی؟ آنسو دو غلے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

بیٹا منہ پھیر کر چلا گیا۔

> تجسس و تحیر سے بھرپور مزید
> واقعات اگلے شمارے میں



بہت عرصے تک ننگا یہی سمجھتا رہا کہ خمیرہ گاؤزبان شاید ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو گانے کے معاملے میں اپنی زبان کو رواں کرنا چاہتے ہوں لیکن پھر کسی بھلے مانس نے اسے بتایا کہ خمیرہ گاؤزبان دماغی طاقت کے لیے ہوتا ہے۔ تب اس نے اسی شام گوریا کو فیصلہ سنا دیا۔ "میرا خیال ہے مجھے پاؤ ڈیڑھ پاؤ خمیرہ گاؤزبان کھانا پڑے گا۔"

"کیوں؟ آخر ایسی کیا مصیبت آن پڑی تم پر؟" گوریا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا تمہیں علم نہیں کہ یہ چیز دماغی طاقت کے لیے ہوتی ہے؟" ننگے نے اس پر اپنی علمیت کا رعب جھاڑا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے کہ یہ خمیرہ دماغی طاقت کے لیے ہوتا ہے۔" گوریا منہ بنا کر بولی۔ "لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں اس کی کیا ضرورت آن پڑی؟ طاقت تو ظاہر ہے، اس چیز کو بنایا جا سکتا ہے جو انسان کے پاس موجود ہو۔"

**غم روزگار میں مبتلا ایک بہروپیے کا دلچسپ روپ**

کچی آبادی کی زگ زیگ گلیوں کے مانند... ننگے کی زندگی میں بھی بے شمار نشیب و فراز تھے مگر... مجال ہے جو اس مرد مجاہد نے ذرا بھی ہمت ہاری ہو... جہاں حالات سے مقابلے کے لیے اتنی سر توڑ کوششیں کی جائیں وہاں کسی کا سر توڑے بغیر ہی کامیابیاں مل جاتی ہیں... اس کا ثبوت معصوم ننگے کا یہ کارنامہ ہے جسے وہ ہزار ہا دشواریوں کے باوجود انجام دے ہی گیا۔

# شلغم کی چوری

نجمہ مودی

جب دماغ جیسی فالتو چیز تمہارے پاس ہے ہی نہیں تو اسے طاقت دینے کی فکر میں کیوں دبلے ہو رہے ہو؟''

''ایک تو تم نے شادی سے پہلے ہی بیویوں والا رویہ اپنا لیا ہے یعنی قسم کھا لی ہے کہ تم کسی معاملے میں میری ہمت افزائی نہیں کرو گی۔'' نکا برا مناتے ہوئے بولا۔ ''بالفرض اگر میرے پاس دماغ نہیں ہے تب بھی اس کا سب سے زیادہ فائدہ تمہیں ہی پہنچ رہا ہے۔ ظاہر ہے جس کے پاس دماغ ہوگا، وہ تم جیسی لڑکی کے چکر میں کیوں پڑے گا، جس کی ناک اور پکوڑے کے درمیان اگر مقابلہ حسن منعقد کرایا جائے تو پکوڑے کو دو چار نمبر زیادہ ہی ملیں گے...... اور تمہاری آنکھیں......؟ یوں لگتا ہے جیسے کسی بچے نے چھروں والی بندوق سے کسی صندوقچے میں دو سوراخ کر دیے ہیں......''

ابھی شاید نکا آگے بھی کچھ کہتا اور گوریا کے ہونٹوں، بالوں اور رخساروں کے لیے بھی کچھ تشبیہات پیش کرتا مگر گوریا غصے سے تھر تھر کانپتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے چلانے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اس کے زکام زدہ گلے سے کچھ اور بھی منمناتی ہوئی آواز نکلی۔ ''تم...... یہ سب کچھ تم کہہ رہے ہو؟ تم......؟ جو کل ہی کہہ رہے تھے کہ میری ناک قلو پطرہ کی ناک سے زیادہ حسین ہے اور میری آنکھیں کسی ہرنی کی آنکھیں معلوم ہوتی ہیں۔''

''ہاں...... اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کل تک میں نے قلو پطرہ کی تصویر ہی نہیں دیکھی تھی اس لیے تمہاری ناک کو اس کی ناک سے تشبیہ دے بیٹھا تھا۔ دوسرے میں نے جس ہرنی کا ذکر کیا تھا، وہ دراصل دونوں آنکھوں سے محروم تھی۔ اندھی تھی...... اور ایک مزار پر بھیک مانگ رہی تھی۔'' نکے نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ اگر میں تمہارے حسن کی تعریف کر ہی بیٹھا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کل میں پیے ہوئے تھا۔''

''کیا......؟'' گوریا اپنا غصہ اور تھر تھر کانپنا سب کچھ بھول گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''کیا کہا تم نے؟ اب تم پینے پلانے بھی لگے ہو؟ کل تم پی کر یہاں آئے تھے؟ یہاں...... میرے دفتر میں؟''

''ہاں۔ کل میں نے پی ہوئی تھی۔ پرنس روڈ کی لسی۔'' نکے نے تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''اور چونکہ بڑی مدت کے بعد پی تھی اس لیے کچھ خمار سا چڑھ گیا تھا۔ اسی لیے اول فول بک رہا تھا۔ تمہارے حسن کی تعریفیں کر رہا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، حقیقت میں، میں تمہاری نظر میں ذرا بھی حسین نہیں ہوں؟'' گوریا نے دوبارہ اسٹارٹ لیا اور تھر تھر کانپنے لگی۔

''میری نظر کو گولی مارو۔ تم اگر کسی اور کی نظر میں حسین ہو تو مجھے بتاؤ۔'' نکا غصہ دلانے والے لہجے میں ...

''کوئی گینڈا ہی تمہیں حسین قرار دے سکتا ہے اور وہ بھی ... جس کی آئی سائٹ کافی کمزور ہو چکی ہو۔''

''بس...... بس...... بہت ہو چکی۔'' گوریا ... وجود سے کانپنے لگی کہ اس کے کانوں میں بندے ... طرح جھولنے لگے۔ ''اب تم فوراً یہاں سے دفع ہو ... آئندہ اس دفتر میں قدم نہ رکھنا۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ دفتر ... نہیں، میرے دوست سجاد کا ہے اور وہ اس وقت موجود ... ہے۔ میں تو یونہی ذرا انتظار کی گھڑیاں گزارنے ... تمہارے پاس بیٹھ گیا تھا۔''

''اگر تمہیں سجاد کے انتظار میں بیٹھنا ہی ہے ... سامنے اس صوفے پر بیٹھو جس کا کشن پھٹا ہوا ہے۔ یہ ... ملاقاتیوں کے لیے مخصوص ہے جو بن بلائے آ جاتے ہیں۔'' گوریا نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''ارے تم تو واقعی ناراض ہو گئیں۔'' نکا فوراً ... بدلتے ہوئے بولا۔ وہ مہینوں دھکے کھانے کے بعد ... زمانہ شناس ہو گیا تھا۔ یکایک ہی اس کے لہجے میں ... شیرینی سمٹ آئی کہ دو تین مکھیاں اس کے منہ کے ... منڈلانے لگی تھیں۔

وہ اپنے چہرے پر کسی سرکاری افسر کے معمولی ... کی سی مسکینی طاری کر کے بات جاری رکھتے ہوئے ... ''میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تمہارا حسن بلاخیز تو آنکھوں کو خیرہ کیے رکھتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میری آنکھیں قدرتی طور ہی ایسی ہیں کہ چندھیائی ہوئی سی لگتی ہیں۔ ان بے وقوفوں کو کیا معلوم کہ تمہیں دیکھ دیکھ کر میری آنکھوں کا یہ حال ہے۔ جتنی دیر تمہیں دیکھتا رہتا ہوں، یوں لگتا ہے کہ آسمان پر کوندتی ہوئی بجلی کو دیکھ رہا ہوں اور جتنی دیر میں تمہیں نہیں دیکھ پاتا، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں لوڈشیڈنگ گزارا کر رہا ہوں اور غصے میں چونکہ تم زیادہ حسین ہو جاتی ہو اور تمہارے جلووں کی دو تیغ بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے تمہیں غصہ دلا رہا تھا۔''

گوریا کی حالت کچھ اعتدال پر آئی اور وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے تھر تھر کانپنا بھی بند کر دیا اور جو غصے کی شدت سے جامنی ہو گیا تھا، دوبارہ گندمی ہو گیا۔ اب بھی وہ سنجیدہ ہی نظر آ رہی تھی۔



''ہاں...... تو میں بات خمیرہ گاؤزبان کی کر رہا تھا۔'' نکے نے سلسلہ کلام یوں جوڑا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ''دراصل میں نے بہت سوچ بچار کی ہے...... بہت غور و فکر کیا ہے......''

''کاش تم ہر وقت غور و فکر کرنے کے بجائے کچھ کام بھی کر لیتے۔'' گوریا اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ لہجے میں اب بھی تلخی تھی لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ دل ہی دل میں وہ نکے سے صلح کر چکی ہے۔ مسکا پالش کام دے گئی تھی۔

''میں نے کام ہی کے سلسلے میں غور و فکر کیا ہے۔'' نکا جلدی سے بولا۔ ''میں سوچتا رہا کہ آخر زندگی میں میری ناکامی کی وجہ کیا ہے۔ اپنے مسائل کا حل میری سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا دماغ کمزور ہے۔ اس لیے میں صحیح طور پر سوچنے سے قاصر ہوں۔''

''میرے خیال میں تو تم سرے سے سوچنے ہی سے قاصر ہو۔ صحیح اور غلط کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے۔'' گوریا نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی لیکن نکا اس طرح اپنی بات کٹوانے اور اس کے باوجود بات جاری رکھنے کا عادی ہو چکا تھا اس لیے وہ کوئی نوٹس لیے بغیر بولا۔ ''چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے چند روز خمیرہ گاؤزبان کھانا چاہیے اور کیونکہ آج کل میری جیب میں ڈھائی تین ہزار روپے موجود ہیں اس لیے یہ ظالم سماج میرے اور خمیرہ گاؤزبان کے درمیان حائل نہیں ہو سکتا۔''

''کاش کوئی ایسا خمیرہ بھی ایجاد ہوا ہوتا جو تمہاری زبان بند کر سکتا۔'' گوریا تلخ لہجے میں بولی۔

''ایسا خمیرہ تو صدیوں پہلے دریافت ہو چکا ہے نادان لڑکی!'' نکا مربیانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس خمیرے کا نام بیوی ہے جس کا خمیر ہی کسی ایسی چیز سے اٹھا ہے کہ اس کے آتے ہی اچھے اچھوں کی زبان بند ہو جاتی ہے۔''

''تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' گوریا جلے کٹے لہجے میں بولی۔ ''یہ خمیرہ زباں بندی جس کا تم ذکر کر رہے ہو تمہارے گھر میں کبھی نہیں آئے گا۔ مانا کہ دنیا میں بہت سی لڑکیوں کے مقدر پھوٹے ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں کسی لڑکی کا مقدر اس حد تک نہیں پھوٹ سکتا کہ وہ تم سے بیاہ دی جائے۔''

''ارے...... اتنے تجاہل عارفانہ سے بات کیوں کر رہی ہو؟'' نکا خالص رانجھا مارکہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری نظر تو بس ایک ہی لڑکی پر ہے اور اس کا مقدر بہر حال پھوٹ کر رہے گا۔'' پھر وہ قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ویسے تم تو ناحق اتنے تلخ الفاظ استعمال کرتی ہو گوریا! بس اب صرف چند ماہ کی بات ہے، اس کے بعد میرے حالات ایسے بدل جائیں گے کہ تم مجھ سے شادی کرنے میں فخر محسوس کرو گی۔''

''یہ بات میں پچھلے تین سال سے سن رہی ہوں۔'' گوریا منہ بنا کر بولی۔

نکا بڑے جوش سے بولا۔ ''قوموں کی زندگی...... اوہ معاف کرنا...... میرا مطلب ہے، عاشقوں کی زندگی میں تین سال کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ تین سال تو وہ جماہیاں لیتے ہوئے ہی گزار دیتے ہیں۔''

''نہیں...... بعض لوگ بکواس کرتے ہوئے بھی گزارتے ہیں جیسے تم۔'' گوریا کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بیزاری کے ساتھ بولی۔

''اچھا...... اب میں جا رہا ہوں۔'' نکا گویا ایک عزم کے ساتھ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب میں تم سے اسی وقت ملوں گا جب میں خمیرہ گاؤزبان کھانے کے بعد نہایت گہرائی کے ساتھ سوچ بچار کر کے اپنے مسائل کا حل دریافت کر چکا ہوں گا، خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور کسی زنگ خوردہ توپ سے

## خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826,021-32446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

نکلے ہوئے گولے کی طرح دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

گوریا کا خیال تھا کہ اب وہ کئی روز تک واپس نہیں آئے گا مگر خلافِ توقع وہ دوسرے دن ہی پھر آن موجود ہوا۔ اس وقت سجاد بھی گوریا کے پاس ہی کھڑا تھا اور کسی کام کے سلسلے میں اسے ہدایات دے رہا تھا۔ نکے کی باچھیں اتنی زیادہ کھلی پڑ رہی تھیں کہ وہ دونوں تشویش آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھے بغیر نہیں رہ سکے۔

”کیا تمہیں سرِراہ کوئی ایک آدھ روپے کا سکہ پڑا مل گیا جو اتنے خوش نظر آ رہے ہو؟“ سجاد نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ارے آج تو پانچ کا سکہ بھی مل جاتا تو میں اتنا خوش نہ ہوتا جتنا اس وقت ہوں۔“ نکا لہک کر بولا۔ پھر وہ گوریا کی طرف دیکھتے ہوئے فاتحانہ لہجے میں بولا۔ ”دیکھا...... میں نہ کہتا تھا کہ خمیرہ گاؤزبان میرے لیے ترقی و کامیابی کی راہیں کھول دے گا۔ رات میں نے اس کا پہلا چمچہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔“

”تم نے اچھی طرح دیکھ بھی لیا تھا کہ وہ خمیرہ گاؤزبان ہی تھا؟ کہیں کسی مشہور دکان کی نہاری وغیرہ تو نہیں تھی؟“ گوریا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں...... مجھے معلوم ہے، وہ خمیرہ ہی تھا۔“ نکا ذوق سے بولا۔ ”کیونکہ میں نے وہ حکیم صاحب کے مطب سے خریدا تھا اور نہاری فی الحال کسی حکیم کے مطب پر دستیاب نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خمیرے کا ایک چمچہ منہ میں ڈالتے ہی میرے خیالات پر سے دھند بالکل صاف ہو گئی۔ سستی، کاہلی بالکل دور ہو گئی، میں چست و چالاک ہو گیا۔ زندگی کا راستہ مجھے بالکل صاف دکھائی دینے لگا حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں ورنہ اب تک میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ دو اور دو ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ میری ناکامی کی سب سے بڑی وجہ میری سمجھ میں آ گئی اور معلوم ہو گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”کیا وجہ تھی تمہاری ناکامی کی؟“ گوریا نے گویا ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”یہی...... کہ میرا کوئی آفس نہیں تھا۔ لوگوں کو جب معلوم ہی نہیں ہوگا کہ ایک عظیم آدمی کا کاروباری ٹھکانا کون سا ہے اور اس کے اوقاتِ کار کیا ہیں، تب تک وہ اس کی خدمات سے فائدہ کیا خاک اٹھائیں گے؟“ نکے نے یوں اس کی طرف دیکھا گویا اس نے کوئی انعامی معما حل کر لیا ہو۔

”لیکن میں نے اپنا یہ اچھا بھلا شاندار [illegible] تمہارے لیے مخصوص کیا ہوا ہے۔ میں نے تمہیں اجازت دی ہوئی ہے کہ جب اور جس طرح چاہو اسے استعمال کر کے اپنے کلائنٹس کو یہاں بلا سکتے ہو...... بلکہ میں خود تمہیں کلائنٹ تلاش کر کے دیتا رہا ہوں اور جو اکا دکا کیس تمہیں ملے وہ میں نے ہی تو دلائے تھے۔ اس کے باوجود تمہیں یہ خیال کہ دفتر نہ ہونے سے تمہارا دھندا مندا جا رہا ہے؟“ سجاد کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”نہیں یار......! تمہاری نوازشات اپنی جگہ ہیں۔“ نکا فوراً پُرخلوص لہجے میں بولا۔ ”میں کوئی تمہاری مہربانیوں سے منکر تھوڑا ہی ہو رہا ہوں۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ دوستوں کی چیزیں بھی گو کہ اپنی ہی ہوتی ہیں اور دوستوں کو تکلیف [illegible] دوستوں کا اخلاقی فرض ہے لیکن میں نے سوچا، انسان کو گھٹنوں پر کھڑے ہونے کی کوشش بھی کرنا چاہیے۔“

”اپنے پیروں پر۔“ گوریا نے تصحیح کی۔

”مجھ جیسے آدمی کو پہلے تو گھٹنوں پر کھڑا ہونا پڑے گا، پیروں پر کھڑے ہونے کی نوبت تو بعد میں آئے گی۔“ نکے نے فوراً جواب دیا اور ایک بار پھر سجاد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب دیکھو نا...... یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ تمہارے ہاں میرا کلائنٹ پہنچے پھر تم میری تلاش میں آدمی دوڑاؤ۔ خوش قسمتی سے خود ہی کسی آوارہ گائے کی طرح ٹہلتا ہوا منہ اٹھائے یہاں پہنچ جاؤں۔ اس طرح ذرا پوزیشن نہیں بنتی، کلائنٹ پر رعب نہیں پڑتا۔ میرا گھر ابھی ایسا نہیں ہے کہ کلائنٹ کو وہاں بھیج سکو۔ میں بھی مالک مکان کے خوف سے وہاں ذرا کم ہی پایا جاتا ہوں۔ اب معاملہ ذرا باعزت ہو گا تاکہ کوئی تم سے اپنے مسئلے کا ذکر کرے گا اور تم اسے وزیٹنگ کارڈ دے کر کہو گے کہ اس پتے پر تشریف لے جائیے۔ یہاں ایک مردِ قلندر موجود ہے جو آپ کو مشکلات کی دلدل سے یوں نکال لے گا جیسے دودھ سے جھینگر۔“

”دودھ سے مکھی۔“ گوریا نے ایک بار پھر تصحیح کی۔

”مکھی پھر بھی ذرا مشکل سے نکلتی ہے۔ جھینگا ہے نا۔ جھینگر آسانی سے نکل آتا ہے۔ ویسے بھی میرے دودھ والے نے شاید حال ہی میں جوہڑ تبدیل کیا ہے۔ پہلے اس سے صرف مکھیاں نکلتی تھیں۔ پھر کچھ عرصہ ننھی منی مچھلیاں رہیں۔ آج کل جھینگر نکل رہے ہیں۔ میرے خیال میں کل وہ جس جوہڑ سے دودھ میں پانی ملا رہا ہے، وہاں اجتماعی خودکشی کے لیے آتے ہیں۔ اس لیے میرے ذہن پر جھینگر سوار ہیں۔“ نکے نے وضاحت کی۔



”تو کیا تم دودھ بھی پیتے ہو؟“ گوریا نے مشکوک سے انداز میں اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔

”ہاں...... ہفتے میں پاؤ ڈیڑھ پاؤ تو پی ہی لیتا ہوں۔“ نکے نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔ ”بھئی کیا کریں، جان شان کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے اور پھر میرا تو پیشہ بھی کافی خطرناک ہے۔“

”تم وہ کچھ وزیٹنگ کارڈ کی بات کر رہے تھے۔ چھپوا لیے کیا تم نے؟“ سجاد نے اسے واپس اصل موضوع کی طرف گھسیٹا۔

”وزیٹنگ کارڈ تو بس اب کوئی کلائنٹ آنے کے بعد ہی چھپیں گے۔ البتہ میں نے شہر کے تقریباً سبھی اچھے پریسوں کو اسٹینڈ بائی رہنے کی ہدایت کر دی ہے کہ عنقریب ان میں سے کسی خوش نصیب کے پاس میرے وزیٹنگ کارڈ چھپنے کا آرڈر آنے والا ہے۔“ نکے نے بتایا۔ ”ذہن روشن ہونے کے بعد سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا ہے کہ آفس لے لیا ہے۔ ظاہر ہے، اس کے بعد ہی وزیٹنگ کارڈ چھپنے کا مرحلہ آ سکتا ہے۔ اس پر کوئی ایڈریس تو چھپانا پڑے گا نا۔“

”...... تو تم نے آفس لے لیا؟“ سجاد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ گویا گرتے گرتے بچا۔ ”رقم کہاں سے آئی تمہارے پاس؟“

”میں کوئی اتنا گرا پڑا آدمی تو نہیں ہوں۔ تین چار ہزار روپے تھے میرے پاس۔“ نکے نے فخریہ انداز میں سینہ پھلاتے ہوئے جواب دیا مگر اس کوشش میں قمیص میں بھی اس کی پسلیاں نمایاں دکھائی دینے لگیں۔

”تین چار ہزار روپے میں آفس مل گیا تمہیں؟“ سجاد ایک بار پھر گرتے گرتے بچا۔

”ہاں۔“ نکے نے سادگی سے جواب دیا۔ ”کوئی پگڑی، کوئی ڈپازٹ، کوئی ایڈوانس نہیں دینا پڑا۔ بس ایک ماہ کا کرایہ دیا ہے۔ آخر واقفیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ لینڈلارڈ کے دادا اور میرے دادا نے ایک مرتبہ انڈیا میں دو تین میل تک بیل گاڑی میں اکٹھے سفر کیا تھا۔ تب سے دونوں خاندانوں کے درمیان گہرے مراسم چلے آ رہے تھے۔ یعنی عید، بقرعید کے موقع پر عیدگاہ میں دونوں خاندانوں کے مرد ایک دوسرے سے ضرور مل لیتے تھے۔ اسی محبت کے پیشِ نظر موجودہ لینڈلارڈ نے واجبی کرائے پر وہ عظیم الشان دفتر میرے سپرد کر دیا۔ سخاوت، فیاضی اور ہمدردی کی تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔“

”بشرطیکہ وہ تاریخ تم نے لکھی ہو۔“ گوریا نے لقمہ دیا۔

نکا اس کی طرف توجہ دیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس وقت دراصل اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تمہیں وہ آفس دکھا دوں تاکہ تم بوقتِ ضرورت کلائنٹ کو صحیح طور پر میرا پتا سمجھا کر میرے پاس بھیج سکو یا خود ہی ساتھ لے کر آ سکو۔ بلکہ بہتر یہی ہوگا کہ خود ہی ساتھ لے کر آیا کرو۔ کہیں تنہا میرے آفس کی طرف آتے وقت وہ کمبخت راستے ہی میں ارادہ بدل لے اور واپس گھر بھاگ جائے۔“

”میں اس وقت تمہارے ساتھ چلوں؟“ سجاد گھڑی دیکھ کر قدرے پریشان ہو کر بولا۔ ”تھوڑی دیر بعد میرے پاس تو باہر کی ایک پارٹی آنے والی ہے۔ کدوؤں کی ایکسپورٹ کے سلسلے میں مذاکرات کرنے ہیں۔“

”تو اب کدو بھی ایکسپورٹ ہونے لگے؟“ نکا حیرانی سے بولا۔

”ہاں۔ تو اور اب رہ ہی کیا گیا ہے ایکسپورٹ کرنے کے لیے۔ خدا کی دی ہوئی ہر اچھی چیز ہم نے ایکسپورٹ کر دی ہے۔ اس شعبے میں ہماری کارکردگی قابلِ فخر ہے۔ اب کدو رہ گئے ہیں۔ ان کے لیے ایک پارٹی آ رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مستقبل میں، میں کدوؤں کا اکلوتا ایکسپورٹر کہلاؤں۔“

”تو گویا تم محض چند ٹکے کے کاروباری فائدے کی خاطر ایک دوست کا بھلا کرنا نہیں چاہتے۔ اس کی خوشی میں شریک ہونا نہیں چاہتے؟“ نکا جلال میں آتے ہوئے بولا۔ ”کدوؤں کی ایکسپورٹ کو تم ایک دوست کے مفاد پر ترجیح دے رہے ہو۔ ایک بار پھر سوچ لو۔ اس کے بعد بھی اگر تمہارا جواب انکار میں ہوا تو میں چلا جاؤں گا لیکن یاد رکھنا کہ تم ایک عظیم انسان کی دوستی سے محروم ہو جاؤ گے۔ ایسا عظیم انسان جس کا تذکرہ عنقریب بچے بچے کی زبان پر ہوگا۔“

”سب یہی کہہ رہے ہوں گے ہائے بیچارا کیسی نوجوانی میں فاقوں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔“ گوریا نے لقمہ دیا۔

”کم از کم تم تو ایسی باتیں نہ کرو کیونکہ مجھ سے ہی تمہارا مستقبل وابستہ ہے۔“ نکا دردناک لہجے میں بولا۔

”تبھی تو ایک نجومی نے لڑکپن میں ہی میرا ہاتھ دیکھ کر پیشگوئی کر دی تھی کہ تمہارا مستقبل مخدوش ہے۔“ گوریا متاسفانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

اس دوران میں سجاد گویا فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ ان کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے نکے سے مخاطب ہوا۔ ”اس مسئلے پر اگر تم کسی فلمی ملکہ جذبات کی طرح جذباتی ہو رہے ہو تو

ہمیں تمہارے ساتھ چلنا ہی پڑے گا..... چلو گوریا، اٹھو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ دفتر کو ہم صرف چپراسی کے سہارے چھوڑ جائیں؟" گوریا نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہیں۔" سجاد مردہ سے لہجے میں بولا۔ "ہمارا بیشتر کاروبار وہی چلا رہا ہے۔ تمہیں یاد نہیں پچھلی مرتبہ مڈل ایسٹ سے فروٹ کے سلسلے میں جو پارٹی آئی تھی اس سے ہمارے چپراسی نے ہی مذاکرات کیے تھے۔ اس وقت بھی ہم کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے۔ ہمارا دفتر تو کچھ سرکاری سا ہوتا جارہا ہے۔"

گوریا اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ تینوں نیچے آ کر سجاد کی گاڑی میں بیٹھ کر ککے کی رہنمائی میں روانہ ہوگئے۔ نمائش کے راؤنڈ اباؤٹ پر پہنچ کر جب ککے نے سجاد کو دائیں طرف گاڑی موڑنے کی ہدایت کی تو وہ حیرانی سے بولا۔ "جیکب لائنز میں دفتر لیا ہے کیا؟" پھر وہ گویا خود ہی اپنی کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے..... ڈیڑھ تین ہزار ماہوار میں انسان کو ڈیفنس میں کوئی بنگلا تو ملنے سے رہا۔"

"ارے تم چلو تو سہی..... دیکھ کر داد دو گے کہ کیا عمدہ لوکیشن ہے آفس کی۔" ککا گردن اکڑاتے ہوئے بولا مگر فوراً ہی اس خیال سے اس نے گردن دوبارہ ڈھیلی کر لی کہ کہیں منکا ہی نہ ٹوٹ جائے۔

نظامی روڈ پر کافی آگے تک جانے کے بعد ککا مصر تھا کہ گاڑی ایک گلی میں موڑی جائے لیکن سجاد کو یقین تھا کہ اس قسم کی کوشش کا نتیجہ یہی ہوگا کہ گلی میں دونوں طرف کے مکانوں کی دو دیواریں ٹوٹیں گی جس کے بعد گاڑی کا دایاں پہیہ ایک مکان کے صحن میں ہوگا اور بایاں پہیہ دوسرے مکان کے صحن میں..... اور وہ تینوں خود اندیشۂ نقصِ امن کے سلسلے میں بریگیڈ تھانے میں ہوں گے۔

بالآخر کافی زیادہ بحث و تمحیص کے بعد گاڑی گلی کے قریب ہی ایک دیوار کے ساتھ لگا کر پارک کی گئی تب کہیں جا کر مین روڈ سے لوگوں اور سواریوں وغیرہ کے گزرنے کے لیے دو ڈھائی فٹ جگہ بچ ہی گئی۔ وہ تینوں گاڑی سے اتر کر پیدل ہی گلی میں داخل ہوئے۔

گلی میں کہیں دائیں طرف کا مکان آگے کو نکلا ہوا تھا اور کہیں بائیں طرف کا۔ گلی کیا تھی اچھا خاصا زگ زیگ کا ڈیزائن تھا اور اس میں نشیب و فراز ککے کی زندگی کے نشیب و فراز سے بھی زیادہ تھے۔ گلی میں لاتعداد بچے ایک دوسرے سے دست بہ گریباں تھے، مٹی اچھال رہے تھے اور گالیوں کے سینہ گزٹ میں بیش بہا اضافہ کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر سنگ و خشت کے میزائلوں سے بھی حملے کر رہے تھے اور ان کی رسائی بڑی دور دور تک تھی۔ وہ تینوں اپنے آپ کو بمشکل اس ایٹمی جنگ سے بچاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

"آخر یہ سب کیا کر رہے ہیں؟" سجاد بار بھوں چڑھا کر بولا۔

"قوم کے نونہال ہیں۔ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔" ککے نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم نے لاتعداد اشتہاروں میں نہیں پڑھا کہ بچے ہی تو قوم کے اصل معمار ہیں اور انہیں ہی بڑے ہو کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔"

سجاد یہ جواب صحیح طور پر نہ سن پایا کیونکہ اس دوران وہ اچانک ہی ایک گڑھے میں گر پڑا تھا جہاں ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔

"ابے تو کہاں سے ٹپک پڑا؟" اس آدمی نے اپنے ہاتھ کا ایک ڈونگا سجاد کے سر پر رسید کرتے ہوئے کہا۔ "صبر نہیں ہو رہا تھا تجھ سے؟ ابھی تو میرا کنستر ہی نہیں بھرا اور تو باری کے لیے کود پڑا۔"

سجاد جو بری طرح بدحواس ہو چکا تھا، اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے بولا۔ "کس چیز کی باری قبلہ؟ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"ابے اندھا ہے کیا؟ دیکھ نہیں رہا کہ پانی بھر رہا ہوں..... اور اس گڑھے میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ صاحب مزید بگڑ کر بولے۔ تب سجاد نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے دیکھا۔ گڑھے کی تہ میں واقعی ایک ٹوٹی افقاً و طرفاً سے نکلی ہوئی تھی اور ان صاحب نے اس ٹونٹی کے نیچے ایک کنستر رکھا ہوا تھا اور ٹونٹی سے پانی یوں قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا جیسے کسی بہت طویل عمل کشید سے گزر کر آرہا ہو۔ سجاد نے اوپر بھی اس گڑھے کے کنارے ایسے ہی کنستروں کی میل بھر لمبی قطار دیکھی تھی اور درحقیقت اس قطار کو دیکھتے رہنے کے چکر میں ہی وہ گڑھے کو نہیں دیکھ سکا تھا۔

دفعتاً ان صاحب کو غالباً احساس ہوا کہ سجاد کی اس گڑھے میں شان نزول کچھ اور معنی رکھتی ہے کیونکہ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور ان صاحب نے آج تک کسی کو تھری پیس سوٹ میں پانی ڈھونے کے لیے آتے ہوئے یقیناً نہیں دیکھا ہوگا، اس لیے وہ آنکھیں کچھ سکیڑتے ہوئے بولے۔ "آپ تو کچھ اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں..... آپ کو اس گڑھے میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"



"امید ہے، آئندہ بھی نہیں دیکھیں گے۔" سجاد نے کہا اور ان سیڑھیوں سے اوپر آ گیا جو گڑھے میں آمد و رفت کی سہولت کے لیے بنائی گئی تھیں۔

اوپر گوریا اور ککا اس کی تلاش میں ادھر ادھر گلیوں میں جھانکتے پھر رہے تھے۔ شاید وہ سمجھ نہیں سکے تھے کہ سجاد ان کے ساتھ چلتے چلتے اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا۔

"اوہ..... خدا کا شکر ہے، تم یہیں ہو۔" گوریا اطمینان کی سانس لے کر سسنائی۔ "ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ تم کسی شارٹ کٹ سے واپس چل دیے ہو۔"

"ہاں..... میں شارٹ کٹ کے ذریعے اللہ میاں کے ہاں پہنچنے ہی والا تھا۔ وہ تو خیر گزری کہ صرف گھٹنے پر ایک کٹ آیا ہے۔" پھر وہ ککے کی طرف دیکھتے ہوئے تقریباً بلبلا اٹھا۔ "ککے! خدا تجھے غارت کرے۔ تیری دوستی میں، میں نے بڑے نقصان اٹھائے ہیں۔"

"ابھی اور اٹھاؤ گے۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔" ککے نے نہایت خلوص سے کہا۔

کافی دیر تک وہ گلیوں ہی گلیوں میں چلتے رہے اور گلیاں اسی قسم کی تھیں جس طرح کا نقشہ عموماً بچوں کے اخباروں میں دیا جاتا ہے اور عنوان ہوتا ہے۔ "راستہ تلاش کیجیے۔"

"ککے، تمہیں یقین ہے کہ ہم یہاں سے واپس بھی جاسکیں گے؟" سجاد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔" ککا بزرگانہ انداز میں بولا۔ "آخر میں آفس لینے کے بعد آج تمہارے پاس پہنچ ہی گیا تھا نا؟ ارے میاں! میں اس علاقے کا کیڑا ہوں کیڑا، اور وہ بھی نہایت پاپولر قسم کا کیڑا..... آفس پہنچنے کے بعد میں تمہیں باقاعدہ ایک نقشہ بنا کر دوں گا۔ اس کی مدد سے تم نہایت آسانی سے میرے کلائنٹس کو مجھ تک بھیج سکو گے۔"

بالآخر وہ ایک گلی میں پہنچے جو دیگر گلیوں کی نسبت چار چھ انچ زیادہ چوڑی تھی۔ یہاں دکانیں ہی دکانیں نظر آرہی تھیں اور خوب چہل پہل تھی۔ دکانوں پر گڑی ٹافیوں سے لے کر جہازوں کے سیکنڈ ہینڈ اسپیئر پارٹس تک دستیاب تھے۔ ہر قسم کا ٹریفک بھی رواں تھا۔ سائیکلیں، گدھا گاڑیوں سے دست بہ گریباں تھیں اور اسکوٹر سوار، راہ گیروں کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل جانے کی فکر میں تھے۔ تاہم کسی بھی متحرک چیز کے بارے میں یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ جارہی ہے یا آرہی ہے۔

ککے کی رہنمائی میں وہ ہانپتے کانپتے کسی نہ کسی طرح بالآخر ایک ایسی دکان کے سامنے پہنچ گئے جو کچھ بلندی پر واقع تھی۔ اس کے سامنے سیمنٹ کے بہت سے بلاک رکھ کر عبوری بنیادوں پر سیڑھیاں تیار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دکان کا شٹر گرا ہوا تھا اور اس شٹر کی حالت ایسی تھی جیسے ہٹلر کی فوجیں اس پر نشانے بازی کی مشق کرتی رہی ہوں۔ دکان کی چھت بھی ٹین کی تھی اور یوں آگے کو جھکی ہوئی تھی گویا وہ چھت نہ ہو کسی نوبیاہتا لڑکی کا گھونگٹ ہو۔

ککے کی مستعدی قابل داد تھی کہ وہ دکان کی پیشانی پر گتے کا ایک سائن بورڈ بھی آویزاں کر چکا تھا جس پر اس نے غالباً کسی جھاڑو سے موقلم کا کام لیتے ہوئے جلی حروف میں لکھا تھا..... "ککا اینڈ کمپنی..... مشیران برائے خصوصی معاملات۔"

لکھائی کچھ اس قسم کی تھی کہ اگر یہ بورڈ کسی عجائب گھر میں رکھا ہوتا تو اس پر گندھارا آرٹ کے کسی نادر نمونے کا گمان ضرور گزرتا۔

"یہ..... اینڈ کمپنی، کہاں ہے؟" سجاد نے حیرانی سے پوچھا۔

## مہکتی کلیاں

☆ جب عمر رفتہ کا غبار جھریوں میں ڈھل جاتا ہے تو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ خوشیاں کہاں کہاں جا کر گم ہو گئی تھیں۔

☆ جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہوتا ہے اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔

☆ زخم ہمیشہ اس سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں عنایت کرتا ہے۔

☆ لاحاصل محبت اور دیوانگی میں کچھ خاص فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہی جنون کی حدوں پر لے جاتے ہیں۔

☆ رشتے اپنائیت کے ہوں یا خلوص کے اتنے ہی نازک ہوتے ہیں جتنے آبگینے کہ ذرا سی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گئے۔ بدگمانی نے سر اٹھایا تو چکنا چور ہو گئے پھر ان پر فخر کیسا۔

☆ زندگی میں دو باتیں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں ایک جس کی خواہش ہو اس کا نہ ملنا اور دوسری جس کی خواہش نہ ہو اس کا ملنا.....

☆ غلطی کرنا انسانی فطرت ہے لیکن اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنا کہیں زیادہ انسانی فطرت ہے۔

وزیر محمد خان..... جل ہزارہ

"جب نکا موجود ہے تو "اینڈ کمپنی" بھی آ ہی جائے گی۔" نکے نے دردیشانہ لہجے میں کہا اور جزلزل قسم کی سیڑھیوں پر چڑھ کر تالا کھولنے کے بعد جونہی شٹر اٹھایا تو گڑگڑاہٹ سے گھبرا کر سڑک پر جاتی ہوئی کئی گدھا گاڑیوں کے گدھے بغلی گلیوں میں گھس گئے۔

شٹر اٹھنے پر انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک عجیب و غریب کمرا تھا جسے نہ تو دفتر سمجھا جا سکتا تھا اور نہ گیرج..... نہ ہی اسے رہائشی کمرا قرار دیا جا سکتا تھا اور نہ ہی دکان..... زیادہ سے زیادہ اسے کچھ خوشحال قسم کی مرغیوں کا ڈربا سمجھا جا سکتا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز موجود تھی جس کی تین ٹانگیں تو سلامت تھیں، چوتھی ٹانگ کی جگہ اینٹیں رکھی گئی تھیں۔ دو مرمت شدہ کرسیاں بھی تھیں لیکن مرمت اس قدر زیادہ ہو چکی تھی کہ اب صرف مرمت ہی مرمت نظر آ رہی تھی، اصل کرسیاں غائب ہو چکی تھیں۔

"مجھے یہ آفس فرنشڈ ملا ہے۔" نکے نے فخر سے بتایا۔ "تین ہزار روپے ماہوار میں فرنیچر سمیت برا تو نہیں ہے۔"

"اسے تم آفس کہہ رہے ہو؟" سجاد دہشت زدہ سی آواز میں بولا۔

"کیوں؟ کیا خرابی ہے اس میں؟" نکا تیکھے لہجے میں بولا۔ "ایک صرف قالین، ائر کنڈیشنر، ٹیلی فون، لیڈی سیکریٹری، بھاری بھرکم فرنیچر اور مزید دو تین کمروں ہی کی تو کمی ہے اس میں، ورنہ ہر لحاظ سے یہ ایک مکمل دفتر ہے۔ تم ذرا لوکیشن پر تو غور کرو۔ کیسے بارونق بازار میں واقع ہے..... بلکہ یوں کہو کہ سرِعام واقع ہے..... انسان یونہی رفتہ رفتہ..... زینہ بہ زینہ ترقی کرتا ہے۔ سمجھو، بنیادی مسئلہ تو حل ہو گیا ہے نا..... بزنس شروع کرنے کے لیے ایک باعزت جگہ مل گئی ہے۔ رفتہ رفتہ باقی لوازمات بھی آ جائیں گے۔ تم دیکھو گے کہ اسی جگہ سے میری ذاتی اور کثیر المنزلہ عمارت سر اٹھائے گی جس میں میرے دفاتر پھیلے ہوئے ہوں گے۔ اس کا نام ہوگا "نکا ایمپائر"..... پھر میں صرف ایک ہی کام پر اکتفا نہیں کروں گا۔ کئی قسم کے کاروبار ہوں گے میرے....."

گوریا بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "اس کے بعد مالک مکان تمہاری کمر پر لات رسید کرے گا اور تمہاری آنکھ کھل جائے گی۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ....." سجاد جلدی سے بولا۔ "کہ تم نے باہر اپنے بورڈ پر مشیرانِ خصوصی معاملات، کیوں لکھوایا ہے؟ یہ کیوں نہیں لکھوایا کہ یہاں آرڈر پر بے ضرر اور بے وقعت چیزیں چوری کی جاتی ہیں؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ بریگیڈ تھانہ یہاں سے قریب ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں کام شروع کرنے سے پہلے ہی اندر ہو جاؤں۔"

"مگر تم تو بے ضرر اور بے وقعت چیزیں چراؤ گے۔" سجاد بولا۔

"اسی لیے تو پولیس مجھے پکڑ لے گی۔ تم نہیں سمجھ سکتے یہ معرفت کی باتیں ہیں۔" نکا درویشانہ بے نیازی سے بولا۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ کر دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر حتی الامکان متاثر کن پوز بناتے ہوئے گوریا سے مخاطب ہوا۔ "کیسا لگ رہا ہوں؟"

"بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی لنگور چڑیا گھر سے فرار ہو کر کسی سے کپڑے ادھار مانگ کر فٹ پاتھ پر تصویر کھنچوانے بیٹھ گیا ہے۔ اسی کیمرے سے جس میں فوٹو گرافر تقریباً سارا کا سارا اندر گھس جاتا ہے۔ صرف اس کی ٹانگیں باہر لٹکی رہ جاتی ہیں۔" گوریا نے وضاحت سے بتایا۔

آثار بتا رہے تھے کہ نکے کو جلال آنے لگا ہے مگر اس لمحے سجاد نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "بحث مباحثہ چھوڑو یار! مجھے یہاں تک پہنچنے کے لیے نقشہ بنا دو۔ میں راستے میں اس کی دس بیس فوٹو اسٹیٹس بنوا لیتا ہوں گا۔ میرے پاس تمہارا جو بھی کلائنٹ آئے گا، اسے ایک نقل دے کر بھیج دیا کروں گا، زبانی بھی سمجھا دیا کروں گا۔"

"بہت خوب۔" نکا مسرور لہجے میں بولا۔ "دوست ہو تو تم جیسا ہو، چائے پانی بھی پلا کر بھیجا کرنا تاکہ یہاں پہنچنے تک اس کے حوصلے بلند رہیں۔"

اس نے میز کی دراز کھولنے کے لیے اسے کھینچا تو میز اس پر آگری اور اینٹوں سے تعمیر شدہ اس کی چوتھی ٹانگ ایک طرف کو ڈھیر ہو گئی۔ نکا کرسی سمیت الٹ گیا تھا اور میز کے نیچے دب گیا تھا۔ غنیمت تھا کہ کوئی اینٹ اس پر نہیں گری تھی۔ ورنہ شاید سجاد کو اسی وقت اسی کی قبر کے لیے کتبے کا آرڈر دینے سامنے والی دکان پر جانا پڑتا جہاں ایک شخص جو خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا، قبروں کے لیے کتبے تیار کر رہا تھا۔

سجاد اور گوریا مل جل کر جب نکے کے دفتری حالات درست کر چکے اور وہ کراہتا ہوا دوبارہ کرسی پر بیٹھ چکا تو اس نے ایک بار پھر دراز کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر سجاد نے لپک جھپٹ کر اس کا ہاتھ روک لیا جیسے وہ کسی کی جیب کاٹنے لگا ہو۔

"اس طرح نہیں۔" سجاد نے سمجھایا۔ "میں میز کو پکڑ لوں تب تم دراز کھولنا۔"

سجاد نے پوری قوت سے میز کو پکڑے رکھا اور نکے نے پوری قوت دراز کو کھولنے پر صرف کی۔ اس بار دراز ایک جھٹکے سے باہر آ گئی اور نکا ایک بار پھر کرسی سمیت الٹ کر نیچے جا گرا۔

"الو کی پٹھی.....!" نکا اٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "صبح تو آرام سے نکل گئی تھی۔ میں نے تبھی تو اس میں 5 روپے والی کاپی اور بال پوائنٹ رکھا تھا۔ کلائنٹس کا حساب رکھنے کے لیے۔"

اس نے کاپی اور بال پوائنٹ اٹھایا جو دراز سے نکل کر فرش پر گر گیا تھا۔ پھر اس نے کاپی سے ایک کاغذ پھاڑ کر نہایت عرق ریزی سے نقشہ تیار کیا اور سجاد کے حوالے کیا۔

"ٹھیک ہے..... اب ہم چلیں؟" سجاد نقشہ تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھہرو، میں تمہیں گاڑی تک چھوڑنے چلتا ہوں ورنہ تم واپس آ جاؤ گے۔" نکا اٹھتے ہوئے بولا۔ باہر آ کر اس نے شٹر گرایا جس سے ایک بار پھر وہی آواز پیدا ہوئی جسے سن کر گدھے راہ راست سے بھٹک جاتے تھے۔

نکے کی راہنمائی میں وہ بخیر و عافیت گاڑی تک واپس تو پہنچ گئے لیکن گاڑی کی حالت دیکھ کر سجاد کو سکتہ سا ہو گیا۔ گاڑی کی حالت اس فلم سے مشابہ ہو چکی تھی جسے صومالیہ اور مرکزی دونوں سنسر بورڈز نے سنسر کر دیا ہو۔ وہ بالکل ننگی ننگی سی لگ رہی تھی۔ وائپرز، بیک ویو مررز، وہیل کیپ حتیٰ کہ اینٹی کینرز کے کور اور بلب تک غائب تھے۔ یہی نہیں بلکہ بعض نوکیلی چیزوں سے گاڑی کے پینٹ کو کھرچ کر بہت سے نشانات اور انکی کی مناسبت سے متنوع قسم کے عنوانات ثبت کیے گئے تھے۔

ایک جگہ دل بنا ہوا تھا جس پر تیر نیم کش تھا اور اس کے نیچے لکھا تھا۔ "زخمی محبت۔" دوسری طرف بغیر کوئی خاکہ بنائے لکھا گیا تھا۔ "آن ملو سجنا۔" اس کے قریب ہی لکھا تھا۔ "اچھا ڈارلنگ! پھر ملیں گے۔" ایک طرف کرکٹ کے کسی جاں نثار نے بیٹ اور بال کا خاکہ بنا کر لکھا تھا۔ "آفریدی بھائی زندہ باد!"

سجاد نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا مگر اب آس پاس ان بچوں کا ہجوم نظر نہیں آ رہا تھا جن کی موجودگی سے کچھ دیر پہلے میدان کارزار گرم تھا۔ صرف ایک بچہ دور جاتا نظر آ رہا تھا۔ وہ سجاد کی گاڑی کے ایک وائپر سے بالی کا کام لیتے ہوئے جھک کر ایک گندی سی گیند کو لڑھکاتا ہوا لے جا رہا تھا۔ اسی طرف سڑک کے کنارے ایک حجام ایک شخص کو کرسی پر بٹھائے اس کے رخساروں پر جھاگ کا طوفان برپا کرنے میں مصروف تھا۔ حجام، سجاد ہی کی طرف متوجہ تھا، شاید وہ سجاد کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران اس کے زیرِ مشق گاہک نے جماہی لی تو صابن میں لتھڑا ہوا برش سیدھا اس کے منہ میں چلا گیا۔

"نکے! کاش میں تجھے قتل کر سکتا۔" سجاد بلبلا کر بولا۔

"مگر میرا اس میں کیا قصور ہے؟" نکا معصومیت سے بولا۔ سجاد نے دانت پیسے مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا نکا ہاتھ اٹھا کر متانت سے بولا۔ "خیر..... جو ہوا سو ہوا، اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس دو ایک کلائنٹس آ لینے دو۔ میں تمہارے تمام نقصانات پورے کر دوں گا بلکہ اگر حالات کچھ بہتر ہو گئے تو میں تمہیں نئی گاڑی ہی لے دوں گا۔"

"گدھا گاڑی؟" گوریا نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ ہمیں صرف گاڑی لے کر دے گا۔" سجاد تڑپ کر بولا۔ "گدھے کے فرائض تو یہ خود ہی انجام دے لے گا۔" پھر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور گوریا کو ساتھ بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

نکا دھیمے سروں میں گنگناتا ہوا آفس کی طرف واپس چل دیا۔ "بڑے ارمانوں سے رکھا ہے بلم تیری قسم..... پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم....."

آفس پہنچ کر اس نے ایک بار پھر اسی زلزلہ خیز عمل سے گزر کر شٹر کھولا اور اندر جا کر نہایت متانت سے میز کے عقب میں جا بیٹھا۔ اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے اس نے کاپی کھول کر سامنے رکھ لی اور بال پوائنٹ سنبھال کر اس پر جھک گیا۔ دوسرے ہی لمحے غیر ارادی طور پر وہ اپنے قرض خواہوں کا حساب لکھنے لگا جن میں سجاد اور گوریا سرفہرست تھے۔

اس وقت وہ چھٹی مرتبہ میزان لگا رہا تھا اور پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح میزان میں دو چار روپے ہی کم ہو جائیں، جب اچانک وہ ایک بھیانک قہقہہ سن کر کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ قہقہہ ایسا ہی تھا جیسے کسی بدروح نے کوئی عمدہ لطیفہ سن لیا ہو۔

نکے نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے اسے ایک اور سر نظر آیا۔ سر کے نیچے باقی جسم بھی تھا مگر وہ سر کے نیچے بیچ تھا۔ نکا پہلے تو یہی سمجھا کہ شاید کسی اور سیارے کی مخلوق آئی سائٹ کی کمزوری کی وجہ سے راستہ بھول کر ادھر آ نکلی ہے مگر پھر ذرا غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ وہ کرۂ ارض ہی کی مخلوق تھی۔

وہ درحقیقت ایک نوجوان تھا مگر جوان کم اور نوکا ہندسہ زیادہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا یا پھر شاید وہ غیر معمولی طور پر بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے بڑا نظر آ رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے بالی مونڈ دیے جاتے تو اندر سے کچھ بھی برآمد نہ ہوتا اور ان گنت جوئیں بلا وجہ

خانماں برباد ہونے پر دہائی دینے لگ جاتیں۔

ان بالوں کے نیچے دوسری قابل ذکر چیز عینک تھی جس کے شیشے گلاس کے پیندے جتنے موٹے تھے اور یہ عینک نہ جانے کس چیز پر ٹکی ہوئی تھی کیونکہ ناک تقریباً غائب تھی، صرف ناک کی بنیادیں موجود تھیں۔

نوجوان کے استخوانی اور مجہول جسم پر لباس تو موجود تھا مگر کچھ اسی طرح جیسے کسی بانس نے دنیا کے طعنوں سے تنگ آ کر کسی اور کے کپڑے پہن کر تن کی عریانی کو چھپا لیا ہو۔ قہقہہ یقیناً اسی نوجوان نے لگایا تھا کیونکہ اس کے دانت ابھی تک ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہے تھے اور یہ دانت اس بات کے گواہ تھے کہ اس نوجوان کو ابھی تک کسی بھی ٹوتھ پیسٹ کی پبلسٹی متاثر نہیں کر سکی۔

نوجوان نے نہایت بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک پاؤں میز پر رکھ لیا اور قدرے آگے کو جھک کر نکے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا جس سے اس کی آنکھیں موٹے موٹے شیشوں کے عقب سے یوں دکھائی دینے لگیں جیسے کوئی مینڈک انتہائی توجہ سے وی سی آر پر فلم دیکھ رہا ہو۔ اب وہ بالکل اسی طرح سنجیدہ نظر آ رہا تھا جیسے ٹی وی کے کسی ڈرامے میں مزاحیہ کردار ادا کر رہا ہو۔

''برادر عزیز!'' بالآخر نکا سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''ٹانگ نیچے کر لو۔ ورنہ میز کی ٹانگ یا تمہاری ٹانگ دونوں میں سے کوئی ایک ضرور ٹوٹ جائے گی۔''

نوجوان کے دونوں کان چونکہ بالوں کے انبار میں دفن تھے اس لیے اس نے شاید نکے کی آواز سنی ہی نہیں اور نہایت ڈرامائی انداز میں نکے کے سینے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا..... تو تم ہو خصوصی معاملات میں مشورہ دینے والے۔ فوری طور پر مجھے ایک مشورہ دیدو ورنہ تمہارا انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

''میرا تو آغاز ہی اچھا نہیں ہوا تھا عزیزم!'' نکے نے متانت سے کہا۔ ''لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ کیا تمہارا معاملہ اتنا خصوصی ہے کہ تم یوں ایمرجنسی بنیادوں پر مشورہ طلب کر رہے ہو؟''

''معاملہ خصوصی ہے لیکن اسے نہایت عمومی سمجھا جاتا ہے اب میں مزید صبر نہیں کر سکتا۔ تم میرے ہاتھ آ گئے ہو تو میں تم سے ہی جواب لے کر چھوڑوں گا..... کہیں اور تو میرا بس نہیں چلا..... تم مسکین سے آدمی معلوم ہوتے ہو..... تمہارے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکتا ہے.....'' نوجوان خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ اس کے عزائم خطرناک معلوم ہوتے تھے۔

''آخر مسئلہ کیا ہے؟'' نکے نے ملائمت سے پوچھا۔

''مسئلہ تمہیں میری شکل پر لکھا ہوا نظر نہیں آ رہا؟'' نوجوان نے آنکھیں نکالیں۔ ''میٹرک کیے ہوئے چھ سال ہو گئے۔ آج تک نوکری نہیں ملی۔ چپراسی کے لیے بھی اپلائی کرتا ہوں تو دفتر والے شرط لگا دیتے ہیں کہ ذاتی سائیکل ہونی چاہیے جبکہ میرے پاس جوتے تک ذاتی نہیں ہیں۔ دوست سے مانگے ہوئے ہیں۔''

''اوہ..... بہت افسوس ہوا تمہارے حالات سن کر۔'' نکا واقعی متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ ''پہلے میرا خیال تھا کہ صرف میرے حالات ہی خاصے اشک آور قسم کے ہیں لیکن اب میں چاہوں تو تمہارے حالات پر بھی اشک بہا سکتا ہوں۔''

''مجھے اشکوں کی نہیں، مشورے کی ضرورت ہے۔'' نوجوان جارحانہ لہجے میں بولا۔ ''فوری طور پر بتاؤ کہ مجھے کرنا چاہیے؟ اور یہ مشورہ مجھے بلا فیس چاہیے۔''

''ظاہر ہے، جس کی جیب میں حجامت کے لیے پیسے نہیں ہیں، اس سے فیس کی توقع کیونکر رکھی جا سکتی ہے۔'' نکے نے متانت سے سر ہلایا۔ ''فوری طور پر تو میں تمہیں ایک ہی مشورہ دے سکتا ہوں۔''

''وہ کیا؟'' نوجوان مارے اشتیاق کے اتنا آگے جھک آیا کہ میز الٹتے الٹتے بچی۔

''یہی کہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔'' نکے نے اطمینان سے جواب دیا۔

نوجوان نے قہر آلود نظروں سے نکے کو گھورا لیکن بالآخر بیٹھ ہی گیا۔ شاید وہ خود بھی اس پوز میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا اور اس کی کمر شاخ گل کی طرح لچکنے لگی تھی۔ اس شاخ گل کی طرح جس کے بالائی سرے پر اتفاق سے گل کی جگہ تربوز اگ آیا ہو۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' نکے نے محبت سے پوچھا۔

''کیا انٹرویو شروع ہو گیا ہے؟'' نوجوان نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں..... نہیں..... میں تو دوستی میں پوچھ رہا ہوں۔'' نکا گھبرا کر بولا۔

''اوہ.....'' نوجوان کے لہجے میں ایک بار پھر مایوسی آ گئی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''مابدولت کو ٹینس بانڈ کہتے ہیں۔ اسکول کے زمانے میں جیمز بانڈ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر میں نے پکا پروگرام بنا لیا تھا کہ میٹرک کر کے میں جیمز بانڈ کی ٹکر کا اسپائی ایجنٹ بنوں گا۔ اس لیے

اسی وقت سے میں نے اپنا نام ٹینس بانڈ رکھ لیا تھا۔ ویسے والدین نے خوشی محمد رکھا تھا کیونکہ میرے پیدا ہونے کی انہیں بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یقیناً اس خوشی پر پچھتا رہے ہوتے۔"

"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر ٹینس بانڈ۔" نکے نے اٹھ کر گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں خود ایک بہت نامی گرامی امریکی شخصیت کا اکلوتا حریف ہوں۔ آگے سے تم بھی ایسے ہی مل گئے ہو۔ بس یوں سمجھو کہ اندھے کو اندھا سوکوس سے ٹکرا گیا ہے۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ ......خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے ڈیڑھ، جب میری اور تمہاری صحت بہتر ہو جائے گی تو ہم اس مصرعے میں ڈیڑھ کی جگہ دو کہا کریں گے۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "ویسے تم ٹینس بانڈ کے بجائے انعامی بانڈ ہوتے تو مجھے تمہارے ملنے کی اور بھی زیادہ خوشی ہوتی...... لیکن خیر...... فی الحال جتنی خوشی ہوئی ہے، اس سے بھی کام چل جائے گا...... یہ بتاؤ تم نے کھانا کھایا ہے؟"

"کھانا......؟" نوجوان بے پروائی سے بولا۔ "کھانے کی ایسی کیا جلدی ہے۔ ابھی پرسوں ہی تو کھایا تھا۔"

"بات یہ ہے نوجوان!" نکا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے، میں تمہیں مشورے کے بجائے نوکری دیدوں تو زیادہ بہتر ہے۔ ویسے بھی مشورے دینا میرا کام نہیں ہے۔ یہ مشیران والا بورڈ تو میں نے تھ نے والوں سے بچنے کے لیے لگایا ہے لیکن میں فی الحال تمہیں کچھ اسی قسم کی ملازمت دے سکتا ہوں جیسے ایک صاحب نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ ضرورت ہے ایک بے ہنر آدمی کی، خواہ ان پڑھ ہی ہو۔ تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار، دو وقت کھانا بھی ملے گا۔ اشتہار پڑھ کر تم جیسا ایک آدمی وہاں پہنچا تو اسے فوراً رکھ لیا گیا اور اشتہار دینے والے نے دوپہر کو اسے بتایا کہ میاں! کام یہ ہے کہ داتا دربار کے لنگر سے دونوں وقت اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی کھانا لے آیا کرو...... میرے ہاں بھی تمہاری ملازمت کچھ اسی قسم کی ہوگی، جب کلائنٹ آئے گا، تبھی تنخواہ ملے گی اور ہر مرتبہ اس کا تعین بھی میں خود ہی کروں گا کہ تمہیں کتنی تنخواہ دی جائے جسے پا کر تم عیش و عشرت کی طرف مائل نہیں ہوگے۔"

"کلائنٹ......؟" نوجوان نے شک زدہ نظروں سے پہلے نکے کو گھورا، پھر اس کے دفتر کا جائزہ لیا۔ "کس قسم کے کلائنٹ! کیا دھندا ہے آپ کا؟"

جب نکا اسے تفصیل سے اپنے متعلق بتا چکا تو وہ اٹھ کر نہایت جوشیلے انداز میں دوبارہ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "تو آپ ہی وہ مسٹر نکا ہیں جن کے کارنامے سسپنس ڈائجسٹ میں سال میں ایک آدھ مرتبہ چھپتے رہتے ہیں۔ ارے آپ کی نوکری تو بلا تنخواہ بھی قبول ہے۔ مجھے آپ جیسے عظیم آدمی سے کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔"

"بے شک۔" نکے نے متانت سے سر ہلایا۔ "سب سے پہلے تو تم یہ سیکھو گے کہ کم سے کم پیسوں میں زیادہ سے زیادہ بے فکری کے ساتھ کس طرح زندہ رہا جا سکتا ہے۔ فی الحال تم اپنے آپ کو بلا تنخواہ ہی سمجھو۔ باقی کھانے پینے کی فکر مت کرو۔ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ ضرور دیتا ہے۔ یہ لو پچاس روپے...... برابر میں ہی اعلیٰ درجے کا ایک ریستوران ہے، وہاں سے کھانا کھا آؤ، باقی باتیں پھر کریں گے۔"

ٹینس بانڈ یوں پچاس روپے کی اس عظیم رقم پر جھپٹا جس طرح فلموں میں ولن بے بس اور مجبور لڑکیوں پر جھپٹتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس طرح غائب ہو چکا تھا جیسے زمانے سے محبت اور خلوص۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر رونق آ چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ قریب المرگ بھینسوں کے گوشت سے تیار شدہ سالن اور برادے سے تیار شدہ روٹیوں نے اس کے جسم میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی تھی۔

نکے نے اسے سامنے بٹھا کر کاروباری نشیب و فراز پر لیکچر دینا شروع کیا۔ ابھی اس نے ٹینس بانڈ کو صرف دو ڈھائی سو کاروباری نشیب و فراز ہی سمجھائے تھے کہ ایک شخص سیڑھیاں چڑھنے کا تکلف کیے بغیر اچانک ہی یوں آفس میں آن گرا جیسے وہ کسی توپ سے نکلا ہوا گولا ہو۔

کافی دیر تک ہانپنے کے بعد وہ چندھی چندھی آنکھوں سے ان دونوں کو باری باری گھورتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں میں سے نکا کون ہے؟"

حلیے سے وہ ایک معزز، خوش حال اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا اور اس وقت سخت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ تاہم نکے نے ازراہِ احتیاط کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تم میرے قرض خواہ نہیں ہو...... اس لیے مجھے یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ میں ہی نکا ہوں۔"

"خدا کے لیے اتنے طویل جملے بول کر وقت مت ضائع کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔" معزز آدمی ہانپتے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی تمہارے اس منحوس آفس تک پہنچنے میں میرا جتنا وقت ضائع ہو چکا ہے، اس سے کم وقت میں کولمبس نے امریکا دریافت کر لیا تھا۔ مجھے سجاد نے تمہارے پاس بھیجا ہے، میں سخت مصیبت میں ہوں۔ مجھے بچا لو نکے بی گریٹ۔"

نکا کہنے لگا تھا۔ "میں تو زندگی میں چار پیسے نہیں بچا سکا۔ تمہیں کیسے بچا سکتا ہوں......؟" مگر بمشکل اس نے زبان کو پھسلنے سے باز رکھا اور فوراً ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر نزاکت سے بیٹھ گیا پھر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس نے بے ڈھنگی ٹینس بانڈ کی ٹانگ پر رکھ دی ہے۔ پوز درست کر کے اس نے کاروباری سنجیدگی سے کہا۔ "میرا وقت بھی قیمتی ہے ابھی! تم بھی طویل باتیں مت کرو اور مختصر ترین الفاظ میں اپنی آمد کا مدعا بیان کرو۔"

"میں عشق کا مارا ہوں اور اگر تم نے مجھے نہ بچایا تو میں بالکل ہی مارا جاؤں گا۔" وہ پختہ العمر شخص رو دینے والی آواز میں بولا۔ "قصہ مختصر یہ ہے کہ وہ حسینۂ دلنواز گلی کے اس پار عین ہمارے مکان کے سامنے رہتی ہے۔ دن چڑھے جب بچے اسکولوں کو جا چکے ہوتے ہیں اور مرد کاموں پر تو وہ جانِ جاناں دھلے ہوئے کپڑے لے کر انہیں چھت پر لگی ہوئی الگنیوں پر پھیلانے کے لیے آتی ہے۔ اس وقت ہم بھی بہانے سے چھت پر موجود ہوتے ہیں اور کسی گاجر، مولی، چقندر یا ٹینڈے کے ساتھ رقعہ باندھ کر اس کی طرف پھینک دیتے ہیں۔ آج ہم ذرا جلدی میں تھے۔ چھت پر پہنچے تو وہ آئی نہیں تھی لیکن ہم نے ایک شلغم کے ساتھ بندھا ہوا محبت نامہ اس کی چھت پر ڈلیور کر دیا کہ جب آئے گی تو اٹھا لے گی۔ آج شاید اس نے کپڑے دھونے کا ناغہ کر دیا ہے۔ کل آئے گی تو اٹھا لے گی......"

"قطع کلامی معاف...... یہ آپ محبت نامہ کسی نہ کسی سبزی کے ساتھ ہی باندھ کر کیوں پھینکتے ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ محبت میں بھی وٹامن اے اور ڈی شامل رہیں؟" نکے نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "عام طور پر لوگ پتھر سے رقعہ باندھ کر پھینکتے ہیں۔"

"اب آپ سے کیا چھپانا......" وہ شخص قدرے شرما کر بولا۔ "پتھر سے رقعہ باندھ کر پھینکنا ایک تو ویسے بھی بڑا غیر رومانی سا لگتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آباؤ اجداد کا پیشہ سبزی فروشی ہی رہا ہے۔ گو کہ بندہ خود اس وقت پراپرٹی ڈیلر ہے مگر سبزیوں سے محبت اب بھی نس نس میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ شلغم سے رقعہ باندھ کر ہم پھینک چکے تھے۔ بعد میں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ محبوبۂ دلنواز تو چند روز کے لیے حیدرآباد گئی ہوئی ہیں۔ اچانک ہی پروگرام بن گیا تھا، وہ ہمیں مطلع بھی نہیں کر سکیں۔ اس سے پہلے بھی وہ



کسی بچی عمر، کچی عقل نے کہا ہے، تمام ضروری معلومات جمع کرو، پھر تمام ضروری مشورے، پھر تمام ضروری غور و فکر۔ تب پالیسی بناؤ۔

مرد کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ عورت کے ہمت کا تاؤ دلائے۔

شہد کی مکھی یہ نہیں گنتی کہ ہر گلاب میں کتنے کانٹے ہیں۔

ہاں اور نہیں، دنیا کے سب سے آسان الفاظ مگر ان کے درمیان فیصلہ کرنا سب سے مشکل ہے۔

صبح آٹھ بج کر ستر منٹ ۔۔۔ بزرگوں کے لیے یہ ابھی میٹھی نیند کا وقت تھا، ہمارے لیے کام پر جانے کی آخری ٹرین کی روانگی۔

ریسرچ والوں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ آنسو نازنین کی داہنی آنکھ میں اچھا لگتا ہے یا بائیں آنکھ میں اور ان دونوں میں زیادہ حسین آنکھ کون سی ہے۔

جاہل و راشی و بدمعاش و شری ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

کئی بار حیدرآباد جا چکی ہیں۔ وہاں ان کی خالہ رہتی ہیں...... ان کی عدم موجودگی میں ان کی والدہ محترمہ کپڑے دھو کر چھت پر لاتی ہیں اور سکھانے کے لیے پھیلاتی ہیں...... کل بھی وہ ضرور چھت پر آئیں گی اور ہمارا محبت نامہ عین ایک الگنی کے نیچے شلغم کے ساتھ بندھا ہوا پڑا ہے......"

"حیرت ہے......!" نکا بڑبڑایا۔ "ہم نے اس سے پہلے ایسی شلغمی محبت کا قصہ کبھی نہیں سنا۔"

"آپ قصے کو گولی ماریے...... آپ میری سنیے۔" وہ شخص بے تابی سے بولا۔ "عین ممکن ہے کہ ہماری محبوبۂ دلنواز کی والدہ کی نظر شلغم پر نہ پڑے لیکن میں اس خوش فہمی میں رہنا نہیں چاہتا کیونکہ اس خاتون کی نظر اس عمر میں بھی کمزور نہیں ہے...... اور خاتون ہے بھی کچھ اس قسم کی کہ ہر وقت آمادۂ فساد رہتی ہے۔ ہم حماقت یہ کرتے رہے ہیں کہ آج تک رقعے میں اپنا نام لکھتے چلے آ رہے ہیں اور وہ نہ صرف ہمیں بلکہ ہماری بیوی کو بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"تو آپ شادی شدہ ہو کر عشق فرما رہے ہیں؟" نکا،

تقریباً چلا اٹھا۔

"یہ تو بڑی ناانصافی ہے.....!" ٹینس بانڈ نے بھی لقمہ دیا۔ "ہمیں تو غیر شادی شدہ ہو کر بھی کسی کی نگاہِ التفات میسر نہیں۔ ایک آپ ہیں کہ ادھر گھر میں بیگم بھی میسر ہے اور سامنے محبوبہ دلنواز بھی۔ اتنی فضول خرچی؟"

"تم خاموش رہو۔" نکے نے ٹینس بانڈ کو ڈانٹا۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ اس وقت وہ ایک کلائنٹ سے مصروفِ گفتگو ہیں۔ اگر انہوں نے اس کی زیادہ دل شکنی کی تو واپس بھی جا سکتا ہے۔

چنانچہ وہ قدرے نرم لہجے میں اجنبی سے مخاطب ہوا۔ "تو تم چاہتے ہو کہ ہم کمان سے نکلا ہوا تیر واپس لائیں؟"

"بے شک....." اجنبی جلدی سے بولا۔ "آج ہی آج میں، بہرحال میں وہ شلغم سے بندھا ہوا رقعہ مجھے واپس چاہیے ورنہ میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ اس بڑھیا نے اگر وہ رقعہ اٹھالیا تو ضرور میری بیوی کے پاس پہنچے گی اور پھر....." اس شخص نے آنکھیں بند کر کے جھرجھری سی لی۔ "میں خود اس گھر کے اندر کسی بہانے سے داخل نہیں ہو سکتا، چھت پر جانا تو دور کی بات ہے۔ بڑھیا کو پہلے ہی میرے چال چلن پر کچھ شک سا ہے۔"

"جو بالکل بجا ہے۔" نکا لقمہ دیے بغیر نہ رہ سکا۔ "آپ کا نام؟"

"منیر خان!" جواب ملا۔

"یہ بتایئے منیر خان صاحب کہ وہ بڑھیا تھوڑی بہت ضعیف الاعتقاد ہے یا نہیں؟" نکے نے پرخیال لہجے میں پوچھا۔

"بہت زیادہ جناب! بلکہ میرے خیال میں تو عورتوں کی اکثریت ہی ضعیف الاعتقاد ہوتی ہے۔" منیر خان نے جلدی سے کہا۔

"میں نے تم سے اکثریت کے بارے میں رائے نہیں مانگی۔" نکا رکھائی سے بولا۔ "اب تم ایسا کرو کہ میری ایڈوانس فیس دس ہزار روپے اس میز پر رکھو اور گھر جا کر آرام سے سو جاؤ۔ سمجھو کہ تمہارا کام ہو گیا۔"

"اور اگر نہ ہوا تو؟" منیر خان نے رقم پر اعتراض کیے بغیر شک زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تو رقم سجاد سے واپس لے لینا۔" نکے نے فراخدلی سے کہا۔ منیر خان نے فوراً کانپتے ہاتھوں سے نوٹ گن کر میز پر رکھ دیے۔ ٹینس بانڈ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رقم کو دیکھ رہا تھا۔

"اب ایڈریس مجھے سمجھا دو۔ اپنے اور اس کے گھر کی نشانیاں بتا دو اور اطمینان سے اپنے گھر یا دفتر چلے جاؤ۔ آدھے گھنٹے بعد جائے واردات..... میرا مطلب ہے مطلوبہ مکان پر پہنچیں گے۔ لو اس کاپی میں ایڈریس لکھو۔" نکے نے اپنی 5 روپے والی کاپی اس کی طرف بڑھائی۔ منیر خان نے ایڈریس لکھا، پھر نقشہ بنا کر سمجھایا اور بالآخر رخصت ہو گیا۔

نکے نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر فاتحانہ انداز میں ٹینس بانڈ کی طرف دیکھا جو نہایت مرعوب، کچھ حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔

"سر! آپ واقعی عظیم ہیں..... گدڑی میں چھپے لعل ہیں۔" ٹینس بانڈ بولا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت نکا کچھ اسی قسم کی بات سننا چاہتا ہے۔

"تم بھی بڑے بھاگوان ہو ٹینس بانڈ! تمہارے آتے ہی کلائنٹس کی آمد شروع ہو گئی ہے۔" نکے نے محسن کا جواب تحسین سے دیا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اٹھو، اب ہم بھی ایکشن میں آ جائیں۔ سب سے پہلے صدر جانا ہو گا، میں راستے میں تمہیں بتاؤں گا کہ کس طرح میرے اسسٹنٹ کے فرائض انجام دینے ہیں۔"

ٹینس بانڈ اٹھ کر سعادت مندی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔

صدر پہنچ کر انہوں نے چند ضروری چیزیں خریدیں جن میں ایک لمبی چوڑی سفید داڑھی، سفید وگ، سبز رنگ کا جبہ، گول ٹوپی اور موٹے موٹے منکوں والی کچھ مالائیں وغیرہ تھیں، یہ سب چیزیں لے کر وہ لوگوں کی نظر بچا کر بوہری مارکیٹ کے قریب ایک پبلک لیٹرین میں گھس گئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ لیٹرین سے نکلے تو نکے کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ امریکا سے نکالے جانے والے رجنیش بابا کا سستا اور چالو ایڈیشن نظر آ رہا تھا۔ ٹینس بانڈ ہاتھ باندھے، نظریں جھکائے اور دنیا جہان کی عقیدت مندی چہرے پر بکھرائے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ رکشے میں بیٹھ کر مطلوبہ ایڈریس پر پہنچے۔ رکشا انہوں نے گلی کے کونے پر چھوڑ دیا۔

گلی تقریباً سنسان ہی تھی۔ مطلوبہ مکان کے گیٹ پر پہنچ کر ٹینس بانڈ نے بیل بجائی اور نکے نے پہنچے ہوئے بزرگ کے تاثرات چہرے پر طاری کرنے کی کوشش شروع کر دی جیسے اس وقت وہ آسمان اور زمین کے درمیان کہیں



چند لمحے بعد خاصی بڑی عمر کی ایک عورت نے گیٹ کھول کر جھانکا تو ٹینس بانڈ ہدایات کے عین مطابق قدرے دبی لیکن پُر اسرار آواز میں بولا۔ "بڑھیا! ادب سے جھک جا۔ پہنچے ہوئے والے خود چل کر تیرے غریب خانے پر آئے ہیں، تجھے سرفراز کرنے۔ اپنی خوش نصیبی پر رشک کر۔"

نکے کی آنکھیں اس وقت نیم وا تھیں اور لمبی نقلی داڑھی سینے پر لہرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک لوٹا بھی موجود تھا۔ بڑھیا کی آنکھیں قدرے پھیل گئیں اور وہ قدرے مرعوب نظر آنے لگی۔ تب نکے نے فوراً گیٹ کے اندر قدم رکھ دیا تاکہ انہیں گلی میں کھڑے باتیں کرتے دیکھ کر کوئی راہگیر شک میں مبتلا نہ ہو جائے۔

"بڑھیا!" اس بار نکے نے حلق سے رعب دار آواز نکالنے کی کوشش کی۔ یہ بھی اس کی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا کہ پہلے وہ بار بار اس عورت کو بڑھیا کہہ کر اس کا مورال ڈاؤن کرنے کی کوشش کریں گے۔

نکا بات جاری رکھتے ہوئے اور قدرے آگے کو جھک کر آنکھیں نشیلی سی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تیرا لکڑ دادا بھی ایک بہت بڑا بزرگ تھا....."

"جی..... مجھے تو معلوم نہیں....." عورت ہکلائی۔

"تجھے کیا معلوم..... تو ایک گناہ گار اور عام سی عورت ہے، دنیا دار بڑھیا! ہم تجھے بتا رہے ہیں کہ تیرا لکڑ دادا خاصا بڑا بزرگ تھا اور ہمارے لکڑ دادا سے اس کی دوستی تھی جو اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے بزرگ تھے۔ آج انہوں نے ہی ہمیں خواب میں آ کر ہماری کمر پر ٹھڈا مار کر تمہارے بارے میں خبردار کیا ہے کہ تیرے گھر پر ایک آفت آنے والی ہے اور ہم تجھے بچائیں۔ ہمارے لکڑ دادا نہیں چاہتے کہ ان کے دوست کی لکڑ پوتی کو کوئی گزند پہنچے۔ کسی نے تیرے خلاف خطرناک سازش کی ہے۔"

"کیسی سازش حضور والا؟" عورت اب ہاتھ باندھ کر تھر تھر کانپنے لگی۔

"کسی نے تجھ پر نیلا جادو کرنے کے لیے ایک نیلے شلغم کے ساتھ تعویذ باندھ کر تیری چھت پر پھنکوایا ہے۔" نکے نے بتایا۔

"نیلا جادو؟" اس عورت کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

"ہاں..... کیونکہ کالا جادو آج کل آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکا ہے۔" نکا بھاری آواز میں بولا۔ "اور یہ نیلا جادو اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اگر ہم تیری مدد کو نہ پہنچتے تو کل تک تیرا گھر الٹ چکا ہوتا۔"

دفعتاً بڑھیا کو جیسے کچھ خیال آیا اور وہ دانت پیستے ہوئے غرائی۔ "یہ حرکت ضرور اس کلموہی زیب النسا کی ہو گی، وہی میری جانی دشمن ہے....."

"بس....." نکے نے شاہانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "تیرے دشمن کا نام بھی ہمیں معلوم ہے مگر ہمیں بتانے کی اجازت نہیں۔ ہم خود ہی اس کا بندوبست کر دیں گے۔ تو پریشان نہ ہو۔ بس تو جلدی سے چھت پر جا اور وہ شلغم اور اس کے ساتھ لپٹا ہوا رقعہ اٹھا لا..... اور دیکھ..... اسے کھولنا تو درکنار، چھونا بھی مت..... اسے چمٹے سے پکڑ کے اٹھا کے لا..... ورنہ بھسم ہو جائے گی..... جا..... اس سے پہلے کہ سورج ساڑھے بیاسی کے زاویے پر آ جائے، اسے اٹھا لا۔ ہم خود اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔"

بڑھیا دوڑی دوڑی پہلے کچن میں گئی پھر چمٹا اٹھا کر یوں سیڑھیوں کی طرف بھاگی جیسے کوئی بچہ پتنگ لوٹنے جا رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد وہ نہایت محتاط انداز میں سیڑھیوں کے راستے واپس آتی دکھائی دی۔ وہ یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی جیسے چمٹے میں اس نے شلغم نہیں، ٹائم بم پکڑا ہوا ہو۔ دہشت سے اس کی آنکھیں اتنی پھیلی ہوئی تھیں کہ مزید پھیلنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

وہ قریب آئی تو نکے اور ٹینس بانڈ نے دیکھا کہ شلغم کے کچھ ڈنٹھل باقی تھے اور ایک ڈنٹھل میں دھاگے کے ذریعے ایک تہ شدہ گلابی رقعہ بندھا ہوا تھا۔ بڑھیا نے کانپتے ہاتھ سے چمٹے میں پکڑا ہوا شلغم نکے کی طرف بڑھایا جسے نکے نے بے پروائی سے چمٹے کی گرفت سے نکال کر اپنے لوٹے میں ڈال لیا۔

"میں آپ کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔" بڑھیا کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟"

"اگر تو خدمت کرنا ہی چاہتی ہے تو میرے چیلے کو رکشے کا کرایہ۔ آنے اور جانے کا۔ 101 روپے دے دے۔ بس تو اپنے ہی حلقے کی چشم و چراغ ہے۔ اس لیے تجھ سے ہم کوئی نذرانہ نہیں لیں گے۔" نکے نے بے نیازی سے کہا۔

بڑھیا نے فوراً دوپٹے کے پلو میں بندھے ہوئے تہ شدہ نوٹوں میں سے سو کا ایک نوٹ نکال کر ٹینس بانڈ کی طرف بڑھا دیا ساتھ میں ایک سکہ بھی تھا، اور وہ دونوں "جل تو جلال تو..... آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرتے ہوئے باہر آ گئے۔

تقریباً چلا اٹھا۔

"یہ تو بڑی ناانصافی ہے......!" ٹینس بانڈ نے بھی لقمہ دیا۔ "ہمیں تو غیر شادی شدہ ہو کر بھی کسی کی نگاہِ التفات میسر نہیں۔ ایک آپ ہیں کہ ادھر گھر میں بیگم بھی میسر ہے اور سامنے محبوبہ دلنواز بھی۔ اتنی فضول خرچی؟"

"تم خاموش رہو۔" نکے نے ٹینس بانڈ کو ڈانٹا۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ اس وقت وہ ایک کلائنٹ سے مصروفِ گفتگو ہیں۔ اگر انہوں نے اس کی زیادہ دل شکنی کی تو واپس بھی جا سکتا ہے۔

چنانچہ وہ قدرے نرم لہجے میں اجنبی سے مخاطب ہوا۔

"تو تم چاہتے ہو کہ ہم کمان سے نکلا ہوا تیر واپس لائیں؟"

"بے شک......" اجنبی جلدی سے بولا۔ "آج ہی آج میں، بہر حال میں وہ شلغم سے بندھا ہوا رقعہ مجھے واپس چاہیے ورنہ میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ اس بڑھیا نے اگر وہ رقعہ اٹھا لیا تو ضرور میری بیوی کے پاس پہنچے گی اور پھر......" اس شخص نے آنکھیں بند کر کے تھرتھری سی لی۔ "میں خود اس گھر کے اندر کسی بہانے سے داخل نہیں ہو سکتا، چھت پر جانا تو دور کی بات ہے۔ بڑھیا کو پہلے ہی میرے چال چلن پر کچھ شک سا ہے۔"

"جو بالکل بجا ہے۔" نکا لقمہ دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"آپ کا نام؟"

"منیر خان!" جواب ملا۔

"یہ بتائیے منیر خان صاحب کہ وہ بڑھیا تھوڑی بہت ضعیف الاعتقاد ہے یا نہیں؟" نکے نے پرخیال لہجے میں پوچھا۔

"بہت زیادہ جناب! بلکہ میرے خیال میں تو عورتوں کی اکثریت ہی ضعیف الاعتقاد ہوتی ہے۔" منیر خان نے جلدی سے کہا۔

"میں نے تم سے اکثریت کے بارے میں رائے نہیں مانگی۔" نکا رکھائی سے بولا۔ "اب تم ایسا کرو کہ میری ایڈوانس فیس دس ہزار روپے اس میز پر رکھو اور گھر جا کر آرام سے سو جاؤ۔ سمجھ لو کہ تمہارا کام ہو گیا۔"

"اور اگر نہ ہوا تو؟" منیر خان نے رقم پر اعتراض کیے بغیر شک زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تو رقم سجاد سے واپس لے لینا۔" نکے نے فراخدلی سے کہا۔ منیر خان نے فوراً کانپتے ہاتھوں سے نوٹ گن کر میز پر رکھ دیے۔ ٹینس بانڈ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رقم کو دیکھنے لگا۔

"اب ایڈریس مجھے سمجھا دو۔ پتے اور اس کے گھر کی نشانیاں بتا دو اور اطمینان سے اپنے گھر یا دفتر چلے جاؤ۔ آدھے گھنٹے بعد جائے واردات...... میرا مطلب ہے مطلوبہ مکان پر پہنچیں گے۔ لو اس کاپی میں ایڈریس وغیرہ لکھو۔" نکے نے اپنی 5 روپے والی کاپی اس کی طرف بڑھائی۔ منیر خان نے ایڈریس لکھا، پھر نقشہ بنا کر بھی سمجھایا اور بالآخر رخصت ہو گیا۔

نکے نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر فاتحانہ انداز میں ٹینس بانڈ کی طرف دیکھا جو نہایت مرعوب، مسحور اور حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔

"سر! آپ واقعی عظیم ہیں...... گدڑی میں چھپے ہوئے لعل ہیں۔" ٹینس بانڈ بولا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت نکا کچھ اسی قسم کی بات سننا چاہتا ہے۔

"تم بھی بڑے بھاگوان ہو ٹینس بانڈ! تمہارے آتے ہی کلائنٹس کی آمد شروع ہو گئی ہے۔" نکے نے مکھن کا جواب مکھن سے دیا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اٹھو، اب ہم بھی ایکشن میں آ جائیں۔ سب سے پہلے ہمیں صدر جانا ہوگا، میں راستے میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کس طرح میرے اسسٹنٹ کے فرائض انجام دینے ہیں۔"

ٹینس بانڈ اٹھ کر سعادت مندی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔

صدر پہنچ کر انہوں نے چند ضروری چیزیں خریدیں، جن میں ایک لمبی چوڑی سفید داڑھی، سفید وگ، سبز رنگ کا لمبا چغہ، گول ٹوپی اور موٹے موٹے منکوں والی کچھ مالائیں وغیرہ شامل تھیں۔ یہ سب چیزیں لے کر وہ لوگوں کی نظر بچا کر ایمپریس مارکیٹ کے قریب ایک پبلک لیٹرین میں گھس گئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ لیٹرین سے نکلے تو نکے کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ امریکا سے نکالے جانے والے جوگی رجنیش بابا کا سستا اور چالو ایڈیشن نظر آ رہا تھا۔ ٹینس بانڈ ہاتھ باندھے، نظریں جھکائے اور دنیا جہاں کی عقیدت مندی اپنے چہرے پر بکھرائے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ رکشے میں بیٹھ کر وہ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچے۔ رکشا انہوں نے گلی کے کونے پر ہی چھوڑ دیا۔

گلی تقریباً سنسان ہی تھی۔ مطلوبہ مکان کے گیٹ پر پہنچ کر ٹینس بانڈ نے بیل بجائی اور نکے نے کچھ ایسے مبہم قسم کے تاثرات چہرے پر طاری کرنے کی کوشش شروع کر دی جیسے اس وقت وہ آسمان اور زمین کے درمیان کہیں معلق



ہے۔ چند لمحے بعد خاصی بڑی عمر کی ایک عورت نے گیٹ کھول کر جھانکا تو ٹینس بانڈ ہدایات کے عین مطابق قدرے نیچی لیکن کڑکدار آواز میں بولا۔ "بڑھیا! ادب سے جھک جا۔ پہنچے ہوئے والے خود چل کر تیرے غریب خانے پر آئے ہیں، تجھے سرفراز کرنے۔ اپنی خوش نصیبی پر رشک کر۔"

نکے کی آنکھیں اس وقت نیم وا تھیں اور لمبی نقلی داڑھی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک لوٹا بھی موجود تھا۔ بڑھیا کی آنکھیں قدرے پھیل گئیں اور وہ قدرے مرعوب نظر آنے لگی۔ تب نکے نے فوراً گیٹ کے اندر قدم رکھ دیا تاکہ انہیں گلی میں کھڑے باتیں کرتے دیکھ کر کوئی راہگیر شک میں مبتلا نہ ہو جائے۔

"بڑھیا!" اس بار نکے نے حلق سے رعب دار آواز نکالنے کی کوشش کی۔ یہ بھی اس کی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا کہ پہلے وہ بار بار اس عورت کو بڑھیا کہہ کر اس کا مورال ڈاؤن کرنے کی کوشش کریں گے۔

نکا بات جاری رکھتے ہوئے اور قدرے آگے کو جھک کر آنکھیں تیلی سی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تیرا لکڑ دادا بھی ایک بہت بڑا بزرگ تھا......"

"جی...... مجھے تو معلوم نہیں......" عورت ہکلائی۔

"تجھے کیا معلوم...... تو ایک گناہ گار اور عام سی عورت ہے۔ دنیا دار بڑھیا! ہم تجھے بتا رہے ہیں کہ تیرا لکڑ دادا خاصا بڑا بزرگ تھا اور ہمارے لکڑ دادا سے اس کی دوستی تھی جو اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے بزرگ تھے۔ آج انہوں نے ہی ہمیں خواب میں آ کر ہماری کمر پر ٹھڈا مار کر تمہارے بارے میں خبردار کیا ہے کہ تیرے گھر پر ایک آفت آنے والی ہے اور ہم تجھے بچائیں۔ ہمارے لکڑ دادا نہیں چاہتے کہ ان کے دوست کی لکڑ پوتی کو کوئی گزند پہنچے۔ کسی نے تیرے خلاف خطرناک سازش کی ہے۔"

"کیسی سازش حضور والا؟" عورت اب ہاتھ باندھ کر تھرتھر کانپنے لگی۔

"کسی نے تجھ پر نیلا جادو کرنے کے لیے ایک نیلے شلغم کے ساتھ تعویذ باندھ کر تیری چھت پر پھنکوایا ہے۔" نکے نے بتایا۔

"نیلا جادو؟" اس عورت کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

"ہاں...... کیونکہ کالا جادو آج کل آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکا ہے۔" نکا بھاری آواز میں بولا۔ "اور یہ نیلا جادو اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اگر ہم تیری مدد کو نہ پہنچتے تو کل تک تیرا گھر الٹ چکا ہوتا۔"

دفعتاً بڑھیا کو جیسے کچھ خیال آیا اور وہ دانت پیستے ہوئے غرائی۔ "یہ حرکت ضرور اس کلموہی زیب النسا کی ہو گی، وہی میری جانی دشمن ہے......"

"بس......" نکے نے شاہانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "تیرے دشمن کا نام بھی ہمیں معلوم ہے مگر ہمیں بتانے کی اجازت نہیں۔ ہم خود ہی اس کا بندوبست کر دیں گے۔ تو پریشان نہ ہو۔ بس تو جلدی سے چھت پر جا اور وہ شلغم اور اس کے ساتھ لپٹا ہوا رقعہ اٹھا لا...... اور دیکھ...... اسے کھولنا تو درکنار، چھونا بھی مت...... اسے چمٹے سے پکڑ کے اٹھا کے لا...... ورنہ بھسم ہو جائے گی...... جا...... اس سے پہلے کہ سورج ساڑھے بیاسی کے زاویے پر آ جائے، اسے اٹھا لا۔ ہم خود اسے ٹھکانے لگائیں گے۔"

بڑھیا دوڑی دوڑی پہلے کچن میں گئی پھر چمٹا اٹھا کر یوں سیڑھیوں کی طرف بھاگی جیسے کوئی بچہ پتنگ لوٹنے جا رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد وہ نہایت محتاط انداز میں سیڑھیوں کے راستے واپس آتی دکھائی دی۔ وہ یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی جیسے چمٹے میں اس نے شلغم نہیں، ٹائم بم پکڑا ہوا ہو۔ دہشت سے اس کی آنکھیں اتنی پھیلی ہوئی تھیں کہ مزید پھیلنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

وہ قریب آئی تو نکے اور ٹینس بانڈ نے دیکھا کہ شلغم کے کچھ ڈنٹھل باقی تھے اور ایک ڈنٹھل میں دھاگے کے ذریعے ایک تہ شدہ گلابی رقعہ بندھا ہوا تھا۔ بڑھیا نے کانپتے ہاتھ سے چمٹے میں پکڑا ہوا شلغم نکے کی طرف بڑھایا جسے نکے نے بے پروائی سے چمٹے کی گرفت سے نکال کر اپنے لوٹے میں ڈال لیا۔

"میں آپ کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔" بڑھیا کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟"

"اگر تو خدمت کرنا ہی چاہتی ہے تو میرے چیلے کو رکشے کا کرایہ۔ آنے اور جانے کا۔ 101 روپے دیدے۔ بس تو اپنے ہی حلقے کی چشم و چراغ ہے۔ اس لیے تجھ سے ہم کوئی نذرانہ نہیں لیں گے۔" نکے نے بے نیازی سے کہا۔

بڑھیا نے فوراً دوپٹے کے پلو میں بندھے ہوئے تہ شدہ نوٹوں میں سے سو کا ایک نوٹ نکال کر ٹینس بانڈ کی طرف بڑھا دیا ساتھ میں ایک سکہ بھی تھا، اور وہ دونوں "جل تو جلال تو...... آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرتے ہوئے باہر آ گئے۔

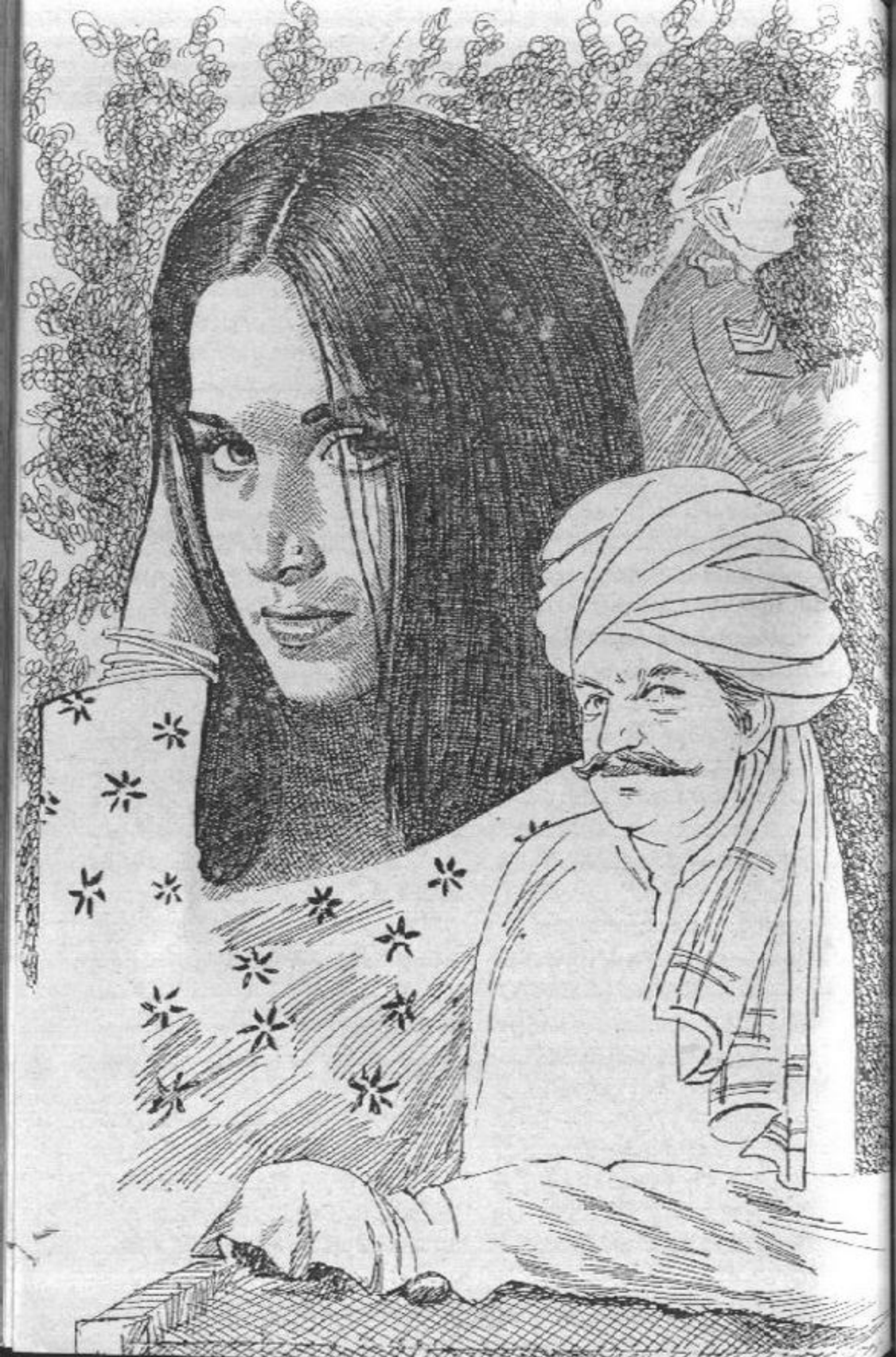

ایک کریہہ فعل انجام دینے والے شقی القلب مجرموں کی روداد

# کینہ پرور

ملک۔ سمندر حیات

"شہرِ خموشاں" کو اگر زبان مل جائے تو جانے کتنی ہی داستانوں کی تشہیر ہو جائے۔ کتنے ہی قصے زبان زد عام ہو جائیں... کیونکہ یہ کینہ پرور لوگ نہ زندگی دیکھتے ہیں نہ موت... بس اپنے انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں... اور ان کی یہی پیاس انجانے میں انہیں ایک ایسی آگ کی جانب دھکیلتی رہتی ہے جس میں انہیں ہر حال میں جل جانا ہوتا ہے... کہ یہی تو ان کا انجامِ آخر ہے۔

دستک کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں اس وقت اپنے کوارٹر کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے ناشتا کیا تھا۔ میں نے گردن گھما کر بیرونی دروازے کی طرف دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"اللہ خیر کرے..... یہ صبح صبح کون آ گیا.....!"

اس دوران میں دستک کی آواز دوبارہ ابھری۔ اب دروازہ کھول کر دیکھنا لازم ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے تھانے کے عملے سے کہہ رکھا تھا کہ ایمرجنسی کی صورت میں وہ لوگ کسی بھی وقت مجھے بلا سکتے ہیں۔ علی الصباح ہونے والی اس خلاف معمول دستک کا مطلب یہی تھا کہ میرے تھانے کی حدود میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

میں بارش زدہ صحن میں سے گزر کر بیرونی دروازے پر پہنچا پھر تیسری دستک کے جواب میں، جب میں نے اپنے کوارٹر کا دروازہ کھولا تو سامنے کانسٹیبل یعقوب کو کھڑے پایا۔ میں نے گھور کر سوالیہ نظر سے کانسٹیبل کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

"ملک صاحب! ہمارے علاقے میں بڑی عجیب و غریب واردات ہو گئی ہے۔ آپ نے اگر ناشتا وغیرہ کر لیا ہے تو تیار ہو کر تھانے آ جائیں....."

"تیار ہو کر میں تھانے تو آ ہی جاؤں گا۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ "لیکن پتا تو چلے، یہ عجیب و غریب واردات کیا ہوئی ہے؟"

"جناب! چودھری شہادت علی کے دو بندے ادھر تھانے کے برآمدے میں آئے بیٹھے ہیں۔" کانسٹیبل یعقوب وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پچھلی رات کسی نامراد نے بڑے چودھری صاحب کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کی بڑی بے حرمتی کی ہے۔ چودھری شہادت نے آپ کو جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے لیے بلایا ہے۔"

ان دنوں میری تعیناتی ضلع جھنگ کے ایک دور افتادہ گاؤں فیض آباد کے تھانے میں تھی۔ یہ تھانہ ایک پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا۔ تھانے سے موضع فیض آباد تک پیدل کا راستہ تھا۔ مجھے اس تھانے میں کام کرتے ہوئے لگ بھگ ایک سال ہو گیا تھا۔ فیض آباد میں اس وقت چودھری شہادت علی کی حکمرانی تھی۔ کوئی مہینا بھر پہلے شہادت علی کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی تسلی کی خاطر کانسٹیبل سے پوچھ لیا۔

"بڑے چودھری صاحب سے تمہاری مراد چودھری ظفر علی ہے نا؟"

"جی ہاں..... میرا یہی مطلب تھا۔" وہ جلدی سے اثبات

میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

ظفر علی، شہادت علی کا باپ تھا۔ بہت ہی سلجھا ہوا اور سمجھدار انسان۔ وہ روایتی قسم کے چودھریوں سے بالکل ہٹ کر تھا۔ پچھلے ایک سال میں میری بہ مشکل دو، تین مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو پائی تھی کہ کسی نے اس کی لاش کی بے حرمتی کر ڈالی تھی اور وہ بھی انتقال کے ایک ماہ بعد..... بہرحال، کسی افسوس ناک واقعے کی اطلاع آئی تھی تو جائے وقوعہ پر جا کر قانونی کارروائی کرنا لازمی ہو گیا تھا۔

میں نے کانسٹیبل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”یعقوب! تم تھانے جا کر چلنے کی تیاری کرو۔ میں یونیفارم پہن کر آرہا ہوں۔“

وہ مجھے سیلیوٹ کر کے پلٹ گیا۔

وردی پہننے کے دوران میں، میں مسلسل چودھری ظفر علی کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ بات بڑی عجیب اور ناقابلِ یقین لگتی تھی کہ کوئی شخص چودھری ظفر علی کے ساتھ، اس کے سامنے یا پیٹھ پیچھے معمولی سی بدتمیزی کے بارے میں بھی سوچے کجا یہ کہ اس کی لاش کو قبر سے نکال کر کوئی ناروا کارروائی کی جائے.....!

میں نے تیار ہونے کے بعد صحن کے سیلے فرش کو عبور کیا اور تھانے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ ماہ جولائی کا آخری ہفتہ تھا۔ ساون کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ابھی تک کھل کر مینہ نہیں برسا تھا۔ کبھی دن میں اور کبھی رات میں ہلکی پھلکی بارش ہو جاتی تھی۔ پچھلی رات آسمان پر ایسی غضب ناک بجلی چمکتی رہی تھی کہ لگتا تھا، دھواں دھار بارش ہوگی لیکن پوری رات سوکھی ہی گزر گئی۔ رات کے آخری پہر میں تھوڑی بوندا باندی ہو گئی تھی جس نے دھرتی اور درختوں کے منہ کو دھو ڈالا تھا۔

چودھری شہادت علی نے جن دو بندوں کو مجھے بلانے کے لیے بھیجا تھا، ان کے نام طفیل اور احسان تھے۔ میں نے فوراً انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میرے استفسار پر وہ کوئی اہم بات نہ بتا سکے۔ طفیل نے کہا۔

”تھانے دار صاحب! چودھری صاحب ادھر بیری والے کھوہ (کنوئیں) کے پاس ہیں۔ آپ کو بھی وہیں بلایا ہے۔“

بیری والا کھوہ قبرستان کے نزدیک ہی کھیتوں کے بیچ واقع تھا۔ میں نے طفیل سے پوچھا۔ ”جب چودھری ظفر علی کی قبر کھود کر اس کی لاش کی بے حرمتی کی گئی ہے تو مجھے قبرستان جانا چاہیے نا۔ یہ بیری والے کھوہ کا کیا معاملہ ہے؟“

”جناب! ان بدبختوں نے چودھری صاحب کی لاش کو قبر سے نکال کر پہلے بیری والے کھوہ تک پہنچایا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پھر ادھر ہی ان کی لاش کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا.....“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے طفیل سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے، وہ بدبخت کون تھے جنہوں نے یہ مذموم کارروائی کی ہے؟“

”جناب! اگر ہمیں ان کے بارے میں پتا ہوتا تو پھر پنچایت کس بات کی تھی۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”چودھری شہادت علی صاحب خود ہی نہ نمٹ لیتے ان سے.....“

طفیل اپنے آقا چودھری شہادت علی کی طرح بڑا الوکھا اور گرم دماغ کا لگتا تھا۔ مجھے طفیل کی وضاحت پسند تو نہیں آئی تھی تاہم میں نے اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور ضروری تیاری کے بعد جائے وقوعہ یعنی بیری والا کھوہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھ کانسٹیبل یعقوب کے علاوہ کانسٹیبل جمیل کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

چودھری شہادت علی سے ابھی تک میری ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے اس کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا۔ وہ اپنے باپ چودھری ظفر علی سے بہت مختلف تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ بہت جلد باز اور اکھڑ مزاج تھا۔ اسے غصہ بھی بہت جلد آجاتا تھا۔ وہ اپنے سامنے دوسرے لوگوں کو کم تر سمجھتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ چودھری ظفر علی مرحوم نے اپنے حسن سلوک سے گاؤں والوں کے دل جیت رکھے تھے جبکہ فیض آباد کے اکثر چھوٹے چودھری شہادت علی سے بیزار نظر آتے تھے۔ بس وہی لوگ خوش اور خوش حال تھے جو چودھری کے بہت قریب تھے اور ہر وقت اس کی مصاحبی میں لگے رہتے ہیں جیسا کہ طفیل اور احسان۔

مختصر الفاظ میں شہادت علی ایک روایتی چودھری تھا۔

☆☆☆

بیری والے کھوہ پر لگ بھگ درجن بھر افراد موجود تھے، جن میں چودھری شہادت علی کی شخصیت سب سے نمایاں تھی۔ میں سیدھا اسی کے پاس چلا گیا۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

”چودھری صاحب! یہ سب کیسے ہو گیا؟“

یہ ایک رسمی سا جملہ تھا جس کے جواب میں چودھری شہادت غضب ناک ہو کر بولا۔ ”ملک صاحب..... یہ جس نے بھی کیا ہے، اپنی موت کو للکارا ہے..... آپ جلدی سے پتا چلائیں، وہ بدبخت ہے کون، پھر دیکھیں میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں.....!“

چودھری شہادت کے تیور خاصے خطرناک اور قانون کے دائرے کو پھلانگتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اس موقع پر اس کی



نفسیات کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے سمجھانے یا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا پھر نرم لہجے میں کہا۔

”حوصلہ کریں چودھری صاحب۔ میں آ گیا ہوں۔ اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں دیکھوں گا سارے معاملے کو.....“ میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آئیں، ذرا میں بھی دیکھوں.....“

میں نے جس طرف اشارہ کیا تھا، وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی جس کے اوپر کسی شے کو سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ مذکورہ ”شے“ چودھری ظفر علی کی لاش ہوگی۔

چودھری شہادت علی میرے ہمراہ مذکورہ چارپائی کی سمت بڑھ گیا۔

چودھری نے مجھے دکھانے کے لیے جب سفید چادر کو ایک طرف ہٹایا تو میرے ذہن کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ منظر میرے اب تک کے دیکھے ہوئے ناپسندیدہ مناظر میں سے ایک تھا۔ کم و بیش ایک ماہ تک قبر کے اندر بند رہنے کے بعد مٹی اور مخصوص کیڑوں نے چودھری ظفر علی کی لاش کا جو حشر کیا تھا اس کو الفاظ میں بیان کرنا مناسب نہیں۔ بس، یوں سمجھ لیں کہ اس کی ہڈیوں کے پنجر پر برائے نام ہی گوشت رہ گیا تھا اور یہ باقی ماندہ گوشت دیکھنے والی آنکھ کو درس عبرت دیتا تھا۔ ان باقیات کے لیے ”لاش“ کا لفظ بھی موزوں نہیں تھا۔

”یہ دیکھیں جناب!“ چودھری شہادت نے اپنے باپ کے بازوؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ سؤر کے تخم باجی کے دونوں ”ہاتھ“ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں.....“

میں نے دیکھا۔ شہادت علی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ چودھری ظفر علی کے دونوں ”ہاتھ“ کلائیوں کے مقامات سے کٹے ہوئے تھے جس سے یہ واضح تھا کہ جن ظالم لوگوں نے چودھری ظفر علی کی لاش کو قبر سے نکالا تھا، وہ اسے کوئی سنگین سزا دینا چاہتے تھے۔ چودھری کے ہاتھوں سے کبھی انہیں کوئی شدید نوعیت کا نقصان پہنچا تھا جبھی ان کا سارا غصہ چودھری کے ”ہاتھوں“ پر اترا تھا۔

میں نے لاش کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اسے دوبارہ چادر سے ڈھک دیا اور چودھری شہادت علی کی طرف مڑتے ہوئے سوال کیا۔ ”چودھری صاحب! بڑے چودھری صاحب کی لاش آپ کو کہاں پڑی ملی تھی؟“

اس نے ایک جانب اشارہ کیا اور بتایا۔ ”وہاں..... کھوہ کی منڈیر کے قریب۔“

”آپ صبح صبح اس طرف کیا کرنے آئے تھے؟“

”میں اس طرف نہیں بلکہ قبرستان کی جانب گیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں فجر کی نماز کے بعد اباجی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے قبرستان گیا تھا۔ آپ کو تو پتا ہے، ہمارے خاندان کی قبروں کے لیے قبرستان کا بالائی حصہ مخصوص ہے۔ جب میں اس حصے میں پہنچا تو اباجی کی قبر دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا.....“

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”آپ نے وہاں کیا دیکھا؟“

”میں نے دیکھا.....“ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے دیکھا کہ اباجی کی قبر کھلی ہوئی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر تو میں سناٹے میں رہ گیا اور جب قبر کے اندر لاش کو بھی غائب پایا تو سمجھ لیں، میرے دل و دماغ کی کیا حالت ہوئی ہوگی.....“ وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے اباجی کی لاش کے لیے پورا قبرستان چھان مارا۔ جب وہ کہیں نہیں ملی تو میں کھیتوں کی طرف نکل آیا اور پھر یہاں..... بیری والے کھوہ کی منڈیر کے قریب رکھی اباجی کی لاش مجھے مل گئی۔ ان کی کٹی ہوئی کلائیوں (بہ صورت ہڈیاں) کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میں نے فوراً حویلی میں سے ایک چارپائی اور چادر منگوا کر اباجی کی لاش کو سمیٹا پھر دو بندوں کو آپ کی طرف دوڑا دیا..... یہ ہے کل کہانی جناب!“

”یہ بڑی افسوس ناک کہانی ہے چودھری صاحب!“ میں نے غمگین لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں اور میرا یہ آپ سے وعدہ ہے کہ میں اس اندوہناک بلکہ شرم ناک واقعے کے ذمے دار افراد کو جلد از جلد گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دلواؤں گا لیکن ان تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے چند اہم باتوں کا ذکر بہت ضروری ہے۔“

”کون سی اہم باتیں جناب؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”نمبر ایک..... قبر کو کھودنے والا جو کوئی بھی تھا یا جو کوئی بھی تھے وہ آپ کے اباجی سے شدید نفرت کرتے تھے۔ نمبر دو..... اس نفرت کی تفصیل میں جانا چاہیں تو بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ چودھری صاحب کے ہاتھوں انہیں ماضی میں شدید قسم کا کوئی نقصان پہنچا تھا۔ نمبر تین..... وہ لوگ لاش کو قبر سے نکال کر یہاں لے آئے تھے۔ وہ چاہتے تو ”ہاتھوں“ کی کٹائی کا کام وہاں قبرستان میں بھی کر سکتے تھے۔ اس کا مطلب ہے، یہ بیری والا کھوہ ان کی چودھری صاحب سے نفرت میں کلیدی کردار کا حامل ہے۔ اب چودھری صاحب! آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ.....“ میں نے محاورتاً توقف کر کے ایک گہری سانس لی، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"کہ کیا بڑے چودھری صاحب کے ہاتھوں ماضی میں کسی کو کوئی بڑا نقصان پہنچا تھا جو وہ انتقام کی رو میں ظلم و بربریت کی ساری حدود کو پھلانگ گیا۔ آپ ہی اس دشمن کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو چودھری صاحب کے لیے اپنے دل میں شدید ترین نفرت پالے بیٹھا تھا۔ میں آپ کے تعاون کے بغیر اپنی تفتیش کو آگے نہیں بڑھا سکوں گا۔"

"آپ کو بھی اچھی طرح پتا ہے ملک صاحب ....!" میرے خاموش ہونے پر چودھری شہادت علی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابا جی کتنی نرم اور ہمدرد طبیعت کے مالک تھے۔ ہر شخص ان سے خوش تھا۔ آج تک کسی کو ان کے بارے میں شکایت کرتے نہیں دیکھا۔ انسان تو بہت بڑی بات ہے جناب، میں نے تو ابا جی کے ہاتھ سے کبھی چڑیا کے بچے کو نقصان پہنچتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے ساری زندگی محبت بانٹی تھی۔ کوئی ان سے نفرت کس طرح کر سکتا ہے۔ جہاں تک میں ابا جی کو جانتا ہوں جناب ..... ان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔"

"لیکن چودھری شہادت علی .....!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں پچھلی رات جو کچھ پیش آیا ہے وہ کسی دوست کا تو کام نہیں ہو سکتا۔ آپ کو پتا ہے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے لیکن میں کسی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ان کا کوئی دشمن نہ ہو ..... یہ کسی بدترین دشمن کی کارگزاری ہے۔"

"تو پھر آپ جلد از جلد اس بدترین دشمن کو ڈھونڈ نکالیں ملک صاحب ....." وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ "تاکہ میں اپنے ہاتھوں سے اسے زندہ دفن کر سکوں۔"

بات کے اختتام پر چودھری شہادت علی کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے تھے۔ دکھ اور غم کے بجائے اب وہاں زندگی اور سفاکی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چودھری صاحب! جلد یا بدیر مجرم میری گرفت میں ہوں گے لیکن یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ میں انہیں آپ کے حوالے کر دوں گا تاکہ آپ انہیں اپنی مرضی کی سزا دے سکیں۔ میں ان کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کروں گا اور اس بات کا آپ اطمینان رکھیں ....." میں نے تھوڑا توقف کر کے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

"میں انہیں ایسی عبرت ناک سزا دلواؤں گا کہ آپ کا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ آپ بس دیکھتے جائیں، میں کرتا کیا ہوں .....!"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی الجھن کو دور کرنا ضروری نہیں سمجھا اور کہا۔

"چلیں، اب قبرستان میں جا کر چودھری صاحب کی قبر کا جائزہ لیتے ہیں۔ شاید وہاں سے مجرموں کا کوئی سراغ مل جائے ....!"

"ان کا کیا کرنا ہے؟" چودھری شہادت علی نے چادر سے ڈھکی ہوئی چارپائی کی جانب اشارہ کیا۔ انداز اس کے پوچھنے کا ایسا ہی تھا جیسے چادر کے نیچے چودھری ظفر علی بہ نفس نفیس لیٹا ہوا ہو یا پھر کم از کم وہاں اس کی لاش رکھی ہو۔

بیری والے کھوہ کے مقام پر میں موقع کی کارروائی مکمل کر چکا تھا اور وہاں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا میں نے چارپائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "انہیں بھی ساتھ لے چلیں ....."

اگلے ہی لمحے چودھری شہادت علی نے چار بندوں کو حکم دیا کہ وہ چودھری ظفر علی والی چارپائی کو اٹھا لیں۔ فوراً اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور چودھری ظفر علی کا "جنازہ" تدفین کے لیے قبرستان کی جانب لے جایا جانے لگا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ "کلمۂ شہادت" کی صدائیں بلند نہیں ہو رہی تھیں۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ اٹھانے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی عدالت انہیں کوئی اہمیت دیتی تھی لہٰذا چودھری ظفر علی کی بچی کھچی لاش پر کسی نوعیت کی "طبع آزمائی" کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجرموں کا سراغ لگانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔

قبرستان ایک بڑے ٹیلے پر "آباد" تھا۔ اس کی ایک جانب ریلوے لائن اور دوسری طرف کھیتوں کا طویل سلسلہ تھا۔ موضع فیض آباد اسی ریلوے لائن اور پختہ سڑک کے درمیان واقع تھا۔ مذکورہ ریلوے لائن مین ٹریک نہیں تھا۔ اس پر سے اکا دکا پسنجر ٹرینیں گزرا کرتی تھیں یا پھر دن میں دو، تین مرتبہ مال گاڑیوں کا گزر ہوتا تھا۔

چودھری خاندان کی تدفین کے لیے قبرستان کے بالائی حصے میں ایک جگہ مخصوص تھی۔ جلد ہی ہم چودھری ظفر علی کی کھلی ہوئی قبر پر پہنچ گئے۔ چارپائی کو قبر کے قریب ہی تھوڑے فاصلے پر رکھ دیا گیا۔ میں نے بڑی توجہ سے اس کھدی ہوئی قبر کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے اردگرد کا بھی بہ غور معائنہ کیا لیکن کوئی بھی قابلِ گرفت شے یا سراغ میری نظر میں نہ آ سکا۔ میں نے اس کے بعد چودھری ظفر علی کی "تدفین" کی اجازت دیدی۔

جس دوران میں چودھری شہادت علی، اس کے خاص بندے اور گاؤں کے دیگر افراد چودھری ظفر علی کے برائے نام گوشت والے پنجر کو قبر میں اتار کر مٹی برابر کر رہے تھے ..... میرے ذہن میں ایک نہایت اہم خیال چکا۔ یہ خیال اس کمرے کو دیکھ کر ابھرا تھا جو قبرستان کے داخلی دروازے کے قریب بنا ہوا



تھا۔ میری معلومات کے مطابق مذکورہ کمرا گورکن کرامت علی کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے ابھی تک جتنی بھی تفتیش کارروائی کی تھی اس میں گورکن مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا حالانکہ ان حالات میں اسے پیش پیش ہونا چاہیے تھا۔

میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے اضطراری لہجے میں چودھری شہادت علی سے پوچھا۔ "چودھری صاحب! کیا گورکن نہیں گیا ہوا ہے .....؟"

"گورکن .....!" اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی پوچھ لی ہو۔

"ہاں گورکن!" میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔ "میں کرامت علی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔ کیا وہ گاؤں میں موجود نہیں .....؟"

"وہ ادھر اپنے کمرے میں موجود ہے جناب۔" چودھری نے افراتفری میں جواب دیا پھر جلدی سے میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! میں ابا جی کی پریشانی میں، گورکن کے بارے میں آپ کو بتانا بالکل بھول گیا۔ کرامت علی اپنے کمرے میں بے ہوش پڑا ہے ....."

"بے ہوش پڑا ہے .....؟" میں نے حیرت بھرے انداز میں اسی کے الفاظ دہرائے۔

"آپ آئیں میرے ساتھ۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو دکھاتا ہوں ....."

چودھری ظفر علی کی قبر سے گورکن کے کمرے تک پہنچنے کے دوران میں شہادت علی نے مجھے بتایا کہ وہ جب بھی علی الصباح اپنے ابا جی کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آتا تھا تو کرامت علی اس کے پاس ہی موجود رہتا تھا تاکہ اگر اسے کسی شے کی ضرورت ہو تو وہ مدد کر سکے۔ آج جب چودھری نے اپنے ابا جی کی قبر کو کھلا ہوا پایا اور اردگرد کہیں گورکن بھی دکھائی نہیں دیا تو وہ سب سے پہلے اس کے کمرے ہی کی طرف دوڑا تھا اور ..... گورکن کو اس نے کمرے کے اندر رسیوں میں جکڑا ہوا بے ہوش پایا تھا۔

"جناب! میں نے اس کی بندشیں تو جس حد تک ممکن تھیں، کھول دی ہیں لیکن باوجود کوشش کے میں اسے ہوش میں نہیں لا سکا۔" اپنے بیان کے آخر میں اس نے بتایا۔ "پھر میں ابا جی کی پریشانی میں اس قدر الجھا کہ کرامت علی میرے ذہن سے نکل گیا۔ اسی لیے میں آپ کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا ہوں۔"

جلد ہی ہم دونوں گورکن کے کمرے کے اندر موجود تھے۔ گورکن کرامت علی کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال رہی ہوگی۔ وہ کمرے کے قریب پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں اس کے قریب

صبح سے کچھ دیر پہلے کلب کے سکریٹری کو اس کی سکریٹری نے بتایا۔ "ایک صاحب اپنے دو دوستوں کے ہمراہ آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ اسپائر ہیں۔"

"اُسے بھگا دو۔ وہ شخص یقیناً جھوٹ بول رہا ہے۔" کلب سکریٹری نے جواب دیا۔

"آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"میں اس فیلڈ میں ۳۰ سال سے ہوں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی اسپائر پوری زندگی میں ایک دوست بھی نہیں بنا سکتا، جس کے ساتھ دو دوست عمرہ اسپائر ہو ہی نہیں سکتا۔"

oooooooo

"جب اسپائر نے سمتھ کو ایل بی ڈبلیو قرار دیا تو اسمتھ نے کیا کہا؟"

"اور مجھے بے ہودہ الفاظ سننے کرنا ہوں گے، ہے نا؟"

"بالکل۔"

"تب تو اُس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔"

اکڑوں بیٹھ کر معائنہ کرنے لگا۔

اس کی نبض بڑی سست روی سے چل رہی تھی۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ وہ خطرے سے باہر تھا۔ میں نے اسے رسی کی بندشوں سے آزاد کرنے کے بعد اس کی بے ہوشی کا سبب جاننے کی کوشش کی، جلد ہی اس کے سر کی چوٹوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجرموں نے اسے بے بس کرنے کے لیے اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ کھوپڑی کے ایک حصے میں بڑا سا گومڑ ابھرا ہوا تھا جبکہ دوسری جانب ایک کھلا ہوا زخم نظر آ رہا تھا، جس میں سے رسنے والے خون نے گورکن کے سر کے بالوں کو تر بہ تر کر دیا تھا۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں لے جانے والی بھی سر کی چوٹیں تھیں جو محتاط اندازے کے مطابق کسی ڈنڈے یا موٹی لکڑی سے لگائی گئی تھیں اور ..... یہ کام ان مجرموں کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا جنہوں نے چودھری ظفر علی کی لاش کے ساتھ کھلواڑ کیا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ انہوں نے پہلے گورکن کو بے ہوش کیا، پھر اسے رسیوں میں جکڑ کر اس بات کا اطمینان کر لیا کہ وہ ان کی کسی بھی مذموم کارروائی میں مداخلت کے قابل نہیں رہا۔ اس کے بعد ہی وہ لوگ چودھری ظفر علی کی قبر کی طرف بڑھے ہوں گے۔

گورکن کا جلد از جلد ہوش میں آنا بہت ضروری تھا۔ وہ ہوش میں آ جاتا تو مجھے نامعلوم مجرموں کے بارے میں بہت کچھ

بتا سکتا تھا۔ اس وقت بے ہوش گورکن کرامت علی کی صورت میں میرے پاس واحد ذریعہ تھا جسے اختیار کر کے میں مجرموں تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس سراغ کو یقینی اور کارآمد بنانے کے لیے میں نے فی الفور اسے اسپتال پہنچانے کا بندوبست کیا۔ اگر گورکن بیان دینے کے قابل ہو جاتا تو تفتیش کی گاڑی کو بہ آسانی آگے بڑھایا جا سکتا تھا۔

میری فرمائش پر چودھری شہادت علی نے ایک تانگے کا انتظام کروا دیا۔ میں نے گورکن کو تانگے میں ڈلوایا اور دونوں کانسٹیبلوں کی نگرانی میں اسے سرکاری اسپتال کی طرف روانہ کر دیا۔ مذکورہ اسپتال موضع فیض آباد سے کافی فاصلے پر تھا لیکن چونکہ یہاں سے ایک پختہ سڑک اسپتال کی طرف جاتی تھی لہٰذا مجھے پکی امید تھی کہ دونوں کانسٹیبل سورج غروب ہونے سے پہلے گورکن کو "ٹھیک" کروا کے لے آئیں گے۔

اس کے بعد میں نے گورکن کے کمرے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہاں چند برتنوں اور ایک چارپائی بستر وغیرہ کے سوا رہائشی سامان کے نام پر کچھ نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں کھدائی کے چند مخصوص آلات رکھے ہوئے تھے مثلاً کدال، پھاوڑا، کسی، بیلچہ اور کھرپے وغیرہ..... یہ آلات وہ قبر کی کھدائی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ میں نے ایسا ہی ایک بیلچہ اور کدال چودھری ظفر علی کی کھلی ہوئی قبر کے پاس رکھی ہوئی بھی دیکھی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ مجرموں نے گورکن کو بے ہوش کرنے کے بعد اسی کے آلاتِ کھدائی کی مدد سے چودھری کی قبر کھولی ہوگی اور اپنا کام کر کے فرار ہو گئے ہوں گے۔

میں نے مذکورہ آلاتِ کھدائی کا بہ غور جائزہ لیا تو ان کے درمیان مجھے ایک مضبوط ڈنڈا پڑا ہوا مل گیا۔ یہ کسی کدال وغیرہ کا دستہ تھا۔ مذکورہ دستے کے ایک سرے پر خشک جمے ہوئے خون کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس دستے کو اٹھایا اور بڑی باریک بینی سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔ جمے ہوئے خون والے سرے پر چند انسانی بال بھی چپکے ہوئے تھے۔ اب اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ گورکن کو اسی دستے کی ضربات سے بے ہوش کیا گیا تھا۔

میں نے مذکورہ آلۂ بے ہوشی کو اپنے قبضے میں لے لیا اور چودھری شہادت علی کے ساتھ دوبارہ چودھری ظفر علی کی قبر پر آ گیا۔

آج کل تفتیشی میدان میں پولیس کو کس قدر آسانیاں اور سہولیات میسر ہیں لیکن ہمارے زمانے میں سارا کام جسم اور ذہن ہی کو کرنا پڑتا تھا، کوئی ٹیکنیکل اور سائنسی سہولت مہیا نہیں تھی۔ اگر ہمارے زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ کا نظام رائج ہوتا تو کدال کا یہ دستہ مجھے بڑی آسانی سے مجرموں تک پہنچانے میں ایک مددگار کا کردار ادا کر سکتا تھا۔ بہرحال، ہر دور کے کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں اور انہی تقاضوں کے فریم میں رہ کر کھیلنا پڑتا ہے۔

چودھری ظفر علی کی قبر کو "ٹھیک ٹھاک" کر دیا گیا تو چودھری شہادت علی نے مجھ سے پوچھا۔ "ملک صاحب! مجرموں کا سراغ لگانے کے لیے کسی ماہر کھوجی سے بھی تو مدد لی جا سکتی ہے.....؟"

"میرا دھیان بھی اس طرف گیا تھا۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "لیکن رات کے آخری پہر ہونے والی بارش نے کھرے کا سوا ستیاناس کر دیا ہے۔ کھوجی اس سلسلے میں ہماری مدد نہیں کر سکے گا البتہ.....!"

میں نے سانس لینے کے لیے تھوڑا توقف کیا تو اس نے جلدی سے پوچھا۔ "البتہ کیا.....؟"

"البتہ یہ کہ....." میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے دو جگہوں سے بڑی امید ہے۔ وہاں سے کوئی نہ کوئی ایسا سراغ ضرور ملے گا کہ میں تفتیش کی گاڑی کو بہ آسانی آگے بڑھا سکوں....."

"اور وہ دو جگہیں کون سی ہیں؟" اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے دوسرے لوگوں سے ذرا فاصلے پر آ گئے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "چودھری صاحب! ایک جگہ تو گورکن کرامت علی ہے۔ میں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کروں گا۔ مجرموں کا گورکن سے "واسطہ" پڑا تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ ان میں سے کسی کو جانتا ہو یا کم از کم وہ ان کے حلیے اور قد کاٹھ کے بارے میں بتا کر میری راہنمائی کر سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، گورکن جن لوگوں کی نشاندہی کرے ان میں سے آپ یا گاؤں کا کوئی دوسرا شخص کسی کو پہچان لے۔ اس طرح مجرموں کی تلاش کا کام قدرے سہل ہو جائے گا....."

"ہاں، یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ پھر پوچھا۔ "اور دوسرا ذریعہ کون سا ہے؟"

"دوسرا ذریعہ آپ ہیں چودھری صاحب.....!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں....." وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ "میں کیسے جناب؟"

"آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ چودھری ظفر علی کا دشمن کون ہے.....؟"

"یہ سوال آپ پہلے بھی پوچھ چکے ہیں اور میں نے آپ کو



اس کا جواب بھی دے دیا ہے۔" اس کے چہرے پر الجھن کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

"کوئی ایسا شخص....." میں نے اس کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "ماضی میں چودھری ظفر علی کے ہاتھوں جس نے کوئی تکلیف اٹھائی ہو....."

"ابا جی کسی کو تکلیف پہنچانے والے نہیں تھے.....!"

"اس شخص کے دل میں بڑے چودھری صاحب کے لیے اتنی نفرت تھی کہ....." میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ "کہ جب اس کا بس چلا تو اس نے نہ صرف یہ کہ ظفر علی کی "لاش" کو قبر سے نکال کر اس کی بے حرمتی کی بلکہ وہ دونوں ہاتھ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ نقطہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اسی طرح بیری والا کھوہ بھی میری نظر میں بڑی اہمیت کا حامل ہے چودھری صاحب.....!"

"مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ آپ کو بتا چکا ہوں جناب!" وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ "اب تحقیق اور تفتیش کرنا آپ کا کام ہے۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ آپ جلد از جلد مجرموں کو گرفتار کر کے سامنے لائیں اور ان کے خلاف سخت ترین قانونی کارروائی کریں....."

"یہی ہوگا..... بالکل یہی ہوگا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کام کے لیے آپ کی اور آپ کے گاؤں والوں کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔ موقع پر موجود لوگوں سے میں سرسری پوچھ گچھ کر چکا ہوں لیکن کوئی حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آپ نے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ کیوں نا ایک کام کریں چودھری صاحب.....؟"

"کیا کام.....؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے جواب میں بتایا۔ "میں آپ کے ساتھ حویلی چلتا ہوں۔ ہو سکتا ہے، آپ کے اہل خانہ کے ساتھ بات چیت کر کے کوئی مفید بات معلوم ہو جائے۔"

"بسم اللہ..... تشریف لائیں....."

میں چودھری شہادت علی کی معیت میں اس کی حویلی پہنچ گیا۔

حویلی کے اندر خاندان کے بہت کم لوگ آباد تھے۔ چودھری شہادت علی کی بیوی صفیہ سے میری ملاقات ہوئی۔ صفیہ، چودھری سے کوئی پانچ سال چھوٹی یعنی لگ بھگ تیس سال کی تھی۔ وہ ایک گوری چٹی اور خوبصورت عورت تھی۔ اپنی وضع قطع اور شخصیت کے اعتبار سے وہ بنی بنائی چودھرائن تھی۔ اگر کوئی یہ نہ بھی بتائے کہ وہ فیض آباد کے چودھری شہادت علی کی گھر والی ہے تو بھی ایک نظر دیکھنے والے کو فوراً پتا چل جاتا تھا کہ وہ چودھریوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہوگی.....!

چودھری شہادت علی کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑا بیٹا صداقت علی آٹھ سال کا تھا۔ اس سے چھوٹی ایک بہن جمیلہ تھی جس کی عمر سات سال رہی ہوگی اور سب سے چھوٹی شکیلہ محض پانچ سال کی تھی۔ ظاہر ہے، ان بچوں سے پوچھ گچھ کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن حیرت انگیز طور پر چودھرائن صفیہ بھی اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہ کر سکی۔

ان لوگوں کے علاوہ میں نے حویلی میں کام کرنے والے مختلف ملازمین سے بھی سوال و جواب کیے مگر ہر طرف سے ایک ہی فتویٰ آ رہا تھا کہ..... بڑے چودھری صاحب کا کوئی دشمن ہو ہی نہیں سکتا۔ دشمنی تو بہت دور کی بات ہے، کوئی ان کے خلاف سوچنے کا بھی تصور نہیں کر سکتا اور یہی بات کانٹے کی طرح میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ چودھری ظفر علی کی لاش کا جو حشر ہوا تھا اور نامعلوم مجرم جتنی بے دردی سے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے اس سے تو یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ اس دنیا میں کم از کم ایک شخص ایسا ضرور موجود تھا جو اپنے دل میں چودھری کے لیے بڑی اعلیٰ پائے کی نفرت رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازم تھا کہ ایسے انتقامی شخص کو ماضی میں چودھری ظفر علی کے ہاتھوں کوئی بڑا نقصان پہنچا ہو..... میں اپنی تھیوری سے ایک سوت ادھر ادھر ہٹ نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ افسوس ناک واقعہ اسی تھیوری کے تناظر میں پیش آیا تھا۔ کوئی میرے پیشہ ورانہ تجربے کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا..... ایسا صرف اور صرف کسی خطرناک دشمنی کے پس منظر ہی میں ممکن تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے چودھری شہادت علی سے پوچھا۔ "چودھری صاحب! آپ کی والدہ ماجدہ کہیں نظر نہیں آ رہیں۔ کیا وہ حویلی میں موجود نہیں ہیں؟"

"امی جی! ادھر ہی ہیں جناب!" اس نے بتایا۔ "خیریت..... آپ نے ان کا کیوں پوچھا؟"

"میں نے سوچا، جب سب سے بات چیت ہوئی ہے تو بڑی چودھرائن جی سے بھی تھوڑی پوچھ تاچھ کر لوں۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے، انہیں کوئی ایسی بات پتا ہو جو آپ کے ابا جی کے مجرموں تک پہنچنے میں میری مدد کر سکے۔"

"امی جی کو ہم نے اس واقعے کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا۔" چودھری شہادت علی نے جواب دیا۔ "ان کی طبیعت پہلے ہی بہت خراب رہتی ہے۔ یہ بری خبر سن کر انہیں گہرا صدمہ پہنچتا۔" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"جب سے ابا جی کا انتقال ہوا ہے، امی جی کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ ان کی سماعت اور بصارت تو پہلے ہی بری

طرح متاثر تھیں، اب کمر میں بھی شدید درد رہنے لگا ہے۔ یوں سمجھیں کہ پچھلے ایک ماہ سے وہ چارپائی سے لگی ہوئی ہیں۔ ابا جی کے انتقال کو بھی لگ بھگ اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔ آپ خود سوچیں، ان حالات میں امی جی کو تازہ ترین واقعے کے بارے میں بتانا کتنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے.....؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چودھری صاحب!" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ مجبوری تو بہرحال ہے....."

میں مزید تھوڑی دیر تک چودھری کی حویلی میں رکا پھر واپس آ گیا۔

☆☆☆

کانسٹیبل یعقوب اور جمیل کو میں نے گورکن کے ہمراہ سرکاری اسپتال بھیج دیا تھا۔ تھانے پہنچ کر پتا چلا کہ ابھی تک ان کی واپسی ہوئی ہے اور نہ ہی ادھر سے کوئی اطلاع آئی ہے۔ میرے پاس فی الوقت تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے واحد ذریعہ گورکن کرامت علی ہی تھا۔ یہ بندہ ان لوگوں کے بارے میں معلومات فراہم کرسکتا تھا جنہوں نے چودھری ظفر علی کی قبر کھود کر یہ قول شقی، اس کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔

پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ گورکن کی واپسی کا انتظار کروں گا لیکن تھانے پہنچتے پہنچتے میں نے ارادہ بدل دیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے فوراً اسپتال جا کر گورکن کی خبر لینا چاہیے۔ میں نے اے ایس آئی فاروق احمد کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میرے تھانے میں فاروق واحد اے ایس آئی تھا۔ عملے میں اس کے علاوہ ایک حوالدار اور چار کانسٹیبل تھے۔

"فاروق.....!" اے ایس آئی میرے پاس پہنچا تو میں نے گہری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ "میں گورکن کو دیکھنے اسپتال جا رہا ہوں۔ اس دوران میں یہ تھانہ تمہارے حوالے ہے۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"تمہیں ایک اور کام بھی کرنا ہے فاروق.....!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس تھانے میں طویل عرصے سے ڈیوٹی دے رہے ہو۔ فیض آباد کے تقریباً سبھی لوگوں سے تمہاری جان پہچان ہے۔ تم نے ایک بار کسی ماسی کا ذکر کیا تھا جو ضرورت پڑنے پر پولیس کے لیے بھی کام کر لیتی ہے....."

"ماسی جیراں.....!" فاروق نے بتایا۔

"ہاں ہاں..... یہی نام بتایا تھا تم نے....." میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"خیریت ملک صاحب.....!" اے ایس آئی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "ماسی جیراں سے آپ کو کیا کام پڑ گیا ہے؟"

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "گزشتہ رات چودھری ظفر علی مرحوم کی قبر کے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے وہ تمہارے علم میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چودھری کے کسی ایسے دشمن کی انتقامی کارروائی ہے جو اپنے دل میں چودھری کے لیے بے پناہ نفرت رکھتا ہو اور ماضی میں جس نے چودھری کے ہاتھوں کوئی بہت بڑا نقصان اٹھایا ہو لیکن اب تک کی تفتیش میں ایسا کوئی شخص سامنے نہیں آ سکا اور میں سمجھتا ہوں، یہ ایک تفتیشی ناکامی ہے اس لیے....." میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں، نہایت ہی خفیہ طور پر ماسی جیراں کو استعمال کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ میرا مطلوبہ بندہ کون ہوسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب!" فاروق نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "میں جیراں ماسی کو فوراً اس مہم پر لگا دیتا ہوں۔ انشاءاللہ! ایک آدھ دن میں کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو جائے گا۔"

"اس کام میں نہایت ہی احتیاط کی ضرورت ہے فاروق۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ گاؤں میں کسی کو ماسی جیراں کے مشن کا پتا چلے۔ اسے بڑی رازداری سے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا ہوگا۔"

"وہ اس نوعیت کے کاموں کی ماہر ہے جناب!" فاروق نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ویسے میرے ذہن میں ایک اور بات بھی آ رہی ہے....."

"ہاں ہاں..... بولو۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"میرا یہ تجربہ ہے کہ تمہارے ذہن میں کافی مفید اور کارآمد خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ عام ڈگر سے ہٹ کر سوچنے والے ہی کسی حتمی نتیجے پر پہنچ پاتے ہیں....."

"اس تعریف کا بہت بہت شکریہ ملک صاحب!" وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔ "میں خود کو اس حوالے سے بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ یقین مانیں، میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے اور....."

"سیکھنے اور سکھانے کا کام تو چلتا ہی رہے گا فاروق!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے کسی اور بات کے بارے میں بتانے جا رہے تھے جو ابھی ابھی تمہارے ذہن میں آئی ہے؟"

"جی ملک صاحب!" اس نے ایک گہری سانس لی پھر بتانے لگا۔ "یہ ضروری تو نہیں کہ چودھری ظفر علی کی قبر کو عبرت کا نشان بنانے والے فیض آباد میں، باہر سے آئے ہوں..... ان کا تعلق اسی علاقے سے بھی تو ہوسکتا ہے؟"



"بالکل ہوسکتا ہے، میں نے کب انکار کیا ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہر بات کا امکان موجود ہے۔ مجرموں کا تعلق فیض آباد سے ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے، وہ کسی اور علاقے سے آئے ہوں۔ ایک امکان یہ بھی ہے میرے ذہن میں کہ اس بے ہودہ کارروائی میں فیض آباد کے کسی باسی نے ان کی مدد کی ہو....." میں نے لمحاتی توقف کے بعد اے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے میں ماسی جیراں والی کارروائی میں، بہت زیادہ احتیاط برتنے پر زور دے رہا ہوں۔ اگر مجرم یا ان کا کوئی ساتھی فیض آباد سے تعلق رکھتا ہے تو انہیں اس بات کا مطلق احساس نہیں ہونا چاہیے کہ پولیس ان کے خلاف سرگرم ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟"

"بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں جیراں ماسی کو اس سلسلے میں تفصیل سے سمجھا دوں گا۔"

"اسے ایک اور بات کی بھی تاکید کرنا ضروری ہے فاروق!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی کون سی بات؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "جیراں ماسی کو اس بات کا پتا بھی چلانا ہے کہ گاؤں میں سے کوئی بندہ غائب تو نہیں....."

"جی.....!" اے ایس آئی نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ "میں سمجھ گیا جناب!"

"ٹھیک ہے!" میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں کے معاملات دیکھو اور میں اسپتال جا کر گورکن کو چیک کرتا ہوں۔"

اے ایس آئی نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں ایک صحت مند گھوڑے پر سوار ہو کر سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد میں اسپتال میں تھا۔ مذکورہ اسپتال میرے تھانے سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے چونکہ پختہ سڑک پر گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا تھا اس لیے بہت جلد اسپتال پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اس ڈاکٹر سے ملاقات کی، گورکن کرامت علی جس کی نگرانی میں تھا۔ کانسٹیبل یعقوب کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ گورکن کو ہوش آ گیا ہے۔ اسی تناظر میں، میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! کیا میں مریض سے ملاقات کر سکتا ہوں؟"

"ملاقات سے آپ کی مراد بیان لینا ہے نا.....؟" ڈاکٹر نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ظاہر ہے، میں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجرموں تک پہنچنے کے لیے گورکن کا بیان لینا بہت ضروری ہے۔"

"تھانے دار صاحب! کسی ڈاکٹر کے لیے اس کا مریض سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔" وہ بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں بولا۔ "آپ مجرموں کے ساتھ دن رات آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں اس لیے آپ بھی اپنے فرائض کے ہاتھوں مجبور ہیں لیکن میرے لیے مریض کی صحت بہت ضروری ہے اور..... اس مریض کی صحت ابھی کسی نوعیت کے بیان کی اجازت نہیں دیتی۔"

"لیکن میری معلومات کے مطابق گورکن کو ابتدائی طبی امداد دی جا چکی ہے اور وہ ہوش میں بھی آ گیا ہے۔" میں نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔ "پھر اس سے ملاقات میں کیا قباحت ہے؟"

"ملاقات میں کوئی قباحت نہیں ہے تھانے دار صاحب!" وہ بدستور نرم اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پھر.....؟" میری الجھن دوچند ہو گئی۔

"شاید آپ نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا.....!" ڈاکٹر نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ فی الوقت مریض کا انٹرویو نہیں ہوسکتا۔ ہم نے اس کی مناسب مرہم پٹی کر دی ہے۔ اس کے سر میں آٹھ ٹانکے آئے ہیں۔ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اور وہ ہوش میں بھی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں، اس کی صحت کسی بیان یا سوال و جواب کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ اگر اسے دیکھنا چاہتے ہیں تو ضرور دیکھیں لیکن خدارا..... "بیان" کو کچھ عرصے کے لیے موخر کر دیں....."

"مثلاً کتنے عرصے کے لیے.....؟" میں نے پوچھا۔

لفظ "عرصے" نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ ہفتوں یا مہینوں کی بات کر رہا ہو۔ ڈاکٹر نے میری پیشانی پر ابھرنے والی الجھن زدہ لکیروں سے میری ذہنی کیفیت کا فوراً اندازہ لگا لیا اور تسلی بخش لہجے میں بولا۔

"زیادہ نہیں تھانے دار صاحب! بس صبح تک انتظار کر لیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ اگر آج مریض کو مکمل آرام کرنے کا موقع مل گیا تو وہ کل صبح سو فیصد بیان دینے کے قابل ہو جائے گا....." اس نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بظاہر مریض کے سر کی چوٹیں بہت معمولی نوعیت کی نظر آتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، ان ضربات نے اس کی سوچ کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ وہ ابھی آپ کے کسی بھی سوال کا مناسب

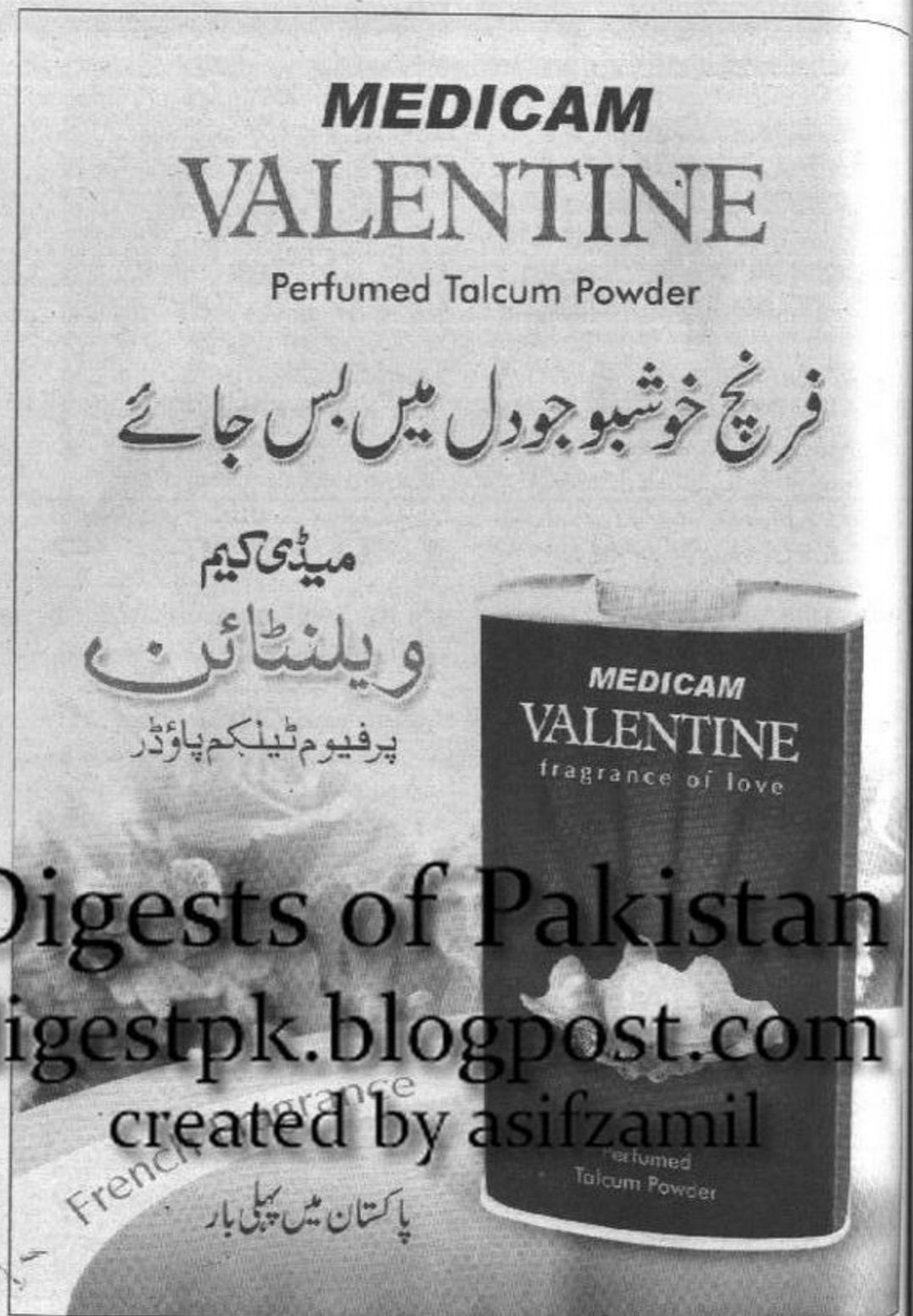

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
created by asifzamil

جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں۔"

"او کے ڈاکٹر......" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔ "آئی تھنک، یو آر رائٹ۔" اس نے زیرِ لب مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس کے بعد میں ڈاکٹر کی معیت میں گورکن کو دیکھنے وارڈ تک گیا۔ اس کا سر سفید بینڈیج میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ اسپتال کے بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وثوق کے ساتھ یہ کہنا تو مشکل تھا کہ گورکن اس وقت سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا تاہم یہ بات یقینی تھی کہ وہ بے ہوش نہیں تھا۔

میں نے اس کی نبض ٹٹول کر دیکھی۔ دل کی دھڑکن معمول کی رفتار پر تھی۔ سینے کے زیر و بم سے نارمل اور اطمینان بخش تنفس کا بھی سراغ ملتا تھا۔ گورکن کی مجموعی حالت کو تسلی بخش کہا جاسکتا تھا۔ وہ مکمل طور پر خطرے سے باہر تھا تاہم تجربہ کار ڈاکٹر کے بقول ابھی اس سے سوال و جواب کرنا ٹھیک نہیں تھا...... میں وارڈ سے باہر نکل آیا۔

کانسٹیبل یعقوب اور جمیل میرے ساتھ چلتے ہوئے ویٹنگ روم تک آگئے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ گزشتہ رات کے آخری پہر میں برسنے والی بارش نے چونکہ زمین کے سینے کو اچھی طرح بھگو دیا تھا۔ لہٰذا یہ دھوپ اس نمی سے بغل گیر ہو کر قیامت خیز حبس کو جنم دے رہی تھی۔ اس وقت بھی کچھ اسی نوعیت کی حالت ہو رہی تھی۔ آج علی الصباح ہی بھاگ دوڑ کا آغاز ہو گیا تھا لہٰذا بھوک بھی خوب چمک رہی تھی۔ میں نے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم لوگوں نے یہاں آ کر کچھ کھایا پیا بھی یا یونہی بھوکے بیٹھے ہو؟"

"کھانا پینا کیا تھا جناب، بس ادھر اسپتال ہی میں مصروف ہیں۔" جمیل نے جواب دیا۔ "بس ایک دو مرتبہ باہر جا کر ستو پیا ہے جناب......!"

"ستو والے گڑ کے شربت کا ایک گلاس گندم کی دو چپاتیوں کے برابر ہوتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر تم لوگوں نے اب تک ستو کے دو دو گلاس معدے میں اتار لیے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تمہیں دوپہر کا باقاعدہ کھانا کھانے کی بالکل ضرورت نہیں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ کافی حد تک درست فرما رہے ہیں ملک صاحب!" یعقوب اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "ستو کے دو گلاسوں سے کچھ آسرا تو ہوا ہے لیکن کھانے کی گنجائش اب بھی بہرحال باقی ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے......"

"ہاں ہاں...... بالکل پتا ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا پھر معدے کے حوالے سے اس کے فلسفے کو دہراتے ہوئے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے اس روئے زمین پر انسان کے لیے جتنی نعمتیں پیدا کی ہیں، اس کے معدے کے اندر ہر نعمت کے لیے ایک الگ خانہ بھی بنایا ہے لہٰذا......" میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"لہٰذا...... ستو گئے اپنے خانے میں اور...... دوپہر والے کھانے کا خانہ ہنوز خالی پڑا ہے یہی بات ہے نا؟"

میری بات کے اختتام پر وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ وہ ایک ہاتھ سے اب بھی اپنے پیٹ کو سہلا رہا تھا۔ "اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب...... یہی ہے نا آپ نے کام کی بات!"

میں ان دونوں کو اپنے ساتھ ایک قریبی ہوٹل پر لے گیا۔ وہاں ہم تینوں نے حسبِ ذوق اور حسبِ طلب کھانا کھایا پھر میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میرا خیال ہے، تم دونوں کو یہاں رکنے کی ضرورت نہیں۔ گورکن کی حالت اب کافی بہتر ہے۔ مجھے پکی امید ہے کہ رات تک وہ پوری طرح ہوش و حواس میں آجائے گا لہٰذا تم میں سے کوئی ایک میرے ساتھ تھانے جائے گا اور دوسرا یہاں رک کر گورکن کا خیال رکھے گا۔ ٹھیک ہے......؟"

"ٹھیک ہے ملک صاحب!" یعقوب نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

جمیل بولا۔ "ڈاکٹر صاحب نے تو کہا ہے، گورکن کو کسی اٹینڈنٹ کی ضرورت نہیں۔ اسپتال کا عملہ پوری طرح مریض کا خیال رکھے گا۔ ہم چاہیں تو کل صبح اسے یہاں سے ڈسچارج کرا کے اپنے ساتھ گاؤں لے جاسکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر نے اپنے طور پر بالکل درست مشورہ دیا ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن شاید وہ یہ نکتہ بھول رہا ہے کہ گورکن کرامت علی کوئی عام مریض نہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ مجرموں کی وضع قطع اور حلیے بیان کر کے ان کے لیے کوئی بہت بڑی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر وہ یہاں اسپتال میں آ کر گورکن کو کوئی شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں اور...... یہ نقصان گورکن کی جان لینے کے برابر بھی ہو سکتا ہے لہٰذا......" میں تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"لہٰذا ہم گورکن کو اسپتال والوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ پولیس کے کسی ایک اہلکار کو یہاں چوکس موجود رہنا ہے تاکہ مجرموں کے کسی ساتھی کو کوئی مذموم کارروائی کرنے کا موقع نہ ملے۔ بس، ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ کل صبح ہم گورکن کو گاؤں لے جائیں گے۔"

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' یعقوب نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''آپ نے جس خدشے کا اظہار کیا ہے، میں اس سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔''

''آپ دونوں بے فکر ہو کر تھانے جائیں۔'' جمیل نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں کی ذمے داری کو سنبھال لوں گا۔ انشاءاللہ! آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

میں یعقوب کے ساتھ واپس آ گیا۔

☆☆☆

سہ پہر شام میں ڈھل رہی تھی۔ دھوپ ایک مرتبہ پھر غائب ہو گئی تھی۔ بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں پتا نہیں، کہاں کہاں سے سفر کر کے آسمان پر...... فیض آباد کے آسمان پر جمع ہو رہی تھیں۔ گویا فیض آباد کی زمین اور فضا ایک مرتبہ پھر بارش کی لپیٹ میں آنے والی تھی۔

مجھے اسپتال سے واپس لوٹے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ایک ملاقاتی کی اطلاع دی گئی۔ میں نے اطلاع لے کر آنے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''آفتاب! وہ کون ہے...... اور کہاں سے آیا ہے؟''

''آیا نہیں، آئی ہے جناب۔'' کانسٹیبل نے اپنی انگشت شہادت سے ناک کو کھجایا اور معنی خیز انداز میں بتایا۔

''اچھا، تو وہ کوئی عورت ہے......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہے؟ وہ کہاں سے آئی ہے؟ اس نے اپنا نام کیا بتایا ہے......؟''

میرے سوالات کی بوچھاڑ نے کانسٹیبل کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''جناب! نام اور کام تو اس نے بتایا نہیں۔ اس کی زبان پر بس ایک ہی جملے کی تکرار ہے...... وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں فی الفور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ وہ یہیں فیض آباد ہی کی رہنے والی ہے......''

''فیض آباد کے رہنے والے تو تم بھی ہو آفتاب!'' میں نے گھور کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''پھر اندازہ لگانے کی کیا تک بنتی ہے۔ کیا تم فیض آباد کے وسنیکوں کو اچھی طرح نہیں جانتے؟''

''جانتا ہوں جناب اور ایک ایک بچے بڑے کو پہچانتا بھی ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس عورت نے خود کو خصوصاً چہرے کو ایک چادر میں چھپا رکھا ہے۔ لمبے چوڑے گھونگٹ کے باعث میں اس کی صورت نہیں دیکھ پایا۔ پر اس کی آواز جانی پہچانی محسوس ہوئی ہے جس سے میرے ذہن نے اندازہ لگایا کہ وہ فیض آباد ہی کی رہنے والی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مزید کسی بحث میں پڑے بغیر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تم اس پردہ پوش عورت کو میرے کمرے میں بھیج دو!''

کانسٹیبل آفتاب مجھے سیلیوٹ کر کے واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مذکورہ عورت میرے سامنے موجود تھی۔ اس وقت ہم دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ چادر کو سنبھالتے ہوئے بیٹھ گئی۔ میں چند لمحات تک اس ''تنبو ایکسپریس'' کا بغور جائزہ لیتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں بی بی! بولو، تم کون ہو اور مجھ سے کیا کام ہے؟''

''میں آپ کو ایک اہم بات بتانے آئی ہوں۔'' وہ دھیمے انداز میں بولی۔

اس کی آواز سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی عورت نہیں بلکہ کوئی نوعمر لڑکی ہے۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''کون سی اہم بات...... اور کان کھول کر سن لو، میں تمہارے اس طویل گھونگٹ کے پیچھے سے کچھ نہیں سنوں گا۔ تمہیں کھل کر میرے سامنے آنا ہو گا......!''

''میں یہ چادر ہٹا دوں گی اور اپنا مکمل تعارف کرانے کے بعد بات کروں گی۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''لیکن تھانے دار جی...... اس سے پہلے آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا!''

''کیسا وعدہ؟'' میں نے کڑے انداز میں پوچھا۔

''آپ میری یہاں آمد کے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''میں خوامخواہ خود کو اور اپنے ابا کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں جس طرح چادر میں لپٹی ہوئی یہاں آئی ہوں، اپنی بات کہنے کے بعد اسی طرح پردہ کر کے واپس چلی جاؤں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''میں نہ صرف تمہاری بات سمجھ رہا ہوں بلکہ یہ اندازہ بھی قائم کر چکا ہوں کہ تم جو کچھ بھی مجھے بتانے آئی ہو وہ بہت ہی سنسنی خیز اور تہلکہ مچا دینے والا ہے۔'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جی۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کو جو خاص بات بتانے آئی ہوں اس کا تعلق بڑے چودھری صاحب کی قبر والے معاملے سے ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، میں وعدہ کرتا



ہوں کہ تمہارا راز کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔ اس کے بدلے میں تمہیں بھی وعدہ کرنا ہو گا کہ مجھے چکر دینے کے لیے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لوگی اور...... اب باقی کی باتیں تمہارے چہرے سے چادر ہٹنے کے بعد ہی ہوں گی......!''

''غلط بیانی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ چہرے پر مسلط گھونگٹ کو ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''میں قانون کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ میرے خیال میں بڑے چودھری صاحب کی لاش کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے......!''

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر اس کا چہرہ میرے سامنے طلوع ہو گیا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ بیس سال رہی ہو گی۔ وہ ایک پرکشش اور حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ اس کے حسن اور خوب صورتی کی تعریف کے ذیل میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ شاید پورے فیض آباد میں اس جیسی اور کوئی نہ ہو۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا پھر تصدیقی انداز میں پوچھا۔ ''کیا تم ادھر فیض آباد ہی میں رہتی ہو؟''

''جی ہاں......!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میرا نام زیب النسا ہے لیکن میں پورے گاؤں میں زیبن کے نام سے مشہور ہوں۔ میرا ابا خیر دین فیض آباد کا ایک چھوٹا کاشتکار ہے۔ ہماری دس ایکڑ اراضی ہے۔ میری ماں کا انتقال کوئی پانچ سال پہلے ہو گیا تھا۔ اب گھر میں، میں اور ابا ہی ہیں۔ ابا کو سب لوگ خیرو چاچا کہتے ہیں......''

اس نے ایک ہی سانس میں اپنے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''ٹھیک ہے زیبن...... اب مجھے بتاؤ، تمہارے پاس کیا اطلاع ہے......؟''

''جناب! آپ اس علاقے کے تھانے دار ہیں۔ یہ بات تو آپ کے علم میں ضرور ہو گی کہ پچھلے روز ہمارے گاؤں میں منظور موچی کی بیوی عنایتاں فوت ہو گئی تھی۔ کل ہی سہ پہر میں عنایتاں کی تدفین ہوئی تھی۔''

''ہاں یہ بات مجھے پتا ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن عنایتاں کی موت کا چودھری ظفر علی والے واقعے سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق کچھ اس طرح سے ہے جی۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''کل عنایتاں کی تدفین کے بعد مجھے بھی قبرستان میں جانے کا اتفاق ہوا تھا اور میں نے وہاں ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو ہمارے گاؤں کا رہنے والا نہیں۔ وہ بڑے مشکوک انداز میں قبرستان کے بالائی حصے کا جائزہ لے رہا تھا جیسے اسے وہاں کسی خاص شے کی تلاش ہو۔ جناب، یہ قبرستان کا وہی حصہ ہے،

### کھلا دروازہ

حضرت صالح قزوینی نے ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصریؒ کے سامنے کہا۔ ''جو شخص اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اس کے لیے ضرور کھلتا ہے۔''

یہ سن کر حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ ''وہ دروازہ کون کھٹکھٹاتا ہے اور دروازہ کون کھولے گا؟ پہلے یہ بتاؤ کہ دروازہ بند کس نے کیا ہے جو اس کے کھٹکھٹانے اور کھلنے کی ضرورت پیش آئے۔''

حضرت رابعہؒ کا یہ جواب سن کر حضرت صالح قزوینی نے فوراً کہا۔ ''آج مرد جاہل ٹھہرا اپنی جہالت اور عورت کی دانائی پر بہت تعجب ہوا۔''

چودھری خاندان کے افراد کو جہاں دفن کیا جاتا ہے......''

زیبن نے موضوع کے اعتبار سے بڑی اہم بات کی تھی لیکن وزن کے لحاظ سے یہ بات کافی ہلکی پھلکی نظر آتی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''زیبن! تم نے جس اجنبی بندے کا ذکر کیا ہے اس کا قد کاٹھ اور حلیہ وغیرہ کیسا تھا؟''

''جی...... وہ اچھا لمبا (دراز قامت) اور صحت مند تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''سر کے بال گھونگریالے تھے۔ مونچھیں گھنی اور آنکھیں سرخ۔ اس نے تہ بند کے اوپر ململ کا کرتا پہن رکھا تھا۔ چہرے پر غصہ اور رعب تھا۔''

''زیبن! تمہاری قوت مشاہدہ بہت تیز اور طاقت ور ہے۔''

''جی...... کون سی قوت؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے ''قوت مشاہدہ'' کی وضاحت میں جانے کے بجائے نہایت ہی سادہ الفاظ میں اسے سمجھایا۔ ''میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم نے اس مشکوک بندے کو بڑی توجہ اور غور سے دیکھا تھا......''

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے الجھن آمیز انداز میں پوچھا۔ ''زیبن! تم نے ایک اجنبی مشکوک بندے کو کل قبرستان کے بالائی حصے میں چکراتے دیکھا، یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن تم نے کس بنا پر اس بات کا اندازہ لگایا کہ چودھری ظفر علی کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے افسوس ناک واقعے میں اسی بندے کا ہاتھ ہو سکتا

ہے......؟"

"جی میرے اندازے کی دو وجوہات ہیں۔" زبین مضبوط لہجے میں بولی۔

"کون سی دو وجوہات؟" میں نے پوچھا۔

"نمبر ایک......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "وہ بندہ قبرستان کے اسی حصے میں گھوم رہا تھا جو چودھری خاندان کے لیے مخصوص ہے جبکہ اس کا فیض آباد سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ یہ چونکا دینے والی بات تو ہے نا جی......؟"

زبین نے رک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "بالکل یہ چونکا دینے والی بلکہ ہلا دینے والی بات ہے......" پھر پوچھا۔ "اور دوسری وجہ کیا ہے؟"

"دوسری وجہ جناب...... میرا خواب ہے!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"تمہارا خواب......کیا مطلب؟"

"میں نے اس مشکوک بندے کو قبرستان میں دیکھا اور تھوڑی دیر میں بھول بھال گئی۔" زبین نے بتایا۔ "لیکن پچھلی رات جب میں سوئی تو وہی بندہ مجھے خواب میں بھی نظر آیا...... وہ مجھے خطرناک دھمکی دے رہا تھا......!"

ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ زبین اپنی زبردست اداکاری کے ذریعے مجھے اُلّو بنانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر زبین سے پوچھا۔ "وہ تمہیں کس قسم کی دھمکی دے رہا تھا......؟"

"جناب! وہ اچانک میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے مجھے دھمکی دی...... زبین! تم مجھے نہیں جانتی ہو۔ ہماری کبھی ملاقات نہیں......"

"ایک منٹ......!" میں نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ "تم نے بتایا ہے کہ وہ اچانک تمہارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ تم اس وقت کہاں تھیں......؟"

"جی...... قبرستان کے زیریں حصے میں......" وہ اٹک کر بولی۔

اس کی غلط بیانی کے حوالے سے میرے شک کو تقویت پہنچی۔ میں نے قدرے سخت انداز میں پوچھا۔ "تم قبرستان کے زیریں حصے میں کیا کر رہی تھیں؟"

"جی...... وہ...... میں عنایتاں کی قبر کی طرف سے...... آ رہی تھی......"

"خواب میں نا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں جی......" وہ گڑبڑا گئی پھر سنبھالا لیتے ہوئے بولی۔ "ہاں جی، خواب میں...... میں نے خواب میں دیکھا کہ میں عنایتاں کی قبر کی طرف سے آ رہی ہوں اور وہ آدمی اچانک میرے راستے میں آ جاتا ہے۔ وہ...... وہ مجھے دھمکی دیتا ہے...... دھمکی درج ہے......" وہ رک کر مجھے ایسی نظر سے دیکھنے لگی جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں اس کی بات کا یقین کر رہا ہوں یا نہیں......!

میری چھٹی حس یا اسے کوئی بھی اطلاع کنندہ قوت کہہ لیں...... مجھے دورہ کر بتا رہی تھی کہ زبین اپنے بیان میں کوئی گڑبڑ کر رہی ہے یعنی وہ دروغ گوئی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ میں نے اسے گھیرنے کی خاطر بڑی نرمی سے کہا۔ "ہاں ہاں...... آگے بتاؤ۔ شاباش...... میں تمہاری بات کا یقین کر رہا ہوں زبین۔ وہ اجنبی شخص تمہیں کیا دھمکی دیتا ہے......؟"

"اس نے مجھ سے کہا......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "زبین! تم مجھے نہیں جانتی ہو۔ ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ تم نے آج قبرستان میں کچھ نہیں دیکھا۔ تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی، وغیرہ وغیرہ......"

"اچھا...... تو اس نے تمہیں "زبین" کہہ کر مخاطب کیا تھا!" میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے، وہ پہلے سے تمہارا نام جانتا تھا......؟"

"پہلے سے نہیں جناب......" وہ جلدی سے بولی۔ "جب ہمارا سامنا ہوا تو اس نے سب سے پہلے میرا نام پوچھا تھا۔ میں نے نام بتا دیا تو اس نے پوچھا کہ میں آدھی رات کو قبرستان میں کیا کر رہی ہوں؟ میں نے صاف صاف بتا دیا کہ عنایتاں کی قبر کی طرف سے آ رہی ہوں۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ مجھ جیسی حسین و جمیل لڑکی کو، آدھی رات کے وقت یوں اکیلے قبرستان میں نہیں آنا چاہیے تھا......" وہ سانس درست کرنے کے لیے لمحے بھر کو تھمی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے اس کو یقین دلایا کہ میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔ اس کے بعد ہی اس نے مجھے خطرناک دھمکیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ اگر میں نے اس کی باتوں کو یاد نہ رکھا تو میرا بہت برا حشر ہوگا......!"

"پھر کیا ہوا......؟" وہ رکی تو میں نے استفسار کیا۔

"پھر علی مراد قبرستان کے بالائی حصے کی طرف چلا گیا تھا۔"

"علی مراد...... تو کیا اس بندے نے تمہیں اپنا نام بھی بتا دیا تھا؟"

"اس نے نہیں جی...... اس کے ساتھی نے......!" زبین نے ایک اور انکشاف کیا۔

"ساتھی؟" میرا اضطراب دو چند ہو گیا۔ "کیا اس کا کوئی ساتھی بھی وہاں موجود تھا؟"

"نہیں جی...... ہاں جی......" وہ کنفیوژ انداز میں بولی۔

"زبین......!" میں نے خطرناک نظر سے اسے گھورا۔

وہ میری نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "جناب! نہ تو علی مراد نے مجھے اپنا نام بتایا تھا اور نہ ہی میں نے اس کے کسی ساتھی کو اپنی آنکھوں سے وہاں دیکھا تھا۔ وہ کچھ اس طرح ہوا تھا کہ......" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بتایا۔

"جب علی مراد مجھے خطرناک دھمکیاں دے رہا تھا، اسی وقت قبرستان کے بالائی حصے سے ایک کرخت مردانہ آواز ابھری تھی...... "اوئے علی مراد...... تو کب تک وہاں کھڑا رہے گا؟" اس پکار سے مجھے پتا چلا کہ مجھے دھمکانے والے اس بندے کا نام علی مراد ہے اور پکارنے والا علی مراد کا کوئی ساتھی۔ علی مراد نے جواب میں کہا تھا...... "میں آ رہا ہوں۔" اور پھر وہ واقعی قبرستان کے بالائی حصے کی طرف چلا گیا تھا......"

"وہ قبرستان کے بالائی حصے کی طرف چلا گیا تھا۔" میں نے بے یقین نظر سے اسے گھورا۔ "اور زبین...... تم؟"

"میں اپنے گھر آ گئی تھی......!"

"جب تم گھر پہنچیں تو کیا تمہارا ابا خیر دین جاگ رہا تھا؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے بے دھیانی میں، میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم رکھتے ہوئے سر کو نفی جنبش دی۔ "ابا گہری نیند کا مزہ لے رہا تھا۔ میں اسے جیسا چھوڑ کر گئی تھی وہ ویسا ہی پڑا سو رہا تھا۔"

"پھر تم نے کیا، کیا؟" میں نے اپنے جال کو دھیرے دھیرے سمیٹنا شروع کر دیا۔

"میں اپنی چارپائی پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔" وہ اپنی ہی رو میں بولتی چلی گئی۔ "لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ آنکھیں بند کرتی تو علی مراد اپنی خوفناک سرخ سرخ آنکھوں سے گھور کر دھمکی دینے لگتا اور میں ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتی۔ اسی ادھیڑ بن میں بارش شروع ہو گئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ہماری چارپائیاں برآمدے میں بچھی ہوئی تھیں......" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی، اپنی ناہموار سانس کو درست کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"ورنہ اگر میری واپسی سے پہلے بارش ہو جاتی تو ابا کی آنکھ کھلنا لازمی بات تھی۔ اس طرح میرا بھانڈا پھوٹ جاتا اور ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی میرے لیے......"

"ظاہر ہے، خیر دین تم سے پوچھتا کہ آدھی رات کو کہاں گئی تھیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے اسے الفاظ کی ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اپنے ابا کو اصل بات نہ بتاتیں تو واقعی تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جاتی اور...... اصل بات تو تم کسی کو بتانے والی نہیں تھیں۔ وہ تو ایک گہرا راز تھا...... ایک ایسا اہم کام تھا جس نے تمہیں آدھی رات کو عنایتاں کی قبر پر جانے پر مجبور کر دیا تھا...... ہے نا؟"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں کسی اہم کام سے قبرستان گئی تھی......؟" وہ چونک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں ایک اندازے کی بنا پر میں نے جو تیر چھوڑا تھا وہ جا کر نشانے پر لگا تھا۔

میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا بلکہ یہ بات میں نے اپنے پیشہ ورانہ تجربے کی روشنی میں اخذ کی ہے۔ کیا میرا اندازہ غلط ہے؟ کیا کوئی جوان لڑکی آدھی رات کے وقت بغیر کسی کام کے اکیلی قبرستان میں جاتی ہے......؟"

"نہیں جی...... بالکل نہیں......" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"زبین!" میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔ "تم نے تو یہ سب کچھ خواب میں دیکھا تھا......؟"

"آں...... ہاں...... نہیں......!" وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر مجھے تکنے لگی۔

"میں نے تم سے ابتدا ہی میں کہہ دیا تھا کہ مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرنا۔" میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ "لیکن میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم اتنی دیر سے مسلسل جھوٹ بول رہی ہو۔ تمہاری عمر اور جوانی کو دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے کہ اس جھوٹ اور غلط بیانی کی سزا کے لیے جب میں تمہیں تفتیش کی چکی میں پیسوں گا تو تمہارا کیا حشر ہوگا......!"

"تھانے دار جی...... مجھ سے غلطی ہو گئی۔" وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ "میری نیت صاف ہے جناب۔ میں نے ہر بات جھوٹ نہیں کی...... بس وہ خواب والی بات ایک بہانہ تھی تاکہ آپ کو یہ بتانہ چلے کہ میں کس مقصد سے قبرستان گئی تھی...... آپ مجھے معاف کر دیں جی......" اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے پھر منت ریز لہجے میں بولی۔ "اگر آپ مجھے کوئی سزا نہ دیں تو میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی۔"

"جیسا سچ پہلے بتایا ہے...... ہیں نا؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "میری توبہ جی...... اگر میں اب ایک لفظ بھی جھوٹ بولوں تو مجھے ابھی یہاں بیٹھے بیٹھے موت آ جائے۔ آپ میری بات کا اعتبار کریں جی...... مجھے صفائی کا ایک موقع تو دیں جناب......!"

"ٹھیک ہے زبین!" اس کی منت، خوشامد اور معافی تلافی کو دیکھتے ہوئے میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے جو کچھ کیا، جو کچھ کہا...... اسے میں تمہاری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کرتا ہوں۔ اب مجھے بتاؤ...... اس قبرستان والے معاملے کی حقیقت کیا ہے......؟"

وہ نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھے بتانے لگی کہ وہ اپنی کسی غرض سے قبرستان گئی تھی کہ علی مراد سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ میں زیب النسا عرف زبین کی کتھا کو نہایت ہی مختصر الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کہانی میں زبین کے کردار کی اہمیت سے آگاہ ہوجائیں۔

حالات وواقعات کے مطابق وہ پاگل کی بچی یعنی زبین ایک لڑکے کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اکرم عرف گوگا فیض آباد ہی کے ایک زمیندار ملک امین کا بیٹا تھا۔ یہ یک طرفہ محبت تھی کیونکہ گوگا کو زبین کے جذبات کی بالکل پروا نہیں تھی۔ وہ کسی شبنم عرف شبو کے چکر میں پھنسا ہوا تھا مگر یہ ہر قیمت پر گوگا کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔

زبین کی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے اپنی ایک سہیلی فہمیدہ عرف رانو کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ رانو شادی شدہ تھی۔ وہ زبین کو اپنے ساتھ ایک پیر صاحب کے پاس لے گئی۔ پیر جمن شاہ کا آستانہ فیض آباد گاؤں کے آخر میں کھیتوں سے لگا ہوا تھا۔ پیر صاحب نے زبین کا مسئلہ پوری توجہ سے سنا اور اسے ایک تعویذ بنا کر دیا۔ یہ تعویذ منگل اور بدھ کی درمیانی رات کسی قبر کے اندر دفن کرنا تھا۔ اتفاق سے اس روز منگل تھا اور آنے والی رات بدھ کی تھی۔ مزید اتفاق یہ کہ اسی شام عنایتاں نامی ایک عورت کی تدفین ہوئی تھی۔ عنایتاں کی قبر تازہ تازہ بنی تھی لہٰذا زبین کا کام آسان ہوگیا۔ پیر جمن شاہ نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر اس نے آج کی رات تعویذ کو کسی قبر میں دفن کردیا تو دس دن کے اندر گوگا اس کی طرف مائل ہوجائے گا۔

مجھے مذکورہ تھانے میں تعینات ہوئے لگ بھگ ایک سال ہوا تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی تھی کہ میں جس بھی علاقے میں محکمہ جاتی خدمات انجام دینے جاتا تھا، وہاں موجود پیروں کو کچھ عرصہ اپنی خفیہ نگرانی میں رکھتا تھا۔ تاحال مذکورہ پیر جمن کی طرف سے مجھے کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔ زبین والے معاملے کے بعد دیکھنا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ دنیا میں اچھے برے ہر قسم کے لوگ موجود ہیں لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ آستانے سجا کر بیٹھنے والے پیروں میں سے اکثریت فراڈ لوگوں کی ہوتی ہے اور آپ نے میری مختلف کہانیوں میں ایسے فراڈ پیروں کا قلع قمع ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ یہ میں نقلی اور ڈبا پیروں کی بات کررہا ہوں ورنہ اس دنیا میں اللہ کے سچے دوست بھی بستے ہیں اور وہ بلاغرض مخلوقِ خدا کی ہر نوعیت کی دست گیری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

زبین منگل اور بدھ کی درمیانی رات، پیر جمن شاہ کے دیے ہوئے تعویذ کو عنایتاں کی قبر میں دفن کرنے کے لیے قبرستان پہنچ گئی۔ یہ وہی رات تھی جب چودھری ظفر علی کی قبر کے ساتھ مذموم چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔ زبین اپنا کام کرنے کے بعد جب واپس آرہی تھی تو راستے میں علی مراد نامی اس آدمی سے ملاقات ہوگئی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ قبرستان میں کسی غیر کی موجودگی کو محسوس کرکے علی مراد صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے قبرستان کے زیریں حصے کی طرف آگیا ہوگا۔ وہ اپنے کسی ساتھی یا ساتھیوں کے ساتھ قبرستان کے بالائی حصے میں چودھری ظفر علی کی قبر کے ساتھ مصروف رہا ہوگا۔ زبین کو نصیحت وہدایت وغیرہ کرنے کے بعد وہ اپنے ساتھی کی پکار پر واپس قبرستان کے بالائی حصے کی طرف چلا گیا تھا۔

زبین کا انکشاف ہر لحاظ سے نہایت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ میں نے علی مراد نامی اس نامراد شخص کا قد کاٹھ اور حلیہ اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔ اگر کسی طرح میں علی مراد تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو یہ کیس حل کرنے میں پھر ہینگ لگتی اور نہ پھٹکری...... رنگ بھی چوکھا آتا!

اب چونکہ زبین سارے داؤ گھماؤ بھول کر راہِ راست آگئی تھی اور اس نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ کردیا تھا اس لیے میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اسے مزید کریدا۔

"زبین! تم اب مجھے یہ ساری باتیں بتا رہی ہو جبکہ تمہارا فرض بنتا تھا کہ اگلی صبح فوراً تھانے آکر مجھے اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کرتیں......؟"

"میں اپنے "تعویذ نبانے" والے معاملے کی وجہ سے چپ ہوکر بیٹھ گئی تھی۔" اس نے سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس راز کو کسی کے سامنے کھولنا نہیں چاہتی تھی لیکن جب اگلی صبح مجھے پتا چلا کہ......" بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بتانا شروع کیا۔

"آج صبح جب بڑے چودھری صاحب کی قبر والا واقعہ سامنے آیا تو میرا دھیان فوراً اس سرخ آنکھوں والے علی مراد کی طرف چلا گیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ مذموم کارروائی علی مراد اور اس کے کسی ساتھی ہی نے کی ہے۔ میں چودھری صاحب کا بڑا احترام کرتی تھی۔ میں کیا...... گاؤں کا ہر چھوٹا بڑا ان کی عزت کرتا تھا جی۔ ظالموں نے چودھری صاحب کے ساتھ کتنی زیادتی کی ہے۔ وہ ان کی لاش کے دونوں ہاتھ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے......"

وہ بولتے بولتے آبدیدہ ہوگئی۔ یہ اس کے سچے جذبات تھے جو وہ چودھری ظفر علی کے لیے اپنے دل میں رکھتی تھی۔ اسی نوعیت کے جذبات میں نے تقریباً ہر شخص میں دیکھے اور محسوس کیے تھے۔ میں نے جب زبین سے مزید کوئی سوال نہ کیا تو چند لمحات کے بعد وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چودھری صاحب والے واقعے نے مجھے مجبور کردیا کہ میں آکر آپ سے ملوں اور پچھلی رات قبرستان میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں آپ کو بتاؤں۔ میں نے ابا تک کو نہیں بتایا کہ میں کیا جاتی ہوں اور کہاں جارہی ہوں۔ اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ میرے بارے میں آپ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے......"

"میں اپنے وعدے کا پاس کروں گا زبین!" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "تم بالکل بے فکر ہوجاؤ۔"

"آپ سے ایک درخواست ہے تھانے دار جی......" اس نے ملتجی بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

"ہاں ہاں...... کہو......؟" میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اس نے کہا۔ "میری یہ خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد ان مجرموں کو گرفتار کرکے عبرت ناک سزا دلوائیں جنھوں نے چودھری صاحب کے ساتھ یہ بھیانک مذاق کیا ہے......!"

"بالکل ایسا ہی ہوگا اور...... بہت جلد ہوگا!" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

وہ رنجیدہ سی ہوگئی۔ "تھانے دار جی! آپ کو پتا نہیں ہے، چودھری صاحب کتنے اچھے، کتنے نیک انسان تھے۔ انھیں اپنے گاؤں کی عزت اور حفاظت کا بڑا خیال تھا۔ وہ اس گاؤں کی طرف میلی نگاہ سے دیکھنے والوں کی آنکھیں نکال لیا کرتے تھے۔ مجھے نرگس والا واقعہ اب بھی یاد ہے۔ چودھری صاحب نے بڑھاپے میں بھی جوانوں سے زیادہ ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ کتنی عزت کرتے تھے وہ گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں کی......"

میں نے روا روی میں پوچھ لیا۔ "یہ نرگس کون ہے اور مرحوم چودھری نے کس قسم کی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا؟"

"یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے جناب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ "نرگس گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ، بیری والے کھوہ پر پانی بھر رہی تھی کہ ایک آوارہ نوجوان گھوڑے پر سوار ادھر آنکلا۔ اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ نرگس ہمارے گاؤں کی البیلی مٹیار اور بانکی نار تھی......"

"تھی کیا مطلب؟" میں نے پوچھ لیا۔

"مطلب یہ جی کہ نرگس اب اس گاؤں میں نہیں رہتی۔"


ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مئی 2011ء
کے شمارے کی
پربہار رنگینیاں

موت کے سائے
ان اگنت خزانوں کی مالک سرزمین پاک پر دست دشمن کی یلغار کا سنسنی خیز احوال **منظر امام** کے قلم سے

للکار
ہندوستان کی دیومالائی سرزمین سے وابستہ ناقابل فراموش حقائق...... جہاں قدم قدم پہ موت پیہ پھیلائے کھڑی تھی
**طاہر جاوید مغل** کا پرہنگام سلسلہ

گرداب
نفرتوں اور سازشوں کے بند توڑتی طوفانی محبت اور مکروہ عزائم رکھنے والوں کی سنگین عداوت
**اسما قادری** کی عبرت اثر داستان

سرورق کے رنگ
تاوان
اس شخص کی کتھا جو تاوان کی زد میں آگیا تھا...... **کاشف زبیر** کی پراثر تحریر

دلدل
جدیدیت اور دم توڑتی قدامت کا امتزاج
**احمد اقبال** کے تیکھے وانوکھے انداز بیان میں

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں...
...اور نئی نئی دلچسپ باتیں... تحائف

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”چھ ماہ پہلے اس کی شادی ہوگئی۔ وہ بیاہ کر فیض آباد سے چک جھمرا چلی گئی ہے.....!“

”اچھا.....“ میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ”تم مجھے چوہدری ظفر علی کی بہادری کے بارے میں بتا رہی تھیں.....!“

”میں نے جس گھڑسوار نوجوان کا ذکر کیا ہے نا جی، وہ کوئی بہت ہی آوارہ اور لچا تھا۔“ وہ بتانے لگی۔ ”اس کی نظر نرگس پر ٹک گئی پھر وہ بڑی دیدہ دلیری سے نرگس کے ساتھ بے ہودہ مذاق کرنے لگا۔ دوسری لڑکیوں اور عورتوں نے شور مچا دیا۔ اتفاق سے بڑے چوہدری صاحب کا ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے جب یہ تماشا دیکھا تو اس لفنگے نوجوان کی خوب خبر لی۔ برا بھلا کہتا تو رہا ایک طرف، چوہدری صاحب نے باقاعدہ اس کے منہ پر طمانچے بھی مارے تھے۔ وہ ایسا خوف زدہ ہوا کہ پھر اس کو دم دبا کر بھاگتے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی۔ دیکھا آپ نے تھانے دار جی.....“ وہ لمحے بھر کے لیے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”چوہدری صاحب کو اپنے گاؤں اور یہاں کی عورتوں کی عزت کا کتنا خیال تھا.....!“

زبین نے نرگس کے حوالے سے جو کہانی سنائی تھی، اس میں میرے لیے دو چیزیں بہت اہم تھیں۔ نمبر ایک..... چوہدری ظفر علی نے طیش کے عالم میں کسی آوارہ نوجوان کی پٹائی کر دی تھی۔ جبہ اس بدمزگی کی کوئی بھی رہی ہو لیکن یہ طے تھا کہ اس واقعے نے مذکورہ نوجوان کے دل و دماغ کو چوہدری کے لیے نفرت اور غصے سے بھر دیا ہوگا۔ نمبر دو..... یہ افسوس ناک واقعہ بیری والے کھوہ پر پیش آیا تھا۔

اس کیس کی کڑیاں خود بہ خود جڑ کر ایک زنجیر کی شکل اختیار کرتی چلی جا رہی تھیں۔ چوہدری ظفر علی کی قبر اور نام نہاد لاش کے ساتھ گزشتہ رات جو شرم ناک واقعہ پیش آیا تھا، اس کی حقیقت کی تہ میں اترنے کے لیے مجھے دو سیڑھیوں کی ضرورت تھی۔ سیڑھی نمبر ایک..... مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی، چوہدری کے ہاتھوں جسے ماضی میں کوئی نقصان پہنچا ہو اور اس بنا پر وہ چوہدری سے نفرت کرنے لگا ہو۔ سیڑھی نمبر دو..... اس نفرت اور نقصان کا کوئی نہ کوئی تعلق بیری والے کھوہ سے ہونا چاہیے۔ زبین نے مجھے ابھی نرگس کی جو کہانی سنائی تھی اس میں میرے دونوں مطلوبہ عناصر پائے جاتے تھے۔ میں نے زبین پر کچھ ظاہر کیے بغیر آہستہ آہستہ اسے گھسنا شروع کیا۔

”زبین! جب چوہدری صاحب نے اس اوباش نوجوان کو تھپڑ مارے تو کیا تم بھی بیری والے کھوہ پر موجود تھیں؟“

”نہیں جی، میں اس وقت اپنے گھر میں تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے اس واقعے کے بارے میں بعد میں پتا چلا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے، تم نے اس لفنگے نوجوان کو نہیں دیکھا تھا؟“

”جی نہیں.....“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ فیض آباد ہی کا وسنیک تھا؟“

”نہیں جی، وہ منحوس یہاں کا رہنے والا نہیں تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ نے دیکھا ہے، بیری والا کھوہ گاؤں سے باہر ہے۔ وہ ادھر سے گزر رہا ہوگا۔ کھوہ پر لڑکیوں بالیوں کو پانی بھرتے دیکھا تو اس کی نیت میں فتور آ گیا لیکن چوہدری صاحب نے اس شیطان کو ایسا سبق سکھایا کہ پھر کبھی بھول کر بھی فیض آباد کی طرف آنے کی جرأت نہیں کی.....!“

”تم نے پچھلی رات قبرستان میں جس علی مراد کو دیکھا تھا، کیا خیال ہے..... یہ وہی آوارہ نوجوان تو نہیں تھا جسے ایک سال پہلے چوہدری ظفر علی نے بیری والے کھوہ پر طمانچے مار کر بری طرح ذلیل کیا تھا؟“

”میرا خیال ہے..... علی مراد وہ نہیں تھا۔“ وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔

”تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ”تم نے تو گھڑسوار آوارہ نوجوان کو دیکھا ہی نہیں تھا؟“

”یہ ٹھیک ہے، میں نے اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔“ وہ وضاحتی لہجے میں بولی۔ ”لیکن محمودہ نے اتنی وضاحت سے اس کا حلیہ بیان کیا تھا کہ میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔ اگر علی مراد وہی نوجوان ہوتا تو میں دیکھتے ہی اسے پہچان جاتی.....“

”تم نے ابھی محمودہ کا ذکر کیا ہے، یہ کون ہے؟“

”محمودہ، صدیق لوہار کی بیوی ہے۔“ زبین نے بتایا۔ ”محمودہ اس وقت بیری والے کھوہ پر موجود تھی جب چوہدری صاحب نے اس بدتمیز نوجوان کی پٹائی کی تھی۔ محمودہ نے اس کمینے کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”محمودہ نے بدتمیز نوجوان کا حلیہ کیسا بیان کیا تھا؟“

”محمودہ کے مطابق وہ پستہ قامت تھا۔ رنگت گندمی اور جسم بھاری۔ اس نے ہلکی اور پتلی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور اس کے بائیں گال پر چنے کے برابر ایک سیاہ مسا تھا جبکہ علی مراد کا حلیہ اور وضع قطع اس سے بالکل مختلف تھی۔“

میں نے نامعلوم آوارہ نوجوان کے حلیے سے متعلق تمام تر اہم پوائنٹس کو اپنے ذہن میں محفوظ کیا اور زبین سے پوچھا۔ ”تم



نے پچھلی رات جب علی مراد کو کسی پُراسرار سرگرمی میں مصروف دیکھا تو تمہارے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ وہ آخر ہے کون اور آدھی رات کو قبرستان کے بالائی حصے میں وہ اور اس کا ساتھی کیا کرتے پھر رہے ہیں؟“

”جی، میرے ذہن میں فوراً یہ سوال ابھرا تھا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اور میں نے علی مراد سے اس بارے میں پوچھا بھی تھا.....“

”پھر اس نے کیا جواب دیا؟“ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

”اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گورکن کرامت علی کا بھتیجا ہے جو موضع دھرم پورہ کا رہنے والا ہے۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے اٹھ کر قبرستان میں ٹہلنے لگا۔ پھر جب اس نے مجھے قبرستان کے زیریں حصے میں سے گزرتے ہوئے دیکھا تو وہ ادھر آ گیا.....“ وہ چند لمحات کے لیے تھمی، ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”میں گورکن اور اس کے رشتے داروں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی اس لیے مجھے سرخ آنکھوں والے اس شخص کی بات کا یقین آ گیا پھر جب قبرستان کے بالائی حصے سے یہ آواز ابھری کہ..... ”اوئے علی مراد..... تو کب تک ادھر کھڑا رہے گا؟“ تو میں یہی سمجھی کہ گورکن نے اسے پکارا ہے۔ علی مراد..... ”میں آ رہا ہوں۔“ کہتے ہوئے قبرستان کے بالائی حصے کی طرف چلا گیا تو میں جلدی سے اپنے گھر آ گئی لیکن جب دوسری صبح یعنی آج صبح چوہدری صاحب والے واقعے کی خبر عام ہوئی تو میں سمجھی کہ علی مراد گورکن کا بھتیجا نہیں تھا بلکہ وہ ان مجرموں کا ساتھی تھا جنہوں نے چوہدری صاحب کی قبر اور لاش کی بے حرمتی کی تھی.....!“

”تمہارا بہت بہت شکریہ زبین!“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس پُراسرار کیس کو حل کرنے کے سلسلے میں پورے فیض آباد نے مل کر میری اتنی مدد نہیں کی جتنا تعاون تم نے کیا ہے۔ اب تم بے فکر ہو کر گھر چلی جاؤ۔ میں تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اگر دوبارہ تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئی تو انتہائی احتیاط سے تم سے ملاقات کروں گا کہ کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ تم اس حوالے سے بالکل مطمئن ہو کر جاؤ کہ اس کیس میں کہیں تمہارا نام نہیں آئے گا اور نہ ہی میں تمہارے تعویذ والے راز کا کسی سے ذکر کروں گا۔“

وہ ممنونیت بھری نظر سے یک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر بڑے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”تھانے دار جی! چوہدری صاحب کے مجرم پکڑے جائیں گے نا.....؟“

”کیوں نہیں!“ میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ”دو چار دن میں نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ میں ان بدبختوں کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔“

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئی۔

اس رات میں سونے سے پہلے دو افراد کے حلیوں کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا رہا۔ نمبر ایک، علی مراد..... دراز قامت، گھونگریالے بال، گھنی مونچھیں، رنگت سانولی۔ آنکھیں سرخ، وغیرہ وغیرہ۔ نمبر دو، بدتمیز نوجوان..... جسم فربہ، رنگت گندمی، قد پستہ، ہلکی اور پتلی مونچھیں، کان بڑے بڑے اور بائیں گال پر سیاہ مسا..... یہ دونوں افراد دو مختلف شخصیات تھیں اور مجھے بڑی شدومد سے ان کی تلاش تھی۔ ان میں سے کوئی ایک بھی میرے ہتھے چڑھ جاتا تو میں چوہدری ظفر علی کے مجرموں کی گردنیں ناپ سکتا تھا۔

انہی منصوبہ جاتی سوچوں سے الجھتے ہوئے میں سو گیا۔

☆☆☆

گزشتہ رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی لیکن صبح جب میں سو کر اٹھا تو مطلع صاف تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا اور اے ایس آئی فاروق کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ مجھ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔

”ہاں بھئی فاروق! ماسی جیراں کی طرف کیا خیر خبر ہے؟“

”وہ کام سے لگی ہوئی ہے جناب!“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ”آج دوپہر تک کسی خبر کی امید کی جا سکتی ہے۔ ابھی تک تو صرف یہی پتا چل سکا ہے کہ گزشتہ روز کون بندہ گاؤں سے باہر تھا.....!“

”کون؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا۔

”گوگا.....!“ اس نے بتایا۔ ”ملک امین کا لڑکا اکرم عرف گوگا۔“

مجھے فوراً یاد آ گیا کہ یہ وہی گوگا تھا جس کی محبت اور حصول نے زبین کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ گوگا کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ہر حد کو پھلانگ گئی تھی حتیٰ کہ وہ پیر جمن شاہ کا دیا ہوا تعویذ قبر میں دبانے کی غرض سے آدھی رات کو اکیلی قبرستان پہنچ گئی تھی۔ میں نے اے ایس آئی فاروق سے زبین کا کوئی ذکر نہ کیا اور گوگا کے بارے میں پوچھا۔

”کیا پتا چلا ہے گوگا کا..... وہ کہاں گیا ہوا تھا؟“

”ماسی جیراں کی رپورٹ کے مطابق گوگا منگل کی دوپہر اپنے ایک دوست اصغر جٹ سے ملنے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) گیا تھا۔ اس کی واپسی کل رات کو ہوئی ہے۔“ فاروق احمد نے بتایا۔ ”اس امر کی تصدیق گوگا کے باپ ملک امین نے بھی کی ہے کہ ادھر لائل پور میں گوگا کا ایک یار بیلی اصغر جٹ رہتا ہے۔ مہینے میں ایک آدھ بار گوگا اس سے ملنے جاتا رہتا ہے اور کبھی اصغر

جٹ، گوگا سے ملنے یہاں فیض آباد آجاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے فاروق! اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم گوگا کو بعد میں چیک کریں گے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "فی الحال ایک اور اہم کام نکل آیا ہے....."

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "کون سا کام ملک صاحب؟"

میں نے اسے نہایت ہی مختصر الفاظ میں چودھری ظفر علی مرحوم اور اس بدتمیز نوجوان کے درمیان ایک سال قبل بیری والے کھوہ پر ہونے والی بدمزگی کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "یہ میں معلوم کر چکا ہوں کہ اس گھڑسوار، اکھڑ مزاج نوجوان کا تعلق فیض آباد سے نہیں۔ اب تمہیں ماسی جیراں کی مدد سے یہ سراغ لگانا ہے کہ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس نے نرگس پر بری نگاہ کیوں ڈالی؟ چودھری ظفر علی کے طمانچوں کے جواب میں اس نے کوئی شدید ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے خاموشی سے واپسی کی راہ کیوں اختیار کی؟ اور اگر اب اس اوباش نوجوان کو تلاش کرنا ہو تو ہم کدھر کا رخ کریں، وغیرہ وغیرہ....؟"

"میرا خیال ہے، یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔" میری پوری بات توجہ سے سننے کے بعد فاروق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "فیض آباد کا کوئی نہ کوئی بندہ تو اس گھڑسوار کو جانتا ہی ہوگا اور اگر وہیں سے بھی اس نوجوان کا سراغ نہیں ملتا تو پھر چودھری شہادت علی تو ہے ہی نا.....!"

"چودھری شہادت علی؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے فاروق کو دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اگر چودھری ظفر علی اس بندے کو جانتا ہوگا تو اس نے گھر آکر شہادت علی سے اس کا ذکر ضرور کیا ہوگا۔ نرگس والا معاملہ کوئی چھوٹا موٹا واقعہ نہیں تھا۔ جب گاؤں کے بیشتر افراد اس سے واقف ہیں تو چودھری شہادت علی کیوں نہیں.....؟"

"تمہارا پوائنٹ جان دار ہے فاروق!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم گاؤں کے دیگر افراد کے ساتھ ساتھ چودھری شہادت علی کو بھی ضرور چیک کرو اور اسی سلسلے میں، میں تمہیں ایک ٹپ بھی دینا چاہوں گا۔ اگر میں نے یہ کام تمہیں سونپا ہے تو تمہاری راہ نمائی اور مدد کرنا بھی لازم ہے....."

"جی حکم ملک صاحب!" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے کیا ٹپ دینا چاہیں گے؟"

"فیض آباد گاؤں میں ایک شخص رہتا ہے، صدیق لوہار....." میں نے اسے بتایا۔ "اس کی بیوی محمودہ ان لڑکیوں اور عورتوں میں شامل تھی جو ایک سال پہلے نرگس کے ساتھ بیری والے کھوہ پر پانی بھر رہی تھیں۔ چودھری ظفر علی کی جرأت اور بہادری کے مظاہرے کو محمودہ نے بڑی تفصیل سے دیکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، محمودہ کو اس اجنبی گھڑسوار کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات ہوں گی....." میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"عورت، مرد کی بہ نسبت زیادہ متجسس ہوتی ہے اور اگر اس کی نگاہ کے سامنے کوئی سنسنی خیز واقعہ پیش آجائے تو اس کے حوالے سے اسے کچھ زیادہ ہی کرید ہوتی ہے۔ اگر..... بہ فرض محال اس موقعے پر محمودہ اجنبی گھڑسوار کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی تو یقیناً بعد میں اس نے اِدھر اُدھر سے کھوج لگا کر اس بے غیرت کے بارے میں اچھی خاصی معلومات جمع کر لی ہوں گی۔"

"ملک صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں دوسرے لوگوں کے علاوہ محمودہ کو بھی خاص طور پر چیک کروں گا۔ انشاءاللہ! شام سے پہلے میں آپ کو رزلٹ دوں گا..... تسلی بخش رزلٹ جناب!"

"انشاءاللہ!" میں نے صدق دل سے کہا۔ "اور شام کو میں تمہیں اسی نوعیت کے ایک دو کام اور دوں گا....."

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "ایک کام تو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا ہو سکتا ہے، گورکن کے انٹرویو کے بعد سامنے آجائے۔ میں ابھی سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہو رہا ہوں۔"

"اوہ.....!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! آپ بے فکر ہو جائیں۔"

اور میں واقعی بے فکر ہو کر تھانے سے نکل پڑا.....!

☆☆☆

فاروق سے میں نے اپنے ہاتھ میں جس ایک کام کے ہونے کا ذکر کیا تھا اس کا تعلق علی مراد سے تھا۔ گھڑسوار بے غیرت نوجوان کا مسئلہ حل ہو جاتا تو پھر میں علی مراد کی تحقیق کا کام فاروق کے سپرد کرتا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے امید تھی کہ گورکن کی زبان سے بھی چند سنسنی خیز انکشافات ہوں گے۔ اس نے علی مراد کے ساتھی یا ساتھیوں کی شکلیں ضرور دیکھی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے، وہ ان میں سے کسی کو پہچانتا بھی ہو۔ اگر پہچانتا نہ بھی ہو تو کم از کم ان کے حلیے اور وضع قطع کے بارے میں تو وہ بتا ہی سکتا تھا۔ مجھے اس سے بھی مدد ملنی تھی۔

میں اسپتال پہنچا تو پتا چلا، گورکن کو مکمل ہوش آگیا تھا اور اس کی طبیعت بھی پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میں سیدھا وارڈ میں چلا گیا۔ کانسٹیبل جمیل بڑی تندہی سے ڈیوٹی دے رہا تھا۔ وہ گورکن



والے بیڈ کے نزدیک ہی ایک اسٹول پر بیٹھا تھا جبکہ گورکن آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔

کانسٹیبل مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے سیلوٹ کیا اور اٹینشن ہو گیا۔ میں نے گورکن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا چاچا کرامت سو رہا ہے؟"

"نہیں جی، آنکھیں بند کیے لیٹا ہے۔" کانسٹیبل نے بتایا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔"

اسی لمحے گورکن نے آنکھیں کھول دیں۔

"دیکھو..... تھانے دار صاحب آئے ہیں۔" کانسٹیبل نے گورکن کی توجہ میری جانب مبذول کرانے کی کوشش کی۔

کرامت علی کی مجھ پر نگاہ پڑی تو اس نے بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کی کوشش کو "ناکام" بنا دیا اور بہ آہستگی اسے دوبارہ بستر پر لٹانے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اٹھنے کی ضرورت نہیں کرامت علی۔ تم آرام اور سکون سے لیٹو۔ مجھے تم سے جو بھی پوچھنا ہوگا، ایسے ہی پوچھ لوں گا۔"

وہ احسان مندانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اسی اسٹول پر بیٹھتے ہوئے گورکن سے پوچھا۔ "کرامت علی، اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"اللہ کے کرم سے جان بچ گئی ہے جناب۔" وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ "چوٹوں کا کیا ہے، یہ بھی آہستہ آہستہ ٹھیک ہو ہی جائیں گی۔"

"تمہیں بات کرنے میں کوئی دقت تو محسوس نہیں ہو رہی؟"

"نہیں جناب! اب میں اتنا بھی نرم جان نہیں ہوں۔" وہ قدرے مضبوط لہجے میں بولا۔ "ساری زندگی مردوں کو قبروں پر اتارتے ہوئے گزری ہے۔ دل اور دماغ جیسے پتھر کے ہو گئے ہیں اور ویسے ایک اور بات بھی ہے....."

"وہ "اور بات" کون سی ہے.....؟"

"تھانے دار جی! جس کا ڈن یا (دنیا) میں کوئی نہیں ہوتا وہ بڑا سخت جان ہوتا ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "رشتے ناتے اور قریبی تعلقات انسان کو بڑا کمزور کر دیتے ہیں۔"

"جیسے تمہارے ایک بھتیجے نے تمہیں کمزور کر کے اسپتال پہنچا دیا ہے..... ہیں نا؟"

"میرا بھتیجا..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سرکار؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں ہلکی پھلکی تفریحی گفتگو سے اس کی مزاج پرسی کر رہا تھا۔

## جہالت کی تاریکی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چند لوگ ہندوستان سے ایک ہاتھی کسی ایسے ملک میں لے گئے جہاں پہلے کسی نے ہاتھی دیکھا ہی نہ تھا۔ ہاتھی کو ایک تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ لوگوں کو اس بات کا علم ہوا تو اس کمرے کے باہر ہجوم جمع ہو گیا۔ کمرا تاریک اور ہاتھی سیاہ کسی کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لوگوں نے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر یہ اندازہ لگانا چاہا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ جس شخص کا ہاتھی کے جسم کے کسی حصے پر ہاتھ لگتا وہ اسی سے ہاتھی کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنا لیتا۔ جس کا ہاتھ کان پر پڑا اس نے کہا یہ بہت بڑے پنکھے جیسا ہے، جس نے ہاتھی کی پیٹھ کو چھوا اس نے کہا یہ تخت کی طرح ہے، جس نے ہاتھی کے پاؤں اور ٹانگوں کو چھوا تھا اس نے اعلان کیا۔ "یہ تو ستون جیسا ہے۔"

ہر شخص نے ہاتھی کو جیسا ٹٹول کر دیکھا ویسا بتایا۔ کسی نے کہا الف ہے کسی نے اسے ب کہا مگر ہاتھی کی ابجد سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ البتہ ان کے ہاتھوں میں روشنی کے لیے شمع ہوتی تو سب کی ایک رائے ہوتی اور اختلاف رائے نہ ہوتا اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہاتھی کی شکل وصورت کیسی ہے۔

سبق: تیری ظاہری آنکھوں کی بینائی پورے ہاتھی کو پہچان نہیں سکتی اپنی آنکھوں سے جہالت کی تاریکی دور کرے گا تو بات بنے گی۔

اقتباس حکایات رومی اور سعدی

از ڈاکٹر تصدق حسین

پھر میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بھئی! میں علی مراد کی بات کر رہا ہوں۔ وہ جو ادھر موضع دھرم پورہ میں رہتا ہے۔''

''نہ جی...... '' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دھرم پورہ کیا، میرا کوئی بھتیجا بھانجا اس دن یا (دنیا) میں کہیں نہیں ہے۔ آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔''

وہ ابھی تک میرے مذاق کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ میں نے اس کے ذہن پر زیادہ بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور علی مراد کا تفصیلی حلیہ بیان کرنے کے بعد کہا۔ ''میں اس بندے کی بات کر رہا ہوں کرامت علی......؟''

''آپ اسے بندہ نہ کہیں تھانے دار صاحب......!'' وہ پہچان کے تمام تر مراحل طے کرتے ہوئے بڑے کرارے لہجے میں بولا۔ ''وہ تو ایک شیطان تھا اور اس کا ساتھی...... اس سے بھی بڑا کمین...... انہوں نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے جناب......!''

مجھے اپنا مقصد سو فیصد حل ہوتا نظر آیا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کرامت علی! علی مراد کا حلیہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب تم مجھے اس کے ساتھی کی وضع قطع اور حلیے وغیرہ کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرو تا کہ میں انہیں جلد از جلد گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچا سکوں۔''

''جناب! آپ نے جس شیطان کا نام علی مراد بتایا ہے نا اس کے ساتھی کا حلیہ کچھ اس طرح تھا۔ دبلا پتلا، لمبا قد، چہرے پر سیاہ ڈاڑھی درمیانے سائز کی...... رنگ گورا اور...... اور......''

وہ اپنے بیان میں اٹکنے لگا تو میں نے جلدی سے اسے سہارا دیا۔ ''اور کیا......؟''

''اور جی، اس کی سب سے بڑی نشانی تو چہرے کا زخم ہے جناب۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''اس کے چہرے کی دائیں جانب، بھووں سے گال تک ایک لمبے کٹ کا نشان ہے جیسے کسی نے چھری سے اس پر وار کیا ہو۔ اس کی آنکھ تو بچ گئی ہو لیکن چہرے پر ایک لمبا نشان ہمیشہ کے لیے باقی رہ گیا ہو۔ وہ مجھے شکل سے کوئی جرائم پیشہ شخص لگتا تھا......'' اس نے اپنی بات کے اختتام پر ایک جھرجھری لی اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''کرامت علی! تم نے جتنی تفصیل سے علی مراد کے ساتھی کا حلیہ بیان کیا ہے اس سے مجھے ان لوگوں کی گرفتاری میں بڑی مدد ملے گی۔ کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ ان دونوں بدمعاشوں کا تعلق فیض آباد سے تھا؟''

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اس سوال کا جواب وہ نفی میں دے گا لیکن اسے آپ الفاظی کارروائی سمجھ لیں یا زبانی خانہ پری کا نام دے دیں۔ کرامت علی نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔

''جناب! اگر ان دونوں شیطانوں کا تعلق فیض آباد سے ہوتا یا میں انہیں جانتا ہوتا تو پھر میں آپ کو ان کا حلیہ نہیں بلکہ ان کا نام اور شجرہ نسب بتا رہا ہوتا......''

''بہرحال، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''ان بدبختوں سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔''

''آپ تو ان سے جیسے جی چاہے، نمٹتے رہیں سرکار لیکن میری ایک الجھن ضرور دور کر دیں۔'' وہ متامانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیسی الجھن کرامت علی؟''

''آخر ان لوگوں کی مجھ سے دشمنی کیا تھی؟'' وہ نیم احتجاجی انداز میں مستفسر ہوا۔ ''انہوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا......؟''

''کیا تمہیں اس بارے میں کچھ پتا نہیں ہے؟'' میں نے کرامت علی سے پوچھا، پھر سوالیہ نظر سے قریب کھڑے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

میری اس نظر میں ایک سوال چھپا ہوا تھا کہ...... کیا تم نے گورکن کو چودھری ظفر علی والے واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟ کانسٹیبل نے فوراً میری نگاہ کے مفہوم کو پالیا اور جلدی سے نفی میں گردن ہلا دی۔

کرامت علی بھی سر کو منفی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں ہے......''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کرامت علی! ان دونوں کی تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی......''

''پھر......؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''پھر انہوں نے میرا یہ حشر کیوں کیا؟''

''تم خاموش رہ کر پوری توجہ سے میری بات سنو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''پھر یہ معاملہ تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے حالات حاضرہ سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ ''وہ لوگ تمہارے نہیں، اصل میں چودھری ظفر علی کے دشمن تھے۔''

اس نے اضطراری انداز میں ایک مرتبہ پھر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور پوچھا۔ ''کیا ہوا کرامت علی؟''

''وہ جی...... بڑے چودھری صاحب کی قبر کھلی پڑی ہے اور میں یہاں آرام سے بستر پر لیٹا ہوں۔'' ان لمحات میں وہ ایک معصوم بچے کی طرح ایکٹ کر رہا تھا۔ احساس ذمے داری اس کے چہرے سے مترشح تھا۔ ''مجھے فوراً قبرستان جا کر چودھری صاحب کو دفن کرنا چاہیے۔''

''سب ہو گیا ہے کرامت علی۔'' میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ''چودھری صاحب کی جیسی تیسی لاش کو قبر میں رکھ کر مٹی ڈال دی گئی ہے۔ قبرستان کے معاملات معمول پر ہیں۔ تمہیں فکر نہیں کرنا چاہیے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دو تین دن مزید اسپتال میں رک کر اپنا علاج کرالو۔ جب تمہارے سر کے ٹانکے کھل جائیں گے تو فیض آباد آجانا۔''

''اور اس دوران میں اگر کسی کی میت ہو گئی تو......؟'' اس نے تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھا۔ ''اس کے لیے قبر کون کھودے گا، اسے مٹی میں کون اتارے گا جناب......؟''

''گورکنیت'' جیسے لہو بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ یہ اس کا اخلاص تھا اور احساس ذمے داری تھا۔ گورکن کرامت علی کے یہ سچے جذبات مجھے بڑے بھلے لگے۔ میں نے اس خالص انسان کی روشن آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کرامت علی! کیا تم نے پٹا لکھوایا ہوا ہے کہ قیامت تک زندہ رہو گے؟''

''نہیں جی...... زندگی کا تو ایک پل کا بھروسا نہیں...... کوئی بھی پٹے پر لکھوا کر نہیں آتا۔'' اس کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تاہم اس نے زبان سے اپنی کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا، متذبذب نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کرامت علی! کیا تمہارے جانے کے بعد لوگ مرنا بند کر دیں گے؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب......!''

''بس، تو پھر ایک نکتہ اچھی طرح ذہن میں نقش کر لو......'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''قدرت اور اس کا نظام کسی انسان کا محتاج نہیں۔ ایک انسان ختم ہو جاتا ہے تو قدرت وہی کام کسی دوسرے انسان سے لینا شروع کر دیتی ہے۔ تمام انسان قدرت کے سامنے محتاج اور بے بس ہیں، قدرت نہیں......!''

''جی، میں سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا......'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ جو کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔''

''تمہیں فی الحال مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک تمہارے سر کے زخموں کے ٹانکے نہیں کھل جاتے۔ وہاں قبرستان میں کوئی تمہاری دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ اسپتال سے ٹھیک ٹھاک ہو کر جاؤ تو اچھی بات ہے اور یہ زخم محال......'' میں نے سانس درست کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اس دوران میں فرشتۂ اجل کسی کا بلاوا لے کر آجاتا ہے تو اسے گاؤں کے افراد کسی نہ کسی طرح مٹی میں اتار ہی دیں گے۔ تمہارے کمرے میں کھدائی کے تمام تر آلات رکھے ہوئے ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں چند روز تک بالکل فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلا کر میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔

میں نے اسپتال کے ڈاکٹر کو ''مریض'' اور اس کی صحت کے حوالے سے چند اہم باتوں سے آگاہ کیا پھر گھوڑے پر سوار ہو کر واپس فیض آباد آگیا۔

☆☆☆

تھانے میں پہنچ کر سب سے پہلے اے ایس آئی فاروق احمد سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا تو میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب وہ بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔

''فاروق! لگتا ہے، تم نے میری غیر موجودگی میں کوئی بہت بڑا معرکہ مار لیا ہے......؟''

''بڑا تو نہیں ملک صاحب......!'' وہ انکساری سے بولا۔ ''لیکن آپ سنیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔ ایک پیش رفت تو ہوئی ہے۔''

''تفصیلات کیا ہیں؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے ایک بدتمیز گھڑسوار کا حلیہ مجھے بتایا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جس نے ایک سال پہلے بیری والے کھوہ پر نرگس نامی ایک الھڑ مٹیار سے دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر چودھری ظفر علی نے موقعے پر پہنچ کر اس جوان کو تھپڑ مارے تھے......!''

''ہاں...... میں نے تمہیں یہ سب بتایا تھا، پھر......؟''

''میں نے ماسی جیراں بہ الفاظ دیگر محمودہ کے تعاون سے اس بدتمیز اکھڑ مزاج گھڑسوار کا سراغ لگا لیا ہے......'' اے ایس آئی نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

''کون ہے وہ......؟'' میرا تجسس سوا ہو گیا۔

''وہ بندہ چودھری رحمت کا بیٹا چودھری حشمت ہے جناب!'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''ہمارے گاؤں فیض آباد سے کوئی آٹھ میل مغرب میں ایک گاؤں ہے رکھاں والی...... چودھری رحمت اور چودھری حشمت کا تعلق اسی رکھاں والی سے ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''چودھری ظفر علی اور چودھری رحمت میں بڑے اچھے

تعلقات رہے تھے۔ اب تو یہ دونوں چودھری صاحبان پیوندِ خاک ہو چکے..... تین ماہ پہلے چودھری رحمت کا انتقال ہوا ہے۔"

"فاروق.....!" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "تم چودھری شہادت علی کو ابھی فوراً تھانے بلالو۔ میں اس سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

فاروق اٹھا اور "اچھا جی" کہتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔

یہ قطعاً ضروری نہیں تھا کہ چودھری ظفر علی اور اس کی قبر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا اس کے پیچھے رکھاں والی کے چودھری حشمت کا ہاتھ ہو لیکن کم از کم یہ تو پتا چل گیا تھا کہ چودھری حشمت ایک ایسا شخص تھا جو چودھری ظفر علی سے نفرت کرسکتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کے ایک خانے میں "چودھری حشمت" کو لاک کیا اور علی مراد اینڈ کمپنی کے بارے میں سوچنے لگا۔

اگر علی مراد اور اس کے ساتھی میں سے کسی کی شناخت ہوجاتی تو میرے لیے تفتیش کے گھوڑے کو آگے بڑھانا آسان ہوجاتا۔ یہ بات تو ایک سو ایک فیصد طے تھی کہ منگل اور بدھ کی درمیانی شب قبرستان میں اور بیری والے کھوہ پر چودھری ظفر علی مرحوم کے ساتھ جو "کارروائی" کی گئی تھی، اس کے ذمے دار یہی دونوں افراد تھے۔ یہ ان کا ذاتی منصوبہ تھا یا کسی تیسرے شخص کے ایما پر انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا، اس بات کا فیصلہ اسی وقت کیا جاسکتا تھا جب وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک میرے ہتھے چڑھ جاتا۔

تھوڑی دیر کے بعد فاروق واپس آیا اور اس نے آکر مجھے بتایا۔ "ملک صاحب! میں نے ایک کانسٹیبل کو چودھری کی حویلی کی جانب روانہ کردیا ہے اور کہا ہے کہ ملک صاحب نے چودھری شہادت علی کو فوراً تھانے بلایا ہے۔ چودھری ظفر علی کے حوالے سے کسی نہایت ہی اہم معاملے پر بات کرنا ہے۔ میرا خیال ہے، بیس پچیس منٹ میں چودھری آپ کے سامنے ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، ہم ان پچیس منٹ میں ایک اور ضروری کام نمٹا لیتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم اپنے فنکار حوالدار کو بلا لاؤ اور..... اس سے کہنا کہ کاغذ پنسل وغیرہ سب لیتا آئے۔"

اے ایس آئی نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا، وہ حوالدار کے بلاوے کا مقصد نہیں سمجھا، تاہم اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

ہمارے تھانے کے حوالدار سرمد علی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اسے آرٹ سے گہرا لگاؤ تھا۔ خصوصاً وہ فری ہینڈ اسکیچ بنانے کا ماہر تھا۔ میں نے اس کی پنسل اسکیچنگ کے کئی شاہکار دیکھے تھے۔ میری رائے میں وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ میں نے اس سے علی مراد اور اس کے ساتھی کا خاکہ بنوانے کے بارے میں سوچا تھا۔ یہ خیال ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔

سرمد، فاروق کی معیت میں میرے پاس پہنچا تو میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے اپنے مقصد سے آگاہ کیا پھر کہا۔ "میں تمہیں ان دونوں افراد کے چہروں کی تفصیل لکھوا دیتا ہوں۔ تم اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان کے کلوز اپ اسکیچ تیار کرو۔ انیس بیس کا فرق چلے گا۔"

"میں کوشش کروں گا ملک صاحب..... کہ انیس بیس کا فرق بھی نہ آئے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "آپ مجھے تفصیلات سے آگاہ کریں۔"

میں نے بتانا شروع کیا۔ "بندہ نمبر ایک..... دراز قد، گھونگریالے بال، رنگ سانولا، گھنی مونچھیں، آنکھیں سرخ وحشت ٹپکاتی ہوئی....." لمحے بھر کو توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"بندہ نمبر دو..... گورا چٹا، دبلا پتلا، دراز قامت، چہرے پر درمیانے سائز کی سیاہ داڑھی، چہرے پر زخم کا نشان....."

"ذرا اس زخم کے نشان کی تفصیل بتادیں....." سرمد نے لقمہ دیا۔

"وہ چھری یا کسی تیز دھار آلے کے کٹ کا نشان ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "یہ نشان لمبائی کے رخ، چہرے کی دائیں طرف بھوؤں سے لے کر گال تک چلا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب..... یہ تو ہوگیا!" وہ نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ان نشانیوں سے کام چل جائے گا یا کچھ اور.....؟"

"یہ بہت ہے جناب!" وہ جلدی سے بولا۔ "میں ان اشاروں کی مدد سے بڑا ٹھیک ٹھاک کام چلا لوں گا۔"

"تو پھر تم جاؤ اور تھانے کے کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر کام میں جت جاؤ۔" میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "کام ایسا ہونا چاہیے کہ ان خبیثوں کے خاکے بولنے لگیں۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "پہلے میں پنسل کی نوک کی مدد سے ان کے خاکوں کو بولنے پر مجبور کروں گا اور جب آپ انہیں گرفتار کرکے میرے حوالے کریں گے تو میں ان کی زبان کھلوانے کے لیے کسی اور "شے کی نوک" آزماؤں گا۔"

"انشاء اللہ! بہت جلد تمہیں یہ موقع ملنے والا ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔



حوالدار خوش خوش میرے کمرے سے رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں اور اے ایس آئی فاروق، علی مراد اینڈ کمپنی کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ہمیں اس موضوع پر صلاح مشورہ کرتے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ چودھری شہادت علی اپنے حواریوں کے ساتھ تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اس کے دائیں اور بائیں بازو یعنی طفیل اور احسان کو باہر برآمدے ہی میں روک کر چودھری کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

"السلام علیکم ملک صاحب.....!" اس نے اندر داخل ہوتے ہی بہ آوازِ بلند مجھے سلام کیا، پھر بولا۔ "سنا ہے آپ نے اباجی کے مجرموں تک رسائی حاصل کرلی ہے.....؟"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے چودھری صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "وہ دن دور نہیں جب میں ان مجرموں کو گردنوں سے پکڑ کر آپ کے سامنے مرغا بنادوں گا لیکن اس کام کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہے اور آپ ہیں کہ....."

"میں حاضر ہوں ملک صاحب!" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ نے بلایا اور میں دوڑا بھاگا چلا آیا۔ میں نے اب تک آپ سے مکمل تعاون کیا ہے۔ اب بھی جو حکم ہو، میں تیار ہوں....."

اس نے بات کے اختتام پر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ "چودھری صاحب! جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ جس بندے نے آپ کے اباجی کی قبر اور لاش کے ساتھ قابلِ مذمت سلوک کیا ہے وہ چودھری صاحب کے لیے اپنے دل میں غصہ اور نفرت رکھتا ہوگا۔ میں نے ایک ایسے ہی دشمن کا سراغ لگایا ہے۔ بس، آپ کو تصدیق کے لیے بلایا ہے۔"

"وہ بدبخت کون ہے؟" چودھری نے پھنکار سے مشابہ لہجے میں پوچھا۔

"قد چھوٹا، گندمی رنگت، جسم بھاری، ہلکی مونچھیں، کان بڑے بڑے اور بائیں گال پر چنے کے دانے کے برابر سیاہ مسا....." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چودھری حشمت کا حلیہ دہرا دیا اور کہا۔ "کوئی ایک سال پہلے آپ کے اباجی نے بیری والے کھوہ پر اس بندے کو طمانچے مارے تھے.....؟"

"اوہ....." وہ چونک اٹھا۔ "تو آپ چودھری حشمت کی بات کررہے ہیں؟"

"ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اچھا ہوا، آپ پہچان گئے۔ اب مجھے آپ اس واقعے کے بارے میں بتائیں۔"

"واقعہ کیا تھا جناب....." وہ سرسری انداز میں بولا۔ "لگ بھگ ایک سال پہلے چودھری رحمت کا بیٹا چودھری حشمت

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
جون 2011ء کے خاص نمبر کی ایک جھلک
آپ کی پُرزور فرمائش پر فسانہ نہیں
حقیقت ہے یہ میں محترمہ
عذرا رسول کی سچی اور کھری باتیں
آخری قسط ملاحظہ کریں
ذکیہ بلگرامی کا ناول
اگر ملنا نہیں ہمدم سوچ کی نئی راہوں پر گامزن
شیریں حیدر کا نیا ناول شیشوں کا
مسیحا کوئی نہیں
عالیہ بخاری کا ناول خوشبو کا سفر
ایک نئی مہک کے ساتھ
راحت وفا کا نیا ناول ایک تھی نیناں
نفسیاتی احساسات و خیالات سے مزین
میمونہ خورشید اور رضوانہ پرنس
کے سچے جذبوں سے مزین پُرتاثر ناولٹ
عطیہ عمر، عظمیٰ آفاق سعید،
عندلیب سلمیٰ، تسنیم منیر
علوی، بلقیس جہاں،
اور حرا فاطمہ
کے زندگی سے قریب ترین تلخ و شیریں افسانے
آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے
کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

گھوڑے پر سوار ہو کر ہمارے گاؤں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ بیری والے کھوہ پر عورتوں کو پانی بھرتے دیکھ کر رک گیا، پھر وہ نرگس نامی ایک دوشیزہ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ اتفاق سے ابا جی کا ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے بدتمیزی کا کھلم کھلا مظاہرہ دیکھا تو ان سے برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے موقعے پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ چودھری حشمت کو برا بھلا کہا بلکہ اس کے منہ پر دو چار تھپڑ بھی مار دیے تھے۔ ابا جی نے یہ پورا واقعہ مجھے سنایا تھا۔"

"اور میں نے سنا ہے، چودھری ظفر علی اور چودھری رحمت میں بڑے اچھے تعلقات تھے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ چودھری حشمت کو سمجھا بجھا کر اور ڈانٹ ڈپٹ کر بھی تو رخصت کر سکتے تھے۔ یہ طمانچے مارنے کی کیا ضرورت تھی آخر......؟"

"آپ کو پتا نہیں ہے ملک صاحب...... کہ ابا جی عورت کی عزت کے حوالے سے کتنے حساس اور جذباتی تھے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "انہوں نے گھر آ کر جب مجھے یہ واقعہ سنایا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا...... حشمت تو میرے دوست رحمت کا بیٹا تھا۔ اگر تم...... (یعنی میں چودھری شہادت علی) بھی ایسی بیچ حرکت کرتے تو میرے عتاب سے بچ نہیں سکتے تھے......" وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اور یقین یہی بات انہوں نے چودھری رحمت سے بھی کہی تھی۔ چودھری رحمت نے ابا جی کے عمل کا برا نہیں منایا بلکہ الٹا انہوں نے اپنے بیٹے چودھری حشمت کو لعن طعن کی تھی۔"

"اور اب چودھری رحمت کے انتقال کو تین ماہ گزر چکے ہیں۔ کم و بیش ایک ماہ پہلے آپ کے ابا جی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے......" میں نے چودھری شہادت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "چودھری حشمت کے دل میں آپ کے ابا جی کے لیے جو ناپسندیدگی اور نفرت چھپی ہوئی تھی وہ اب رنگ دکھا سکتی ہے...... کیا خیال ہے چودھری صاحب...... یہ سب کچھ اسی چودھری حشمت کے اشارے پر نہیں کیا گیا...... چودھری ظفر علی نے بیری والے کھوہ پر حشمت کو تھپڑ مارے تھے اور اب چودھری ظفر علی کے "دونوں ہاتھ" بھی بیری والے کھوہ پر ہی "کاٹے" گئے ہیں۔ یہ تو چودھری حشمت کی کھلی انتقامی کارروائی نظر آتی ہے......؟"

"آپ کی بات میں وزن ہے ملک صاحب!" وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے، وہ معاملہ تبھی رفع دفع ہو گیا تھا۔ چودھری رحمت بالکل پہلے کی طرح ابا جی سے ملتا رہا تھا۔"

"کیا چودھری حشمت نے بھی آپ کے گاؤں کے ساتھ مراسم بحال رکھے تھے؟"

"نہیں جی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "اس نے پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔"

"چودھری صاحب!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دلوں میں روشن نفرت کی چنگاریاں اتنی آسانی سے نہیں بجھا کرتیں...... میرا دھیان تو سیدھا سیدھا چودھری حشمت کی طرف جا رہا ہے...... میں ایک ضروری کام سے نمٹ لوں پھر رکھاں والی پر چڑھائی کا ارادہ ہے۔"

"ضروری کام......؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"دو مشکوک بندوں کی شناخت کا معاملہ ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "گورکن نے ان دونوں کا حلیہ بڑی وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے۔ یہ وہی دونوں افراد ہیں جنہوں نے بڑے چودھری صاحب کی قبر کی بے حرمتی کی تھی۔"

"آپ نے پہلے تو مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا......؟" وہ شاکی لہجے میں بولا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کے شکوے کو رفع کرتا، حوالدار سرمد علی کامیابی کا نعرہ لگاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پنسل اسکیچ والے دو صفحات بھی پکڑ رکھے تھے۔

"لیں ملک صاحب! میں نے اپنا کام مکمل کر دیا......!"

میں نے فاتحانہ نظر سے چودھری شہادت علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ دو بندوں کے خالی خولی ذکر کو چھوڑیں جی...... میں آپ کو ان کی تصویریں (خاکے) دکھاتا ہوں۔"

چودھری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سرمد علی کے ہاتھ سے مذکورہ اسکیچز لے کر ان کا بغور جائزہ لیا پھر مطمئن ہونے کے بعد انہیں چودھری کی جانب بڑھاتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "لیں چودھری صاحب! یہ ہیں آپ کے ابا جی کے مجرم۔ آپ انہیں پہچاننے کی کوشش کریں اور مجھے بتائیں کہ یہ دونوں کہاں ملیں گے؟"

چودھری کے چہرے پر الجھن زدہ لکیروں کا ایک جال سا پھیل گیا۔ تاثرات سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی اور وہ بولا۔

"اس بندے کو تو میں نے ایک آدھ بار چودھری رحمت کے ساتھ دیکھا تھا۔" اس کا اشارہ علی مراد کے اسکیچ کی طرف تھا پھر وہ دوسرے اسکیچ پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ داڑھی والا بندہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ ٹھہریں، میں اس کے بارے میں طفیل سے پوچھتا ہوں۔"



فوری طور پر طفیل نامی اس بندے کو کمرے کے اندر بلا لیا گیا جو چودھری شہادت علی کا دایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔ چودھری نے باریش، زخمی چہرے والے شخص کا خاکہ طفیل کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"ذرا پہچانو تو...... یہ بندہ کون ہے؟"

"یہ تو سیفا ہے چودھری صاحب!" وہ بے ساختہ بول اٹھا۔ "اس کو پہچاننے کی کیا ضرورت ہے......!"

"سیفا کون؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"جناب! یہ بندہ ٹبا سلطان کا رہنے والا ہے۔" طفیل نے بتایا۔ "اس کا پورا نام تو سیف اللہ ہے لیکن "سیفا" مشہور ہے۔ یہ بڑا کمینہ بدمعاش اور خطرناک ڈکیت ہے تھانے دار صاحب......!"

ٹبا سلطان، موضع رکھاں والی سے جنوب میں چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میرا مخاطب طفیل تھا۔

"اس کمینے بدمعاش کو تو میں چٹکی بجاتے میں دانت نکالا بدمعاش بنا دوں گا۔ تم ذرا اس دوسرے بندے کے بارے میں بتاؤ......"

بات ختم کرتے ہی میں نے چودھری شہادت علی کی جانب اشارہ کر دیا۔ چودھری نے میرا اشارہ سمجھتے ہوئے دوسرا علی مراد والا اسکیچ طفیل کے سامنے کر دیا۔ اس خاکے پر نظر پڑتے ہی طفیل جلدی سے بولا۔

"جناب! یہ تو مرادا ہے، میرا مطلب ہے...... علی مراد...... یہ "رکھاں والی" کا رہنے والا ہے۔"

حوالدار سرمد علی نے دل کی گہرائیوں اور ذہن کی گیرائیوں کے ساتھ وہ اسکیچ تیار کیے تھے۔ میرا دل خوش ہو گیا۔ میں نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ "شاباش سرمد! ساری محنت وصول ہو گئی۔"

پھر میں نے روئے سخن چودھری شہادت علی کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب! ساری صورت حال اب آپ کے سامنے ہے۔ چودھری حشمت اس افسوس ناک واقعے میں ملوث ہے یا نہیں، اس بات کا فیصلہ خود بخود ہو جائے گا۔ میں پہلی فرصت میں علی مراد اور سیف اللہ کو گرفتار کر رہا ہوں۔ یہی وہ دو افراد ہیں جنہوں نے بڑے چودھری صاحب کی قبر کا حشر نشر کیا ہے......!"

"بسم اللہ کریں جناب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جب یہ دونوں شیطان آپ کی تفتیش کی چکی میں پسیں گے تو ان کی زبانیں خود بخود کھل جائیں گی۔ ایک بات کا تو مجھے پکا یقین ہے......" وہ لمحاتی توقف کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"مرادا اور سیفا جیسے سڑک چھاپ غنڈے اپنی مرضی سے اتنا بڑا اور خطرناک کام نہیں کر سکتے۔ ان کی لگامیں کسی نہ کسی مضبوط ہاتھ میں ہیں......!"

"ان مضبوط ہاتھوں تک پہنچنا اور انہیں جڑ سے کمزور بنانے کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے چودھری صاحب!" میں نے پرعزم انداز میں کہا۔ "آپ مطمئن ہو کر حویلی جائیں۔ آج جمعرات ہے۔ انشاء اللہ! کل شام سے پہلے آپ کے ابا جی کے مجرم اسی تھانے کی حوالات میں بند ہوں گے۔"

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

جب بھیڑ چھٹ گئی تو اے ایس آئی فاروق نے مجھ سے کہا۔ "کیا خیال ہے ملک صاحب! ہم کل رکھاں والی اور ٹبا سلطان کی طرف جائیں......؟"

"کل کا مطلب ہے آج......!" میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔

"کل کا مطلب آج کیسے جناب؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ اگر کسی بندے پر مضبوط ہاتھ ڈالنا ہو تو اسے سورج طلوع ہونے سے پہلے گھر پر پکڑو۔" میں نے جواب میں بتایا۔ "لہٰذا ہم آج رات کے آخری پہر یہاں سے روانہ ہوں گے۔ رکھاں والی فیض آباد سے کوئی آٹھ میل دور مغرب میں واقع ہے اور ٹبا سلطان، رکھاں والی سے چار میل جنوب میں...... یعنی ہمیں زیادہ سے زیادہ بارہ میل جانے میں اور بارہ میل واپسی میں سفر طے کرنا ہوگا۔ میرے ذہن میں ترتیب پانے والے پروگرام کے مطابق ہم پہلے سیف اللہ پر ہاتھ ڈالیں گے۔ اس کے بعد واپسی میں علی مراد کی گردن ناپ لیں گے۔ جب ہم ان دونوں خبیثوں کو لے کر تھانے کی جانب سفر شروع کریں گے تو رکھاں والی میں سورج طلوع ہو رہا ہوگا۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اور...... تم بھی اس مشن میں میرے ہمراہ ہو گے۔ ہمارے ساتھ صرف دو کانسٹیبل جائیں گے۔ ہم چاروں الگ الگ گھوڑوں پر سوار ہوں گے۔ انشاء اللہ! کل دوپہر سے پہلے ہم کامیاب تھانے لوٹ آئیں گے۔ اب تم فوراً روانگی کے انتظامات میں لگ جاؤ۔ روانگی کے وقت کوئی کمی محسوس نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں ملک صاحب!" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

اس کے لہجے میں موجود اعتماد کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

☆☆☆

بروز جمعۃ المبارک، بہ وقت سہ پہر، میرے تھانے کے ٹرائل روم سے بلبلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ حوالدار سرمد علی نے جن دو افراد کے پنسل اسکیچ بنائے تھے، اس وقت وہ دونوں بندے اس کی تحویل میں تھے اور...... وہ ان کی زبانیں کھلوانے کے لیے مختلف نسخے آزما رہا تھا۔ مجھے سرمد کے کہے ہوئے الفاظ یاد آگئے۔ اس نے بڑے فخر سے کہا تھا...... ملک صاحب! پہلے میں پنسل کی نوک کی مدد سے ان کے خاکوں کو بولنے پر مجبور کروں گا اور جب آپ انہیں گرفتار کر کے میرے حوالے کریں گے تو میں ان کی زبان کھلوانے کے لیے کسی اور ”شے کی نوک“ آزماؤں گا۔ اس وقت وہ دونوں ”زبان کھلنے“ کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان کی بلبلاہٹ میں کس شے کی ”نوک“ کی چبھن شامل ہے......!

مجرم چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی ساری بہادری اور اچھل کود اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ جاتا۔ ماشاءاللہ محکمہ پولیس کے پاس درجن بھر ایسے حیرت انگیز آلات کی کٹ موجود ہے جو پتھر اور لوہے کی زبان کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایک گھنٹے کی ”سرمدی محنت“ نے ان دونوں سخت جان مجرموں کی چیخیں بلوا دی۔ انہوں نے اقرار جرم کرلیا۔

میری توقعات اور حسابات کے عین مطابق، سیف اللہ عرف سیفا اور علی مراد عرف مرادا نے وہ مذموم کارروائی چودھری حشمت کے ایما پر کی تھی۔ اس تمام تر مشن میں فیض آباد کے ایک وسنیک نے بھی ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ علی مراد تو چودھری حشمت کا خاص آدمی تھا۔ سیف اللہ اور فیض آباد کے وسنیک کو چودھری حشمت نے بھاری معاوضے پر اس کام کے لیے خریدا تھا۔ جب ”فیض آبادی“ بندے کا نام میرے سامنے آیا تو میں حیرت سے اچھل پڑا۔ آپ سنیں گے تو ہوسکتا ہے، انگشت بہ دنداں رہ جائیں......!

اس نابکار، گندے انڈے کا نام تھا گوگا...... ملک امین کا بیٹا اکرم عرف گوگا!

میں نے شام سے پہلے گوگا کو بھی گرفتار کر کے اس کے ہانڈی وال مرادا اور سیفا کے پاس حوالات میں پہنچا دیا۔ نامراد گوگا نے فیض آباد سے اپنی غیر موجودگی ظاہر کرنے کے لیے، لائل پور میں اپنے کسی دوست اصغر جٹ سے ملنے جانے کا ڈراما رچایا تھا۔

چودھری حشمت نے سیف اللہ اور گوگا کو جس معاوضے پر خریدا تھا، وہ اس زمانے کے لحاظ سے تو ایک بھاری رقم تھی لیکن آج کل کے حساب سے وہ کسی بھی اچھے پرائیویٹ پرائمری اسکول کے بچے کی ایک ماہ کی فیس سے زیادہ نہیں تھی۔

اس افسوسناک کھیل کے مرکزی کردار یعنی چودھری حشمت کی گرفتاری میرے لیے بہت آسان ثابت ہوئی کیونکہ گرفتاری سے قبل میں علی مراد، سیف اللہ اور گوگا کی شکل میں اس کے خلاف ٹھوس ثبوت ”جمع“ کر چکا تھا۔ ان تینوں کا اقبالی بیان چودھری حشمت کو ٹھیک ٹھاک فٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس کینہ پرور شخص نے اپنے دل میں موجود انتقام کی حسرت کو نکالنے کے لیے ایک معزز انسان کی قبر اور لاش کی جس طرح بے حرمتی کروائی تھی، وہ سخت سے سخت ترین سزا کا تقاضا کرتی تھی۔ میں نے آپ کی توقع سے کہیں زیادہ، عدالت سے سزا دلوا کر چودھری حشمت کو جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پہنچا دیا۔

یہ کیس اپنے منطقی انجام کو تو پہنچ گیا لیکن اس کے ایک انتہائی دل شکستہ اور رنجیدہ پہلو کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے اور...... وہ نازک پہلو ہے مذیب النسا عرف زیبن!

اسی زیبن کی ”سجھائی“ ہوئی راہ پر قدم رکھ کر میں نے یہ کامیابی حاصل کی تھی اور اسی زیبن نے اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے پیر جمن شاہ کی بتائی ہوئی ایک انتہائی خطرناک ترکیب پر عمل کر ڈالا تھا، یہ الگ بات کہ وہ جسے چاہتی تھی، وہ بہت ہی کمینہ، کم ظرف اور گھٹیا ثابت ہوا۔

اس کیس کے اختتام پر زیبن مجھ سے ملنے آئی تھی۔ گوگا کی مجرمانہ ذہنیت والے انکشاف کے بعد اس کے دل اور دماغ کی جو کیفیت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ زیبن کے لیے میرے دل میں ہمدردی اور خلوص کے جذبات تھے۔ میں نے اسے ایک غمزدہ بچی کی حیثیت سے ٹریٹ کیا اور یہی مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی خواہش کے مطابق شادی کرلے۔ گوگا والے غم کو بھلانے کے لیے ضروری تھا کہ اس کی فوراً کہیں شادی ہوجائے۔

زیبن نے کسی قسم کا جذباتی بخار چڑھ جانے کے بجائے گہری سنجیدگی سے میرے مشورے پر عمل کیا اور آنے والے دنوں میں، اس کے پھوپی زاد مشتاق عرف مشتا سے اس کی شادی ہوگئی۔ اب تک تو ماشاءاللہ وہ نانی دادی بن چکی ہوگی۔

چلتے چلتے قارئین سے یہی درخواست کروں گا کہ کبھی بغض اور کینہ کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔ یہ دونوں ایسے لاعلاج امراض ہیں کہ پہلے یہ انسان کو نفرت کی آگ سے اندر سے جلاتے ہیں اور پھر یہی آگ آس پاس کے لوگوں اور اردگرد کے ماحول کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر تباہ و برباد کر ڈالتی ہے جیسا کہ چودھری حشمت کے ساتھ ہوا۔

اللہ ہم سب کو سوچنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین!

تحریر: حسام بٹ

# شیطان

تنویر ریاض

ہوا کے رخ سے موسم کے بدلنے کا اندازہ لگانا آسان ہے مگر انسان کے بدلتے روپ کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب کہیں نہ کہیں کوئی واقعہ رونما ہوجاتا ہے۔ ”صحبت اثر تخم تاثیر“ سیانوں کا یہ قول بالکل غلط نہیں... اسی لیے بار بار اچھی صحبت اختیار کرلینے کی تلقین کی جاتی ہے مگر... اس نے کبھی ایسا نہ سوچا تھا کہ ان جانے میں زہر اس کی جڑوں کو رفتہ رفتہ کھوکھلا کرتا جا رہا ہے۔ بالآخر جب اس کی شخصیت کی عمارت گری تو اس کا اصل روپ سامنے آیا۔

**خیالات کی ہم آہنگی سے بے خبر ایک مخلص انسان کی تلخی علالت**

میں اپنے بھائی کو سنی کہہ کر بلاتی تھی کیونکہ اس کی مسکراہٹ میں ابھرتے ہوئے سورج جیسی چمک تھی۔ وہ اپنی خوب صورتی کی وجہ سے لڑکیوں میں بہت مقبول تھا اور ہر لڑکی اس سے قریب ہونے کی کوشش کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت ہمدرد اور مہربان بھی تھا اور اس کی یہی خوبی اسے دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتی تھی۔ دسویں جماعت میں اس کی دوستی ایک بدمعاش لڑکے جیرڈ ریس سے ہوگئی۔ اسے اپنے جم کا تالا کھولنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ میرے بھائی سے اس کی پریشانی نہ دیکھی گئی اور وہ اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جیرڈ ریس آگے چل کر پندرہ عورتوں کو قتل کر دے گا۔ البتہ اس کی فطرت میں شروع سے ہی جارحانہ پن شامل تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میں شیطان کی روح حلول کرگئی ہو۔ بظاہر وہ ایک اوسط درجہ کا طالب علم تھا لیکن اس کی عجیب و غریب حرکتیں دیکھ

کر کوئی بھی اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن میرے بھائی نے کبھی اس کی برائی نہیں کی اور ہمیشہ اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

جس روز اس پر فردِ جرم عائد کی گئی تب بھی میرے بھائی نے اسی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے جو کچھ بھی اس کے ساتھ کیا وہ ٹھیک نہیں تھا۔" سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے بھی بھائی کی یہ منطق سمجھ میں نہ آئی۔ سارا زمانہ جیرڈ کو جانتا تھا اور اب تو اس پر قتل جیسے بھیانک جرم کا الزام بھی عائد ہو چکا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میرا بھائی اپنا کاروبار جمانے کی فکر میں تھا اور میرے یہاں پہلے بچے کی پیدائش ہونے والی تھی۔ اس روز ہم سب سنی کے یہاں ڈنر پر مدعو تھے اور میری بھابی وینڈی نے کئی مزے دار کھانے بنائے ہوئے تھے۔ اسے نت نئے تجربے کرنے کا شوق تھا اور وہ ایسی ایسی ڈشز بناتی جن کا نہ کبھی نام سنا اور نہ ہی انہیں چکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس کی بنائی ہوئی ہر ڈش خوش ذائقہ اور لاجواب ہوتی تھی۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"وہ ہمیشہ سے ہی ایسا تھا۔ خواہ اس پر کسی شیطانی قوت کا غلبہ ہوا ہو یا نہیں وہ پھر بھی ایک عفریت ہی ہوتا۔"

میری بھابی ہمیشہ ہی لڑائی کا بہانہ ڈھونڈتی رہتی تھی۔ جب سے ان دونوں کی شادی ہوئی تھی، میں نے یہی دیکھا کہ میرا بھائی جو بھی کہتا وہ اس کے برعکس ہوتی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے سنی کی ہر بات کی مخالفت کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے لیکن وہ بھی، اس کی باتوں کا برا نہیں مانتا تھا اور نہ ہی کبھی اس نے اپنی برہمی کا اظہار کیا بلکہ اس کی اشتعال انگیزی کے جواب میں وہ ہمیشہ معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کر لیتا۔ مجھے اپنے بھائی سے بہت محبت تھی لیکن وینڈی مجھے ہمیشہ نیچا دکھانے کی کوشش کرتی۔ اسے اپنے حسن پر غرور تھا جبکہ میں واجبی شکل و صورت کی مالک تھی۔ اس بار بھی یہی ہوا اور میرے بھائی نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر اسکول کے ساتھی اس سے لاتعلقی اور بےزاری کا اظہار نہ کرتے تو اس کے اندر کا شیطان کبھی بیدار نہ ہوتا۔"

"کچھ بھی بلاوجہ نہیں ہوتا۔" وینڈی ترخ کر بولی۔ "کیا تمہیں یہ بات عجیب معلوم نہیں ہوتی کہ اسکول کا ہر لڑکا اس سے دور کیوں رہتا تھا۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ جیرڈ کی حرکتوں کے پیچھے کون سی قوت کام کر رہی تھی؟ ممکن ہے کہ ان لڑکوں نے اس کے اندر چھپے ہوئے شیطان کو پہچان لیا ہو اور وہ سب اپنے آپ کو اس عفریت سے بچانے کے لیے ایسا کر رہے ہوں۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ریز راؤس نے اس کے منہ میں زبردستی مرغی کا کچا گوشت ٹھونس دیا۔ کیا یہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں تھی۔"

"اس طرح کا نشانہ تو وہ تمہاری بہن کو بھی بناتے تھے لیکن وہ تو سیریل کلر نہیں بنی۔" وینڈی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی سنی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ غصے سے بولا۔ "میری بہن کو کوئی نشانہ نہیں بنا سکتا۔" اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی میرا محافظ تھا۔ یہاں تک کہ جب میں چار جوان بیٹوں کی ماں بن گئی تب بھی وہ میرے بارے میں پریشان ہی رہا۔ میں نے فاتحانہ انداز میں وینڈی کی طرف دیکھا جس نے وقتی طور پر پسپائی اختیار کر لی تھی۔ میں جانتی تھی کہ مجھے نشانہ بنانے والی بات اس نے محض سنی کو مشتعل کرنے کے لیے کہی تھی۔ شاید اسی طرح اس کی تسکین ہوتی تھی۔

☆☆☆

زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی، پھر اچانک ہی اس میں ایک تغیر آ گیا۔ میرے لڑکے اور سنی کی بیٹی ابھی اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں تھے کہ میرے شوہر کو بیماری کی وجہ سے کام چھوڑنا پڑ گیا۔ یہ ہمارے لیے بہت مشکل وقت تھا۔ ہیلتھ انشورنس سے ملنے والی رقم گزارے کے لیے ناکافی تھی لہٰذا میں نے گھر کی گاڑی چلانے کے لیے اپنے بھائی کے ایک گیس اسٹیشن پر کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس وقت تک پانچ گیس اسٹیشنوں کا مالک بن چکا تھا اور کاروبار میں کامیابی کی واحد وجہ اس کی خوش اخلاقی اور رحم دلی تھی۔ جس کا مظاہرہ وہ ہائی اسکول کے زمانے سے کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا اور ہمیشہ ہر ایک کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا۔ اسی لیے لوگ اسے پسند کرتے اور اس پر بھروسا کرتے تھے۔

پہلے دن جب میں کام پر پہنچی تو سنی نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھے وہ جگہ دکھائی جہاں مجھے کام کرنا تھا۔ وہ گیس اسٹیشن کے ایک حصے میں بنا ہوا ایک آئس کریم کاؤنٹر تھا جہاں کاروبار کی تمام جدید سہولتیں موجود تھیں۔ اس کا کیش رجسٹر چابی کو ایک مخصوص انداز میں گھمانے سے کھلتا تھا جبکہ ریفریجریٹر کے لیے بھی مخصوص نمبر استعمال کرنے پڑتے تھے۔ جب اس نے مجھے تنخواہ کے بارے میں بتایا تو میں حیرت زدہ رہ گئی اور بولی۔ "یہ تو میری توقع سے بہت زیادہ ہے۔"

"تم اسے قبول کر لو۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "اگر کچھ



پیسے بچ جائیں تو انہیں برے وقت کے لیے سنبھال کر رکھ لینا۔"

میں سوچ رہی تھی کہ اسے میرا کتنا خیال ہے، وہ جانتا تھا کہ یہ رقم میرے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

"اسٹیو کو مت بتانا۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔" میں نے کہا۔ "چاہے اچھا ہو یا برا، میں یہ سب پیسے گھر لے جاؤں گی۔ اس سے ہماری کئی ضرورتیں پوری ہو سکیں گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ وہ اس حقیقت کو کیسے فراموش کر سکتا تھا کہ میرے لڑکے شریر ہیں اور ہمیشہ مجھے پیسوں کے لیے تنگ کرتے رہتے ہیں۔ میں کسی اچھے مکان میں رہنے کے قابل نہیں تھی اور ایک گیس اسٹیشن میں آئس کریم بیچنے پر مجبور تھی مزید یہ کہ میری زندگی دشوار ہوتی جا رہی تھی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، اس کے باوجود میں تہی داماں نہ تھی۔ مالی مشکلات اپنی جگہ لیکن میں نے زندگی میں بہت کچھ حاصل بھی کیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں بچے مجھے مذاق کا نشانہ بناتے تھے۔ میں ان کے خیال میں سست، کاہل اور بدصورت تھی لیکن آج جب میں اپنے چار خوب صورت بیٹوں اور محبت کرنے والے شوہر کو دیکھتی ہوں تو میرا دل مسرت سے بھر جاتا ہے۔

سنی نے اپنا گلا صاف کیا اور آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا۔ "تم میری بہت اچھی بہن ہو جس پر میں فخر کر سکتا ہوں۔" حالانکہ میں بالکل بھی اچھی نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف میرا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

میں جس گیس اسٹیشن پر کام کر رہی تھی وہ ایک ایسی جگہ واقع تھا جس کے قریب ہی ایک اسکول، عبادت گاہ اور اسپتال بھی تھے۔ اس وجہ سے وہاں طرح طرح کے لوگ گیس بھروانے اور آئس کریم خریدنے آتے تھے۔ ان میں طالب علم، اساتذہ، ڈاکٹرز، نرسیں اور مریضوں کے ملنے والے بھی طرح طرح کے لوگ شامل تھے اور میں انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر سکتی تھی کہ وہ کس قسم کی آئس کریم پسند کریں گے کیونکہ اس کا انحصار بھی آدمی کے موڈ اور اندرونی کیفیت پر ہوتا ہے۔ تاہم زیادہ تر لوگ چاکلیٹ پسند کرتے تھے۔ البتہ کشمش اور پستہ والی آئس کریم بالکل نہیں چلتی تھیں۔ اس لیے میں نے سنی سے کہہ دیا کہ وہ ان کا اسٹاک کم ہی رکھے۔ میں نے ان تمام فلیورز کی ایک فہرست تیار کر لی تھی جو زیادہ فروخت ہوتی تھیں۔

یہ تو میں اچھی طرح جان گئی تھی کہ وینڈی کو میرا گیس اسٹیشن پر بیٹھنا بالکل پسند نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے وہاں کام کرتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے لیکن وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ میرے کام میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کرتی۔ ایک مرتبہ وہ گیس اسٹیشن آئی اور بولی۔ "تم اپنے سامان کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے لو۔ اس طرح تمہیں گاہکوں کی مطلوبہ آئس کریم نکالنے میں آسانی ہوگی اور تمہاری سیل بھی بڑھ جائے گی۔"

میں جانتی تھی کہ وہ مجھے نیچا دکھانے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں اس کے شوہر کی ملازمہ ہوں، ایسا کہہ رہی تھی۔ اس لیے میں نے بھی جل کر جواب دیا۔ "مجھے تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے گاہکوں کا خیال رکھنا مجھے آتا ہے۔"

وینڈی کچھ نہ بولی اور پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دنوں وہ مشکل حالات سے گزر رہی تھی۔ گوکہ اس کے حسن و دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور وہ اب بھی پہلے جیسی ہی خوب صورت تھی لیکن اپنی بدزبانی کی وجہ سے تنہا ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کی بیٹی بھی اس سے دور رہنے لگی تھی۔ سنی بھی اکثر میرے گھر چلا آتا اور میرے بیٹوں کے ساتھ بیس بال کھیلتا، محلے کے دوسرے لڑکے بھی اس کھیل میں شامل ہو جاتے۔ وینڈی کو یہ سب پسند نہ تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق فقرے کستی رہتی۔ اس کا نشانہ بالعموم میں ہی ہوا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے گھیر لیا اور بولی۔

"کیا تمہیں کبھی اپنی زندگی بدلنے کا خیال نہیں آتا؟"

"مجھے کچھ سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے چار بیٹے ہیں اور سمجھتی ہوں کہ میرے لیے یہی بہت بڑا انعام ہے۔"

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس کی ایک ہی بیٹی تھی اور اس میں اپنے باپ کی کوئی خصوصیت نہیں آئی تھی۔ وہ اتنی نازک مزاج تھی کہ کوئی اس کے پاس سے بھی گزر جائے تو منہ بسورنے لگ جاتی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ سنی کو تمہیں یہاں کام کرتے دیکھ کر کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر میں خاموش ہو گئی۔ میں نے بھی اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میرے بھائی کے پاس وہ سب کچھ تھا جس پر وہ فخر کر سکتا۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ دولت مند بھی تھا اور اسے ایک خوبصورت بیوی بھی مل گئی تھی جبکہ اسے احساس تھا کہ شادی کے بعد میرے حالات مزید ابتر ہو گئے تھے۔ اس نے میرے بیٹوں کو پرائیویٹ اسکول میں داخلہ دلوانے کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے منع کر دیا کیونکہ

جانتی تھی کہ اس طرح ہمارے تعلقات پر برا اثر پڑ سکتا ہے جو میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم تھے۔ وینڈی کی یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی۔ لہٰذا جب سنی سے میرا سامنا ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور اس سے پوچھ بیٹھی۔ ''کیا تمہیں میرے یہاں کام کرنے پر کوئی پریشانی ہے؟''

''کیا وینڈی نے کچھ کہا ہے؟'' وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں تمہارے لیے کسی پریشانی کا سبب نہیں بننا چاہتی۔''

اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی بھینی خوشبو کے ساتھ ہی میں نے اس کے پیار کی گرمی بھی محسوس کی۔ قدرت نے مجھے بھائی کی صورت میں ایک عظیم تحفہ دیا تھا جو زندگی میں قدم قدم پر میرا ساتھ دے رہا تھا۔

''تم وینڈی کی طرف سے پریشان مت ہو۔'' وہ میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے سنبھال لوں گا۔''

☆☆☆

اس واقعے کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ایک روز جیرڈ ریس کی ماں گیس اسٹیشن پر آئی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس کا بیٹا کئی عورتوں کو قتل کرنے کے الزام میں قید کاٹ رہا تھا، اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ بدستور اپنے گھر میں رہ رہی تھی اور کسی دوسری جگہ جانے کے بجائے یہیں رہ کر پہلے کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ باغبانی کرنا، لائبریری اور چرچ جانا اور دیگر روزمرہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینا۔ سب کچھ وہی تھا۔ وہ میرے گھر سے زیادہ دور نہیں رہتی تھی۔ وہ دیکھنے میں نیچر لگتی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ کسی زمانے میں وہ ایک ایسی ملازمت کی تلاش میں تھی جس میں وہ کچھ وقت گھر سے باہر گزار سکے۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی نظروں سے دور رہنا چاہتی تھی جو صبح سے شام تک گھر میں پڑا رہتا تھا۔ وہ جونہی گیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔

اس وقت آئس کریم کا ڈبہ خالی تھا اور کسی گاہک کے نہ ہونے کی وجہ سے میں بھی فارغ بیٹھی تھی۔ اسے کیش رجسٹر کی طرف آتا دیکھ کر میں گھبرا گئی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اس سے ڈرنے یا گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے تو کسی عورت کا قتل نہیں کیا تھا لیکن اس کے انداز میں کوئی ایسی بات ضرور محسوس ہوئی جس نے مجھے چوکنے پر مجبور کر دیا۔ پھر مجھے اپنے بھائی کا خیال آیا جو جیرڈ سے دوستی کا دم بھرتا تھا جبکہ دوسرے لڑکے اس سے دور رہا کرتے تھے۔ یہ نوازش صرف جیرڈ ہی نہیں بلکہ میرے بھائی کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتی تھی کیونکہ اسی محبت اور حسن سلوک کی وجہ سے اس نے اپنے کاروبار میں اتنی زیادہ ترقی کی تھی۔ کیا میں اس جیسا رویہ اختیار نہیں کر سکتی۔ آخر مجھ پر بھی تو اس کی نوازشات ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتی۔ میں نے مسز ریس کو ایک آئس کریم بار چراتے دیکھ لیا۔

''اے!'' میں زور سے چلائی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے۔ اس کا بیٹا قتل کے الزام میں جیل کاٹ رہا تھا اور وہ گیس اسٹیشن سے آئس کریم چرا رہی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات اسکول کے بچے بھی ایسی حرکت کیا کرتے تھے لیکن یہ ایک بڑی عمر کی عورت تھی جس نے بڑے سلیقے سے لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس طرح تیار ہو کر اپنے بیٹے سے ملنے جیل جا رہی تھی اور شاید یہ آئس کریم بھی اسی کے لیے چرائی ہوگی۔

''کیا تم اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی مزید بات کہتی۔ دروازے سے ایک اور گاہک اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' مجھے اس عورت پر ترس آ گیا۔ ''اگلی بار آؤ تو اس کے پیسے بھی دے دینا۔''

اس کے جانے کے بعد خیال آیا کہ مجھے اس سے پیسوں کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ بے چاری غریب عورت نہ جانے کس طرح حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ یہی غنیمت ہے کہ اس کے پاس سر چھپانے کے لیے ٹھکانا تھا۔ ورنہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

اگلے ہفتے وہ آئی تو اس نے آئس کریم خریدی اور اس کی قیمت بھی ادا کر دی لیکن پچھلا حساب پھر بھی باقی رہا۔ میں نے سوچا کہ اسے یاد دلاؤں لیکن عین اسی وقت ایک اور عورت اپنے بچے سمیت وہاں آ گئی۔ وہ جلدی میں تھی، اس کا شوہر گاڑی میں گیس بھروا رہا تھا چنانچہ میں اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

مسز ریس ہر جمعرات کو آتی اور اپنے بیٹے کے لیے آئس کریم خرید کر لے جاتی لیکن پہلی بار اس نے جو آئس کریم چرائی تھی اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ وہ عموماً خاموش رہتی لیکن میری باتیں بڑی دلچسپی سے سنتی تھی۔ بعض اوقات وہ دکان میں گھوم پھر کر دوسری اشیا کا جائزہ لیتی لیکن اس نے آئس کریم کے علاوہ کبھی کوئی چیز نہیں خریدی۔ یہاں تک کہ اسنال پر رکھے ہوئے



اخبارات کو بھی ہاتھ نہ لگایا، یوں لگتا تھا جیسے اسے دنیا میں آئس کریم کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ کرسمس کے موقعے پر میں نے اسے مبارکباد دی اور اپنی جانب سے ایک آئس کریم مفت پیش کی، جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا لیکن زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ ایک دفعہ میرا بھائی دکان پر آیا تو اسے نہ پہچان سکا۔ البتہ اسے دیکھ کر مسکرایا ضرور تھا اور یہ اس کی عادت تھی۔

وینڈی مجھ سے ملنے بہت کم آتی تھی۔ وہ اپنی ملازمت میں مصروف ہو گئی تھی۔ حالانکہ اسے ملازمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا شوہر یعنی میرا بھائی پانچ گیس اسٹیشن کا مالک تھا لیکن وینڈی کے لیے شاید یہ کوئی قابلِ فخر بات نہیں تھی اور شوہر کی دولت اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اب وہ ہمارے یہاں اتوار کے روز رات کے کھانے پر بھی نہیں آتی تھی۔ اس لیے اگست کی ایک سہ پہر میں اسے گیس اسٹیشن پر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتفاق سے مسز ریس بھی اس وقت آئی ہوئی تھی۔ وینڈی نے اسے دیکھا اور مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

''تم جانتی ہو کہ یہ عورت کون ہے؟''

''ہاں۔''

''اس کے باوجود تم نے اسے یہاں آنے دیا۔''

میں نے اپنے کندھے اچکائے اور بے پروائی سے بولی۔ ''اس نے کوئی جرم نہیں کیا اور ویسے بھی یہ ایک دکان ہے اور یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے۔''

وینڈی نے مجھے گھورا اور مسز ریس کے پاس گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس کی خیریت دریافت کرے گی لیکن اس نے ہمیشہ کی طرح بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں کیا لینے آئی ہو۔ تمہیں کوئی اور جگہ نہیں ملی؟''

مسز ریس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت ایک جنتری دیکھ رہی تھی۔ اس نے وہ جنتری واپس اپنی جگہ پر رکھی اور لمحہ بھر کے لیے میری جانب دیکھا۔ شاید اتنے عرصہ میں پہلی بار ہم دونوں کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ یہ کوئی عام انداز نہ تھا بلکہ اس لمحے کی گرفت نے ہم دونوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں اپنی اپنی حیثیت کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ نہ میں ایک مصیبت زدہ عورت تھی اور نہ وہ ایک قاتل کی ماں۔ بس ہم دونوں میں ایک ہی قدر مشترک تھی اور وہ یہ کہ وینڈی ہمیں ناپسند کرتی تھی۔

جب وینڈی واپس میرے پاس آئی تو میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ میرا مسئلہ ہے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال میں یہ بتانے آئی تھی کہ تمہارے بھائی کی چالیسویں سالگرہ قریب آ رہی ہے اور میں اسے دھوم دھام سے منانا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ اس روز تمہیں کوئی اور مصروفیت نہیں ہوگی۔''

☆☆☆

سنی کی سالگرہ پر اسے کیا تحفہ دوں۔ یہ سوال مجھے پریشان کیے دے رہا تھا۔ میں ایسے شخص کو کیا تحفہ دے سکتی تھی جس نے پہلے ہی مجھے بہت کچھ دے رکھا ہو، جس نے مجھے غربت کے عذاب سے بچا لیا، جو برسوں سے میری اور میرے بچوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا، جو گھنٹوں میرے لڑکوں کے ساتھ بیس بال کھیلتا اور ان سے باپ جیسی شفقت سے پیش آتا تھا۔ اس کے لیے کپڑے، کتابیں، گھڑیاں سب بے حقیقت ہیں۔ اگر میں اپنا گھر گروی رکھ کر اس کے لیے کوئی خاص چیز خریدتی تب بھی اس کی کوئی اہمیت نہ ہوتی اور نہ ہی وہ مجھے اتنے پیسے خرچ کرنے دیتا۔ اس کے لیے کوئی منفرد اور انوکھا تحفہ ہونا چاہیے، بالکل اسی کی طرح کچھ خاص۔

کئی دنوں تک میں اسی سوچ میں گرفتار رہی پھر اچانک ہی جمعرات کی ایک گرم دوپہر مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ستمبر کا مہینا تھا اور خوشگوار موسم نے طبیعت میں جولانی بھر دی تھی۔ میں حسب معمول اپنی دکان میں چیزوں کو ترتیب دینے میں مصروف تھی کہ مسز ریس اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی میرے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں اور مجھے یاد آ گیا کہ میرا بھائی کس موضوع پر بہت زیادہ بات کیا کرتا تھا اور وہ کون سی حقیقت ہے جس نے اسے دوسروں سے ممتاز بنا دیا ہے اور وہ تھی جیرڈ ریس کے ساتھ اس کی ہمدردی اور مہربانی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی تک ان لمحات کو فراموش نہ کر پایا ہوگا۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں؟'' میں نے مسز ریس کو دیکھتے ہی کہا۔

اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہی ہوگی کہ میں اس سے اس آئس کریم کے پیسوں کا تقاضا کروں گی جو اس نے کئی ماہ پہلے میری دکان سے چرائی تھی۔ وہ میری مقروض تھی اور ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ کبھی نہ کبھی میں ان پیسوں کے لیے تقاضا ضرور کروں گی۔ میں نے اسے زیادہ دیر پریشان رکھنا مناسب نہ سمجھا اور بولی۔

''کیا تم اپنے بیٹے سے کہہ سکتی ہو کہ وہ میرے بھائی کو سالگرہ کی مبارکباد کے حوالے سے ایک خط لکھے؟''

وہ اب بھی کچھ نہ بولی۔ شاید میں نے اس سے کوئی بہت ہی قیمتی چیز مانگ لی تھی۔ اتنا تو میں جانتی تھی کہ جیرڈ بہت اچھا پینٹر تھا اور اس جیسے شخص کی لکھی ہوئی کوئی بھی تحریر منہ مانگے داموں فروخت ہوسکتی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے میں نے سوچا کہ اپنے الفاظ واپس لے لوں اور مسز ریس کو منع کردوں کہ وہ اپنے بیٹے سے کچھ نہ کہے لیکن پھر میری نظروں کے سامنے بھائی کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ اس خط کو پڑھ کر کتنا خوش ہوگا۔ یہ صرف میں ہی جانتی تھی۔ اس لیے میں نے مسز ریس سے کچھ نہ کہا۔

اگلی جمعرات وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس نے وہ لفافہ کاؤنٹر پر رکھا اور کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ اس روز اس نے آئس کریم بھی نہیں خریدی۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ اب کبھی دوبارہ اسے نہیں دیکھ پاؤں گی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھولا اور خط پڑھنے لگی۔ جیرڈ نے بڑے بڑے لفظوں میں لکھا تھا۔

"ڈیئر سنی۔ سالگرہ مبارک ہو۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولا۔ اس اسکول میں تم ہی واحد شخص تھے جس نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ اس مہربانی کے لیے تمہارا شکریہ، جیرڈ۔"

میں بہت دیر تک اس خط پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ مجھے بہت خوشی ہورہی تھی۔ شاید پوری زندگی میں پہلی بار میں نے کوئی صحیح کام کیا تھا۔ اس خط کو پڑھ کر میرا بھائی کتنا خوش ہوگا۔ میں اسے قیمتی سے قیمتی تحفہ دیتی تب بھی اسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ میں نے اپنے لیے ایک آئس کریم نکالی، ورنہ عام طور پر کبھی ایسا نہیں کرتی تھی کیونکہ مجھ پر ہمیشہ بچت کرنے کا جنون سوار رہتا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن ہی جیرڈ جیل سے فرار ہوگیا۔ اس جیل کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جب کوئی قیدی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوسکا تھا۔ اخبارات نے اس خبر کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ اس خبر کو سننے کے بعد مجھے لاتعداد اندیشوں نے گھیر لیا۔ جیرڈ کا لکھا ہوا خط ابھی تک میری جیب میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے باہر نکالا اور اپنے سینے سے لگالیا۔ بیس سال سے ہمارا اس سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور اب اس کے فرار ہونے سے صرف ایک دن پہلے ہی میں نے اس کی ماں سے فرمائش کی تھی کہ وہ سنی کی سالگرہ کے موقعے پر اس کے نام ایک خط لکھے۔ کیا یہ محض اتفاق تھا یا اس کے نتیجے میں مزید واقعات جنم لے سکتے ہیں۔ اگر جیرڈ جیل سے فرار ہونے کے بعد میرے بھائی سے ملنے چلا گیا۔ اگر اب بھی اس نے سنی کو اپنا دوست ہی سمجھا تو یہ دوستی میرے بھائی کو بہت مہنگی پڑسکتی ہے۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ جیرڈ اور سنی کی کبھی ملاقات نہ ہو۔

میں نے وہ خط چھپا دیا۔ جیرڈ کے فرار کے بعد صورت حال بدل چکی تھی۔ اب میں اپنے بھائی کو اس خط کے بارے میں بھی نہیں بتاسکتی تھی۔ اس طرح نہ صرف اسے مایوسی ہوتی بلکہ وینڈی بھی طعنے دے دے کر میرا جینا حرام کردیتی۔ میرے ذہن میں اس کا نفرت آمیز چہرہ اور حقارت بھری مسکراہٹ ابھرنے لگی۔ شاید اس بار وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہوتی۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک بار مسز ریس سے مل لوں۔ شاید اسے اپنے بیٹے کے بارے میں کوئی علم ہو۔ یہ سوچ کر میں اس کے گھر کی جانب روانہ ہوگئی جو میرے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے صدر دروازے کی گھنٹی بجائی اور غیر ارادی طور پر میری نگاہ گیرج کی جانب چلی گئی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں جیرڈ نے ان تمام عورتوں کو قتل کیا تھا، مجھے جھرجھری سی آگئی۔ کہیں وہ اندر نہ چھپا بیٹھا ہو۔

مسز ریس نے دروازہ کھولا تو میں اسے ایک لمحے کے لیے نہ پہچان سکی کیونکہ اس نے ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا اور اپنی عمر سے کہیں کم نظر آرہی تھی۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "تمہیں اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ وہ میرے بھائی سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔"

اس نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی اس کی آواز نہ سن سکوں گی۔ میں نے ہمیشہ اسے سر ہلاتے ہی دیکھا لیکن آج تک اس کی آواز نہیں سنی۔ اچانک ہی مجھے اس سے خوف آنے لگا۔ آخر وہ بھی تو ایک قاتل کی ماں ہی تھی۔

"وہ میرا بھائی ہے اور مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ تھوڑا سا کسمسائی جیسے اپنی بے بسی کا اظہار کررہی ہو اور میں سمجھ گئی کہ وہ کچھ بھی نہ کرسکے گی۔ وہ پہلے بھی نہیں بول سکی اور آئندہ بھی چپ ہی رہے گی۔ شاید اسے کسی کی بددعا لگی تھی۔ اس نے گھوم کر گیراج کی طرف دیکھا اور میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اس کے بیٹے کا چہرہ آگیا۔ میں نے اس عورت کے پاس رک کر وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سنی کو اس معاملے سے آگاہ کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے اس کے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔

بیرونی دروازہ مقفل نہیں تھا۔ میں سیدھی اندر چلی گئی



لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے لونگ روم میں کھڑے ہوکر اسے پکارا۔ "وہاں سب کچھ ہمیشہ کی طرح ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ البتہ قالین پر پڑے ایک گلاس کو دیکھ کر میں چونک گئی اور میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں نے ایک بار پھر اسے آواز دی اور کچن کی طرف بھاگی۔ وہاں سے ایک راستہ تہہ خانے کو جاتا تھا۔ یہ مجھے اس لیے یاد رہا کہ ایک مرتبہ میری بھتیجی تہہ خانے کی سیڑھیوں سے نیچے گر گئی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں وہی منظر گھوم گیا تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

سنی ایک اسٹول پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے اسکاچ کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ وہ کافی تھکا ہوا اور پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ اسے صحیح سلامت دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور بولی۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ مجھے دیکھ کر اپنی گرم جوشی کا اظہار ضرور کرتا۔ مجھے اس کے رویے پر بڑی حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"وینڈی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔ "وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگئی ہے۔ ہمیں لنچ پر ملنا تھا لیکن وہ ریسٹورنٹ نہیں پہنچی۔ میں نے اسے ہر جگہ تلاش کرلیا لیکن وہ نہیں ملی۔"

مجھے فوراً جیرڈ ریس کا خیال آیا۔ وہ یقیناً میرے بھائی سے ملنے آیا ہوگا۔ اسی وقت وینڈی بھی گھر آرہی ہوگی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھائی کی جگہ وینڈی سے اس کا سامنا ہوگیا ہو۔

"نہیں۔" میں نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ بے چاری وینڈی۔ پھر مجھے ان عورتوں کا خیال آیا جن کے ساتھ جیرڈ نے وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ ان کے جسم کے حصے دریا سے ملے تھے۔

"وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی۔" میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میری غلطی کی وجہ سے ایسا ہوا۔"

"تمہاری اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔" وہ اپنا زرد چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "تم نہیں جانتیں کہ وہ کیا چاہتی تھی، میں تو کئی سالوں سے یہ توقع کررہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ کبھی میرے ساتھ خوش نہیں رہی۔"

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا اور بولی۔ "میں تمہیں کچھ بتانا چاہ رہی ہوں۔ ممکن ہے تم اس پر یقین نہ کرو کہ میں اتنی احمق بھی ہوسکتی ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اسے ساری بات بتادی کہ میں اسے سالگرہ کا تحفہ دینے کے بارے میں کتنی پریشان تھی پھر ریس کی ماں سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے اس سے سنی کے نام خط منگوایا لیکن نہیں جانتی تھی کہ یہ کتنا نقصان دہ ہوگا۔

"وہ جیل سے فرار ہوچکا ہے۔" میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "وہ یقیناً تمہاری تلاش میں آیا ہوگا اور تمہاری جگہ اسے وینڈی مل گئی۔ ہمیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔"

میں نے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اس نے آہستہ سے مجھے تھپکی دی اور بولا۔

"تم نے کچھ غلط نہیں کہا۔ یہ میری غلطی تھی، میں نے اسے مار دیا۔"

اس نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔ اس وقت مجھے اس کا چہرہ پہلے سے بالکل مختلف نظر آیا۔ وہ شخصیت جو ہمیشہ سے اس کی پہچان تھی، کہیں غائب ہوچکی تھی۔ وہ ایک سرد اور بے حس انسان نظر آرہا تھا۔ یہ وہ سنی تو نہیں تھا جس سے میں محبت کرتی تھی۔ کیا اسے پہچاننے میں مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے وینڈی کے بارے میں سوچا جو ہمیشہ ناراض اور غیر مطمئن نظر آئی اور اکثر سنی کو چھوڑ جانے کی دھمکی دیتی رہتی تھی۔

"ہمارا جھگڑا ہوگیا تھا۔" اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "میرا اسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن....."

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولا۔ "دیکھا جائے تو یہ بھی ایک طرح سے تحفہ ہی ہے۔ پولیس تو یہی سمجھے گی کہ ریس نے اسے قتل کیا ہے۔"

مجھے دور کہیں سے خطرے کی گھنٹیاں سنائی دیں۔ وینڈی کہا کرتی تھی کہ جیرڈ ریس کے اندر ایک شیطان چھپا بیٹھا ہے۔ اس کے یہ الفاظ سن کر میں ہمیشہ پریشان ہوجاتی تھی لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایسا کیوں کہتی تھی۔ میرے بھائی کو چاہیے تھا کہ وہ بھی جیرڈ کے اندر چھپے ہوئے شیطان کو پہچان لیتا اور اس سے دور رہتا۔ جیری سے دوستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے درمیان ذہنی مطابقت بڑھتی گئی۔ سنی فطرتاً نیک تھا اس لیے شیطانی قوت کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا لیکن ایک وقت ایسا آیا جب وہ اپنا کام دکھانے میں کامیاب ہوگئی۔

یہ سب کچھ جان لینے کے باوجود میں کچھ نہ کرسکی کیونکہ مجھے سنی سے پیار تھا اور میں اسے کسی قیمت پر نہیں کھونا چاہتی تھی۔

# محفل شعر و سخن

❁ امتیاز احمد زریاب.....علی چک لالہ موسیٰ

ہو گئیں سب باتیں اگلی واہ رے یہ انقلاب
یاد تھی جو عیب کی اب وہ ہنر کی بات ہے

❁ ایم ڈبل اے.....مانسہرہ

آنکھ سے پھر اک آنسو ٹپکا اور پھر اک جگ بیت گیا
لیکن تیری یاد کا سایہ اب بھی گہرا گہرا ہے
جیون رستے ہنستے بستے پلک جھپکتے دھول ہوئے
شہر جہاں آباد تھا پہلے آج وہاں سناٹا ہے

❁ محمد امین.....گویمار، کراچی

یاد کرو گے ہم کو جب ہم اٹھ جائیں گے دنیا سے
ملتے کب تقدیر سے ایسے ناز اٹھانے والے ہیں

❖ ❖ ❖

❁ سلیم عثمانی بھون.....تحصیل کلر کہار

عجب طور دیکھے اس دور کے انسانوں میں
اہلِ گفتار تو بہت ہیں اہلِ کردار کا پتا نہیں!

❁ حسنین عباس بلوچ.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی!
اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

❁ طاہر سلیم.....کراچی

راتوں کو سو نہ پاؤں اب اتنا بھی ظلم نہ کر
دیکھ صبح ہوگئی ہے تجھے یاد کرتے کرتے

❁ ردمانہ سحر.....میر پور خاص

سورج کے ساتھ ڈوب گیا میرا دل بھی آج
اتنا اداس شام کا منظر کبھی نہ تھا

❁ نصر حیات.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

میں سنگ صفت ایک ہی رستے میں کھڑا ہوں
شاید مجھے دیکھیں گی پلٹ کر تیری آنکھیں
یوں دیکھتے رہنا اسے اچھا نہیں محسن
وہ کانچ کا پیکر ہے تو پتھر تیری آنکھیں

❁ مرزا طاہر الدین بیگ.....میر پور خاص

ملے ہیں زخم محبت میں اس قدر ہم کو
اداس اتنے ہوئے مرہموں کو بھول گئے
بہت قریب سے گزرے ہیں دشت کے جھونکے
ہوائے صبح کی ہم لذتوں کو بھول گئے

❁ امبر ناز.....ملتان

عمر ساری تو بہت دور کی بات تھی
ایک لمحے کے لیے کاش وہ میرا ہوتا!

❁ حسن عقیل چٹھہ.....حافظ آباد

زندگی کاش تو ہی روٹھ جاتی مجھ سے
یہ روٹھے ہوئے لوگ مجھ سے منائے نہیں جاتے!

❁ راجا افتخار علی افتی.....چوآسیدن شاہ

راتوں کی خاموشی میں میرے دل پہ رکھ کے ہاتھ
لیتی ہے کائنات سہارا کبھی کبھی
اس طرح کبھی وہ آتے ہیں آغوشِ شوق میں
گرتا ہے جیسے ٹوٹ کے تارا کبھی کبھی

❁ تنویر احمد.....دادو

تکتے نہیں جب پاؤں زمیں پر تو فضا میں
ذروں کی طرح لوگ بکھر کیوں نہیں جاتے



❁ علی آتش.....الہ آباد

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

❁ محمد اسماعیل اجاگر.....پنڈی گھیب

احساس کے انداز بدل جاتے ہیں ورنہ
آنچل بھی اسی تار سے بنتا ہے کفن بھی

❁ ڈاکٹر وسیم خالق گھمیاں.....گجرات

انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

❁ محمد رشید سیال.....سکھر

کچھ اور بیتتے کچھ اور جی بہل جاتا
بس اتنی دیر ذرا چاند اور ڈھل جاتا

❁ طاہرہ یاسمین.....سرگودھا

اسے میں دل میں رکھ لیتی اگر ہوتا یہ بس میں میرے
اسے سب دیکھتے ہیں مجھ سے یہ دیکھا نہیں جاتا

❁ محمد امجد ریاض.....ساہیوال

ترا آستاں جو مل نہ سکا، تری راہ گزر کی زمیں سہی
ہمیں سجدہ کرنے سے کام ہے جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

❁ تفسیر عباس بابر.....اوکاڑہ

کتنا محتاط ہے انساں پھر بھی!
ہو ہی جاتا ہے حادثہ کوئی

❁ ماہا ایمان.....حافظ آباد

یہ جو پرشکستہ ہے فاختہ، یہ جو زخم زخم گلاب ہے
یہ ہے داستاں میرے عہد کی جہاں ظلمتوں کا نصاب ہے
جہاں ترجمانی ہو جھوٹ کی، جہاں حکمرانی ہو لوٹ کی
جہاں بات کرنا محال ہو، وہاں آگہی بھی عذاب ہے

❁ علی طارق چٹھہ.....حافظ آباد

اب جہاں میں ہوں وہاں آرام ہی آرام ہے
یہ بھی کوئی زندگی ہے درد سر کوئی نہیں

❁ فرحانہ سعید قاسمی.....ڈلوال، چکوال

شام پھیلی ہے تیرے سرمئی آنچل کی طرح
چاند نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے پاگل کی طرح

❁ وزیر محمد خان.....بٹل ہزارہ

مٹ گئے ہم تیرے غم میں تو کہا لوگوں نے
یہ کوئی بات نہ تھی جاں سے گزر جانے کی

❁ سید محی الدین اشفاق.....فتح پور (لیہ)

اس شہر میں آباد غریب الوطنی ہے
غربت کے یہاں نام ہیں کچھ اور طرح کے

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی

مجھے اشتہار سی لگتی ہیں یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سنا کرو، جو سنا نہیں وہ کہا کرو

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر.....نئی منڈی سکھیکی

رخصت ہوا تو ہر اک بات میری مان کر گیا
جو کچھ بھی اس کے پاس تھا مجھے دان کر گیا
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

❁ محمد طاہر ندیم سیال.....جھنگ

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جائے گا اب بھی تو نہ میرا گھر کہے بغیر

❁ عدنان صدیقی.....ملتان

ورق ورق پہ تیری عبارت تیرا فسانہ تیری حکایات
کتابِ ہستی جہاں سے کھولی تیری محبت کا باب نکلا

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

کوئی پل تو تیرے ساتھ کا میری عمر بھر کو سمیٹ لے
میں فراق کے سارے سفر اسی ایک پل میں گزار دوں

❁ ظفر اقبال ظفر.....کامرہ، شرقی

لٹی جو فصلِ بہاراں تو عجیب منظر تھا
خالی تکتے تک رو دیے ایک دوسرے کے گلے لگ کر

❁ راجا ضیاالحسن کیانی ایڈووکیٹ.....ماہیوال

غم دنیا، غم عقبیٰ، غم دوراں، غم دوست
جس جگہ میں ہوں، فرشتہ ہو تو پاگل ہو جائے

❁ افتخار احمد تارڑ.....کوٹ قادر بخش

اس رنگ و بو کی دنیا میں ہر سمت نظارے بکھرے ہیں
اک پھول ہی پہ موقوف نہیں گلشن میں بہت ہے زیبائی

❁ سید مازر خرم.....لاہور

جو نظر بچا کے گزر گئے میرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ مرے ہی شہر کے لوگ ہیں مرے گھر سے گھر ہے ملا ہوا

❄ عارف عاجز......لاہور
اٹھنے لگیں زخموں سے تو کچھ اور بھی ٹیسیں
اے چارہ گر وا! درد کا مرہم ہے یہ کیسا

❄ سعید عباسی......بہاولپور
تیری یاری میں گیا اب ہم سے یاروں کا ملاپ
ایک ملنے سے ترے چھوٹے ہزاروں کا ملاپ

❄ احسان شاکر......چوہوان
سجدوں کے عوض فردوس ملے یہ بات مجھے منظور نہیں
بے لوث عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں

❄ شازیہ گلزار......بھکر
جو پائی بزم میں ساقی تری جگہ خالی
بھر آیا دیکھ کے دل ساغر وسبو کی طرف

❄ ارسلا افضل......روجڑی
اٹھ گیا ہے کون پہلو سے کہ گھبرائے ہوئے
دیکھتے ہیں گھر میں ہم دیوار ودر چاروں طرف

❄ رضوان احمد......لاہور
آنکھوں میں روتے روتے نم بھی نہیں ہے اب تو
تھے موجزن جو پہلے طوفان! اب کہاں ہیں

❄ محمد زریان سلطان......اردو بازار، کراچی
جی لگے کیوں کر مرا تجھ بن کہ نظروں میں مری
گھر ہے ویرانہ سا بھی اور شہر اک جنگل سا ہے

❄ مولا بخش......میرپور ساکرو
ہوگیا صبح وقت بھی منہ دیکھ کے فق
ہم جو محشر میں گئے چاک گریبان گئے

❄ شبیر قائم خانی......میرپور خاص
ہوتے ہیں تیری بزم میں خوش کب شمع صف ہم سوختہ جاں
جلتے شام کو آتے ہیں اور روتے سحر کو جاتے ہیں

❄ شہلا فاروقی......کراچی
اک حرفِ محبت نے یہ طوفان اٹھایا
ہم سارے کتب خانے کو دریا میں ڈبو آئے

❄ ماجد احمد......کراچی
سن لو جو ہے خانۂ زنداں میں دیوانوں کا حال
کر کے برپا غل سدا زنجیر کچھ کہتی تو ہے

❄ نوید اقبال......سعود آباد، کراچی
جواب دے ہے مجھے لو سنو طبیب کی بات
یہ اس کی بات نہیں ہے مرے نصیب کی بات

❄ نوروز خان......چارسدہ
نام ہے بدنام مے کا ورنہ اس سے بھی سوا
مست ہوجاتا ہے انساں نشۂ دولت کے وقت

❄ رمزی آثم......ملتان
بس ایک نام ہے تیرا جو دل کے گنبد میں
ازل سے گونج رہا ہے کسی اذاں کی طرح

❄ مون......اٹک سٹی
یہ کیسا خواب آیا ہے اچانک
ہوئی ہے آنکھ بھی حیران میری

❄ ذیشان منہاس......گلشن اقبال
ہجر ہو یا وصال کی خواہش
کام لگتے ہیں سب فضول مجھے

❄ سمیرا طارق......ساہیوال
یہ چاند اور ستارے رفیق ہیں میرے
میں روز ان سے بیاں اپنا حال کرتا ہوں

❄ فضیلہ قریشی......فیصل آباد
نظر میں رنگ سے بکھرے ہوئے ہیں
کوئی صورت بنانے میں لگا ہوں

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
کہ لہروں کی طرح ساحل سے ٹکرایا نہیں کرتے

❄ احمر علی......گوجرانوالہ
ٹوٹ گیا آنکھوں میں سپنا چھوڑ دیا یاروں نے ساتھ
راہِ سفر میں سب کے ہی پیمان وفا بے کار گئے

کوپن
برائے شمارہ
جولائی
2011

محفلِ شعر و سخن

نام: ____________________

پتا: ____________________



کبھی کبھی عقل کے گھوڑے دوڑانے والے... بے وقوفی کے ہاتھوں دوڑتے دوڑتے نڈھال ہوکر گر جاتے ہیں... ایسے میں بے بسی ان پر ہنستی ہے جنہیں پچھتانے کا موقع بھی میسر نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مقام پر نکل آئے تھے جہاں وہ رونا نہیں چاہتے تھے اور ہنسنا ان کے مقدر میں نہ تھا۔

عقل سے پیدل چند داناؤں کی نادانی کا قصۂ تمام

# ٹوٹی کہاں کمند

سلیم انور

''جلدی سے، ادھر۔'' سائمنڈ نے ہانپتے ہوئے کہا۔
وہ ایک چھوٹی سی گلی میں گھوم گیا تھا۔ میں اندھا دھند اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سائرن کی آوازیں نزدیک آتی جارہی تھیں۔ تھوڑی دور جانے کے بعد گلی بند ہوگئی تھی۔
ہم رک گئے۔
''واپس چلو۔'' سائمنڈ نے کہا۔ اتنے میں سڑک سے ایک پولیس کار تیزی سے گزری۔ پھر کار کے ٹائر چرچرانے اور بریک لگنے کی آواز آئی۔
''ہم پھنس چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب کیا کریں؟''
''ادھر اندر چلو۔'' سائمنڈ نے ایک دروازے میں گھستے ہوئے کہا جو قدرے کھلا ہوا تھا۔
میں بھی اس کے پیچھے اندر جا گھسا۔
ہم نے خود کو ایک کمرے میں پایا جو دیکھنے میں اسٹور روم لگ رہا تھا۔ ایک طرف لکڑی کے بہت سے بکس ترتیب سے رکھے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے غور سے دیکھا تو خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرگئی۔
وہ تابوت تھے!
''ہم کہاں آگئے ہیں؟'' میں نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ میری نگاہیں ان تابوتوں پر مرکوز تھیں۔

"یہ تکفین وتدفین کرنے والے ایک ادارے کا دفتر ہے۔ جب ہم فلیٹ کی طرف جارہے تھے تو میں نے سڑک پر اس کا بورڈ لگا ہوا دیکھا تھا۔ یہ اس دفتر کا عقبی حصہ ہے!"

"کیا تمہارے خیال میں پولیس والے ہماری تلاش میں یہاں آسکتے ہیں؟" میں نے سائمنڈ سے سوال کیا۔

"ہوسکتا ہے کہ آجائیں۔" سائمنڈ نے جواب دیا۔

"پھر تو ہم مارے گئے!"

ہمیں مادام کونیسا کے لگژری اپارٹمنٹ میں گھس کر اس کا مشہور و معروف ڈائمنڈ نیکلس چوری کرنے کا آئیڈیا بہت اچھا لگا تھا کیونکہ وہ ہوٹل ساوی میں اطالوی سفیر کے ہمراہ لنچ پر مدعو تھی اور خالی اپارٹمنٹ میں واردات کرنے کا اس سے بہتر موقع پھر ہاتھ نہیں آسکتا تھا۔

ہم اس واردات میں کامیاب ہوگئے تھے اور ہیروں کا وہ نیکلس اس وقت سائمنڈ کی جیب میں تھا۔

لیکن یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ یا تو مادام کونیسا کے پڑوسیوں کے کان بہت تیز تھے یا پھر اس کے لگژری اپارٹمنٹ کے برگلر الارم کا کنکشن مقامی پولیس اسٹیشن سے تھا۔ ابھی ہم نے اس بلڈنگ سے قدم باہر رکھا ہی تھا کہ ہمارے کانوں میں پولیس سائرن کی مدھم آوازیں سنائی دیں جو بتدریج نزدیک آتی جارہی تھیں۔

ہم دوڑ پڑے۔

ہمیں خطرہ تھا کہ اگر پکڑے گئے تو سزاؤں کے پچھلے حوالوں سے اس بار ہمیں ملکۂ برطانیہ کے مخصوص قید خانوں میں سے کسی میں طویل تعطیلات گزارنا پڑجائیں گی۔

"حواس باختہ مت ہو۔" سائمنڈ نے کہا۔ "ہم ابھی پکڑے نہیں گئے ہیں۔ اس طرف چلو!"

ہم ایک بھاری سے پردے کے عقب میں چلے گئے۔ وہاں ایک دروازہ تھا۔ جب ہم اس دروازے کی دوسری طرف پہنچے تو خود کو ایک استقبالیہ میں پایا۔ وہ ایک بڑا کمرا تھا اور اس میں تین دروازے بنے ہوئے تھے جو باہر کی سمت کھل رہے تھے۔ ان میں سے ایک باہر سڑک پر کھلتا تھا جو یقیناً اس ادارے میں داخل ہونے کا مرکزی دروازہ تھا۔

"رک جاؤ۔" سائمنڈ نے کہا۔ "میں اس ایک دروازے کو چیک کرتا ہوں۔"

اس نے سائڈ کے ایک دروازے کو کھولا اور اس سے گزر کر اندر کہیں غائب ہوگیا۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد وہ نمودار ہوا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس طرف نہیں۔"

پھر اس نے ایک اچٹتی نگاہ دوسرے دروازے پر ڈالی اور ایک بار پھر نفی میں سر ہلانے کے بعد سڑک کی جانب کا دروازہ کھولا اور بولا۔ "آجاؤ۔ باہر نکلنے کا بس یہی ایک راستہ ہے۔"

میں حواس باختہ اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔ پولیس باہر سڑک پر ہمارے دائیں جانب تھی۔ ہم بائیں طرف گھوم گئے۔

میں شاید دوڑ پڑتا لیکن سائمنڈ نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "چلتے رہو۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اپنی جانب توجہ مبذول مت کراؤ!"

سائمنڈ کی اس بات میں وزن تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز نہیں کی لیکن ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ہمیں اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنائی دی جو تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی اور معمول کی رفتار سے قدم بڑھاتے رہے۔ قدموں کی چاپ جب ہمارے بالکل عقب میں آن پہنچی تو ساتھ ہی ایک آواز سنائی دی۔

"پلیز، ایک منٹ جنٹلمین۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

ہم آواز کی سمت پلٹ گئے۔

وہ انسپکٹر ڈوڈون تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس کا میں کسی طور سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں میری گزشتہ پیشی کا ذمے دار یہی شخص تھا۔

"ویل! ویل!" وہ کورنش بجالانے کے انداز میں گویا ہوا۔ "تمہیں دوبارہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم رہا ہوگئے ہو، سائمنڈ!"

"میں گزشتہ ماہ رہا ہوگیا تھا مسٹر ڈوڈون!" سائمنڈ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"اور اب تم واپس اندر جارہے ہو۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کس لیے؟" سائمنڈ نے معصومیت سے پوچھا۔

میں سائمنڈ کے لہجے کی معصومیت پر حیران رہ گیا۔

اس نے ہم دونوں کو ایک پولیس کار میں گھسیڑ دیا اور سیدھا تھانے لے گیا۔ سائمنڈ تمام راستے شور کرتا رہا لیکن اس کے احتجاج پر کسی نے کان نہیں دھرا۔ البتہ میں خاموش بیٹھا رہا اور میں نے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

تھانے میں ہم دونوں کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں لے جایا گیا اور پوچھ گچھ شروع ہوگئی۔

چونکہ ہیروں کا نیکلس سائمنڈ کے پاس تھا، سو میں نے اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے ہر سوال کا جواب نفی میں دیا۔ البتہ مجھے بے چارے سائمنڈ پر رحم آرہا تھا۔ اس کی جاں بخشی ناممکن تھی۔ میرے خیال سے نیکلس کی چوری کے جرم میں میرے شریک کار ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آرہی تھی۔ میں



پرامید تھا کہ پوچھ گچھ کے بعد مجھے چھوڑ دیا جائے گا۔

جب میں نے انسپکٹر ڈوڈون کو یہ بتایا کہ میری اپنے پرانے دوست سائمنڈ سے اتفاقاً چند لمحوں قبل ملاقات ہوئی تھی جب پولیس نے ہم دونوں کو اٹھایا تھا۔ اس اتفاقیہ ملاقات کا جشن منانے کے لیے ہم دونوں مے کدے کی جانب جارہے تھے کہ پولیس نے ہمیں اغوا کرلیا اور تھانے لے آئی۔ اگر سائمنڈ نے کوئی چالبازی کی ہے تو مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔

چونکہ میری مکمل طور پر تلاشی لی جاچکی تھی اور کسی بھی معاملے میں میرے ملوث ہونے کا ثبوت پیش کرنے کی مبارزت کی میں انہیں دعوت دے چکا تھا تو مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے میری جاں بخشی کردیں گے۔

کچھ دیر بعد مجھے قدرے حیرانی ہوئی کہ انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

اس وقت تو مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب انہوں نے سائمنڈ کو بھی رہا کردیا۔

جب ہم پولیس اسٹیشن سے نکل رہے تھے تو سائمنڈ نے ان لوگوں سے کہا کہ جلد ہی انہیں اس کے وکیل کی جانب سے بلاجواز تھانے لے جانے کا نوٹس موصول ہوگا۔

ہم پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے بعد دور سڑک پر جارہے تھے تو میں نے سائمنڈ سے پوچھا۔ "تم نے اسے کہاں چھپایا تھا؟"

"تکفین وتدفین کے ادارے میں۔"

"وہ وہاں کی تلاشی تو لیں گے۔"

"ضرور لیں۔"

"انہیں نیکلس وہاں سے مل گیا تو وہ ہمیں واپس بلالیں گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" سائمنڈ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ اس جگہ کی بھرپور تلاشی لے لیں لیکن ہیرے انہیں نہیں ملیں گے۔"

"کیوں؟ تم نے انہیں کہاں چھپایا ہے؟"

"جس کمرے میں، میں گیا تھا وہ تجہیز وتکفین کرنے والے ادارے کا پرائیویٹ مردہ خانہ تھا۔ وہاں ایک کھلا ہوا تابوت رکھا تھا جس میں نیوی کے یونیفارم میں ایک بوڑھے شخص کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ہیروں کا وہ نیکلس اس لاش کے یونیفارم کی جیب میں چھپادیا تھا۔ اس ملک میں ایسا کوئی پولیس کا جوان نہیں جو اس لاش کے لباس کی تلاشی کی جرأت کرسکے۔" سائمنڈ نے کہا۔

مجھے اتفاق کرنا پڑا۔ اس موقعے کے لحاظ سے ہیروں کے نیکلس کو فوری طور پر چھپانے کی وہ ایک بہترین جگہ تھی۔ البتہ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ وقتی طور پر وہ ہیروں کا نیکلس ہمارے ہاتھ سے نکل چکا تھا لیکن دوسری جانب نیکلس ہمارے پاس سے برآمد نہ ہونے کی بنا پر ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے سے بچ گئے تھے۔

سائمنڈ نے یہ بات قبول کرنے سے انکار کردیا تھا کہ ہیروں کا وہ نیکلس ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ "ہم کل صبح وہاں جاکر اسے دوبارہ حاصل کرلیں گے۔" سائمنڈ نے مجھ سے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"احمق مت بنو!" میں نے اسے جواب دیا۔ "وہاں کل صبح کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہوگا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ آج وہ جگہ بالکل خالی تھی۔"

"تو پھر ہم۔" سائمنڈ نے ہمیشہ کی طرح پرامید لہجے میں جواب دیا۔ "ہم ان سے کہیں گے کہ ہم اپنے ایک پرانے دوست کو اپنا آخری خراج تحسین پیش کرنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ ہمیں مردہ خانے میں لے جائیں گے اور وہاں تنہا چھوڑ دیں گے۔ ہم لاش کے لباس میں سے ہیروں کا نیکلس نکال لیں گے۔ کچھ دیر وہاں موجود رہیں گے اور پھر چپکے سے نکل آئیں گے۔ اس سے زیادہ آسان بات اور کیا ہوسکتی ہے؟"

لہٰذا اگلے روز صبح سویرے ہم دونوں کار میں تجہیز وتکفین کے اس ادارے کے دفتر پہنچ گئے لیکن ہمیں دفتر کے سامنے کار پارک کرنے کی جگہ نہ مل سکی کیونکہ وہاں ایک میت گاڑی اور چند بڑی سیاہ لیموزین کاریں پہلے سے کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک شخص میت گاڑی کے عقبی حصے میں پھول سجانے میں مصروف تھا۔

ہمیں بلاک کے کارنر پر کار پارک کرنے کا موقع ملا۔ کار سے اتر کر ہمیں پیدل تجہیز وتکفین کے ادارے کے دفتر تک جانا پڑا۔ جب ہم مرکزی دروازے تک پہنچے تو میت گاڑی اور لیموزین کاروں کا قافلہ وہاں سے روانہ ہوا چاہتا تھا۔

ہم پراعتماد قدموں سے چلتے ہوئے ادارے کے دفتر میں داخل ہوگئے۔ ہماری مڈبھیڑ ڈارک گرے سوٹ میں ملبوس ایک خوش وضع پستہ قد شخص سے ہوئی۔

"جی! میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟"

"ہم کپتان سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔" سائمنڈ نے جواب دیا۔

"معاف کیجیے، میں سمجھا نہیں؟" اس پستہ قد، خوش پوش شخص نے کہا۔

"ہماری مراد ایڈمرل سے ہے۔ ہم ان کی ماتحتی میں کام کرچکے ہیں۔ ہم انہیں اپنا آخری خراج تحسین پیش کرنا چاہتے

تھی۔" سائمنڈ نے اٹینشن ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کی مراد سر ہربرٹ پارکر اسمائتھ وکٹوریا کراس سے ہے تو پھر آپ کو پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ ان کی تدفین آج ہو رہی ہے۔ ان کی میت کا قافلہ ابھی ابھی یہاں سے روانہ ہوا ہے!"

"وہی قافلہ جو اس وقت روانہ ہو رہا تھا، جب ہم اپنی کار پارک کرنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے؟"

پستہ قد شخص نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سائمنڈ نے میرا بازو پکڑتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ گھسیٹا اور بولا۔ "جلدی چلو۔ ہمیں ان کے پیچھے جانا ہوگا!"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس قافلے کا پیچھا کرنے سے اسے کیا حاصل ہونے کی امید تھی۔ میرا مطلب ہے کہ ہم ان سے تابوت کو کھولنے کی درخواست نہیں کر سکتے تھے لیکن اس معاملے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

جب ہم دوڑتے ہوئے اس کار زر پر پہنچے جہاں ہم نے اپنی کار پارک کی تھی تو دیکھا کہ ہماری کار کو غلط جگہ پارک کرنے کی وجہ سے اس کے ٹائروں پر کلیمپ چڑھائے جا رہے تھے۔

ٹائروں پر کلیمپ چڑھانے والی ٹیم ابھی وہاں موجود تھی لیکن ہم ان سے کلیمپ اتارنے اور کار واپس کرنے کی درخواست نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ کار ہم نے اسی روز صبح سویرے چوری کی تھی۔

جب سائمنڈ نے مغلظات بکنا بند کیں تو پھر ہم پیدل بس اسٹاپ کی جانب چل دیے اور بس میں سوار ہو کر سائمنڈ کے ٹھکانے جا پہنچے۔

"کوئی پروا نہیں۔" میں نے سائمنڈ کو دلاسا دینا چاہا۔ "ہیروں کا نیکلس تو ہمارے ہاتھوں سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔"

"اوہ نہیں!" سائمنڈ نے غراتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہاتھ سے نہیں نکلا۔ اگر ہمیں پتا چل جائے کہ ان کی تدفین کہاں ہوئی ہے تو اندھیرا چھا جانے کے بعد ہم اس کی قبر کو کھود کر تابوت کے اندر سے نیکلس نکال لیں گے۔ حقیقت میں ہم اب بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ وہ وکٹوریا کراس اعزاز یافتہ تھے تو ان کے بارے میں اخبارات میں خبر ضرور شائع ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ ٹیلی وژن کی خبروں میں بھی ان کی تدفین کے بارے میں بتایا جائے!"

یہ ہولناک قدم اٹھانے کے تصور سے میرا رنگ پھیکا پڑ گیا لیکن جب سائمنڈ اپنا ذہن تیار کر لیتا تھا تو پھر اس کو اس کے ارادے سے باز رکھنا یا اس کی مزاحمت کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔

میری دانست میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ہمیں ایڈمرل کی تدفین کے صحیح مقام کے بارے میں پتا چل جائے۔ مان لیا جائے کہ قبرستان کا نام پتا چل جاتا ہے تو وہاں پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں قبریں ہوں گی اور اخبارات ہمیں یہ نہیں بتائیں گے کہ ان میں سے ایڈمرل کی تدفین کا پلاٹ کون سا ہے یا اس کی لوکیشن کیا ہے۔

ہماری وہ سہ پہر جھنجلاہٹ کے عالم میں گزری۔ میں نروس تھا اور اس کیفیت میں، میں نے کئی کپ کافی چڑھا لی جبکہ سائمنڈ خاموشی سے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا، سائمنڈ اس وقت کیا کرے گا اگر یہ آگاہی ہوتی ہے کہ سر ہربرٹ پارکر اسمائتھ وکٹوریا کراس کی لاش کا کریا کرم کر دیا گیا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ سائمنڈ ان کی راکھ کو بھی چوری کرنے کی کوشش کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔

آخر کار رات کے تفصیلی خبرنامے کا وقت ہو گیا۔

میں اور سائمنڈ دونوں ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے اور اپنی تمام تر توجہ اسکرین پر مرکوز کر دی۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھے ایڈمرل کی تدفین کی خبر نیوز بلیٹن میں شامل ہونے کی توقع نہیں تھی لیکن وہ خبر نیوز بلیٹن میں شامل تھی۔

"جٹ لینڈ کی جنگ کے ہیرو ایڈمرل سر ہربرٹ پارکر اسمائتھ، وکٹوریا کراس کی تدفین آج عمل میں لائی گئی۔ ان کا انتقال گزشتہ اتوار کو ہوا تھا اور ان کی عمر ایک سو آٹھ برس تھی۔ انہوں نے بطور مڈشپ مین نیوی میں شمولیت اختیار کی تھی....."

اس کے بعد سر ہربرٹ پارکر کے کیریئر کے بارے میں بتایا گیا اور یہ تفصیل بتائی گئی کہ انہوں نے وکٹوریا کراس کا اعزاز کس طرح جیتا تھا۔

"یہ رہا۔" سائمنڈ نے اسکرین پر تابوت کا منظر آتے ہی نعرہ لگایا۔ تابوت شاہی بحریہ کے پرچم میں لپٹا ہوا میت گاڑی سے اتارا جا رہا تھا۔ "اب بیک گراؤنڈ میں کسی نمایاں یادگار کو نوٹ کر لینا تاکہ ہمیں قبر کی تلاش میں اس سے مدد مل سکے!"

اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ اس مہم میں، میں مزید کسی کارروائی میں حصہ نہیں لوں گا۔ اگر سائمنڈ کو ہیروں کے نیکلس کی طلب اس بری طرح ہے تو وہ خود ہی ایڈمرل کی قبر کو کھودنے کی ذمے داری اپنے سر لے۔

البتہ مجھے اس بارے میں مزید کچھ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہم نے دیکھا کہ ایڈمرل کے تابوت کو ایک بحری جہاز پر لے جایا جا رہا تھا اور پھر خبر میں یہ بتایا گیا کہ.....

"سر ہربرٹ کی خواہش کے مطابق ان کے تابوت کو اس مقام پر جہاں انہوں نے عظیم بحری جنگ جیت کر وکٹوریا کراس حاصل کیا تھا، سمندر میں تہ نشین کر دیا گیا۔"



# خوب تر

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

**پل پل رنگ بدلتی..... ایک حسینہ کی بے قراری کا احوال**

اگر انسان کی فطرت میں جستجو نہ ہوتی تو شاید اسے قدم اٹھانے کا سلیقہ ہی نہ آتا... البتہ قدم اٹھانے سے پہلے درست سمت کا تعین کر لینا بھی ایک خوبی ہے جو شاید ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی... وہ بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں کسی روح کے مانند بھٹکتی پھر رہی تھی۔

رات تیزی سے گزر رہی تھی۔

کراچی جانے والی ایکسپریس ٹرین تھوڑی دیر کے لیے جام شورو کے اسٹیشن پر رکی۔ ڈبے میں زیادہ مسافر نہیں تھے اس لیے بیشتر مسافر پاؤں پسارے خراٹے لے رہے تھے، گاڑی چلنے والی تھی۔ انجن نے روایتی سیٹی بجائی۔

درمیانی عمر کا ایک شخص دوڑ کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اس کا لباس سادہ تھا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ چہرے پر زندگی کی سختیوں کے آثار نمایاں تھے۔ شاید وہ سکون کی دولت بہت پہلے کھو چکا تھا۔

ڈبے میں دو افراد ابھی تک جاگ رہے تھے۔ ایک نوجوان تھا، اس کی عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے ساتھ ایک عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ پردہ کیے ہوئے تھی۔ نوجوان نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی پھر اطمینان کی سانس لے کر ڈبے میں

ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ درمیانی عمر کا نووارد کچھ فاصلے پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کی نشست زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ اس جوڑے کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی توجہ انہی دونوں کی طرف تھی۔ گاڑی چلنے لگی۔ نوجوان نے سرگوشی میں اپنی ساتھی سے کہا۔ ''سورج جلد نکل آئے گا، ہم سات بجے تک کراچی پہنچ جائیں گے۔'' عورت نے چادر سے اپنا چہرہ اور چھپاتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں ڈرتی ہوں۔''

''تم کیوں ڈرتی ہو؟ کراچی بہت بڑا شہر ہے، وہاں ہمیں کوئی نہیں ڈھونڈ سکتا۔'' نوجوان نے تسلی دی۔

''کیا ایسا ہی ہوگا؟'' عورت نے بے یقینی سے پوچھا۔

''اور کیا۔'' نوجوان نے یقین سے جواب دیا۔

عورت نے درمیانی عمر کے نووارد کی طرف دیکھا اور سہم سی گئی۔ نوجوان نے محسوس کیا کہ نووارد اگرچہ ان کی طرف خاموشی سے دیکھ رہا ہے لیکن اس کی نگاہوں میں تجسس یا بدتمیزی کی چمک نہیں تھی، نوجوان مسکرایا اس نے سوچا، عورتیں فطری طور پر بزدل ہوتی ہیں، پھر وہ اپنا منہ عورت کے کان کے قریب کر کے بولا۔

''کیا تم اس شخص سے ڈر رہی ہو؟ تم نے دیکھا نہیں، وہ کتنا شریف آدمی معلوم ہو رہا ہے۔''

عورت نے کہا۔ ''ہم اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''کیا تم پاگل ہوگئی ہو۔ رات کا وقت ہے۔ ہم اس وقت اتر کر کہاں بھٹکتے پھریں گے؟''

''زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم دوسری ٹرین سے کراچی چلے جائیں گے۔''

''واہ صرف اس لیے کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اگر تم اس طرح ڈرتی رہیں تو کراچی میں کیسے رہوگی۔ وہاں تو ہزاروں لوگ رہتے ہیں اور.....''

عورت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم نے دیکھا نہیں کہ وہ آدمی ہماری طرف کس طرح دیکھ رہا ہے؟''

''دیکھا کرے، کبھی دیکھیں گے، تم جیسی عورت کو دیکھنا تو ایک گناہ ہی ہے۔'' نوجوان، انسان کے اس جذبے پر تبصرہ کر کے خوش ہوا۔

عورت، نوجوان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی مگر خاموش ہوگئی۔ اس نے اپنے آپ کو چادر میں مزید لپیٹ لیا۔ شاید وہ ڈر رہی تھی۔ نوجوان کو اس کی خاموشی اچھی نہیں لگی۔

''تم خاموش کیوں ہو؟ کوئی بات کرو؟'' عورت کچھ نہیں بولی۔ اس نے پردے سے درمیانی عمر کے مسافر کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور انہی کی طرف متوجہ تھا۔ نوجوان نے کچھ توقف کے بعد تنگ آ کے کہا۔ ''میں اس آدمی سے بات کرتا ہوں۔ وہ آخر ہمیں کیوں گھورے جا رہا ہے۔''

''نہیں..... نہیں، یہ ہرگز نہیں کرنا۔'' عورت نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

نوجوان نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ اس نے کلائی چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو تو سہی، میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ اس آدمی کے قریب پہنچ گیا۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' ایسا محسوس ہوا جیسے ادھیڑ عمر کا شخص نوجوان کی آمد کا منتظر ہی تھا۔ اس نے اطمینان سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر دیکھا۔

نوجوان کے لیے اس کا یہ رویہ غیر متوقع تھا۔ وہ کچھ گھبرا گیا اور اس کے جوش میں کمی آگئی۔ ادھیڑ عمر کے شخص نے دریافت کیا۔ ''وہ عورت تمہاری کون ہے؟''

''جی، میری بیوی ہے۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

''تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟''

''صرف چند دن، وہ بہت شرمیلی ہے۔ دیکھیے نا، کپڑوں کے بنڈل کی طرح لپٹی بیٹھی ہے۔ شرم اچھی چیز ہے لیکن اسے کم سے کم مجھ سے نہیں شرمانا چاہیے۔ میں اس کے لیے کوئی غیر تو نہیں ہوں۔'' نوجوان ایک ہی سانس میں اتنی باتیں کر گیا۔

''بہت خوب، غالباً محبت کی شادی ہے؟'' اس آدمی نے کہا۔ نوجوان کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اس نے صرف سر ہلا دیا۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی۔ یہاں بہت زیادہ مسافر تھے۔ اب سورج نکلنے والا تھا۔ مسافر شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے دیکھتے گاڑی بھر گئی۔ ڈبے میں جو مسافر سو رہے تھے۔ انہیں اٹھنا پڑا۔ مسافروں کے ہجوم سے عورت گھبرا گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ نوجوان نے ادھیڑ عمر کے آدمی سے کہا۔

''اب مجھے جانا چاہیے۔''

''ہاں، ہاں ضرور، تمہاری بیوی کچھ پریشان بھی نظر آ رہی ہے۔''

انجن نے وسل دی۔ گاڑی روانہ ہوئی اور جلد ہی اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ نوجوان نے اپنی ساتھی سے کہا۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے بہت ہمدردی سے بات کی ہے، ایک بار تو میں نے سوچا کہ اسے سب کچھ بتا دوں۔''

عورت نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کہیں تم نے بتا تو



نہیں دیا؟''

''نہیں، میں نے کچھ نہیں بتایا ہے لیکن اگر بتا بھی دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، وہ بہت شریف آدمی ہے۔''

عورت نے پریشانی سے کہا۔ ''چھوڑو بھی یہ ذکر، خاموش رہو۔'' نوجوان اس کی بے چینی پر حیران تھا مگر اس نے کچھ پوچھا نہیں، خاموشی ہی میں عافیت جانی۔

آخر گاڑی کراچی کینٹ اسٹیشن پہنچ گئی۔ یہ اس ایکسپریس ٹرین کا آخری اسٹیشن تھا ورنہ تو ٹرمینل سٹی اسٹیشن تھا۔

مسافر سامان سمیٹ کر اترنے لگے۔ نوجوان اپنی ساتھی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ شاید سب سے آخر میں اترنے کا ارادہ تھا۔ درمیانی عمر والے کو بھی زیادہ جلدی نہیں تھی۔ وہ بھی بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر میں بھیڑ کچھ کم ہوگئی۔ نوجوان نے باہر دیکھا۔ اب ان کے اترنے کی باری تھی لیکن باہر دیکھتے ہی وہ بے اختیار چلایا۔

''غضب ہوگیا۔''

عورت سراسیمہ ہوگئی۔ ''کیا بات ہے؟''

نوجوان نے گھبراہٹ میں کہا۔ ''تمہارا شوہر پولیس والوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر موجود ہے۔''

عورت بری طرح سہم گئی۔ ''اب کیا ہوگا؟''

نوجوان چند لمحے کھڑا رہا پھر ادھیڑ عمر شخص کی طرف لپکا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ نیچے کیوں نہیں اترتے؟''

''میں خطرے میں ہوں۔'' نوجوان نے آہستہ سے کہا۔

''بات کیا ہے؟''

''میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ ہم شادی شدہ نہیں ہیں۔ گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ میری ساتھی کا شوہر پلیٹ فارم پر موجود ہے۔'' نوجوان کی آواز بھرا گئی۔ ''اب کیا ہوگا؟ ہماری مدد کیجیے۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔''

درمیانی عمر کے شخص پر نوجوان کے انکشاف کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے سب کچھ پہلے سے معلوم تھا۔ اس نے آہستہ سے آگے بڑھ کے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پلیٹ فارم پر ایک کالا سا لمبا آدمی پولیس والوں کے ساتھ ایک ایک ڈبے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا شخص مسکرا کے نوجوان سے مخاطب ہوا، ''فکر نہ کرو، تم باہر جاؤ، میں تمہاری بیوی..... معاف کرنا..... تمہاری محبوبہ کو لے کر آتا ہوں۔''

نوجوان نے اس کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا اور ڈبے سے نکل کے ایکا ایکی ہجوم میں غائب ہوگیا۔

ادھیڑ عمر کے شخص نے عورت سے کہا۔ ''آؤ اب چلیں۔''

عورت اس کے ساتھ ڈبے سے اتری اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس کے پہلو میں چلنے لگی۔ وہ بہت پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس کی شرم ختم ہوگئی۔ ادھیڑ عمر والے کے ساتھ چلتے ہوئے وہ خوش بھی معلوم ہو رہی تھی، مسافر خاصے کم ہو چکے تھے۔ وہ اس کے قریب ہوگئی۔

''کیا تم اب بھی وہیں رہتے ہو؟''

یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس شخص نے عورت کی آواز سنی ہے، مگر اس نے سنی تھی، وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔

''اور بھلا کہاں جا سکتا ہوں۔''

عورت نے پوچھا۔ ''تمہارے ساتھ اور کون رہتا ہے؟'' مرد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ گیٹ کے قریب پہنچے۔ ٹکٹ کلکٹر نے ان سے ٹکٹ طلب کیے۔ مرد نے عورت سے اس کے ٹکٹ کے بارے میں پوچھا۔ عورت نے نفی میں جواب دیا۔ مرد نے اپنی جیبیں ٹٹولیں پھر اپنا ٹکٹ اور ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کر ٹکٹ کلکٹر کے حوالے کر دیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے انہیں جانے دیا۔ گیٹ سے نکل کر عورت نے پوچھا۔

''بانو کیسی ہے؟''

مرد نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''اچھی ہے۔''

''تمہارے ساتھ کون رہتا ہے؟'' عورت نے دوبارہ دریافت کیا۔

''کوئی نہیں رہتا۔ بانو اپنی پھوپی کے ساتھ رہتی ہے۔''

''اچھا۔'' عورت، مرد کے ساتھ چلتی رہی۔ نوجوان باہر کھڑا تھا لیکن عورت اس سے بے خبر تھی۔ وہ مرد سے پوچھ رہی تھی۔ ''کیا بانو نے کبھی مجھے یاد کیا؟ کیا کبھی اس نے میرے متعلق پوچھا؟'' اس کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ وہ جواب کی منتظر تھی مگر اسے جواب نہیں ملا۔ مرد نے سنی ان سنی کر دی۔ دو تین قدم چلنے کے بعد اس نے کہا۔

''اچھا اب مجھے چلنا چاہیے۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے نوجوان کو شکریے کا موقع بھی نہیں دیا۔

دونوں کسی سواری کی تلاش میں مصروف ہوگئے۔

نوجوان نے عورت سے کہا۔ ''جب تم دونوں نیچے اترے تو تمہارا خاوند اس درمیانی عمر والے کو دیکھ کر بری طرح بھاگا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو، آخر وہ کون تھا.....؟''

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''اس کے ساتھ میں پہلی بار.....''

خوب صورت دگل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

# اناڑی

قسط نمبر 62

قسمت کے پھیر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہائو اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد ..... وہ لوٹنا..... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دورِ حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک داستان رنگ بہ رنگ

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

گرد و پیش کا احوال۔ سحر کشی کا کمال۔ ایک داستان لازوال، آج کے زندہ کرداروں کی حقیقی کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ اور سحر آفریں انداز تحریر نے تخلیق کیا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریز فوج کو شاہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرت ناک شکست دی۔ بچ جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے زخمی حالت میں میرے پردادا نے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر بہ حفاظت رہتاس کے قلعے میں انگریزی چھاؤنی تک پہنچا دیا۔ انعام کے طور پر انگریز حاکم نے اجازت دی کہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جتنی زمین کا چکر بیل گاڑی دوڑا کے لگا لیں گے وہ ان کے نام کر دی جائے گی۔ یوں ست بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میرے آبا و اجداد نواب کہلائے۔ انہوں نے کثیر دولت حاصل کی اور ایک شاندار حویلی تعمیر کی۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بددعا لگی اور اس کے چھ جوان بیٹے باری باری مختلف حادثات کا شکار ہو کے مر گئے۔ آخری بیٹے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات سمندر پار لندن بھیج دیا لیکن کسی خرابی کے باعث جہاز بحر الکاہل میں گر گیا اور اس کا کوئی مسافر نہ بچا۔ باپ نے عالم دیوانگی میں اپنی تین بیویوں کو گولی مار کے ایک کنویں میں پھینکا اور پھر خودکشی کر لی۔۔۔ حویلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میرے والد لاہور کے ایک کالج سے ریٹائر ہوئے۔۔۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں میرا تعلق ایک سیاسی تنظیم کے دہشت گردوں سے ہو گیا جو مجھے بلیک میل کر کے ہر غیر قانونی کام کرنے پر مجبور کرتے رہے۔ میری زندگی بچانے کے لیے والد صاحب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے بہانے سے برطانیہ بھیج دیا۔ ہارورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لارڈ ارنسٹ کی بزنس فرم میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی بیلیشا مجھ پر فریفتہ ہو گئی۔ وہ مجھ سے شادی کے لیے اپنا گھر، ملک اور مذہب سب چھوڑنے پر تیار تھی اور اپنا نام تک بدل کر عائشہ بن گئی تھی۔۔۔ عائشہ کے انتہائی شریف، حسین اور دولت مند ہونے کے باوجود میں نے اسے ٹھکرا دیا کیونکہ میں فریال کو چاہتا تھا۔ فریال پہلے ماڈل اور ایکٹریس تھی اور اپنی بے وقوفی کے باعث ایک عیاش اور عیار شخص چوہدری سلطان سے منگنی بھی کر بیٹھی تھی جو خوش مزاج لڑکیوں کو فلمساز بن کر اپنی ہوس کے جال میں پھنسا لیتا تھا۔۔۔ میں نے اور فریال نے چھ سال تک اس کی عداوت کا مقابلہ کیا۔

اچانک لندن میں مجھے ایک وکیل کے ذریعے اپنے کسی رشتے کے پروانے نے طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور دماغ کے سوا ان کا سارا جسم مفلوج تھا۔۔۔ ان کے یقین اور حاصل کردہ معلومات کے مطابق میں ان کا رشتے دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انہوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنا دیا۔ یہ وہی ساتویں بیٹے تھے جن کا جہاز لندن جاتے ہوئے سمندر میں گر گیا تھا۔۔۔ کمپنی کی اطلاع غلط تھی کہ کوئی مسافر زندہ نہیں بچا۔۔۔ وہ بچ جانے والے واحد مسافر تھے جو بے ہوشی میں کسی تختے پر تیرتے ہوئے برطانیہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ گزشتہ ساٹھ سال سے وہ زندہ لاش بنے پڑے تھے۔ کسی سراغ رساں ادارے کی مدد سے انہیں لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا۔ لہٰذا وہ مجھے اپنا وارث مقرر کر کے مر گئے۔

اب مجھے لوٹ کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی عالی شان مگر منحوس کہی جانے والی حویلی اور جاگیر ساٹھ ستر سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ ریاست جی ٹی روڈ پر لاہور اور جہلم کے درمیان دینہ جانے والی سڑک پر رہتاس کے تاریخی قلعے کے کھنڈر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ جہاں دریائے کہان تھا اور گرد سیکڑوں میل تک شیشم کے درختوں کا جنگل تھا۔۔۔ حویلی کے تہ خانوں، بند تجوریوں اور مقفل الماریوں سے مجھے قیمتی ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے زیور، برتن اور بیش بہا نوادرات کا جن میں گاڑیاں بھی شامل تھیں اتنا بڑا خزانہ ملا جس کی مالیت کروڑوں سے بڑھ کر اربوں تک پہنچ چکی تھی۔

جب میں نے گرد و نواح کے دیہات میں بسنے والوں کی زبوں حالی دیکھی تو لندن واپس نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ خود میرے والدین بھی یہی چاہتے تھے۔ اپنے چند دوستوں کی عملی حمایت سے میں نے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ جنگلات کا فرنیچر بنانے اور ایکسپورٹ کرنا اور دریائے کہان سے بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ شامل تھا۔ مجھے دوستوں سے مدد اور لوگوں سے پذیرائی ملی لیکن علاقے کا جدی پشتی جاگیر دار میرا دشمن ہو گیا۔ روایتی وڈیرے کی طرح وہ بھی اپنی رعایا کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتا تھا۔ انہیں نجی جیل میں پابہ زنجیر رکھتا اور معمولی قصور پر شکاری کتوں کے آگے ڈال دیتا تھا۔ میری انسان دوستی اور غریب پروری کی شہرت پھیلی تو اسے اپنی صوبائی اسمبلی کی سیٹ خطرے میں نظر آنے لگی جسے وہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔

ابتدا میں شہر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے والوں میں میرا نامور صحافی دوست راجا اور اس کی منگیتر ڈاکٹر شہناز کے علاوہ میری چچازاد بہن رابعہ اور میرے والدین شامل تھے۔ پھر علاقے کا نامی گرامی ڈاکو میر احمد میرا دوست بن گیا جس کے گروہ کی دہشت پولیس پر بھی سوار تھی۔ شاہی بادشاہ نے میرے کہنے سے فیصلہ کیا کہ جب چیف منسٹر اسپتال کے توسیعی منصوبے کا افتتاح کرنے آئے گا تو وہ اپنے گروہ کے ساتھ ہتھیار پھینک دے گا اور معافی ملنے کے بعد ست بدھائی میں باعزت زندگی گزارے گا لیکن اس خفیہ پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انہوں نے پولیس مقابلے کا ڈراما رچا کے سب کو راستے میں مار ڈالا۔۔۔ زخمی شاہی بادشاہ کو اس کی بیوی گولی نکال کر لے گئی۔ خود مجھے اغوا کرنے اور قتل کرنے کی کوشش کئی بار ہوئی جو ناکام رہی۔

شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میرے والد اور چچا ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک و مختار بنانے والا برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں قیام اور ملازمت کے دوران میں برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چچا اور چچی کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی رابعہ سے شادی کر لیتا تو حق تلفی کا ازالہ ہو سکتا تھا لیکن میں فریال کے سوا کسی کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ یہی صدمہ چچی کی جان لینے کا سبب بنا اور رنجیدہ چچا پاگل ہو گئے۔ میں نے رابعہ کو بہن کا درجہ دیا اور وہ ست بدھائی میں میرے ساتھ رہی۔ اس نے محبت کی شادی میں دو بار دھوکا کھایا۔ بدقسمتی سے دھوکا دینے والے میرے دوست تھے۔ رفتہ رفتہ رابعہ بھی مجھے حق تلفی اور اپنے والدین کی موت کا قصوروار سمجھنے لگی۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے محافظ کی بیوی نور جہاں کو دیکھا جو درحقیقت اس کی داشتہ تھی۔ اس محافظ نے حویلی کو لوٹ کے بہت دولت اکٹھی کی تھی اور بردہ فروشی سے منشیات فروشی تک ہر کاروبار میں نور جہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی تھی لیکن نور جہاں جیسی حسین عورت نہیں دیکھی۔ اس کے



حسن و شباب کی تباہ کاری سے دنیا کا کوئی مرد خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔۔۔ اس نے مجھ سے مراسم استوار کرنے میں جائز و ناجائز کو نہیں دیکھا۔ فریال سے محبت اور شادی کے عہد و پیمان کے باوجود میں نور جہاں کے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے میرے لیے اپنے نام نہاد شوہر کو بھی قتل کر دیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ فریال پہلے ہی ست بدھائی جیسے ویرانے میں ناخوش تھی۔ وہ میرے ساتھ لندن، پیرس اور نیویارک جیسے شہروں کی چکاچوند والی زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ نور جہاں کے معاملے نے اسے جواز فراہم کر دیا اور وہ لوٹ کر شوبزنس میں چلی گئی جہاں چوہدری سلطان کے ذریعے اسے زبردست کامیابی ملی۔ موقع ملتے ہی اس نے چوہدری سلطان کو قتل کرا دیا اور اپنے اعلیٰ سطحی مراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آنے سے بھی محفوظ رہی۔

نور جہاں نام نہاد شوہر کے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر وہ نور بن گئی۔ ایک نئے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا حصول مشکل نہ تھا۔ میں اسے لندن لے گیا تا کہ وہ کچھ عرصہ وہاں گزار کے انٹیریئر ڈیکوریشن کا کورس کرے اور پھر اپنی نئی شخصیت کے ساتھ ست بدھائی پہنچ جائے۔ میں اسے لارڈ ارنسٹ کی مدد سے برطانوی شہریت بھی دلوانا چاہتا تھا۔ دس سال بعد لندن پہنچ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ عائشہ دوبارہ بیلیشا بن چکی ہے اور ڈپریشن کے باعث خودکشی کرتی ہے۔ شادی ہونے کے باوجود اوباش نوجوانوں کے ساتھ مختصر کر خاندان میں رہتی چلی جاتی ہے۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور باپ سیاسی اور کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ عائشہ کا عشق مجھے دیکھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا۔ اس نے نور کو اغوا کرا کے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ نور کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ رسوائی بھی کرنا پڑی۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو دل کا دورہ پڑا۔ اس کی وارث صرف عائشہ تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس کی بزنس ایمپائر کو چلا نہیں سکتی۔ اس نے مرنے سے پہلے اپنی ایک سو بیس ملین پاؤنڈز کی جائداد اور وسیع کاروبار کا مالک مجھے بنا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد عائشہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ میرے انکار اور اس کے باپ کی موت نے عائشہ کے احساس جرم کو شدید تر کر دیا اور وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ترک دنیا کر کے چرچ میں نن ہو گئی۔ قدرت کی طرف سے خوش نصیبی کی یہ دوسری لاٹری میرے لیے ایک آزمائش بن گئی۔ میں نور یہاں اکیلی رہنے پر راضی تھی اور نہ وہاں اتنے بڑے بزنس کو چلا سکتی تھی۔ پاکستان میں ست بدھائی کی ریاست، حویلی اور میرے ترقیاتی منصوبے تھے۔ میں یہاں رہتا یا واپس جاتا۔۔۔ پھر کچھ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ اچانک مجھے وہ شخص مل گیا جو چیف کہلاتا تھا۔ اس نے دس سال پہلے لاہور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلاوطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے اپنا سیاسی مشیر بنا لوں تو آئندہ انتخابات میں اپنے حریف کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ سکتا ہوں۔ اس کے بغیر میرے مقاصد حاصل نہیں ہوں گے۔ میں نے بظاہر اس کی پیشکش قبول کر لی۔ ست بدھائی کے اسپتال کو وسعت دینے میں میرے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بیٹا شامل تھے۔ اس فیملی کی تیسری رکن بیٹی ثمینہ بھی ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ناکامی اور پھر شوہر کے قتل نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے اپنا سابق محبوب وحید مان لیا اور کسی حد تک نارمل بھی ہو گئی۔ وحید ایک لاابالی مصور تھا جو لندن میں عریاں تصاویر بنا کے اپنا فن اونے پونے بیچ رہا تھا اور استحصال کا شکار تھا۔۔۔ ثمینہ کی جان بچانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جانا ضروری تھا۔ میں اس سے ملا تو دم بخود رہ گیا۔ وہ ہو بہو میری کاربن کاپی تھا اور ابھی تک ثمینہ کے عشق کا بیمار تھا۔ میں نے اس کے تمام قرضے بے باق کیے اور اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کر لیا۔ چیف نے مجھے کئی ٹپ دی کہ میں وحید کو اپنے ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ چیف کا اصل نام غلام علی تھا۔

میں یہ کر سکتا تھا کہ ست بدھائی کو نور کے سپرد کر دوں تا کہ اس کا حق تلفی کا احساس ختم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں رہ کر کاروبار کو مزید پھیلاؤں۔ بالآخر نور کے سمجھانے سے میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں جگہ رہنے کا فیصلہ کیا تا کہ نہ کاروبار متاثر ہو اور نہ ترقیاتی منصوبے یا میرا سیاسی مستقبل ختم ہو۔ لارڈ ارنسٹ کے تمام ملازم مجھے ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ وہ سب احتجاجاً ملازمت چھوڑ گئے۔۔۔ لارڈ کے سابق شوفر اور باڈی گارڈ نے میری راستوں سے ناواقفیت کے باعث ایک ویران احاطے میں لے جا کر قتل کرنے کی کوشش کی جہاں اس کے مددگار پہلے سے موجود تھے۔ ان تینوں کو ناک آؤٹ کر کے میں نے غلام علی کو طلب کیا اور خود بیلیشا سے ملنے چرچ چلا گیا۔ غلام علی نے احاطے میں کھڑا ٹریکٹر چلا کر ریت کے ڈھیر میں لاشوں کو دبا دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے وہ گرفتار ہو گیا۔۔۔ میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتا دیا جو غلام نے اعتماد میں مجھے بتایا تھا۔ چاروں کے مددگار اپنی جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بن گئے۔۔۔ عدالت میں سماعت ختم ہونے کے بعد ایک عورت چیخ چیخ کر مجھے لارڈ ارنسٹ کا قاتل قرار دینے لگی۔ بہر حال اس فراڈی عورت سے بھی جان چھڑا لی گئی جو زبردستی میرے گلے کا ہار بن کر لارڈ ارنسٹ کی دولت میں حصے دار بننا چاہتی تھی۔ حالات نے پلٹا کھایا اور مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مگر سرغنہ کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ جس کا مقصد تھا کہ میں سارے الزامات اپنے سر لے لوں۔ اسی دوران میں چیف کی ایک نفسیاتی کمزوری کی بدولت میں نے یہ جان لیا کہ سرغنہ چیف نہیں بلکہ اس کا ڈپلی کیٹ ہے۔ ادھر لندن پولیس کی مہارت اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے چیف اور اس کے گرگے گرفتار کر لیے گئے۔ میں قید خانے سے نکل کر ایک معمر انگریز جوڑے کی مدد سے اپنے گھر پہنچا۔ پھر میں نور کے ساتھ مل کر اپنی ذمے داریوں کو ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کیونکہ مجھے جلد از جلد گھر اور گھوڑوں کا سودا کرنا تھا۔ میں اور نور تمام امور سے نمٹ کر مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اچانک بیلیشا برقعے میں ملبوس پہنچ گئی۔ شاید اسے اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا تھا جو اس نے اپنی تمام جائداد میرے نام کر کے کی تھی اور اب وہ اسی کی واپسی کا مطالبہ کر رہی تھی مگر مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ تھا لہٰذا میں نے اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا جس پر مشتعل ہو کر اس نے پستول نکال لیا اور دیوانگی کی حالت میں مجھ پر فائر کر دیا۔ گولی چلی ضرور مگر لگی کسی کو نہیں۔ بہر حال نور پولیس کو اطلاع دے چکی تھی لہٰذا وہ بیلیشا کو لے گئے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو بیلیشا نے جواباً مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی لیکن وہ اب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ لارڈ ارنسٹ کے وکیل نے مجھے جذباتی بلیک میل کرتے ہوئے بیلیشا کی حالت کے پیش نظر اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ تجویز سختی سے مسترد کر دی۔ دوسری جانب نور مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں ست بدھائی رابعہ کے نام کر دوں اور لندن میں اس کے ساتھ رہوں۔ میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بہرحال حالات کے پیش نظر میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور نور بڑی مشکل سے تنہا لندن میں رہنے پر راضی ہوئی۔ ایئرپورٹ پر میرا بریف کیس چوری ہو گیا جس کے باعث فلائٹ سے میری روانگی خطرے میں پڑ گئی۔ اسی کشمکش میں غیر معمولی مہارت سے مجھے بے ہوش کر دیا گیا اور ایمبولینس میں ڈال کر نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ میرے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی صورت حال ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اغوا کار کون ہیں پھر جب رابعہ میرے سامنے آئی تو میں بھونچکا رہ گیا اور مزید یہ کہ اس نے میرے حریف وہیب کے ساتھ مل کر یہ ڈراما رچایا تھا۔ اس کا دیرینہ مطالبہ تھا کہ جاگیر اس کے نام کی جائے۔ مجھے اس پر مجبور کرنے کے دوران میں ایک بات پر مشتعل ہو کر اس نے ریوالور سے مجھ پر فائر کر دیا۔ گولی چلی ضرور تھی لیکن لگی کسی کو نہیں۔ اس کا نشانہ خطا گیا تھا، اسی دوران میں بھی اس پر جھپٹ پڑا۔ ہم دونوں گر

گئے۔ اس کا سر فرش سے ٹکرایا جس کے باعث وہ بے ہوش ہوگئی۔ اسی اثنا میں اس کے کارندے داخل ہوئے اور اسے لے کر چلے گئے۔ میری قید بدستور جاری تھی۔ ایک دن میرے کمرے میں ٹی وی رکھ دیا گیا جس کے ذریعے رابعہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنا مطالبہ دہرایا۔ مسلسل قید اور ذہنی اذیت کے باعث میں اتنا بے زار تھا کہ میں نے اس کا مطالبہ منظور کرلیا۔ مجھے یہ پریشانی اور جھنجلاہٹ تھی کہ میرے ساتھیوں نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ رابعہ نے انکشاف کیا کہ راجا اور نور کو بتا دیا گیا ہے اور میری سلامتی کے لیے خاموش رہنے کو کہا گیا ہے۔ پھر راجا سے میری ٹی وی کے ذریعے ہی بات بھی کروادی گئی۔ معاملہ یہ طے پایا کہ میں جاگیر رابعہ کو گفٹ کر دوں گا۔ میرے اور رابعہ کے وکیل قانونی تقاضے کے سامنے کاغذات پر دستخط کروائیں گے۔ بعد ازاں رابعہ نے مجھ سے رابطہ کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی درخواست کی۔ میں نے انکار کیا تو وہ اپنی ڈھٹائی پر دوبارہ مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔ یہاں مجھے یہ اطمینان ضرور ہوگیا تھا کہ اب میری زندگی محفوظ ہے کیونکہ وکیل اور راجا کے درمیان میں آجانے سے جان کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

قید کے دوران میں ایک دن باہر سے کسی آوازیں آنے لگیں جیسے کچھ توڑا جا رہا ہو۔ کچھ دیر بعد صورت حال واضح ہوئی کہ میری نگرانی پر مامور افراد میں سے ایک کے دل میں آخر دوستی کا جذبہ بیدار ہوا اور اس نے قید خانے کی دیوار میں رخنہ ڈال کر مجھے رہائی دلادی۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی متروک گیسٹ ہاؤس تھا۔ ویرانے میں مجھے ایک دیہاتی جوڑا نظر آیا جو مجھے ایک سابق فوجی فضل صاحب کے گھر تک لے گیا جہاں فضل صاحب اور ان کی اہلیہ نے میری بہت مدد کی اور میں راجا سے رابطہ کرنے اور وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر راجا سے گزرے واقعات اور رابعہ کے متعلق بات ہوئی۔ میں رابعہ کے بارے میں مضطرب اور غیر یقینی کیفیت کا شکار تھا۔ اس کی پُراسرار گمشدگی پریشان کن تھی۔ ان باتوں کے دوران میں راجا مجھے ایک اسپتال لے گیا تاکہ میری صحت پر منفی اثرات زائل ہوں۔ پھر مجھے ریشم کے ہاں ولادت اور ثمنہ کے ساتھ وحید کی شادی کی خوش خبری ملی۔ احمد صاحب بیٹی کی خوشی کے ساتھ ساتھ ہی بیٹے کے بارے میں بھی متفکر تھے۔

میں بدستور رابعہ کے بارے میں فکرمند تھا جبکہ راجا جھنجلاہٹ کا شکار۔ ایسے میں نور نے لندن سے فون کر کے اپنی آمد کا عندیہ دیا مگر میں نے اسے منع کردیا۔ اچانک رابعہ نے بھی فون پر مجھ سے بات کرنا چاہی مگر راجا نے اسے جھڑک دیا۔ کچھ وقت گزرا تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اطلاع دی کہ کسی عورت کی لاش پاس کے علاقے میں ملی ہے۔ میں نے اسپتال جا کر دیکھا تو لاکٹ اور دیگر نشانیوں سے وہ رابعہ ثابت ہوئی جس کا چہرہ مسخ تھا۔ میں افسردہ واپس آرہا تھا کہ میرے عقب میں آتی گارڈز کی گاڑی دھماکے سے تباہ ہوگئی اور ایک خونی معرکے کے بعد میں حویلی واپس پہنچا تو نور نے فون پر بتایا کہ وہ پاکستان آرہی ہے لہٰذا میں اسے لینے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے میں دلاور ہی کے ڈاکوؤں نے مجھے اغوا برائے تاوان کے لیے اغوا کرلیا۔ دلاور کے ڈیرے پر نیلم نامی لڑکی نے مجھے اس کے عزائم سے آگاہ کیا اور میری مدد کی۔ یہاں میں ڈاکوؤں سے نمٹ کر جب ایئرپورٹ پہنچا تو دیکھا نور نہیں آئی لیکن کچھ دن بعد اس کی دوبارہ آمد پر بھی وہی منظر میرا منتظر رہا تھا۔ میں انتہائی جھنجلاہٹ کا شکار تھا کہ نور نے فون پر مجھے الزام دیا کہ میں نے رابعہ کے بارے میں اس سے غلط بیانی کی ہے۔ میں نے وضاحت کی تو اس نے فون پر رابعہ کی موجودگی کا انکشاف کیا اور اس کی آواز سن کر میں چکرا کر رہ گیا۔

رابعہ میرے لیے دردسر بن چکی تھی جبکہ اس نے نور کو بھی میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ راجا بھی متفکر تھا لیکن بعد ازاں یہ غلط فہمی دور ہوگئی کیونکہ نور نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے رابعہ کی نگرانی کی جس کے ذریعے انکشاف ہوا کہ رابعہ کا حویلی میں کسی سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا میں نے اپنے محافظوں کے ذریعے اس مخبر کا پتا لگانے کا حکم دیا جس کے نتیجے میں ایک گارڈ سردار خان مجرم ثابت ہوا اور اس نے مجھے یرغمال بنانے کی کوشش کی۔ بہرحال ایک مختصر لڑائی کے بعد میں نے اس پر قابو پالیا۔ دوسری جانب وحید جو ایک الگ تھلگ کاٹیج میں رہتا تھا اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک مقابلے کے بعد اغواکار بھی قیدی بنالیے گئے۔ ایسی حالات میں مجھے نور کے بارے میں تشویش تھی میں نے اسے گل میں منتقل ہونے اور بعد کی نگرانی سخت کرنے کی ہدایت کی اور لندن جانا چاہا لیکن راجا نے مجھے منع کردیا اور خود لندن جانے کا فیصلہ کیا جبکہ قیدیوں سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق ان ساری کارروائیوں کے پیچھے دلاور کا ہاتھ تھا۔ یہ امر میرے لیے نیا تھا لہٰذا میں نے راجا سے معلوم کیا۔ اس کی معلومات کے مطابق دلاور اسلحے اور منشیات کا ایک بین الاقوامی اسمگلر تھا لیکن اس کی میرے ساتھ کیا دشمنی تھی؟ اس کا جواب بھی دلاور کے دھمکی آمیز فون کے ذریعے مل گیا۔ وہ الیکشن میں اپنے حق میں میری دستبرداری کا خواہش مند تھا مگر میں نے اسے چیلنج کردیا۔ اس تمام صورت حال میں میرا ذہن پراگندہ خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ رات کی تاریکی میں مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ چیخ [illegible] کی تھی جسے کسی نقاب پوش نے دبوچ رکھا تھا۔ میری مداخلت پر وہ فرار ہوگیا۔ میں نے [illegible] کو سخت سست سنائیں۔ حملہ آور کی حویلی میں موجودگی باعث تشویش تھی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر شہناز کی کزن شہلا جو ڈاکٹر تھی، بھی ہماری ٹیم کا ایک رکن بن گئی۔ سخت تفتیش کے بعد سجاد نامی حملہ آور کو ڈھونڈ نکالا گیا جو دلاور خان کا آدمی تھا۔ بعد ازاں سجاد نے اپنی کہانی سنائی کہ کس طرح وہ دلاور کے شکنجے میں پھنسا مگر اب وہ حقیقت جان کر دلاور کا دشمن بن گیا ہے۔ میں نے یقین کر کے اسے اپنے دوست کی حیثیت سے حویلی میں رکھ دیا جبکہ ڈاکٹر شہناز نے حقیقت محسوس کرلی۔ یہ واقعات جاری تھے کہ راجا کا فون آیا اور اس نے اطلاع دی کہ رابعہ فرار ہوگئی ہے۔

راجا نے رابعہ کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ جبکہ یہاں ہم نے سجاد کے بارے میں معلومات کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا۔ جس کی روانگی کے بعد ایک نامعلوم کال کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ وہ اسپتال میں زخمی حالت میں ہے۔ ہم حیران تھے کہ اتفاقیہ صوبے دار میجر صاحب نے میرے بستر کی صفائی کے دوران میں ٹرانسمیٹر ٹائپ ایک ڈیوائس دریافت کی اور سجاد کا جس پر شک تھا وہ یقین میں بدل گیا لہٰذا اس سے تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ شدید زخمی ہوگیا اور اسی حالت میں فوت ہوگیا۔ اس سے حاصل شدہ معلومات سے اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ اسے بھیجنے والا زوہیب تھا۔ راجا نے اطلاع دی تھی کہ وہ اور نور پاکستان آرہے ہیں لہٰذا انہیں لینے میں اپنے گارڈز کے ساتھ ایئرپورٹ پہنچا جہاں میں ایک عجیب صورت حال میں پڑ گیا جب ایک گارڈ نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اسی دوران ایک فائر ہوا اور میں نے ایک گارڈ کو گرتے دیکھا۔ ایئرپورٹ پر اس صورت حال پر پولیس بروقت پہنچ کر پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کرتی ہے۔ راجا اور نور ایئرپورٹ سے برآمد ہوتے ہیں۔ نور بڑی فکرمند ہے معاملہ گھمبیر ہے لہٰذا انہیں دبئی رکنا پڑتا ہے جہاں ہوٹل میں نواب رفیق کے گارڈز قتل کردیے جاتے ہیں۔ اسی دوران میں راجا کا ایک کرائم رپورٹر دوست اشرف جو اثرورسوخ کا حامل ہے ان کی مدد کرتا ہے۔ فراغت کے بعد یہ لوگ سیدھے حویلی پہنچ جاتے ہیں جہاں ڈاکٹر شہلا کو اپنے گھر سے بلاوے پر ڈرائیور سرور کے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے لیکن سرور زخمی حالت میں آکر اطلاع دیتا ہے کہ شہلا کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ یہاں بھی راجا کا دوست کام آتا ہے اور شہلا کو بازیاب کرالیا جاتا ہے۔ اس کے بعد رفیق سکون کا سانس لیتا ہی ہے کہ ایک فون کال اس کا سکون غارت کردیتی ہے۔



## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

دوسری طرف رابعہ تھی۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے بھنا کر پوچھا۔ "تم آخر چاہتی کیا ہو؟"

"میں بہت مصیبت میں ہوں رفیق!" رابعہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔" میں نے دانت پیسے۔

"فون بند مت کرنا رفیق!" وہ جلدی سے بولی۔ "پہلے میری بات سن لو!" اس کی آواز میں التجا تھی۔

"کیا اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں...... سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے خود تباہ کرلیا۔" وہ اب رو رہی تھی۔

"تم نے کیا یہی بتانے کے لیے مجھے فون کیا ہے؟" میں جھنجلا کر بولا۔

"میری جان خطرے میں ہے رفیق!"

"تو پھر مر جاؤ۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس وقت مجھے اپنا لہجہ خود بھی اجنبی سا لگا۔ "میرے لیے تو تم اسی دن مرگئی تھیں جب تم نے زوہیب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"اتنے سنگ دل مت بنو رفیق! میری جان واقعی خطرے میں ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"مجھے بچالو رفیق! اسی طرح ایک دن فریال نے تمہیں مدد کے لیے پکارا تھا۔"

"دیکھو رابعہ! اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔" میرے انداز میں بے زاری تھی۔

"میری جان خطرے میں ہے اور......"

"مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔

رابعہ نے کہا۔ "میں اس وقت زندگی اور موت کے درمیان گھری ہوئی ہوں۔ جب تم فریال کی مدد کرسکتے ہو تو میری مدد کیوں نہیں کرو گے؟"

"بار بار فریال کا طعنہ مت دو رابعہ!" میں نے کہا۔

"میں طعنہ نہیں دے رہی بلکہ تمہیں یاد دلا رہی ہوں۔ میں تو پھر تمہارا خون ہوں، خاندان کی عزت اور آخری نشانی ہم......"

"بس کرو رابعہ!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ ڈراما ختم کرو، مجھے سونے دو اور خود بھی سوجاؤ۔"

"تمہیں یہ ڈراما لگ رہا ہے؟" رابعہ سسک کر بولی۔ "میں دشمنوں میں گھری ہوئی ہوں، موت آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی ہے اور تم اسے ڈراما کہہ رہے ہو؟"

"اب تک تم ڈرامے ہی کرتی آئی ہو، میں اسے اور کیا سمجھوں؟"

"میری بات کا یقین کرو رفیق!"

"چلو، میں نے یقین کرلیا۔" میں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "اب مجھے سونے دو۔"

"تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے رفیق! یقین تو تمہیں اس وقت آئے گا جب میری لاش جھاڑیوں یا کسی کھنڈ میں ملے گی۔"

"تمہاری لاش تو مجھے مل چکی ہے۔" میں نے اپنا تضحیک و تحقیر آمیز لہجہ برقرار رکھا۔ "میں تو اسے دفن بھی کرچکا ہوں۔"

"وہ دلاور کی ایک چال تھی رفیق!" رابعہ نے کہا۔ "میں اس کے چنگل میں اس بری طرح پھنسی ہوں کہ میرا اب تک زندہ رہنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔"

"تم دلاور کو کیسے جانتی ہو؟"

"میں تمہیں سب کچھ بتادوں گی لیکن پہلے مجھے یہاں سے نکالو رفیق! میں ابھی مرنا نہیں چاہتی...... میں جینا چاہتی ہوں۔" وہ بری طرح رونے لگی۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"میں اس وقت ایک گاؤں میں ہوں۔"

"ویری گڈ ڈیئر کزن! تمہارا بھی جواب نہیں ہے، تم نے مجھے اتنا ہی احمق سمجھ لیا ہے کہ میں تمہاری ہر بے سروپا بات پر یقین کرلوں گا اور وہاں دوڑا چلا آؤں گا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور وہاں پہنچوں تو دشمن میری گھات میں ہوں۔"

"تم......"

"بس رابعہ!" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "اب یہ اپنی فضول بکواس بند کرو اور مجھے سونے دو۔" میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

نیند میری آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ اس الو کی پٹھی رابعہ نے بھی مجھے کاٹھ کا الو سمجھ لیا تھا کہ وہ بلائے گی اور میں دوڑا دوڑا چلا جاؤں گا۔

اچانک میرے کانوں میں اپنی ہی آواز آئی۔ "قبلہ نواب صاحب! رابعہ اگر اس حد تک گری ہے تو اس کا سبب بھی آپ ہیں، آپ ہی کی وجہ سے اس کے ماں باپ کی جان گئی۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم!" میں نے نفرت بھرے لہجے

میں کہا۔
اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر رابعہ سچ بول رہی ہے تو اس کا سیل فون آف ہوگا۔ وہ ہمیشہ یہی تو کرتی تھی۔ سیل فون کو ٹریس کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بات وہ خود بھی جانتی ہوگی لیکن اس کے دل میں تو چور تھا۔ میں نے سیل فون اٹھا کر رابعہ کا نمبر ملا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ رابعہ کا سیل فون بند ہوگا۔
یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ رابعہ کا سیل فون آن تھا۔ اس نے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کرلی۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم میری مدد ضرور کرو گے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''دیکھو رفیق! میں واقعی بہت مصیبت میں ہوں۔ اب تم ہی مجھے اس مصیبت سے نکال سکتے ہو۔''
''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں ایک مرتبہ پھر تمہارے جال میں پھنسنا نہیں چاہتا۔''
''تم نے ابھی تک میری بات کا یقین نہیں کیا ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں رفیق! ممکن ہے یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہو۔''
''مجھے تمہاری عقل پر حیرت ہے رابعہ! تم نے میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، تم کس منہ سے مدد کی بات کررہی ہو؟''
''وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی رفیق! میں دشمنوں کی باتوں میں آگئی تھی۔ میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس دفعہ میں تمہیں کوئی دھوکا نہیں دے رہی ہوں۔''
''اچھا یہ بتاؤ!'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''
''میں اس وقت لاہور میں ہوں۔'' رابعہ نے جلدی سے جواب دیا۔
''اور تمہیں کس سے خطرہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''مجھے کئی طرف سے خطرہ ہے رفیق! زوہیب..... دلاور اور پولیس! یہ بھی میری جان کے درپے ہیں۔''
''پولیس!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''پولیس سے تمہیں کیا خطرہ ہے؟''
''دلاور نے پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا دیا ہے۔ اس وقت سب سے بڑا خطرہ مجھے پولیس ہی کی طرف سے ہے۔ دلاور کے ساتھی بھی میری گھات میں ہیں اور رانا تو اسی وقت سے میرا دشمن ہے جب میں کورٹ نہیں پہنچی تھی۔''
''یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے رابعہ! خود کردہ را علاج نیست!'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ رابعہ نے مجھے عجیب پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔ مجھے بہت سی باتوں کا جواب نہیں ملا تھا۔ وہ کورٹ کیوں نہیں پہنچی تھی؟ اس کی موت کا ڈراما کس نے کیا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ رابعہ لندن کیوں گئی تھی اور پاگل پن کا ڈراما کیوں رچایا تھا؟ اور سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ دلاور سے رابعہ کا کیا تعلق تھا؟ ان سب سوالوں کا جواب فوری طور پر رابعہ ہی دے سکتی تھی۔ میں سوچتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ رابعہ کیا واقعی کسی مصیبت میں ہے؟ نہ جانے کیوں مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ کزن ہونے کے ناتے میں اس کی مدد ضرور کروں گا۔ اسے مجھ سے اس صاف جواب کی توقع نہیں ہوگی۔ میں نے فریال کی مدد بھی تو ایسے موقعے پر کی تھی جب وہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل چکی تھی۔ اسی کی وجہ سے مجھ پر چودھری سلطان کے قتل کا الزام آیا تھا اور مجھے ضمانت قبل از گرفتاری کرانا پڑی تھی۔ اس کے باوجود میں اس کی مدد کو دوڑ پڑا تھا۔ رابعہ تو میرے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے یقین تھا کہ بدترین تعلقات کے باوجود میں اس کی مدد ضرور کروں گا۔
اچانک سیل فون کی بیل بجی تو میں چونک اٹھا۔ جو بیڈ پر بالکل میرے کان کے پاس پڑا تھا۔ گھنٹی کی آواز بھی ہتھوڑے کی طرح میرے سر میں لگ رہی تھی۔ میں نے سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو!''
''رفیق!'' دوسری طرف سے رابعہ کی آواز سنائی دی۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ تم اتنے بدل جاؤ گے۔ میں معافی کے قابل تو نہیں ہوں، اس کے باوجود تم سے معافی مانگ رہی ہوں۔ ہوسکے تو میری ہر غلطی کو معاف کردینا۔ میں نے تمہیں بہت پریشان کیا ہے، بہت دکھ دیے ہیں۔ اب شاید میں تم سے کبھی بات نہ کروں۔''
''سنو رابعہ!'' میں نے بے اختیار کہا۔ ''تم اس وقت ہو کہاں؟''
''اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے مائی ڈیئر کزن!'' رابعہ کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ ''میں اب تم سے سب سے بہت دور جارہی ہوں۔ میں زندہ نہ زوہیب کے ہاتھ آؤں گی، نہ دلاور کے۔ میں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی جان لے رہی ہوں۔''
''رابعہ!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''مزید کوئی حماقت مت کرنا۔ مجھے اپنا صحیح پتا بتاؤ، میں آرہا ہوں۔''
''میں لاہور کے ایک محلے داروغہ والا میں ہوں۔ تم



لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچو۔ میں خود تم سے رابطہ کرلوں گی۔ پلیٹ فارم نمبر سات پر!''
''کوئی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں رابعہ!'' میں نے کہا۔ ''میں آرہا ہوں۔''
میں نے عجلت میں کپڑے تبدیل کیے۔ بغلی ہولسٹر لگائے اور اوپر سے چمڑے کی جیکٹ پہن لی۔ ہر طرح سے تیار ہوکر میں حویلی کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ گاڑیوں کی چابیاں گارڈ روم میں ہوتی تھیں۔
گارڈز مجھے دیکھ کر مستعد ہوگئے۔ میں نے ایک گارڈ سے کہا۔ ''مجھے لینڈ کروزر نکال دو۔''
''اوکے سر!'' گارڈ نے کہا اور تیزی سے چلا گیا۔
میں اس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک میرے عقب سے غنی کی آواز آئی۔ ''سر! اس وقت آپ کہاں جارہے ہیں؟''
''میں اس وقت انتہائی ضروری کام سے جارہا ہوں۔''
''آپ مجھے جگا لیتے۔ میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔''
''میں اکیلا ہی جارہا ہوں غنی!'' میں نے سرد لہجے میں کہا تاکہ وہ مجھ سے زیادہ سوال نہ کرے۔
''سر! اس وقت آپ کا تنہا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تو آپ اپنے ڈرائیور کی حیثیت سے لے جاسکتے ہیں۔''
میں نے سوچا کہ غنی کو بھی ساتھ لے لوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اسے ساتھ نہ لے جانا زیادہ مناسب ہے۔ میں کب تک غنی کا سہارا تلاش کرتا رہوں گا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم سے جتنا کہا جائے اتنا ہی کیا کرو۔''
غنی نے سر جھکا لیا۔ اس وقت تک دوسرا گارڈ میری گاڑی گیراج سے نکال لایا تھا۔
لینڈ کروزر مضبوط انجن کی سبک رفتار گاڑی تھی۔ میں نے حویلی سے باہر نکلتے ہی اسے دوڑانا شروع کردیا۔ ست بدھائی سے جی ٹی روڈ تک راستہ کچا لیکن ہموار تھا۔ اس کچے راستے پر بھی لینڈ کروزر ہوا سے باتیں کررہی تھی۔
جی ٹی روڈ پر آنے کے بعد میں نے گاڑی کو گویا جیٹ فائٹر بنا دیا۔ میری نظر اسپیڈو میٹر پر پڑی۔ اس کی سوئی ایک سو پچیس اور ایک سو تیس کے درمیان تھرک رہی تھی۔ رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ اس تیز رفتاری میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میرا ہاتھ ذرا سا بہکتا اور گاڑی قابو سے باہر ہوکر دائیں یا بائیں طرف کھیتوں میں گھس جاتی۔ میں نے رفتار کچھ کم کردی۔ رات کے وقت ہائی وے پر عموماً مال بردار ٹرکوں کا راج

ہوتا ہے۔ ٹرک ڈرائیور اس وقت بڑی سے بڑی گاڑی کو راستہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ آپ لاکھ ہارن بجائیں لیکن ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اس میں ان بیچاروں کا بھی کوئی قصور نہیں ہوتا۔ ہر ٹرک پر ٹنوں کے حساب سے سامان لادا جاتا ہے۔ اگر وہ راستہ دینے کے چکر میں ایک دفعہ کچے میں اتر جائیں تو پھر مشکل ہی سے سڑک پر آتے ہیں۔ بعض اوقات تو ٹرک سامان سمیت الٹ جاتا ہے۔ اب یہ ڈرائیور کی مہارت ہے کہ وہ ٹنوں وزنی اس متحرک مشین کو منزلِ مقصود پر پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔
مجھے وہ واقعہ یاد آیا جب جاپان سے سوزوکی موٹرز کے مالکان پاکستان آئے تھے۔ انہوں نے یہاں عجیب وغریب تماشا دیکھا۔ چار پہیوں کی چھوٹی سی سواری میں اس کی بساط سے دگنے سے زیادہ سامان لدا ہوا تھا۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کون سی گاڑی ہے؟ جب انہیں معلوم ہوا کہ یہاں ہی کی کمپنی کی سوزوکی پک اپ ہے تو وہ حیران رہ گئے۔ یہاں آئے دن ان شہروں میں اور شاہراہوں پر جو حادثات ہوتے ہیں، ان میں ایک بڑا سبب گاڑیوں کی اوور لوڈنگ بھی ہے۔
اچانک میرے سامنے ایک بلند و بالا دیوار آگئی۔ شکر ہے کہ وہ دیوار حرکت کررہی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں دیکھا۔ وہ کوئی دیوہیکل ٹرک تھا جس پر بھوسا لدا ہوا تھا۔ بھوسے کی بوریاں گویا آسمان تک چلی گئی تھیں اور ٹرک کے دائیں بائیں بھی وہ ناجائز تجاوزات کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اس ٹرک نے پوری سڑک کو گھیر لیا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اپنی طوفانی رفتار کم کرنا پڑی۔ میں نے چاہا کہ گاڑی کچے میں اتار کر بائیں طرف سے نکل جاؤں لیکن وہاں کی زمین ایسی نہیں تھی کہ نکلا جاسکے۔ کیونکہ وہ ناہموار تھی۔ دائیں طرف سے نکلنے میں بھی خطرہ تھا۔ میں سامنے سے آنے والے کسی ٹرک یا تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا سکتا تھا۔
ٹرک کا بایاں انڈیکیٹر روشن تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ٹرک بائیں طرف مڑنا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پیچھے والی گاڑی اوورٹیک نہ کرے کیونکہ سامنے سے ٹریفک آرہا ہے۔
ہائی وے کے ڈرائیوروں نے اپنے مخصوص اشارے بنا رکھے ہیں۔ جو لوگ ہائی وے پر سفر کرتے ہیں، وہ ان اشاروں کو سمجھتے ہیں۔ دائیں جانب کا انڈیکیٹر روشن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے والی گاڑی کا ڈرائیور اب اوورٹیک کرسکتا ہے، راستہ صاف ہے۔

میں اگر اس ٹرک کے اشارے کا انتظار کرتا تو جی ٹی روڈ میں ہی صبح ہوجاتی۔ ٹرک کچھوے کی رفتار سے چل رہا تھا۔ ٹرک والے کو ہارن دینا بے کار تھا۔ اچانک بائیں طرف کچی زمین ہموار دکھائی دی۔ میں نے لینڈ کروزر کی رفتار بڑھائی اور اسے کچے میں اتار دیا۔ وہ زمین اتنی بھی ہموار نہیں تھی جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ گاڑی اچھلتے کودتے آگے بڑھی۔ میں نے انتہائی خطرناک انداز میں اس ٹرک کو اوورٹیک کیا اور یہ دیکھ کر جھنجلا گیا کہ اس سے آگے بھی ایک اور ٹرک تھا۔ مجھ پر جھلاہٹ طاری ہوگئی۔ میں نے اسی حالت میں گاڑی دوڑائی اور دوسرے ٹرک کو بھی اوورٹیک کرلیا۔ اگر میں حاضر دماغی سے کام نہ لیتا تو میری گاڑی یا تو الٹ جاتی یا پھر ٹرک سے بری طرح ٹکرا جاتی۔ میرے سامنے اچانک مٹی کا ایک تودا آگیا، میں نے بجلی کی سی تیزی سے گاڑی کا اسٹیئرنگ دائیں طرف موڑا۔ گاڑی اچھلتی ہوئی ٹرک کے بالکل قریب سے گزری۔ ٹرک میں سے کسی نے چیخ کر مجھے گالی دی لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر گاڑی کو پختہ سڑک پر لے گیا۔ سخت مٹی کے اس تودے سے گاڑی بس انچوں کے حساب سے بچ کر نکل گئی۔ پختہ سڑک پر آتے ہی میں پھر تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑنے لگا۔ اس وقت اگر ٹریفک پولیس کا کوئی افسر مجھے دیکھ لیتا تو مجھے کچھ لیے بغیر نہ چھوڑتا۔ ٹرک والے یہ سمجھے ہوں گے کہ اس لینڈ کروزر کا ڈرائیور نشے میں ہے۔

ان خطروں سے کھیلنے کا یہ فائدہ ہوا کہ آگے جا کر مجھے سڑک بالکل صاف ملی۔ میں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گاڑی کو پارک کر کے میں دوڑتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ لاہور کا ریلوے اسٹیشن دنیا کے بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنز میں سے ایک ہے۔ کل تک میں یہ بات فخر سے کرتا تھا لیکن اس وقت مجھے شدید جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ رابعہ نے بھی چھپنے کے لیے بہت بہتر جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے مجھے پلیٹ فارم نمبر سات پر آنے کو کہا تھا۔

میں نے احتیاطاً دو پلیٹ فارم ٹکٹ خرید لیے کہ ممکن ہے رابعہ کے پاس بھی پلیٹ فارم ٹکٹ نہ ہو اور ہم فضول میں مزید ایک پریشانی میں مبتلا ہوجائیں۔

میں نے دوڑتے ہوئے ایک ریلوے پل عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ گیا لیکن وہ پلیٹ فارم نمبر پانچ تھا۔ میں نے پل سے جانے کے بجائے نیچے ہی سے جانا مناسب سمجھا اور دائیں بائیں دیکھ کر پٹڑیوں پر کود گیا۔ دوسری طرف لوہے کا جنگلا تھا۔ اس میں ایک جگہ ریلوے ملازمین اور قلیوں نے اپنی آسانی کے لیے درمیان کی ایک سلاخ نکال کر راستہ بنا رکھا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اس راستے سے گزر گیا۔

دیکھنے والے یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ مجھے کوئی ٹرین پکڑنا ہے۔

پلیٹ نمبر سات تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس وقت پلیٹ فارم بالکل سنسان تھا۔ شاید وہاں سے اس وقت کسی بھی گاڑی کی آمد یا روانگی نہیں تھی۔ کونوں کھدروں اور تاریک گوشوں میں کچھ لوگ پڑے سو رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر فقیر اور نشے باز تھے۔ آگے ایک بینچ پر مجھے ایک دیہاتی گھرانا بھی دکھائی دیا۔ مرد سامان پر لیٹا سو رہا تھا اور اتنے خوفناک خراٹے لے رہا تھا کہ اردگرد پڑے ہوئے فقیر اور ہیروئن کے عادی اس کے خراٹوں سے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور اسے گندی گندی گالیاں دے رہے تھے۔ اس خراٹے باز کے ساتھ ادھیڑ عمر کی ایک عورت اور دو جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے بڑے چار بچے تھے۔ وہ سب آڑھے ترچھے پڑے یوں سو رہے تھے، جیسے وہ ریلوے اسٹیشن پر سونے ہی آئے ہوں۔ انہیں دیکھ کر مجھے بچپن کی ایک تصویر یاد آگئی۔ اخبارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کی خیالی تصویر تھی۔ آڑھی ترچھی بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور تصویر کے نیچے عنوان تھا۔

"جنگ آزادی کے شہید!"

مجھے وہ لوگ بھی جنگ آزادی کے شہید ہی لگ رہے تھے۔

میں ان "شہیدوں" کو دیکھنے میں ایسا محو تھا کہ کچھ فاصلے پر استراحت فرمائے ہوئے ایک سائیں بابا پر چڑھ گیا۔ سائیں بابا بلبلا کر اٹھا تو اچانک میرا توازن بگڑ گیا اور میں وہیں گٹھری بنے ہوئے ایک کتے پر چڑھ گیا۔

کتے نے بری طرح غرا کر اپنے دانتوں سے میری پنڈلی پکڑنا چاہی۔ میں بدحواسی میں پیچھے ہٹا تو اس خراٹے باز پر جا پڑا۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلیں اور اس نے اپنے مگدر جیسے ہاتھوں سے مجھے دبوچ لیا۔ اس ہڑبونگ میں خواتین کی آنکھ بھی کھل گئی اور وہ سب بری طرح چلانے لگیں اور "چور چور" کے نعرے بھی لگانے لگیں۔

میں نے بہ مشکل تمام خود کو اس خراٹے باز کی گرفت سے چھڑایا اور کھڑا ہوگیا۔ خواتین اب بھی چیخ رہی تھیں۔ ان کی چیخ پکار سے ارد گرد سونے والے فقیر، محنت کش اور ہیروئچی بھی اپنی اپنی زبان بولنے لگے تھے۔



"بند کرو یہ بکواس!" میں دہاڑ کر بولا۔ "ورنہ ایک ایک کو لے جا کر تھانے میں بند کردوں گا۔"

میری اس دہاڑ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ سب چابی سے چلنے والے کھلونوں کی طرح یوں خاموش ہوگئے جیسے ان کی چابی ختم ہوگئی ہو۔

"کہاں جارہے ہو تم لوگ؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"حضور..... ہم لوگ..... وزیرآباد جائیں گے۔" خراٹے باز بولا۔ اس کی آواز بھی بلغمی تھی۔

"کیا سوتے سوتے وزیرآباد پہنچ جاؤ گے؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"نہیں سرکار..... وہ ..... ہماری گاڑی..... صبح ساڑھے سات..... بجے آئے گی۔" مرد نے جواب دیا۔

اسی وقت دو تین قلی اور ریلوے کے دو ملازم وہاں پہنچ گئے۔ ایک ملازم نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں؟" یہ کہہ کر وہ بری طرح کھانسنے لگا۔

"شٹ اپ!" میں اسی پر الٹ پڑا۔ "اپنے کام سے کام رکھو، سمجھے۔" میں نے رواں انگریزی میں کہا۔

"جناب وہ....."

"بس اب چلے جاؤ یہاں سے۔"

وہ سب حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ وہ شاید اندازہ لگا رہے تھے کہ میرا تعلق کس محکمے سے ہوسکتا ہے؟ ان کے خیال میں جس کسی بھی محکمے کا تھا لیکن یہ طے تھا کہ کوئی بڑا افسر ہوں۔

"غصہ مت کریں سرکار!" خراٹے باز خوشامد بھرے لہجے میں بولا۔

اس شخص کی یہ بات سن کر تو ان لوگوں کو یقین آگیا ہوگا کہ میں کوئی چھوٹا آدمی نہیں ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئے۔

خراٹے باز نے اپنا پھیلا ہوا جسم سمیٹا اور مجھے تشریف رکھنے کی دعوت دی جسے میں نے قبول کرلیا۔

"تمہارے پاس کچھ پانی وغیرہ بھی ہے؟"

"بالکل ہے سرکار!" وہ شخص بلغمی آواز میں بولا اور ایک جگہ سے کپڑا ہٹا دیا۔ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس چادر کے نیچے بھی فقیر یا نشے باز ہوں گے لیکن وہاں تو اس کا سامان ڈھیر تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے ٹین کے ٹرنک، دو تین بوریاں، کپڑوں کی گٹھریاں، برتن اور بستر وغیرہ تھا۔ اسی ڈھیر میں ایک طرف پانی کی صراحی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اگر صراحی پر ڈھکنا نہ ہوتا تو شاید میں پانی پینے سے انکار کردیتا۔

میں نے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔ "تم کیا نقل مکانی کر رہے ہو؟"

وہ حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں نے کیا پوچھا ہے۔

"میرا مطلب ہے کہ تم نے اپنا گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جانے کا فیصلہ کرلیا ہے؟" میں نے کہا۔

"او نہ جی نہ!" وہ جلدی سے بولا۔ "میں اپنی سسرال جارہا ہوں۔ میری سسرال وزیرآباد میں ہے۔"

"کیا دو چار سال کے لیے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں سرکار!" وہ بلغمی آواز میں بولا۔ "وہاں تو ہم لوگ صرف ایک مہینا رہیں گے۔ میرے سب سے چھوٹے سالے کی شادی ہو رہی ہے۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اس شخص سے فضول کی بکواس میں الجھا ہوا ہوں۔ کیا رات کے اس پہر اپنی جان پر کھیل کر میں اسی لیے آیا تھا کہ ان کی بکواس سنوں؟

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس سے پہلے کہ میں رابعہ کا نمبر ملاتا، سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر رابعہ کا نام تھا۔

"ہاں رابعہ؟" میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں پلیٹ فارم نمبر ایک پر ہوں۔" رابعہ نے جلدی سے کہا۔

"اچھا! میں آرہا ہوں۔" میں نے کہا اور ایک بار پھر تیزی سے پلیٹ فارم نمبر ایک کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچا تو رابعہ نے سیل فون پر کہا۔ "رفیق! تم فرسٹ کلاس کی بکنگ کے پاس پہنچو!"

میرا دماغ گھوم گیا۔ الو کی پٹھی! مجھے یوں دوڑا رہی ہے جیسے فلموں میں اغوا کرنے والے تاوان لینے کے لیے لواحقین کو دوڑاتے ہیں۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

میں ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ رابعہ نے پھر سیل فون پر کہا۔ "سوری رفیق! میں تمہیں بہت تنگ کر رہی ہوں۔" اس نے مجھے ایک دوسری جگہ بتاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "دیکھو رابعہ! مجھے نہیں معلوم۔ تم کس حال میں ہو لیکن اس بات کا یقین ہے کہ تمہاری جان کو خطرہ نہیں ہے ورنہ مجھے یوں نہ دوڑاتیں۔ اب مزید بھاگ دوڑ کے بجائے میں واپس جارہا ہوں۔ مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تم

مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔"

"رفیق پلیز!" رابعہ نے جلدی سے کہا۔ "تم مجھ سے ملو گے تو تمہیں یقین آجائے گا۔"

میں خاموشی سے اس طرف بڑھ گیا جہاں اس نے کہا تھا۔ پاکستان میں ہر ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کے عارضی قیام کے لیے چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے کمرے بنائے گئے تھے۔ ان کمروں میں مسافروں کو ہر سہولت میسر ہوتی تھی۔ بستر سے لے کر کھانے تک ہر چیز مہیا ہوتی تھی اور معاوضہ بھی برائے نام لیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ہمارے ملک میں زیادہ چل نہ سکا۔ لوگوں نے ان کمروں کو باقاعدہ قیام کا ذریعہ بنا لیا۔ پھر کچھ مسافر بھی ان کمروں کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ اب وہ کمرے موجود تو تھے لیکن اب وہاں کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ وہ کمرے اب مقفل رہتے تھے، ان میں ریلوے کے ملازمین قیام کر لیتے تھے۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا تھا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا لیکن مجھے وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔

میں آہستہ آہستہ ان کمروں کی طرف بڑھا جہاں رابعہ نے مجھے بلایا تھا۔ وہ کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کوریڈور میں مدھم سا ایک بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی اتنے طویل کوریڈور کے لیے ناکافی تھی۔

میں نے سیل فون پر رابعہ کا نمبر ملایا لیکن اس کا سیل فون آف تھا۔

مجھے اچانک شدید خطرے کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے چھپ کر دیکھ رہا ہو۔

میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ اسی لمحے کسی نے میری گردن پر ریوالور کی نال رکھ دی اور غرا کر بولا۔ "نہیں قبلہ نواب صاحب! مڑ کر مت دیکھیے گا، ورنہ آپ کی گردن میں سوراخ ہو جائے گا۔ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھیں۔" اس نے مجھے حکم دیا۔

میں نے اپنے ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ میں اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے وہ آواز کب سنی ہے۔ سنی بھی ہے یا یہ محض میرا وہم ہے؟

ریوالور والے نے بہت مہارت سے میری تلاشی لی اور میرے دونوں ریوالور لے لیے۔

"سیدھے چلیں۔" پشت سے پھر آواز آئی۔ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی تو وہ غرا کر بولا۔ "نو!" اس کے ساتھ ہی میری کمر پر زوردار لات پڑی۔

میں لڑکھڑا کر چند قدم آگے بڑھ گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری کمر پر کسی نے پانچ کلو کا وزنی ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔

"گردن کو ادھر ادھر گھمانے کی کوشش کریں گے تو اس مرتبہ لات کے بجائے گولی آئے گی۔ سیدھے چلتے رہیں۔"

اس وقت تک نیچے پلیٹ فارم پر اچھی خاصی گہما گہمی ہو گئی تھی۔ کئی گاڑیوں کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا لیکن اوپر کی طرف سناٹا تھا۔

میں سیدھا چلتا رہا۔

"اب دائیں طرف گھوم جائیں۔" کوریڈور کے اختتام پر مجھے محبت سے حکم دیا گیا۔

کوریڈور آگے جا کر انگریزی کے حرف "L" کی طرح گھوم گیا تھا۔ مڑتے ہوئے میں اچانک بیٹھ گیا اور بیٹھے ہی بیٹھے بلی کی سی تیزی سے اپنی لات دائرے کی شکل میں گھما دی۔

میرے عقب میں جو بھی تھا وہ انتہائی درجے کا محتاط تھا۔ میری لات اسے اچٹتی ہوئی لگی کیونکہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود وہ لڑکھڑا گیا۔ میں نے ریوالور کی پروا کیے بغیر اس پر جست لگائی اور اسے ساتھ لیے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں نے ریوالور اٹھانا چاہا تو اچانک ایک بے آواز فائر ہوا اور گولی میری سامنے والی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی درشت لہجے میں بولا۔ "تجھے عزت راس نہیں آتی، نواب کے تھنے؟" بولنے والی آواز بہت مکروہ اور لہجہ درشت تھا۔ "چل اٹھ اور باز دوالے کمرے میں جا!"

میں آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری دائیں جانب ایک قطار میں چار کمرے تھے۔ ان میں سے تیسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں رابعہ کو دل ہی دل میں انتہائی غلیظ گالیاں دیتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا۔ اچانک کسی نے پھر میری کمر پر لات رسید کی اور میں اوندھے منہ کمرے میں جا گرا۔ میرے عقب میں دروازہ بند ہو گیا۔

میں بھڑک کر پلٹا لیکن دروازہ اب بند ہو چکا تھا، میں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ وہ قدیم طرز کا بنا ہوا مضبوط دروازہ تھا۔ وہ دس بائی بارہ کا چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ خاصی بلندی پر ایک روشن دان تھا۔ کمرے میں پرانی سی ایک مسہری اور چوڑے ہتھوں کی بڑی سی ایک آرام دہ کرسی پڑی تھی۔ اس قسم کی بھاری بھرکم کرسیاں انگریزوں کے دور کی یادگار ہیں اور اب بھی اکثر ریلوے



اسٹیشنوں اور ڈاک بنگلوں میں نظر آتی ہیں۔ کرسی کے ساتھ ہی بھاری بھرکم ڈریسنگ ٹیبل تھی جس کا آئینہ امتدادِ زمانہ سے اپنی آب و تاب کھو بیٹھا تھا اور اب محض شیشے کا ایک ٹکڑا رہ گیا تھا۔ مسہری پر بستر البتہ صاف ستھرا تھا۔

وہاں ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر دروازے پر زور آزمائی کی لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ میں نے دروازہ پوری قوت سے پیٹ ڈالا۔ "کوئی ہے؟" مجھے اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ میں پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے دوبارہ چیخا۔ "کوئی ہے یہاں؟"

میرا خیال تھا کہ میری آواز ریلوے کے کسی ملازم یا ریٹائرنگ روم کے بیرے تک پہنچ جائے گی لیکن میری آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ میرا دل چاہا کہ اپنا جوتا اتار کر اپنے ہی سر پر مارنا شروع کر دوں۔ حماقت کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ میں نے نہ جانے کس گھمنڈ میں رابعہ کی باتوں پر اعتبار کر لیا تھا۔ فریال میں اور رابعہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ فریال نے مجھ سے بے وفائی ضرور کی تھی لیکن وہ مجھے نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ اس نے صرف اپنا راستہ بدلا تھا۔ دوسری طرف رابعہ تھی۔ وہ میری محبت کا دم بھرتی تھی اور میری جان بھی لینا چاہتی تھی۔ میں نے خود سے کہا۔ "نواب رفیق احمد شیرازی! تم نے رابعہ سے کہا تھا کہ خود کردہ را علاج نیست! فارسی کا یہی محاورہ تم پر بھی صادق آتا ہے۔ تم نے اس دشمن جاں رابعہ پر ایسا اندھا اعتماد کر لیا کہ اکیلے ہی لاہور کی طرف دوڑ پڑے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر لاہور پہنچے اور اس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔" میں نے بے خیالی میں سیل فون نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن فوراً ہی یاد آ گیا کہ سیل فون مجھ سے چھینا جا چکا ہے۔ اس مردود نے تلاشی لیتے وقت میرا رومال اور پرس تک نکال لیا تھا۔ میں نے بھنا کر لکڑی کے مضبوط دروازے پر لاتیں ماریں لیکن سوائے شور شرابے کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں پھر پوری قوت سے چیخا۔ "رابعہ!" میری آواز پھر سناٹے میں گونج کر رہ گئی۔

اچانک بیڈ کے نیچے سرسراہٹ سی ہوئی پھر آواز آئی۔ "شور شرابا کر کے اپنی انرجی کیوں ضائع کر رہے ہو نواب رفیق! اب یہ کمرا ہی تمہارا مدفن بننے والا ہے۔"

"مجھے دفن کرنے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ تم ہو کون؟"

"ابھی ساری شوخی اور بزلہ سنجی ناک کے رستے بہہ جائے گی۔ میری بات کو مذاق مت سمجھو۔"

"میں اسے کب مذاق سمجھ رہا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں تو صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم ہو کون؟ اتنا تو میرا حق ہے کہ میں مرنے سے پہلے اپنے قاتل کا نام پوچھ لوں۔"

"تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہو گی۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں دلاور بول رہا ہوں۔ اب تمہاری تسلی ہو گئی۔ اب میری بات غور سے سنو۔ یہ جو کمرے میں چھوٹا دروازہ ہے۔ یہ باتھ روم ہے لیکن اسے کھولنے کی کوشش مت کرنا، باتھ روم میں انتہائی طاقت ور ٹائم بم ہے، اس کا فیوز دروازے کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اگر تم نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بم قبل از وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ بم ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پھٹ جائے گا۔ اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں یعنی اگر تم نے باتھ روم کا دروازہ نہ کھولا تو تمہارے پاس ایک گھنٹا ہے۔ تم خود کو بہت افلاطون سمجھتے ہو نا! اب اگر بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ۔"

میں نے بیڈ کے نیچے جھانک کر دیکھا، وہاں مجھے چھوٹا سا ایک پاکٹ سائز ریڈیو نظر آیا۔ آواز اسی ریڈیو سے آ رہی تھی۔ میں نے وہ ریڈیو اٹھا لیا۔ دیکھنے میں وہ عام سا ریڈیو تھا۔ غالباً اسے کسی خاص فریکوئنسی پر سیٹ کیا گیا تھا یا پھر اس میں کوئی ایسی ڈیوائس لگائی گئی تھی جس کے ذریعے میری آواز بھی دوسری طرف سنی جا رہی تھی۔

اب وہ ریڈیو خاموش تھا۔ میں نے اسے منہ کے نزدیک لا کر کہا۔ "ہیلو! ہیلو..... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

دوسری طرف خاموشی طاری رہی۔ میں نے وہ ریڈیو ایک طرف رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ اس صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ گزرنے والا ہر منٹ مجھے موت سے نزدیک کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ پر احسان کیا تھا کہ میری کلائی کی گھڑی میرے پاس چھوڑ دی تھی۔ اس وقت مجھے بچپن میں پڑھا ہوا ایک شعر یاد آیا، غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی۔ گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور بتا دی! مجھے رہ رہ کر رابعہ پر غصہ آ رہا تھا پھر رابعہ سے زیادہ مجھے خود پر غصہ آیا کہ میں اس کی باتوں میں کیوں آ گیا؟ اس کی جان خطرے میں تھی تو ہوا کرے، مجھے کیا ضرورت تھی اس عذاب میں مبتلا ہونے کی؟ میں نے خود سے کہا، تم کیا خود کو دوسروں کا بہت ہمدرد سمجھتے ہو نواب رفیق احمد شیرازی! تمہیں کیا ضرورت تھی محمد بن قاسم بننے کی؟ میں مضطرب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ وقت خود پر یا کسی پر لعنت ملامت کرنے کا نہیں تھا۔ مجھے تو صرف یہ سوچنا چاہیے کہ میں اپنی جان کیسے بچا سکتا ہوں؟

میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ مجھے وہ روشن دان نظر آیا جس میں سے روشنی کی ایک لکیر اندر آرہی تھی۔ کمرے کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں اور وہ روشن دان خاصی بلندی پر تھا۔ میں اگر کسی نہ کسی طرح وہاں تک پہنچ بھی جاتا تو بھی میں اس میں سے نکل نہیں سکتا تھا۔

میں نے سوچا، میں وہاں سے باہر کا جائزہ تو لے ہی سکتا ہوں۔ وہاں چڑھ کر شور مچا سکتا ہوں، دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتا ہوں۔

یہ سوچ کر میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کمرے میں بھاری بھرکم سی ایک ڈریسنگ ٹیبل موجود تھی۔ اگر میں اسے مسہری پر رکھ کر اس کے آئینے والے حصے پر چڑھ جاتا تو روشن دان تک پہنچ سکتا تھا۔

میں نے مسہری کھینچ کر روشن دان کے نیچے لگائی۔ پھر میز گھسیٹنے کی کوشش کی تو مجھے دانتوں پسینا آگیا۔ وہ میز خاصی بھاری تھی۔ میز گھسیٹنے میں ہی پسینے پسینے ہوگیا۔ میں نے اپنی کوشش ترک کردی۔ اس ڈریسنگ ٹیبل کو جگہ سے ہلانا ہی مشکل تھا، میں اسے بیڈ پر کیسے رکھ سکتا تھا۔

میز ہٹانے سے پلاسٹر کا ایک ٹکڑا اکھڑ کر فرش پر گر گیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہاں شاید دروازہ تھا جسے بعد میں بند کردیا گیا تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ مارا تو پلاسٹر کا ایک اور ٹکڑا جھڑ کر میرے سامنے گر پڑا۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے دوسری طرف سے بھی کوئی دیوار پر ٹھک ٹھک کر رہا ہو۔ میں نے پھر دیوار پر مکے مارے تو مزید پلاسٹر جھڑ کر گرا اس کے ساتھ ہی مجھے دوسری طرف سے ٹھک ٹھک کی آواز واضح سنائی دی۔

میں نے دیوار تھپتھپائی تو دوسری طرف سے پھر کسی نے ٹھک ٹھک کی۔ پلاستر جھڑنے کے بعد مجھے اینٹیں دکھائی دے رہی تھیں لیکن وہ بہت مضبوطی سے لگی ہوئی تھیں۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی مدد سے میں کوئی اینٹ نکال سکتا۔

میں دیوانہ وار کمرے میں چکر انے لگا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھولی کہ شاید مجھے اس میں کچھ مل جائے لیکن اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو میرا سانس رکنے لگا۔ بم پھٹنے میں اب صرف سات منٹ اور چوالیس سیکنڈ باقی تھے۔ میں کمرے میں دیوانہ وار چکر لگانے لگا۔ میں نے کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ واہ نواب رفیق شیرازی! تم تو خود کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے، بہت عقل مند سمجھتے تھے۔ خود ہی مرنے کے لیے اس چوہے دان میں آپھنسے۔ میں نے اپنی موت کا تصور کیا، جب اس کمرے کے ملبے سے میری لاش ملے گی تو اس کی شناخت بھی نہ ہوسکے گی۔ تمہیں لاوارث لاش کی طرح لاہور کے کسی اسپتال میں پھینک دیا جائے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ ٹوٹا پھوٹا جسم نواب رفیق کا ہے۔ وہ نواب رفیق جو لندن میں اپنے تئیں لارڈ رفیق کہلاتے تھے۔ مجھے ایک ایک کرکے اپنے پیاروں کے چہرے نظر آئے۔ وہ سب میری گم شدگی سے پریشان تھے۔ راجا کہہ رہا تھا، نکل گیا ہوگا کسی لڑکی کے چکر میں۔ نور اس کی یہ بات نہیں مان رہی تھی کہ رفیق ایسا نہیں کرسکتا۔ اب اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آسکتی۔ کم سے کم میری زندگی میں تو نہیں۔ غنی اپنی صفائی پیش کررہا تھا کہ میں نے نواب صاحب سے بہت کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے دوسرا منظر آگیا۔ میری لاش حویلی کے ہال میں رکھی ہے اور حویلی میں آہ و بکا مچی ہوئی ہے۔ ہر آدمی اشک بار ہے۔

اچانک جھرجھری لے کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

انسان موت کے خوف میں مبتلا ہوتا ہوگا تو اس کے ذہن میں ایسے ہی خیالات آتے ہوں گے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اب بم پھٹنے میں ایک منٹ رہ گیا تھا۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر میز کو گھسیٹ کر کمرے کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا اور خود میز کے نیچے بیٹھ گیا کہ ممکن ہے بم اتنا طاقت ور نہ ہو اور اس سے صرف باتھ روم اور اس طرف کی دیوار گرے یا دھماکے سے کمرے کی دوسری دیواریں بھی گر جائیں تو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ڈوبتا ہوا انسان تنکے کو بھی سہارے کے طور پر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں دونوں ہاتھ کان پر رکھ کے دھماکے کا انتظار کرنے لگا۔ وقت اب بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ میں کسی خوف زدہ بچے کی طرح دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے بیٹھا رہا۔ میں نے آنکھیں بھی بند کرلی تھیں کہ دھماکے کے بعد گرد و غبار اور مٹی اڑ کر میری آنکھوں میں نہ جائے۔

مجھے بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی یا پھر مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں گھنٹوں سے یہاں بیٹھا ہوں۔

اچانک کسی کا مکروہ قہقہہ وہاں گونجا تو میں بری طرح اچھل پڑا۔ پھر ریڈیو سے آواز آئی۔ ”نواب صاحب! کیسا رہا یہ تجربہ؟ موت کا انتظار کررہے ہو؟“ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔



”نواب کی دم! تم اتنے بزدل تو نہیں ہوسکتے کہ موت کے خوف سے بے ہوش ہوجاؤ۔ وہاں کوئی بم نہیں ہے۔“ ریڈیو سے آواز آئی۔

”تم کیا سمجھتے ہو، میں نے تمہاری بکواس پر یقین کرلیا تھا؟“ میں نے کہا۔ یہ جان کر مجھ میں ایک نئی توانائی بھر گئی تھی کہ وہاں بم نہیں ہے۔ ”تم لوگ اتنے احمق تو نہیں ہوسکتے کہ ایک بھرے پڑے اسٹیشن پر بم کا دھماکا کردو۔“

”ہم اس سے بھی زیادہ احمق ہیں۔“ بولنے والا زہریلے لہجے میں بولا۔ ”بس ابھی تمہاری موت کا وقت نہیں آیا۔ ورنہ ہمیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دھماکا کسی بھرے پرے ریلوے اسٹیشن پر ہورہا ہے یا کسی ویرانے میں۔ ہم سے کون پوچھے گا اور کیسے پوچھے گا کہ دھماکا کیوں کیا؟“

”بہت بکواس کرچکے تم!“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے یہاں لائے کیوں ہو؟“

”یہاں تو تم خود آئے ہو جعلی نواب!“ بولنے والا مضحکہ خیز انداز میں بولا۔ ”ہم لوگ تو.....“

اچانک وہ بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی کسی کا گلا دبا رہا ہو۔ اس کے بعد مجھے ایک کراہ سنائی دی پھر سناٹا چھا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بولنے والے کو کیا ہوا ہے؟ کیا وہ دانستہ خاموش ہوا ہے یا اسے خاموش کردیا گیا ہے؟

میں کچھ دیر کان لگائے دوسری طرف کی آواز سننے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہاں اب بالکل خاموشی تھی۔ میں نے چیخ کر کہا۔ ”میں نے تجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

دوسری طرف سناٹا رہا۔ میں سمجھا کہ اس میں بھی دشمنوں کی کوئی چال ہے۔ وہ لوگ مجھے ذہنی اذیت پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ سوچ کر میں بھی خاموش ہوگیا۔

میں ابھی تک ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔

اچانک مجھے کوریڈور میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ آواز میرے کمرے کے دروازے پر آکر رک گئی۔

میں تیزی سے دروازے کے نزدیک پہنچا اور دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔

دروازہ کھلا تو میں چوکنا ہوکر کھڑا ہوگیا۔ پھر اچانک کمرے میں ایک آدمی آگرا۔ اسے شاید باہر سے کسی نے دھکا دے کر اندر پھینکا تھا۔ میں سمجھا کہ مجھے قید کرنے والے کسی اور قیدی کو لائے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے جو آدمی داخل ہوا، اسے دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ غنی تھا۔ اس نے اندر گرنے والے کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ اس نے اندر آکر گرنے والے کو ایک لات رسید کی اور بولا۔ ”بتا تو کس کے لیے کام کررہا ہے؟ جلدی بول میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں تجھے ذبح کرکے یہیں چھوڑ جاؤں گا۔“

”وہ..... میں.....“ گرنے والے کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

اچانک پھر کسی نے برابر والے کمرے کی دیوار پر ٹھک ٹھک کی۔

غنی چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”اس کمرے میں بھی شاید کوئی قید ہے۔“ میں نے غنی سے کہا۔

غنی نے ایک ریوالور مجھے دیا اور خود جھپٹ کر باہر نکل گیا۔

دو تین منٹ بعد مجھے پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ غنی کے ساتھ رابعہ تھی۔ اس کے بال خاک آلود اور لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے تاثرات تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے بولی۔ ”تم آگئے رفیق! مجھے یقین تھا کہ تم مجھے مصیبت میں تنہا نہیں چھوڑو گے۔“

اچانک مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ اگر رابعہ بھی یہاں قید تھی تو وہ لوگ اس طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔

”غنی! یہاں سے فوراً نکلو۔“ میں نے کہا۔

”فکر مت کریں سر! دشمن یہاں سے فرار ہوچکے ہیں۔ باہر ہمارے آدمی موجود ہیں۔“

”تو کیا اب تم مستقل یہیں قیام کرو گے؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

”نہیں سر!“ غنی نے کہا۔ ”میں اس شخص کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“

”یہ کوئی اہم آدمی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے ذبح کرکے یہیں چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے سر!“ غنی نے یوں کہا جیسے میں نے مرغی ذبح کرنے کی بات کی ہو۔

کمرے میں پڑے ہوئے شخص کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ میرے تیور دیکھ کر اسے اپنی موت کا یقین آگیا تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”نواب صاحب!

میں واقعی بہت معمولی سا آدمی ہوں۔ مجھے..... مجھے شہباز نے پانچ ہزار روپے دیے تھے اور کہا تھا کہ میں آپ کو یہاں لاکر بند کردوں۔"

"بکواس کی تو میں خود تجھے ذبح کردوں گا۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "کیا تجھے الہام ہوا تھا کہ میں یہاں آرہا ہوں یا پھر اس شہباز کو غیب کا حال معلوم ہے؟"

"میں آپ کو سب کچھ بتادوں گا، پہلے آپ یہاں سے تو نکلیں۔ یہاں آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے؟" وہ آدمی لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "شہباز اور اس کے ساتھی ابھی تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔ وہ شاید مجھے بھی زندہ نہ چھوڑیں۔"

"شہباز اور اس کے ساتھیوں کی فکر تم مت کرو۔" غنی نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں خود ان کا انتظار کررہا ہوں۔"

"یہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہے رفیق!" رابعہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ لوگ واقعی نہ تمہیں زندہ چھوڑیں گے نہ مجھے۔"

"یہاں سے نکل ہی چلو!" میں نے غنی سے کہا۔

رابعہ کا حلیہ خراب ہورہا تھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ اس حلیے میں باہر نکلنے کے قابل نہیں تھی۔ میں نے بیڈ کی چادر اٹھائی اور رابعہ کے جسم پر ڈال دی۔

"میں دوسرے کمروں کی تلاشی لے لوں۔" غنی نے کہا۔ "ممکن ہے وہاں ہمیں کچھ سراغ مل جائے۔"

غنی کمرے سے باہر نکلا تو میں نے قیدی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرا ست کررہ گیا تھا۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ بلاوجہ فضول میں دیر کررہے ہیں۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

پانچ منٹ بعد غنی لوٹ آیا۔ وہ کچھ بوکھلایا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے غنی؟" میں نے پوچھا۔

"سر، یہاں ایک کمرے میں اسلحے اور منشیات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کمرے میں کسی کی لاش بھی پڑی ہے۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ یہاں سے فوراً نکلیں سر؟ اگر ان لوگوں نے پولیس کو اطلاع دے دی کہ یہاں اسلحے اور منشیات کے ساتھ نواب رفیق اور اس کے آدمی بھی موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک آدمی کو قتل بھی کردیا ہے تو ہماری پوزیشن کیا ہوگی؟"

غنی واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے اور انہوں نے یہاں اسلحے اور منشیات کا ذخیرہ کیوں کیا تھا؟ ممکن ہے ان سماج دشمن عناصر کے ساتھ ریلوے کا کوئی افسر بھی ملوث ہو ورنہ وہ اتنا اسلحہ ریلوے اسٹیشن پر نہیں رکھ سکتے تھے۔

غنی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر میرے دونوں ریوالورز، پرس اور موبائل فون نکالا اور میرے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کی یہ چیزیں بھی مجھے اسی کمرے سے ملی ہیں۔" میں نے وہ چیزیں جیبوں میں رکھیں اور غنی کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

غنی نے اپنے شکار کو گھسیٹا اور بولا۔ "اگر تو نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تجھے گولی ماردوں گا۔ میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے اور میں جیب سے بھی فائر کرسکتا ہوں۔" اس نے قیدی کو آگے کی طرف دھکا دیا۔

میں نے چلتے چلتے وہ ریڈیو بھی اٹھالیا جس کے ذریعے مجھ سے بات کی جارہی تھی۔

غنی کے ساتھیوں میں احمد شاہ بھی تھا۔ اس کے ساتھ تین گارڈز اور تھے۔ وہ تیزی سے نیچے گیا پھر اوپر آکر ہمیں نکلنے کا اشارہ کیا۔ پہلے میں ٹہلنے والے انداز میں باہر نکلا۔ وہ زینہ نسبتاً ویران گوشے میں تھا، اس لیے کسی نے مجھ پر دھیان نہ دیا۔ میرے پیچھے پیچھے رابعہ تھی۔

احمد شاہ تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔ "سر، اس طرف سے باہر آجائیں۔" اس نے کچھ فاصلے پر موجود دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں گاڑی لے کر وہیں آتا ہوں۔"

میں خاموشی سے اس دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا جسے قلی اور ریلوے کے دوسرے ملازمین استعمال کرتے ہوں گے۔ میرے پیچھے پیچھے رابعہ بھی نکل آئی۔ اس کے پیچھے غنی تھا۔ وہ قیدی کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے وہ اس کا بے تکلف دوست ہو۔

احمد شاہ نے گاڑی بالکل میرے سامنے روکی تو میں نے رابعہ کو گاڑی میں بٹھایا، پھر خود بھی گاڑی میں بیٹھ گیا اور احمد شاہ سے کہا۔ "احمد شاہ! یہاں میری لینڈ کروزر بھی ہے۔"

"یس سر!" احمد شاہ نے کہا۔ "آپ کی گاڑی غنی لے آئے گا۔ اسے معلوم ہے کہ یہاں آپ کی گاڑی موجود ہے۔" اس نے گاڑی کو آگے بڑھادیا۔

"تم کہاں جارہے ہو؟" میں نے چونک کر احمد شاہ سے پوچھا۔

"سر! غنی صاحب نے ست بدھائی چلنے کو کہا تھا۔"

"نہیں!" میں نے کہا۔ "ابھی میں لاہور میں رکنا



چاہتا ہوں۔"

احمد شاہ نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

فوراً ہی میری لینڈ کروزر وہاں آکر رک گئی۔ اس میں سے غنی اترا اور لپک کر ہماری طرف آیا۔ "کیا ہوا سر؟"

"ہم فی الحال ست بدھائی نہیں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "لاہور میں کہیں قیام کریں گے۔"

"سر! اگر آپ پسند کریں تو یہاں ماڈل ٹاؤن میں ایک بنگلا موجود ہے۔" غنی نے کہا۔

"یہاں کس کا بنگلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بنگلا میرے ایک دوست کا ہے سر!" غنی نے جواب دیا۔ "اس کا کوئی رشتے دار پاکستان میں نہیں ہے۔ وہ خود بھی آج کل کینیڈا گیا ہوا ہے۔ بنگلے کی چابی وہ مجھے دے گیا تھا۔"

"تمہیں کیوں دے گیا؟" میں نے پوچھا۔

"سر! وہ بنگلا بیچنا چاہتا ہے، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بنگلے کو مناسب قیمت پر فروخت کردوں۔"

"چلو، پھر وہیں چلو۔" میں نے کہا۔

غنی نے احمد شاہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہماری گاڑیاں ایک مرتبہ پھر روانہ ہوئیں۔

غنی کے اس دوست کا بنگلا پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بڑا سا لان تھا اور کار پورچ اتنا بڑا تھا کہ اس میں بیک وقت چار گاڑیاں کھڑی ہوسکتی تھیں۔ بنگلے میں فرنیچر بھی پرانی طرز کا تھا اور اس بنگلے کے لحاظ سے بہت کم تھا۔ اس میں چار بیڈ روم تھے جن میں سے دو بالکل خالی تھے۔

وہاں اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے غنی سے کہا کہ وہ بازار سے کھانا لے آئے اور رابعہ کے سائز کے دو تین ریڈی میڈ سوٹ بھی لیتا آئے۔

غنی کھانا لینے چلا گیا۔ احمد شاہ اور دوسرے گارڈز بنگلے کے گیٹ اور مختلف جگہوں پر کھڑے ہوگئے۔ ان لوگوں نے قیدی کو بھی ایک کمرے میں بند کردیا تھا۔ غنی نے ایک احتیاط یہ کی تھی کہ قیدی کی آنکھیں پٹی باندھ دی تھی۔

رابعہ اب تک بالکل خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "رابعہ!"

"آں!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"یہ سب کیا ہے رابعہ؟" میں نے پوچھا۔ "تم تو لندن میں تھیں، یہاں واپس کب آئیں اور یہ دلاور کون ہے؟"

"یہ لمبی کہانی ہے رفیق!" رابعہ کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کہاں سے شروع کروں؟"

"یہ بتاؤ، تم کورٹ کیوں نہیں پہنچی تھیں؟ میں نے تو گفٹ ڈیڈ پر سائن کردیے تھے۔"

"میں نے جذبات سے مغلوب ہوکر زوہیب کا ساتھ دینے کا فیصلہ تو کرلیا تھا لیکن مجھے فوراً ہی احساس ہوگیا تھا کہ میں زوہیب سے شادی کرکے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کروں گی۔ وہ مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرکے پھینک دے گا اور میں جب تک زندہ رہوں گی، اس کا ظلم سہتی رہوں گی۔ میں نے تم سے کہا تو تھا کہ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ تمہاری پناہ میں آنا چاہتی ہوں۔"

"تم نے تو میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کے باوجود تمہیں امید تھی کہ میں تمہیں اپنالوں گا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں تمہیں بچپن سے جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم میری تمام غلطیوں کو معاف کردو گے لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو میں عین وقت پر غائب ہوگئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔"

"تمہارا کیا خیال تھا کہ زوہیب تمہیں چھوڑ دے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میں جانتی تھی کہ زوہیب کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ میں کافی دن تک تو دینہ کے ایک گاؤں میں چھپی رہی، وہاں میری ایک دوست رہتی تھی اسکول کے زمانے کی۔ وہ شادی ہوکر اسی گاؤں میں گئی تھی۔ اس کا شوہر اچھا خاصا زمیندار ہے۔"

"تم نے یہ سوچا تھا کہ زندگی بھر وہیں چھپی رہو گی؟" میں نے کہا۔

"میں وہاں اس وقت تک چھپی رہنا چاہتی تھی جب تک معاملہ دب نہیں جاتا۔" رابعہ نے کہا۔

"پھر تم نے اپنی موت کا ڈراما رچایا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ ڈراما زوہیب کا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن فون پر بات تو بعد میں تم نے کی تھی؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی بے سروپا کہانی پر بالکل یقین نہیں آیا تھا۔

"جب تم اس عورت کو شناخت کرکے باہر نکلے تو میری دوست کے شوہر نے تمہیں دیکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ نواب رفیق اپنی کزن کی موت پر آنسو بہا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ

اب بھی تمہارے دل میں میرے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ یہی سوچ کر میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ میں نے تو تمہیں سرپرائز دینا چاہا تھا لیکن تمہاری باتیں بہت حوصلہ شکن تھیں۔ مجھے تمہاری باتیں سن کر ایک مرتبہ پھر تم پر غصہ آ گیا ورنہ میں اسی وقت تمہیں سب کچھ بتا دیتی۔'' وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔

اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی لیا اور اسے ایک ہی سانس میں پی گئی۔

اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''زوہیب کتوں کی طرح ہر جگہ میری بو سونگھتا پھر رہا تھا۔ میری دوست کے شوہر غلام علی نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ کچھ دن کے لیے ملک سے باہر چلی جائیں۔ دبئی، سعودی عرب، امریکا یا انڈیا، کہیں بھی! میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔ غلام علی کو اپنی بھی فکر تھی۔ وہ زوہیب سے بھی خوف زدہ تھا اور تم سے بھی۔ اس نے کئی دفعہ دبے لفظوں میں کہا کہ آپ کی وجہ سے میں بھی مارا جاؤں گا۔ ایک طرف رانا ہے اور دوسری طرف نواب رفیق! دو بڑے لوگوں کی لڑائی میں، میں پس جاؤں گا۔ مجھے خود بھی احساس تھا کہ میری وجہ سے وہ بھی مصیبت میں پڑ جائے گا۔ میں نے بھی ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے اکاؤنٹ میں رقم تو اچھی خاصی تھی۔ میں نے لندن کا ویزا لگوایا اور لندن پہنچ گئی۔''

''دلاور تمہیں کہاں ملا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''دلاور مجھے لندن میں ہی ملا تھا۔ وہ کیا ملا تھا، میں ہی اس سے ملی تھی۔ غلام علی کے اس سے تعلقات تھے۔ میں نہیں جانتی کہ ان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میرا ایک دوست بھی آج کل لندن میں ہے۔ میں اس کے نام تمہیں خط لکھ دوں گا، تم اس سے مل لینا، وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کرے گا۔ پھر غلام علی نے اپنے اس دوست کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میں بھی مرعوب ہوگئی۔ غلام علی نے یہ بھی بتایا تھا کہ میرا وہ دوست بھی اتنی قوت رکھتا ہے کہ تمہیں رانا اور رفیق سے بھی بچا لے گا۔ میں لندن جا کر اس سے ملی، وہ دلاور تھا۔ دلاور نے میری بہت خاطر تواضع کی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ زوہیب اور نواب رفیق دونوں ہی میری جان کے درپے ہیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے تم دونوں سے بچا لے گا۔''

''تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میری گاڑی کو دھماکے سے کس نے اڑایا تھا؟''

''میں نہیں جانتی کہ تمہاری گاڑی کو کس نے اڑایا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ اس عورت کو قتل کرنے کے بعد اس کے گلے میں میرا لاکٹ اور انگلی میں میری انگوٹھی کس نے ڈالی؟ جب میں زوہیب کے ساتھ تھی تو وہاں میری انگوٹھی، لاکٹ اور چوڑیاں وغیرہ رہ گئی تھیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ حرکت زوہیب کی ہو سکتی ہے۔ دلاور نے میرے واقعات سنے تو وہ میری مدد پر آمادہ ہوگیا۔ لندن میں بھی اس کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے۔ دلاور کسی بھی طرف سے جرائم پیشہ نہیں لگتا۔ وہ پڑھا لکھا شخص ہے اور اپنی گفتگو، لباس اور طرز عمل سے بہت جلد لوگوں کو دوست بنا لیتا ہے۔''

''وہ لوگوں کے کام کرنے کے لیے بھاری معاوضہ وصول کرتا ہے۔ تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟''

''مجھے غلام علی نے بتایا تھا کہ وہ اسلحے اور منشیات کا ڈیلر ہے اور بھاری معاوضہ لے کر ہر قسم کا کام کرتا ہے۔ میں نے دلاور سے کہا، میں زیادہ معاوضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس نے کہا۔ ''میں ابھی آپ سے اس کام کا معاوضہ نہیں لوں گا۔ جب آپ کا کام ہو جائے گا تو آپ کے پاس اتنی دولت ہوگی کہ مجھے دگنا معاوضہ ادا کر سکیں۔''

''تم نے کہا ہوگا کہ پہلے تم نواب رفیق کو ٹھکانے لگاؤ، پھر میں تمہیں دگنا کیا چار گنا معاوضہ ادا کر دوں گی۔''

رابعہ کھسیانی ہوگئی۔ ''میں اس وقت انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ میں نے ہامی بھر لی۔ پھر اس نے اپنے طور پر تمہارے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہاں نواب رفیق کی ہونے والی بیوی نور بھی ہے۔ تم اس سے ملاقات کرو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے؟''

''پھر اس نے کیا بتایا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کیا چاہتا تھا؟''

''وہ چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح نور کا اعتماد حاصل کر کے تمہارے آفس تک پہنچ جاؤں لیکن نور اتنی احمق ہے نہیں جتنا ہم لوگوں نے سمجھا تھا۔ اس نے مجھے قید کر دیا تو میں نے پاگل پن کا ڈراما رچایا اور وہاں سے فرار ہوگئی۔''

''لیکن دلاور تمہارا دشمن کیسے ہوگیا؟'' میں نے پوچھا۔ ابھی تک مجھے اس کی کہانی پر ذرا سا بھی یقین نہیں آیا تھا۔

''دلاور چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں۔'' رابعہ نے کہا۔ ''وہ بھی زوہیب کی طرح مجھ سے شادی کر کے ست بدھائی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔''

''تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ دلاور کے تعلقات زوہیب سے بھی تھے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے پہلے واقعی اس بات کا علم نہیں تھا لیکن ایک دن



میں نے دلاور کو فون پر بات چیت کرتے سن لیا۔ وہ زوہیب سے بات کر رہا تھا۔ مجھے اگر علم نہ ہوتا تو شاید میں آج زوہیب کے قبضے میں ہوتی۔ یہاں آ کر میں نے دلاور کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دلاور کا ردعمل کیا ہوگا اس لیے میں اس سے پہلے ہی وہاں سے فرار ہوگئی۔ میں نے دارو غہ والا میں چھوٹا سا ایک مکان پہلے ہی لے لیا تھا۔ وہاں سے فرار ہو کر میں دارو غہ والا میں چھپ گئی لیکن دلاور کو نہ جانے کیسے میرے گھر کا علم ہوگیا۔ اس نے مجھ پر چوری کا جھوٹا مقدمہ قائم کر کے پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا دیا؟ وہ خود تو پہلے ہی میری جان کا دشمن تھا۔ کل رات ان لوگوں نے اچانک مجھے گھیر لیا۔ میں چھت کے ذریعے پڑوس کے مکان میں گئی اور وہاں سے بھی فرار ہوگئی۔ میں نے تمہیں فون کیا اور خود ریلوے اسٹیشن پر جا کر چھپ گئی۔'' اتنا کہہ کر رابعہ خاموش ہوگئی۔

میں بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی سنائی ہوئی کہانی کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آیا تھا۔ وہ تو بہر حال ذہین اور طاقت ور نہیں تھی کہ زوہیب کے ساتھ دلاور جیسے بین الاقوامی مجرم سے بھی نمٹ سکتی۔

غنی کھانا اور دوسرا سامان لے کر آ گیا تھا۔ میں نے رابعہ کو نئے کپڑے دیے۔ وہ باتھ روم میں چلی گئی تو غنی نے کھانا لگا دیا۔ رابعہ بھی نہا دھو کر آ گئی تھی۔ اس نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھی۔

''رابعہ! تم کچھ دیر آرام کر لو۔'' میں نے کہا۔ ''تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔ اب شام کو بات ہوگی۔''

رابعہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں بھی ایک بیڈ تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے راجا کا نمبر ملایا۔

میری آواز سنتے ہی وہ بولا۔ ''تو کہاں غائب ہے فیکے پتر!''

''میں لاہور میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لاہور میں!'' راجا نے کہا۔ ''تو اچانک وہاں کیسے چلا گیا؟''

''یار، مجھے رابعہ نے بلایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کیا؟'' راجا چیخ پڑا۔ ''الو کے پٹھے! تو ابھی تک اس کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ اس نے بلایا اور تو چل دیا؟ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ تیری دشمن ہے۔ پھر کیا تیری اس سے ملاقات ہوئی؟'' راجا نے پوچھا۔

''ہاں، میری ملاقات ہوئی۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ بے چاری ایک جگہ قید تھی۔''

''وہ اتنی بے چاری بھی نہیں۔'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو نے ہیرو بن کر اسے قید سے رہائی دلا دی نا! اب تو وہاں کیا کر رہا ہے؟''

''یار.....! وہ رابعہ میرے ساتھ ہی ہے..... میں.....''

''کیا؟'' راجا چونک کر بولا۔ ''وہ خبیث لڑکی تیرے ساتھ ہے؟''

''ہاں یار!'' میں نے کہا۔ ''وہ اپنے دشمنوں سے بہت خوف زدہ ہے۔''

''اسے فوراً چلتا کر دے فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''مجھے تو یہ بھی رابعہ کی کوئی چال ہی لگ رہی ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''تو لاہور میں کہاں ہے؟''

''ماڈل ٹاؤن کے ایک بنگلے میں!'' میں نے جواب دیا۔

''وہ بنگلا اگر رابعہ کا ہے یا اس نے اس کا پتا بتایا ہے تو فوراً وہاں سے نکل جا۔'' راجا پر تشویش انداز میں بولا۔

''بنگلا رابعہ کا نہیں ہے۔ یہاں مجھے احمد شاہ لایا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا احمد شاہ اور غنی کو بھی ساتھ لے کر گیا ہے؟''

''نہیں یار!'' میں نے کہا۔ ''یہ لوگ تو بعد میں آئے ہیں۔'' اس کی بات پر میں نے سوچا کہ میں نے اب تک غنی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ وہاں کیسے پہنچ گیا۔

''اگر رابعہ تیرے ساتھ ہے تو اس سے فوراً پیچھا چھڑا لے۔'' راجا نے کہا۔ ''یہ اچھی بات ہے کہ غنی اور احمد شاہ تیرے ساتھ ہیں۔''

''یار راجا! تو لاہور آ سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تیرا یہاں آنا بہت ضروری ہے۔''

''ضروری ہے تو میں آ جاؤں گا۔'' راجا نے کہا۔ ''تو مجھے ایڈریس بتا۔''

''تو ماڈل ٹاؤن تو پہنچ۔ تجھے احمد شاہ ایڈریس سمجھا دے گا۔''

''اوکے یار، میں آ رہا ہوں۔'' راجا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے غنی سے پوچھا۔ ''غنی! تم وہاں کیسے پہنچ گئے؟''

''جب آپ حویلی سے باہر نکلے تو میں بھی احمد شاہ اور دوسرے گارڈز لے کر آپ کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ آپ کا پیچھا کرنے میں مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ آپ جس طوفانی انداز

میں ڈرائیونگ کر رہے تھے اسے دیکھ کر میں ہول رہا تھا۔ مجھے یہی دھڑکا تھا کہ آپ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔ میں آپ کا تعاقب کرتا ہوا لاہور کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچا۔ پھر آپ کے پیچھے پلیٹ فارموں پر بھاگتا رہا۔ آپ جب ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلے تو میں یہ سمجھا کہ آپ واپس جا رہے ہیں لیکن کسی سے فون پر بات کرنے کے بعد آپ پھر پلیٹ فارم پر گئے اور اس زینے کی طرف بڑھے جو ویٹنگ روم کی طرف جاتا ہے۔ وہاں اچانک آپ کو گھیر لیا گیا۔ ان لوگوں نے آپ کو اوپر ہی ایک کمرے میں بند کر دیا اور ایک آدمی کو چھوڑ کر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میں نے احمد شاہ اور دوسرے گارڈز کو بھی وہاں بلا لیا۔ ہم لوگ دوبارہ اوپر جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ میں نے دو تین آدمیوں کو پھر اوپر جاتے دیکھا۔ احمد شاہ دبے پاؤں ان کے پیچھے گیا تو اس نے ان لوگوں کو ایک کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ان کا ایک ساتھی کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں وہاں شور شرابا اور ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر بہت رش ہو گیا تھا۔ ایسے میں اگر فائرنگ کی نوبت آ جاتی تو ہمارے لیے بہت مشکل کھڑی ہو جاتی۔ ہم لوگ وہاں رک کر مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے اتنا تو یقین تھا کہ آپ خیریت سے ہیں، ایک گھنٹے بعد وہ لوگ دوبارہ وہاں سے نکلے تو ہم لوگ اوپر چلے گئے۔ احمد شاہ نے دو گارڈز کو زینے کے ساتھ ہی کھڑا کر دیا اور خود اس نے کوریڈور میں پوزیشن لے لی۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب میں پوری قوت سے ان لوگوں کا مقابلہ کروں گا۔ چاہے مجھے فائرنگ کرنا پڑے یا بمباری۔ اوپر بالکل سناٹا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا وہ آدمی کس کمرے میں ہے۔ میں اس کمرے تک پہنچا کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں بیٹھا ہوا آدمی شاید سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میری جانب اس کی پشت تھی۔ میں اچانک اس کے سر پر جا پہنچا اور ریوالور کی نال اس کی گردن پر رکھ دی۔ اس کے ہاتھ میں شاید ٹرانسمیٹر تھا۔ میں نے اس سے ٹرانسمیٹر چھینا اور اس کے منہ پر زوردار ہاتھ جما دیا۔ وہ ایسا بدحواس ہوا کہ کچھ بول ہی نہ سکا۔ میں نے خود بھی احتیاط کی تھی کہ میری آواز نہ نکلے۔ اس کے ٹرانسمیٹر کے ذریعے میری آواز کہیں اور بھی سنی جا سکتی تھی۔ میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر کے اسے جیب میں ڈال لیا۔ اس آدمی کے پاس اس کمرے کی چابی تھی جہاں ان لوگوں نے آپ کو قید کیا تھا۔"

"وہاں بھاری مقدار میں اسلحہ اور منشیات کے علاوہ ایک لاش بھی تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ لاش....."

"میں نے ایک پی سی او سے پولیس کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر ایک لاش کے ساتھ بھاری مقدار میں اسلحہ اور منشیات موجود ہیں۔" غنی نے کہا۔ "پولیس اب تک وہاں پہنچ گئی ہو گی۔"

"وہ ڈیوائس کہاں ہے جو تم نے ٹرانسمیٹر سمجھ کے چھینی تھی؟"

"ڈیوائس!" غنی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، وہ ٹرانسمیٹر نہیں ہے بلکہ ایف ایم ریڈیو کا مائیکروفون ہے۔"

غنی نے پلاسٹک کی چھوٹی سی ایک ڈبیا نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ اس ڈبیا کے اندر حساس مائیکروفون پوشیدہ تھا۔ اگر یہ ڈبیا اس شخص کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو غنی کو بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ کسی سے بات بھی کر رہا تھا۔

"اس کا رابطہ ایک ایف ایم ریڈیو سے ہے۔ ایف ایم ریڈیو کی وہ ڈیوائس آج کل مارکیٹ میں عام ملتی ہے۔" میں نے ریڈیو نکالتے ہوئے کہا۔ "فرق صرف یہ ہے کہ ان لوگوں نے ریڈیو میں بھی ایک مائیکروفون فٹ کر دیا ہے تاکہ دوسری طرف کی بات بھی سنی جا سکے۔ وہ قیدی کہاں ہے؟" میں نے غنی سے پوچھا۔

"اسے احمد شاہ نے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔"

میں اٹھ کر اس کمرے میں پہنچا تو قیدی فرش پر بیٹھا تھا۔ احمد شاہ نے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے تھے۔

"ہاں، اب بتاؤ، تم کس کے لیے کام کر رہے ہو! میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ جھوٹ بولو گے تو خسارے میں رہو گے اور میں تم پر زیادہ وقت بھی ضائع نہیں کروں گا۔ چلو، اب شروع ہو جاؤ۔"

قیدی نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگل کر بولا۔ "مجھے..... تھوڑا سا پانی پلا دیں۔"

میرے اشارے پر غنی نے پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے ایک سانس میں پورا گلاس ختم کر دیا۔

"میں رانا زوہیب کے لیے کام کرتا ہوں۔" قیدی نے یوں کہا جیسے وہ حالت نزع میں بیان دے رہا ہو۔

"رانا زوہیب نے رابعہ کو بند کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے یوں پلکیں جھپکائیں جیسے میری بات اس کی



سمجھ میں نہ آئی ہو، پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں کسی رابعہ کو نہیں جانتا۔"

"تم رابعہ کو نہیں جانتے؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "وہ لڑکی جو وہاں پر قید تھی، وہی رابعہ ہے۔"

"وہ لڑکی وہاں کب لائی گئی، مجھے کچھ پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکی وہاں پہلے سے بند ہو۔"

"تم زوہیب کے ساتھ کب سے کام کر رہے ہو؟"

"میں اس کے ساتھ کام نہیں کرتا ہوں۔ اپنے طور پر چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا ہوں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "ہاں شاکر کے لیے کبھی کبھی کام کرتا ہوں۔ شاکر جعل سازوں کے ایک گروہ کا سرغنہ ہے۔ ایک مہینا پہلے اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ رانا صاحب کو کچھ لوگوں کی ضرورت ہے۔ تم آج کل فارغ ہو، ان کے لیے کام کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ، میں بالکل فارغ تھا۔ کافی دنوں سے کوئی واردات بھی نہیں کی تھی اس لیے راضی ہو گیا۔"

"شاکر نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ کام کیا کرنا ہے؟"

"ہم لوگ پیسوں کے لیے قتل کے علاوہ سب کچھ کرتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر شاکر مجھے کہیں بھیج رہا ہے تو کام کی نوعیت کیا ہو گی۔"

"رانا نے تم سے کیا کام لیا؟" غنی نے پوچھا۔

"ابھی تک اس نے کوئی خاص کام نہیں لیا۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "وہ جیسے معقول دیتا ہے اس لیے میں نے کبھی اس بات کی فکر نہیں کی کہ وہ مجھ سے کیا کام لے رہا ہے اور کام لے بھی رہا ہے یا نہیں۔" وہ سانس لینے کو رکا، پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ "کل رانا نے مجھ سے کہا کہ تمہیں منیر، صاحب داد اور موجو کے ساتھ جانا ہے۔ کام تمہیں صاحب داد سمجھا دے گا۔"

"صاحب داد کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ رانا کا آدمی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام تو مسلم ہے لیکن مجھے مچھو کہتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا، اس کے چہرے پر مونچھ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس کے باوجود مچھو کہلاتا تھا۔

"صاحب داد نے مجھے بتایا کہ ہمیں ریلوے اسٹیشن جانا ہے۔ وہاں سے ایک آدمی کو اٹھانا ہے۔ پھر ہم لوگ وہاں پہنچ گئے۔ آپ خود ہی اس طرف آ گئے تھے، صاحب داد اور منیر آپ کو گن پوائنٹ پر وہاں لے آئے اور اس کمرے میں بند کر دیا، پھر صاحب داد نے مجھے وہ مائیکروفون دیا اور کہا، اس مائیکروفون کا رابطہ ایک ریڈیو سے ہے جو برابر والے کمرے کے قیدی کے پاس ہے۔ پہلے تم اسے بتانا کہ باتھ روم میں ایک ٹائم بم پوشیدہ ہے جو ایک گھنٹے بعد پھٹ جائے گا۔ سوا گھنٹے بعد پھر تم اسے مخاطب کرنا اور بتانا کہ میں تمہیں بے وقوف بنا رہا تھا۔"

"تم مجھے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

مچھو نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں آپ کو نہیں جانتا لیکن آپ کا نام سنا ہوا تھا، آپ ست بدھائی کے نواب رفیق ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میں ہی رفیق ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا کہ رانا نے یہ سب ڈراما کیوں کھیلا؟ اس کا مقصد کیا تھا؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔" مچھو نے کہا۔

"شاکر کہاں ملے گا؟" غنی نے اچانک پوچھا۔

لمحے بھر کو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا، پھر وہ بولا۔ "شاکر سے ایک مہینا قبل میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ لاہور میں تھا۔"

"شاکر کیا لاہور ہی میں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر، وہ شیخوپورہ میں رہتا ہے، شیخوپورہ کے علاقے ننکانہ صاحب میں۔"

"ٹھیک ہے مچھو!" میں نے کہا۔ "تم واقعی ذہین آدمی ہو کہ تم نے سچ سچ سب کچھ بتا دیا۔ اگر تم غلط بیانی سے کام لیتے تو غنی اب تک تمہیں ذبح کر چکا ہوتا۔ تم ایک دفعہ پھر غور کر لو، تم نے کوئی بات ہم سے چھپائی تو نہیں ہے یا غلط بیانی سے کام تو نہیں لیا۔"

"مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ اب آپ مجھے ذبح کریں یا میری کھال کھینچ لیں، میں مزید کچھ نہیں بتا سکوں گا۔"

میں کمرے سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر مجھے تھکن کا احساس ہوا۔ گزشتہ پندرہ گھنٹے سے مجھے سکون سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ میں بیڈ روم میں پہنچا اور لمبی تان کر سو گیا۔ سونے سے پہلے میں نے غنی اور احمد شاہ کو ہدایات دے دی تھیں کہ رابعہ کو کسی بھی قیمت پر یہاں سے نکلنے مت دینا!

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی اور نہ جانے کب میں بے سدھ ہو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو راجا میرے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''اوہو، نواب صاحب خوابِ خرگوش سے بیدار ہو گئے۔''

''تو کب آیا راجا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو شام ہی کو آ گیا تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''تو اس وقت اپنا پورا اسطبل بیچ کر سو رہا تھا۔ میں نے تجھے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔''

''شام کو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اس وقت کیا بجا ہے؟''

''اس وقت شام کے سات بج رہے ہیں نواب صاحب!'' راجا ہنس کر بولا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ غنی ہمارے لیے چائے لے آیا۔ میں نے چائے پیتے ہوئے راجا سے پوچھا۔ ''راجا! تو رابعہ سے ملا؟''

''ابھی نہیں۔'' راجا نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو کیا وہ تیرے سامنے نہیں آئی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یا وہ بھی ابھی تک سو رہی ہے؟''

''وہ یہاں آ ہی نہیں سکتی۔'' راجا نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے اسے کمرے میں بند کرا دیا ہے۔''

''بند کرا دیا ہے..... لیکن کیوں؟''

''تو پہلے نہا دھو کر فریش ہو جا، پھر بات کریں گے۔'' راجا نے کہا۔

میں دیر تک گرم پانی سے نہاتا رہا۔ نہانے سے واقعی مجھ میں ایک نئی توانائی آ گئی۔ میں باتھ روم سے باہر نکلا تو راجا سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ احمد شاہ نے روم ہیٹر آن کر دیا تھا۔ کمرے میں خوشگوار حرارت تھی۔

''یار فیکے تو ابھی پوچھنے کو بے چین ہے نا کہ میں نے رابعہ کو بند کیوں کر دیا ہے؟'' راجا نے پوچھے بغیر ہی بولنا شروع کر دیا۔ ''وہ اب بھی تیرے ساتھ ڈراما کر رہی تھی۔ اسی نے دھوکے سے تجھے یہاں بلایا تھا۔''

''دھوکے سے بلایا تھا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، وہ اب بھی ست بدھائی کی جاگیر حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر حال میں تیری موت کی خواہاں ہے۔'' راجا نے ناگواری سے کہا۔ ''اب تو پوچھے گا، مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''ظاہر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی تو جان خطرے میں تھی۔''

''اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''اس نے داروغہ والا میں جس مکان کا پتا بتایا تھا، میں غنی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''وہاں آس پاس کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی میڈم آتی تو ہیں لیکن وہاں رہتی نہیں ہیں۔ وہ مکان ہمیشہ بند ہی رہتا ہے۔''

''یار، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رابعہ کسی کے علم میں لائے بغیر وہاں جاتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''میرے ذہن میں بھی یہ سوال آیا تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''میں نے اپنی ایک دوست جرنلسٹ کو وہاں بلا لیا۔ اس نے پڑوس کے گھروں میں جا کر عورتوں اور لڑکیوں سے پوچھ گچھ کی تو ایک لڑکی نے بتایا کہ میڈم رخسانہ تو گلبرگ میں رہتی ہیں۔ یہ مکان تو انہوں نے اپنے کسی ملازم کے لیے لیا تھا..... میڈم رخسانہ کے نام پر چونک مت۔ رابعہ نے لوگوں کو اپنا یہی نام بتایا تھا۔''

''لیکن راجا وہ لڑکی اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہے کہ رابعہ گلبرگ میں رہتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ رابعہ اس لڑکی کو دو تین دفعہ اپنے ساتھ گلبرگ لے گئی تھی۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ''میری دوست نے اس لڑکی سے گلبرگ کا پتا لیا اور میرے حوالے کر دیا۔ گلبرگ کی وہ کوٹھی بھی خالی ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ کسی دلاور کے نام ہے۔'' راجا مسکرایا۔ ''اس کے بعد میں نے غنی کو ہدایت کر دی کہ رابعہ اپنے کمرے سے باہر نکلنے نہ پائے۔''

''تو نے رابعہ سے پوچھا کہ.....''

''میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔'' راجا نے میری بات کاٹ دی۔ ''یہ سعادت تو خود حاصل کر لے۔ اس بدچلن عورت کی شکل دیکھ کر مجھے غصہ آتا ہے۔''

''یار! اگر وہ میرے خلاف سازش کر رہی ہے تو اس نے اب تک اپنے ہمدردوں کو بتا دیا ہوگا کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''تجھے اس بات کا بہت جلدی خیال آ گیا؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو، تو یوں اطمینان سے لمبی تان کر سو گیا تھا جیسے تو ست بدھائی کی حویلی میں ہو۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی اس مکار عورت کی خبر لیتا ہوں۔''

''اس کی خبر لینے سے پہلے تو اس مچھو کی خبر لے تو اچھا ہے۔ وہ حرام زادہ بھی بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ تو رانا زوہیب کو پہچانتا بھی نہیں ہے، بس اس کا نام سن رکھا ہے۔ میں نے رانا کی تصویر اسے دکھا کر پوچھا کہ یہ صاحب داد ہے یا منیر؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ آدمی ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ میں نے اس آدمی کو کبھی نہیں دیکھا۔''

''کیا؟'' میں غصے کے مارے لرزنے لگا۔ ''اس نے اتنی صفائی سے میرے سامنے جھوٹ بولا۔ میں نے اس کی بے سر و پا کہانی پر یقین نہیں کیا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ حرام زادہ جان بچانے کی خاطر رانا کا نام لے رہا ہے۔ اس کی تو میں کھال ادھیڑ دوں گا۔''

''اوئے آرام سے بیٹھ جا۔'' راجا ہنس کر بولا۔ ''اب ان دونوں میں سے یہاں کوئی نہیں ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''میں نے ان دونوں کو ست بدھائی بھجوا دیا ہے۔''

''لیکن غنی اور احمد شاہ تو ابھی یہیں موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میرے ساتھ سرور آیا تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''میں نے اسے رابعہ اور اس مچھو یا بچھو کے ساتھ ست بدھائی بھیج دیا۔ ان دونوں کو جب ہوش آئے گا تو وہ تہ خانے کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔''

''یار، اگر رابعہ نے ہمارے خلاف سازش کی تھی تو وہ اکیلی نہیں ہوگی۔ اس کی پشت پر دلاور ہوگا۔ اس نے رابعہ پر نظر رکھی ہوگی۔ وہ راستے میں.....''

''او یار، ٹینشن مت لے۔'' راجا نے کہا۔ ''سرور ان لوگوں کو لے کر ست بدھائی پہنچ چکا ہے۔ ابھی جب تو باتھ روم سے نکلا تو میں اسی سے بات کر رہا تھا۔''

میرا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ''یار، اگر دلاور یا رانا نے رابعہ کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی اور پولیس کو حویلی کی طرف روانہ کر دیا تو.....''

''اب یہ اتنا آسان نہیں ہے فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''کون رابعہ! رابعہ تو مر چکی ہے۔ تو نے اس کی لاش شناخت کی تھی۔ وہ اس وقت قبرستان میں میٹھی نیند سو رہی ہے۔ وہ دوبارہ زندہ ہو کر گم کیسے ہو سکتی ہے اور تو..... کسی مردے کو اغوا کیسے کر سکتا ہے؟ فرض کر کہ رابعہ زندہ بھی ہو گئی، پھر بھی پولیس میں اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ڈائریکٹر جنرل پولیس اور ہوم منسٹر کے دوست کے گھر کی تلاشی لے سکے۔ تو شاید بھول گیا کہ ہوم منسٹر اور ڈی جی پولیس سے تیری تفصیلی ملاقات ہو چکی ہے۔''

''پھر ہم یہاں کیوں رکے ہوئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ ریلوے اسٹیشن کے اس کمرے میں ملنے والی لاش کس کی تھی اور اس اسلحے اور منشیات کے ذخیرے کا مالک کون ہے؟''

''یار، میری سمجھ میں تو یہ گورکھ دھندا نہیں آ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''فیکے پتر، تو نے کبھی شطرنج کھیلی ہے، نہ سیاست کی ہے۔ تو اس گورکھ دھندے کو ابھی نہیں سمجھ سکتا۔'' راجا نے کہا۔ ''اقتدار کی ہوس بہت ظالم ہوتی ہے۔ اس ہوس میں انسان گھٹیا سے گھٹیا کام کرتا ہے اور اسے سیاست کا نام دیتا ہے۔'' پھر راجا اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تو آرام کر، میں پریس کلب اور اس پولیس اسٹیشن کا چکر لگا کر آتا ہوں جس کی حدود میں ریلوے اسٹیشن ہے، ممکن ہے وہ لاش اور اسلحہ وغیرہ ابھی ریلوے پولیس کی تحویل میں ہو۔''

''تو غنی یا احمد شاہ کو ساتھ لے جا۔'' میں نے کہا۔

''او یار، مجھے ان نوابی چکروں میں مت ڈال۔'' راجا نے کہا۔ ''میں اگر ان چونچلوں میں پڑ گیا تو کر چکا صحافت۔''

''یار، پھر بھی احتیاط کرنا چاہیے نا؟'' میں نے کہا۔ ''تو احمد شاہ کو ساتھ لے جا۔''

''یار، تو بہت تنگ کرتا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''میں احمد شاہ کو ساتھ لے جاتا ہوں۔''

راجا کے جانے کے بعد میں نے غنی کو بلایا۔ وہ کمرے میں آیا تو اس کے چہرے پر تشویش کے سائے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے غنی۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''

''سر! ایک ڈبل کیبن پک اپ کافی دیر سے کوٹھی کے اردگرد چکر لگا رہی تھی۔ میں نے پہلے تو اس پر توجہ نہ دی لیکن جب وہ گاڑی مجھے اسٹریٹ کے نکڑ پر نظر آئی تو مجھے پریشانی ہوئی۔''

''ارے یار، ہوگی کسی کی گاڑی، اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟''

''پریشانی کی یہ بات ہے سر کہ وہ گاڑی راجا صاحب کی گاڑی کے تعاقب میں روانہ ہو گئی ہے۔ میں نے احمد شاہ کو اطلاع دے دی ہے۔''

''تم نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے کوشش کی تھی سر!'' غنی نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی سامنے والی نمبر پلیٹ پر کالک سی لگی ہوئی تھی۔ عقبی نمبر پلیٹ کے اوپر کسی نے مٹی پھیر دی تھی۔ اس وجہ سے نمبر بالکل چھپ کر رہ گیا تھا۔''

''تم احمد شاہ سے رابطے میں رہو۔ اس سے کہنا کہ ذرا سی بھی گڑبڑ ہو تو فوراً اطلاع دے۔''

''میں نے احمد شاہ سے بھی کہہ دیا ہے اور راجا

صاحب سے بھی۔'' غنی نے کہا۔ ''کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو وہ لوگ فوراً اطلاع دیں گے۔''

اچانک مجھے باہر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ فوراً ہی کوٹھی سے بھی فائرنگ ہوئی، پھر تو وہ علاقہ گویا میدانِ جنگ بن گیا۔

غنی تیزی سے باہر کی طرف دوڑا۔ میں نے بھی بغلی ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکال لیا اور دروازے کی طرف بڑھا تو غنی مجھے برآمدے میں لیٹا نظر آیا۔ میں بھی محتاط انداز میں باہر نکلا تو مجھے برآمدے میں ایک زینہ نظر آیا جو کوٹھی کی اوپری منزل کی طرف جارہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اوپر جا کر باہر کا جائزہ لیتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں رکوع کی حالت میں چلتا ہوا زینے کی طرف بڑھا۔ فائرنگ میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ فائرنگ باہر سے زیادہ ہورہی ہے، کوٹھی کے اندر سے اتنے تواتر سے فائرنگ نہیں ہورہی تھی۔ میرے گارڈز ایمونیشن ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میں زینے تک پہنچا، پھر لپک کر زینے پر چڑھ گیا، یہاں میں فائرنگ سے محفوظ تھا۔ میں تیزی سے زینہ چڑھ کر اوپر پہنچا۔ اوپر زیادہ تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ صرف دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ باقی کھلا ہوا ٹیرس تھا۔ ٹیرس کی دیواریں خاصی اونچی تھیں۔

میں محتاط انداز میں چلتا ہوا ٹیرس کے سامنے والے حصے کی طرف گیا اور وہاں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ فائرنگ دو گاڑیوں سے ہورہی تھی۔ میں نے ان کا نشانہ لینے کی کوشش کی لیکن پھر ارادہ ترک کردیا کیونکہ دونوں گاڑیاں ریوالور کی رینج سے دور تھیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے رائفل لے کر آنا چاہیے تھا۔ میں نے غنی کے سیل فون پر رابطہ کیا اور اس سے رائفل لانے کو کہا۔

''آپ کہاں ہیں سر؟'' غنی گھبرا کر بولا۔

''میں اوپر چھت پر ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ فوراً ہی رائفل اور اس کے راؤنڈ لے کر آگیا۔ ''میں نے پولیس کو فون کردیا ہے سر!'' غنی نے کہا۔

اچانک باہر خاصا زوردار دھماکا ہوا۔ اس سے پورا گھر لرز کر رہ گیا۔ میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ باہر کھڑی ہوئی گاڑی کچھ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ دوسری گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ اسی گاڑی میں سے دستی بم پھینکا گیا تھا۔

میں نے غنی کے ہاتھ سے ٹیلی اسکوپک رائفل لے لی۔ وہ SIG کی جدید رائفل تھی اور ہلاکت خیزی میں یوزی (Yozi) سے کسی بھی طرح کم نہیں تھی۔ ڈبل کیبن پک اپ بالکل میرے نشانے کی زد پر تھی۔ ان لوگوں کو شاید اندازہ بھی نہ ہوگا کہ ہمارے پاس اتنی دور مار رائفل بھی ہوگی۔ ویسے بھی میرے گارڈز اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ کسی گاڑی کا نشانہ لے سکتے۔ اسی لیے باہر والوں کو اطمینان ہوگا۔ میں نے ڈرائیور کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور گولی چلادی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ڈرائیور کو الٹ کر پیچھے گرتے دیکھا۔ گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہوگئی تھی۔ میں نے بہترین نشانے پر خود کو داد دی۔

وہ لوگ بوکھلا گئے۔ ان کی اس بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھا کر غنی نے ان کے ایک اور آدمی کو نشانہ بنالیا۔

گاڑی میں چھ آدمی تھے۔ ان میں سے دو تو کم ہوگئے تھے۔ باقی چار آدمیوں نے گاڑی سے چھلانگ لگائی اور اسی کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

''گاڑی کے پیٹرول ٹینک پر فائر کریں سر!'' غنی نے کہا۔ ''میں بھی پیٹرول ٹینک کو نشانہ بناتا ہوں۔''

''ٹھہر جاؤ غنی!'' میں نے اسے روک دیا۔ ''میں ان لوگوں کو زندہ پکڑنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' غنی نے کہا۔

اسی وقت ایک آدمی اٹھ کر بھاگا۔ میں نے اس کے پیروں کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔ متحرک ہدف پر بالکل صحیح نشانہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ ہنر کئی برسوں کی پریکٹس کے بعد آتا ہے۔ میری گولی اس کے پیروں کے بجائے اس کی پیٹھ میں لگی کیونکہ عین وقت پر وہ لڑکھڑا کر دہرا ہوگیا تھا۔ پھر میں نے اسے الٹ کر گرتے دیکھا۔ اسی وقت مجھے دوسری گاڑی دکھائی دی۔ وہ مین روڈ سے دوسری گاڑی کی طرف آرہی تھی۔ وہ گاڑی اس شخص کے نزدیک پہنچ کر رک گئی جسے میں نے گولی ماری تھی۔ وہ آدمی نہ جانے زندہ تھا یا مرگیا تھا۔

میں نے اس گاڑی کے ڈرائیور کا نشانہ لیا ہی تھا کہ میرے دائیں بازو میں آگ سی بھر گئی۔ میں پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ میں ان لوگوں کا نشانہ لینے میں اتنا آگے آگیا تھا کہ گاڑی سے اترنے والوں میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا۔ میں اس خوش فہمی میں تھا کہ دور مار رائفل صرف میرے ہی پاس ہے۔ شانے میں گولی اترنے کے بعد میری یہ خوش فہمی دور ہوگئی تھی۔

میرا خون بہت تیزی سے ضائع ہورہا تھا۔ بازو میں شدید تکلیف تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا دایاں بازو موجود ہی نہ ہو۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی۔



اچانک میرے کانوں میں پولیس کے سائرن کی آواز گونجی، پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا، دس منٹ یا بیس منٹ یا ایک گھنٹا؟ مجھے کچھ احساس نہیں تھا۔ میں نے نظریں گھما کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ اس کوٹھی کا کمرا نہیں تھا جہاں مجھے گولی لگی تھی۔ اس وقت تکلیف کا احساس کم تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ میرے پہلو میں دایاں بازو نہیں ہے۔

''ہیلو سر! کیسے ہیں آپ؟'' میری بائیں جانب سے آواز آئی۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ کوئی ڈاکٹر تھا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا۔ ''آئی ایم فائن ڈاکٹر!''

''گڈ!'' ڈاکٹر ہنس کر بولا۔ ''آپ کو تکلیف محسوس ہورہی ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''زیادہ نہیں۔'' میں نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔

''آپ زخمی کیسے ہوئے سر؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

عجیب چغد ڈاکٹر ہے، میں نے سوچا، اسی ڈاکٹر نے مجھے فرسٹ ایڈ دی ہوگی اور اب وہی مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں زخمی کیسے ہوا؟

''میرا خیال ہے کہ میں آم توڑتے ہوئے درخت سے گر پڑا ہوں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''آپ نے کبھی چوری کے آم کھائے ہیں؟''

''بہت سر!'' ڈاکٹر بھی اسی لہجے میں بولا۔ ''میں تو آم، امرود، کیلا وغیرہ خریدنے کا قائل ہی نہیں ہوں۔ ہمیشہ محلے والوں کے درختوں سے آم، امرود چوری چھپے توڑ کر کھاتا ہوں۔''

''آپ تو ماشاءاللہ پیشہ ور چور لگتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا یہاں بھی کچھ چرانے آئے ہیں؟'' پھر میں درشت لہجے میں بولا۔ ''مجھے کسی چور سے علاج کرانے کا کوئی شوق نہیں۔ غنی!'' میں نے غنی کو پکارنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں میرے حلق سے عجیب سی آواز برآمد ہوئی اور مجھے زوردار چکر آیا۔

''یس سر!'' کہیں سے غنی کی آواز سنائی دی تو مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ زخمی نہیں ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے غنی میرے سامنے آگیا۔ ''یس سر!''

''اس فضول اسپتال میں تم لائے ہو مجھے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''یہاں کے تو ڈاکٹر ہی چور ہیں۔''

''سر، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' غنی پریشان ہوگیا۔

میں اب تک پوری صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا۔ وہاں پولیس کا ایک انسپکٹر بھی موجود تھا۔ میں فوری طور پر اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ الٹی سیدھی بکواس شروع کردی تھی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''مم..... میں..... غنی ہوں سر!'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''جھوٹ مت بولو۔'' میں نے اسے جھڑک دیا۔

اسی وقت راجا آگے بڑھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے، تکلیف زیادہ ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب! مجھے تکلیف تو ہے لیکن یہاں آپ نے کیسا اسٹاف رکھا ہوا ہے جسے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔''

''اچھا اچھا، میں آپ کے لیے دوسرا اسٹاف بلوالوں گا۔ آپ غصہ تو مت کریں۔''

''چلو نہیں کرتے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ان سب لوگوں کو یہاں سے باہر نکالو۔''

پولیس انسپکٹر آگے بڑھا اور بولا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے نواب صاحب؟''

''یار، اب یہاں کے چپراسی اور وارڈ بوائز بھی ہمارے منہ لگ رہے ہیں۔ غنی!'' میں نے ایک مرتبہ پھر غنی کو آواز دی۔

اچانک ایک ڈاکٹر آگے بڑھا اور بولا۔ ''آپ سب لوگ باہر چلے جائیں پلیز! پیشنٹ کی کنڈیشن اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ سب لوگ باہر نکل گئے۔ غنی کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات تھے۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اب وہ رونا شروع کردے گا۔ راجا اسے سمجھا بجھا کر باہر لے گیا۔

''آپ آرام کریں نواب صاحب!'' ڈاکٹر نے کہا اور ایک انجکشن تیار کرنے لگا۔

وہ یقیناً نیند کا انجکشن ہوگا۔ اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ڈاکٹر فوری طور پر یہی نسخہ آزماتے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ذرا میرے سیکریٹری کو بلوائیں۔''

''کون ہے آپ کا سیکریٹری؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''اس کا نام بتائیے، میں اسے ابھی یہاں بلالیتا ہوں۔''

''ارے نام ہی تو ہم بھول گئے۔'' میں نے پیشانی پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے ہاتھ ہلایا بھی نہیں گیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا دایاں ہاتھ موجود ہی نہیں ہے۔

ڈاکٹر باہر گیا اور راجا کو ساتھ لے کر آ گیا۔

راجا نے بڑے ادب سے جھک کر کہا۔ ''جی نواب صاحب! آپ نے مجھے یاد فرمایا؟''

''تم ہی ہمارے سیکریٹری ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا اور ڈاکٹر کی نظر بچا کر اسے آنکھ ماری۔

راجا بے ساختہ مسکرانے لگا۔ ''جی نواب صاحب! یہ ناچیز ہی آپ کا سیکریٹری ہے۔''

''ہمیں کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''حضور گھوڑے سے گر پڑے تھے۔'' راجا نے چبا چبا کر کہا۔ ''آپ کے دائیں شانے پر بہت گہرا زخم آیا ہے۔ اس چوٹ سے دماغ بھی متاثر ہوتا لیکن وہ سر سے آپ کی کھوپڑی میں نہیں ہے۔'' راجا نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر میری طرف انجکشن لے کر بڑھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''آئی ایم آل رائٹ ڈاکٹر! میں فوری طور پر پولیس کو بیان نہیں دینا چاہتا اس لیے.....''

''آئی سی!'' ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ''آپ تو بہت زبردست ایکٹر ہیں نواب صاحب! لیکن پولیس کو بیان تو دینا ہی پڑے گا۔ وہ انسپکٹر صبح پھر آ جائے گا۔''

''میں اس وقت تک خود کو ذہنی طور پر تیار کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیے، پولیس کو فوری طور پر بیان دینا تو آپ ہی کے مفاد میں ہے۔'' ڈاکٹر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میرا سیکریٹری پولیس کو تفصیلی رپورٹ دے چکا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''او کے سر!'' ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ''آپ ٹینشن مت لیں، صبح تک کوئی پولیس والا یہاں نہیں آئے گا۔''

''میرے زخم کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کے دائیں بازو میں کسی طاقت ور رائفل کی گولی لگی ہے۔ گولی آپ کے بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی ہے لیکن بازو کی ہڈی محفوظ ہے۔ ہاں، ابھی آپ ہاتھ ہلانے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں آپ کو انجکشن دے دوں؟''

''اس وقت آپ نیند کے علاوہ مجھے ہر قسم کا انجکشن دے سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ کی تکلیف بڑھ سکتی ہے نواب صاحب!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ابھی تو قابلِ برداشت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تکلیف بڑھی تو میں انجکشن لگوا لوں گا۔''

''او کے سر، ایز یو وش!'' ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

''یہ کیا ڈراما تھا بیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''کچھ دیر کو تو میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔''

''یعنی ہماری، نواب رفیق احمد شیرازی کی اب اتنی ہی وقعت رہ گئی ہے کہ ان کے لیے کچھ دیر کو، محض کچھ دیر کو پریشان ہوا جائے؟'' میں نے آنکھیں نکالیں۔

''شکر کر میں زیادہ پریشان نہیں ہوا ورنہ تو جانتا ہے، میں کیا کرتا ہوں۔'' راجا نے کہا۔

''یار، وہاں میرے ہاتھ سے کتنے آدمی مارے گئے؟'' میں سنجیدہ ہو کر بولا۔

''تو پوچھ تو ایسے رہا ہے جیسے وہاں بہت سے آدمی مارے گئے ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''وہاں تو کوئی بھی نہیں مرا۔ پولیس کو نہ وہاں کوئی زخمی ملا، نہ لاش!''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ مرنے والوں کی لاشوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''کون سی لاشیں فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تو، تو اپنے گھر میں بیٹھا چلغوزے کھا رہا تھا اور گرم گرم کافی پی رہا تھا۔ اچانک تو نے فائرنگ کی آواز سنی۔ باہر سے کوئی تیری کوٹھی پر اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ تو گھبرا کر صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے چھت پر چڑھا تو، تو بھی فائرنگ کی زد میں آ گیا۔''

''باہر ایک گاڑی کا ونڈ اسکرین گولی لگنے سے چور چور ہو گیا تھا۔ اس گاڑی کے ڈرائیور کو بھی گولی لگی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ لوگ وہ گاڑی بھی وہاں سے لے گئے؟''

''ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''پولیس کو وہاں کوئی گاڑی نہیں ملی، کوئی زخمی نہیں ملا۔ کوئی لاش نہیں ملی۔ ہاں وہاں ونڈ اسکرین کے ٹکڑے اور گولیوں کے خول ضرور ملے ہیں۔''

''پولیس کو کیا بیان دیا ہے تو نے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے بتایا تو ہے۔ تیرے کسی دشمن نے تجھ پر حملہ کیا۔ تیرے گارڈز نے مزاحمت کی۔ اس حملے میں تو بھی زخمی ہوا۔ تیرے ایک ملازم نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس آئی تو حملہ آور فرار ہو گئے۔ اس حملے کی گواہی تو محلے والے بھی دیں گے۔ بس اب تو آرام کر، میں ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں کہ وہ تجھے انجکشن لگا دے۔'' راجا چلا گیا۔

میں دیر تک خالی الذہنی کے عالم میں پڑا رہا۔ میری زندگی بھی ایک مسلسل جنگ بن کر رہ گئی تھی۔ ہر لمحہ نیا زخم



زمانے نے دیا ہے، ہر زخم کا مرہم زمانہ ہی بنا ہے۔ طرح دار سی ایک نرس آئی اور اس نے میرے بازو میں سرنج گھونپ دی، مجھے نہ جانے کب نیند آ گئی۔ نیند بھی ایسی کہ میں نہ سوتا تو زیادہ بہتر رہتا۔

مجھے خواب میں ایلیشا، رابعہ اور نہ جانے کون کون سی لڑکیاں چڑیلیں بن کر ڈراتی رہیں، نور بار بار آتی اور ان چڑیلوں کو مار کے پیچھے ہٹا دیتی، وہ چلی جاتی تو وہ بلائیں پھر آ جاتیں۔ میں سوتے میں نوری کو آوازیں دے رہا تھا۔ ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے۔

صبح آنکھ کھلی تو میرے بازو میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مجھے ایک دو دفعہ پہلے بھی گولی لگ چکی تھی۔ اتنی شدید تکلیف تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اچانک میرے دل میں یہ ہولناک خیال آیا کہ شاید میرا بازو کاٹ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹرز اور راجا مجھ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ تصور ہی اتنا وحشت ناک تھا کہ میرا پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ شدید سردی کے باوجود میرے ماتھے سے پسینا بہہ رہا تھا۔

ایک نرس کمرے میں آئی اور اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی بلڈ کی بوتل دیکھنے لگی۔ اس نے خون کی منتقلی کی رفتار کا جائزہ لیا، پھر تھرمامیٹر لے کر میری طرف بڑھی تو چونک اٹھی۔ ''آر یو آل رائٹ سر!'' وہ بوکھلا کر بولی۔ ''آپ کو تو بہت پسینا آ رہا ہے۔'' اس نے تولیا اٹھا کر میرے چہرے سے پسینا صاف کیا۔

''میں ٹھیک ہوں سسٹر!'' میں نے کہا۔ ''مجھے ذرا پانی پلا دیں۔''

اس نے مجھے پانی پلایا تو میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''سسٹر، مجھے ایک بات سچ سچ بتائیے گا۔'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''میرے جسم پر کتنے زخم ہیں؟''

''آپ کے جسم پر صرف ایک زخم ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''کیا میرے دونوں ہاتھ موجود ہیں؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''پہلے تو وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے رہی، پھر ہنس کر بولی۔ ''آف کورس سر! آپ کے دونوں بازو موجود ہیں۔'' پھر اس نے تھرمامیٹر میرے منہ میں لگا دیا اور بی پی آپریٹس کی پٹی میرے بازو پر باندھنے لگی۔ یہ آپریٹس جب میرے بازو پر بندھتا تھا، مجھے اماں یاد آ جاتی ہیں، وہ ہمیشہ اسی طرح

## صفائی

صفائی کا حال بھی سن لیجیے۔ ہمارے ہاں لوگوں نے ڈنڈے کے خوف سے چند دنوں پہلے دکانوں پر جالیاں لگا لیں، جب دیکھا کہ کوئی نہیں دیکھتا تو اتار پھینکیں۔ تہران میں کسی شخص کو گوشت کی دکان کھولنے کی اجازت نہیں ملتی جب تک اس کے پاس ریفریجریٹر یا ڈیپ فریزر نہ ہو۔ یہی الفرہ میں دیکھا۔ قصبات میں جہاں فریج نہیں وہاں بھی صفائی اور جالی کا انتظام ضرور ہے۔ چلو کباب تو خیر ایرانیوں کی مشہور ڈش ہے۔ ابلے چاول، اس میں مکھن کی ٹکیہ ملائیے۔ ایک انڈا بھی کچا توڑ کر ڈال لیجیے اور کباب چپاتی کباب کا سا، ساتھ پیاز اور بہت سا سلاد۔ لیکن عام خوراک کباب اور روٹی کہہ سکتے ہیں اور روٹی یہاں کئی بھانت کی ہوتی ہے۔ نرم اور موٹی سے لے کر پتلی کاغذی سی تک۔ یہ رواج اب صرف پاکستان اور ہندوستان میں ہے کہ میاں کو گرم گرم روٹی چاہیے۔ چاہے آدھی رات بھی آئے تو بی بی چولہے کے پاس کھڑی ہو کر پھلکے اتارے گی۔ سالن گھر میں پکاؤ لیکن روٹی نان بائی کے ہاں سے لاؤ۔ سینڈوچ کا رواج بھی یہاں بہت ہے۔ اسے سانڈوچ کہتے ہیں۔ لمبی سی گول ڈبل روٹی کو چیر کر اس کے اندر جو جی چاہے بھر دو۔ کبھی بھانت بھانت کی ککڑیاں، جڑی بوٹیاں اور سلاد۔ سب مزے کی چیزیں ہیں۔ ایرانی شام کا کھانا گھر پر نہیں کھاتا۔ شام ہوئی اور بیوی بچوں کو لے کر گھر سے نکلا۔ کسی باغ میں یا کسی حوض پر کسی نہر کے کنارے یا کسی اور پر فضا مقام پر ڈیرا جا ڈالا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائی۔ پاس کوئی ریستوران ہو گا۔ وہاں جا بیٹھے جیسی جیب ویسا کھانا، روپے بھر کا یہ لمبا سینڈوچ نہیں سے بھی لے لیجیے۔ پیٹ بھر جائے اور پھر بھی بچ رہے ورنہ گھر سے ساتھ لے لیجیے۔ کسی ایرانی سے دوپہر کے بعد بھی ملنے کی کوشش نہ کیجیے۔ یہ اس کے قیلولے کا وقت ہے قیلولے کا یہ احوال ہم نے ایران میں دیکھا اور انڈونیشیا میں دیکھا کہ آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت قیلولہ، تو وہ ڈھال تلوار پھینک کر یہ شعر پڑھتا ہوا البالبا لیٹ جائے گا۔

تیرے زانو پہ میں سر رکھ کے ابھی سو تا ہوں
انقلاب آئے تو مجھ کو بھی جگانا سائی

ابن انشا کا سفر نامہ ''دنیا گول ہے'' سے اقتباس

میرے بازو پر امام ضامن باندھا کرتی تھیں۔ نرس نے میرے جسم کا درجۂ حرارت چیک کیا، پھر مطمئن ہوئی کہ فوری طور پر میرے مرنے کا کوئی امکان نہیں۔

نرس کے جانے کے بعد غنی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا ایک شاپر تھا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ کیسے ہیں سر؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ چھت پر گئے ہی کیوں تھے؟'' اس نے کہا اور آنسو بہانے لگا۔ اتنا لمبا چوڑا مضبوط مرد، عورتوں کی طرح آنسو بہا رہا تھا۔ مجھے اس پر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔ ''غنی! تم تو عورتوں سے بھی دو قدم آگے ہو۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور بولا۔ ''کل تو آپ نے مجھے ڈرا دیا تھا۔'' پھر اس نے شاپر سے ناشتے کا سامان نکالا اور بولا۔ ''آپ نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔''

مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ غنی نے میرا بیڈ سرہانے سے اونچا کر کے مجھے ناشتا کرایا۔ کافی پلائی تو واقعی میری جان میں جان آئی۔ میں نے اس سے بھی وہی سوال کیا جو نرس سے کر چکا تھا۔ ''غنی! کیا میرے دونوں بازو موجود ہیں؟''

''سر، آپ کے دائیں بازو میں گولی لگی ہے۔'' غنی نے کہا۔ ''گولی کا زخم بہت گہرا ہے۔ اس سے آپ کے بازو کا گوشت بری طرح ادھڑ گیا ہے لیکن ہڈی محفوظ ہے۔''

پولیس انسپکٹر نے اندر جھانکا، پھر ڈاکٹر نمودار ہوا اور مجھ سے بولا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے نواب صاحب!'' اس نے میرے سرہانے رکھا ہوا چارٹ اٹھا لیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔

''اب میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر!'' میں نے کہا۔

اس نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔ ''آفیسر! آپ صرف دس منٹ لے سکتے ہیں لیکن پے شنٹ کو زیادہ پریشان مت کیجیے گا۔''

انسپکٹر اندر آیا اور ایک کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے وہی سب کچھ بتایا جو راجا نے مجھ سے کہا تھا۔

اس نے وہی گھسا پٹا سوال کیا۔ ''نواب صاحب! آپ کو کس پر شبہ ہے؟''

''شبہ کرنے کو تو میں کسی پر بھی کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو کیا آپ ان..... لوگوں کو شاملِ تفتیش کریں گے؟''

''یقیناً نواب صاحب! آپ نام تو لیجیے۔''

''مجھے اس ملک کے نظام پر شبہ ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پولیس ڈیپارٹمنٹ پر شبہ ہے، صدر اور وزیراعظم اور پوری کیبنٹ پر شبہ ہے۔''

''آپ تو مذاق کر رہے ہیں نواب صاحب!'' اس نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا۔

''مذاق! مذاق تو آپ کر رہے ہیں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ میں کسی کا نام لے دوں اور آپ اس پر چڑھ دوڑیں۔''

''سر، پوچھنا تو پڑتا ہی ہے۔''

''یہ آپ کا کام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لندن کی پولیس کبھی یہ نہیں پوچھتی کہ آپ کو کس پر شک ہے۔ وہ لوگ خود ہی تمام ثبوت اور شواہد اکٹھے کرتے ہیں اور قانون شکن عناصر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر مدعی کسی پر شبہ بھی ظاہر کرتا ہے تو وہ اسے شاملِ تفتیش ضرور کرتے ہیں لیکن اسے اس وقت تک پریشان نہیں کرتے جب تک انہیں مشتبہ فرد کے خلاف ٹھوس ثبوت نہ مل جائے۔''

''آپ کے ساتھ تو پہلے بھی اسی قسم کے واقعات پیش آتے رہے ہیں اس لیے پوچھ رہا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''میرے ساتھ کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی مسلح دشمن نے میرے گھر پر دھاوا بولا ہو۔ میرے گھر پر بمباری کی ہو۔''

''اوکے سر! یہاں سائن کر دیں۔'' اس نے ایک رائٹنگ پیڈ میری طرف بڑھایا۔

''میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں انسپکٹر! آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا دایاں ہاتھ اس وقت کام نہیں کر رہا ہے اور بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مجھے پریکٹس نہیں ہے۔ اگر آپ کہیں تو میری طرف سے میرا یہ گارڈ دستخط کر دے گا۔''

''نو سر! اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں بعد میں آپ کے دستخط لے لوں گا۔ اس نے اپنے کاغذات سمیٹے اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد غنی پھر کمرے میں آگیا۔ میں نے اس سے راجا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ صبح صبح نہیں چلے گئے تھے۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہاں سر، وہ میڈم نور کا فون بھی آیا تھا۔ وہ آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان سے کیا کہوں؟ میں نے ان سے کہہ دیا کہ نواب صاحب صبح ہی صبح راجا صاحب



کے ساتھ کہیں چلے گئے ہیں۔''

''وہ راجا گو فون کرے گی اور جب راجا اسے بتائے گا کہ رفیق میرے ساتھ نہیں ہے تو وہ پریشان ہو جائے گی۔ میرا سیل فون کہاں ہے؟''

اس نے سیل فون جیب سے نکال کر مجھے دے دیا۔

میں نے پہلے راجا کا نمبر ملایا لیکن وہ آف تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور نور کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ہی بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا اور بولی۔ ''تم بیٹھے بیٹھے اچانک کہاں غائب ہو جاتے ہو۔ میری اتنی بھی حیثیت نہیں ہے تمہاری نظروں میں کہ مجھے کچھ بتا ہی دو۔''

''ارے ارے..... ایسی بات نہیں نور!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''بس ایمرجنسی میں وہاں سے نکلنا پڑا ورنہ.....''

''بس بس، رہنے دو۔'' نور نے یہ کہتے ہوئے برا سا منہ بھی بنایا ہوگا۔ ''اب بھی میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب اپنا فون ہی بھول کر چلے گئے ہیں۔ تم واپس کب آ رہے ہو؟''

''کل تک انشاءاللہ واپس آجاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''رفیق! تم لاہور ہی میں ہو نا؟''

''ابھی تک تو لاہور ہی میں ہوں۔'' میں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

''میں بھی لاہور آجاؤں؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تم..... تم لاہور آ کر کیا کرو گی؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ ہمارا ایک گھر لاہور میں بھی ہو۔'' نور نے کہا۔

''چاہتا تو میں بھی ہوں کہ کراچی، اسلام آباد اور کوئٹہ میں بھی ہمارا ایک ایک گھر ہو لیکن.....''

''بس شروع کر دیں تم نے اپنی اوٹ پٹانگ باتیں۔'' نور نے جھلا کر میری بات کاٹ دی۔ ''بس تم جلدی آجاؤ۔''

''میں آج شام تک یا پھر کل صبح ست بدھائی پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

راجا دوپہر کو واپس آیا۔ وہ بہت تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک پولیس کو یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ اسلحے اور منشیات کے اس ذخیرے کا مالک کون ہے؟ ہاں، اخبار والوں کی نشان دہی پر ان لوگوں نے ریلوے کے دو سابق افسران کے خلاف تحقیقات شروع کر دی ہیں۔''

''اور وہ لاش!'' میں نے پوچھا۔

''وہ لاش زمان ٹاؤن کے رہنے والے ایک نوجوان کی ہے۔ اسے فلمی ہیرو بننے کا بہت شوق تھا۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ اس کی جیب سے دس ہزار روپے کی رقم، پاسپورٹ اور انڈیا کا ٹکٹ برآمد ہوا ہے۔''

''انڈیا کا ٹکٹ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''کیا انڈیا جانے کے لیے ٹکٹ کی ضرورت نہیں پڑتی؟''

''وہ ریلوے اسٹیشن پر کیا کر رہا تھا؟ کیا ٹرین کے ذریعے انڈیا جا رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اس کی جیب میں قومی ایئر لائن کا ٹکٹ تھا۔'' راجا نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ''اس کی جیب سے جو پرس برآمد ہوا ہے اس میں کسی لڑکی کی تصویر بھی ہے۔''

''ظاہر ہے، وہ ہیرو تھا تو کوئی ہیروئن بھی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''اس ہیروئن کو تم بھی اچھی طرح پہچانتے ہو۔'' راجا نے کہا۔

''کون..... فریال؟''

''نہیں فیکے پتر! رابعہ..... اس کی ہیروئن رابعہ تھی۔''

''رابعہ!'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس لڑکے کا نام کیا تھا؟''

''پاسپورٹ پر ماجد احمد لکھا ہوا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''گویا یہ بات ثابت ہو گئی کہ رابعہ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔''

''تجھ پر یہ بات اب ثابت ہوئی ہے؟'' راجا نے آنکھیں نکالیں۔

میں نے اسے نور کے فون کے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''میں آج ہی ست بدھائی جانا چاہتا ہوں۔''

''ہاں تو چل!'' راجا نے کہا۔ ''پولیس کو مزید کچھ معلوم کرنا ہے تو وہ ست بدھائی آجائے۔''

شام کو تقریباً چار بجے کے قریب ہم جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ناصر آگیا۔ وہ مجھے دیکھ کر فکرمند ہو گیا۔ ''نواب صاحب! آپ زخمی کیسے ہوئے؟'' اس نے پوچھا۔

''بس یار، یہ ہمارے دشمنوں کی محبت ہے۔'' میں نے کہا۔

''دشمنوں کی محبت سے زیادہ یہ آپ کی اپنی حماقت ہے قبلہ نواب صاحب!'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں تھوڑی دیر پہلے اسپتال سے گھر واپس آیا تھا۔ ڈاکٹر تو مجھے ڈسچارج کرنے پر راضی نہیں تھا لیکن جب میں

نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا کہ اگر آپ اپنی ذمے داری پر جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ست بدھائی میں میرا اپنا اسپتال ہے جہاں ہر قسم کی سہولیات میسر ہیں تو وہ بہت حیران ہوا کہ اس پسماندہ علاقے میں اسپتال کہاں سے آیا؟ بہرحال اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

"تم اچانک یہاں کیسے آگئے؟" میں نے ناصر سے پوچھا۔

"میں تو ست بدھائی گیا تھا۔" ناصر نے کہا۔ "وہاں معلوم ہوا کہ آپ اور راجا دونوں لاہور میں ہیں۔ مجھے بھی یہاں کچھ کام تھا اس لیے میں یہاں آگیا۔ میں تو دوپہر میں ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔ اپنا کام نمٹانے میں مجھے شام ہوگئی۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "یہاں تو لگتا ہے چاند ماری ہوئی ہے۔ کوٹھی کی باؤنڈری وال اور گیٹ پر گولیوں کے بے شمار نشانات ہیں۔ میں نے آتے ہی یہ بات نوٹ کرلی تھی۔ یہ سب ہوا کیسے؟"

راجا نے اسے مختصراً بتایا کہ یہ سب کیسے ہوا؟

"کچھ معلوم ہوا، وہ لوگ کون تھے؟" ناصر نے پوچھا۔

"اس کا جواب تو ان کی چہیتی رابعہ ہی دے گی۔" راجا نے کہا۔ "اس وقت دلاور اور رانا دونوں اسکرین سے غائب ہیں۔"

"دلاور تو آج کل لندن میں ہے۔" ناصر نے کہا۔ "میں نے اپنے ذرائع سے کل رات ہی یہ بات معلوم کی ہے۔"

"رانا بھی آج کل ملک سے باہر ہے۔" راجا نے کہا۔

"ویسے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی کارروائی کرنے کے لیے وہ خود بھی یہاں موجود رہے۔" ناصر نے کہا۔ "یہ تو ان سیاست دانوں اور جرائم پیشہ لوگوں کی پرانی تکنیک ہے کہ خود کو شبے سے بالاتر رکھنے کے لیے یہ لوگ جائے واردات سے سیکڑوں میل دور ہوتے ہیں۔ خیر معلوم ہوجائے گا کہ یہ حرکت کس کی ہے؟" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم لوگ ست بدھائی کے لیے نکلنے ہی والے تھے۔" راجا نے کہا۔ "تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

ہم لوگ ست بدھائی کے لیے روانہ ہوئے تو بہت محتاط تھے۔ ناصر بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ اس کی گاڑی میرا ایک گارڈ لے کر آرہا تھا۔ غنی میری گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ناصر تھا، عقبی نشست پر میرے ساتھ راجا بیٹھا تھا۔ مجھے بیٹھنے میں خاصی تکلیف ہورہی تھی لیکن گھر تو جانا ہی تھا۔

ہم لوگ بخیر وعافیت ست بدھائی پہنچ گئے۔

وہاں کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ میں زخمی ہوچکا ہوں۔ سب سے پہلے شہناز کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ لپک کر میری طرف آئی۔ "یہ کیا ہوگیا؟ کہیں ایکسیڈنٹ ہوگیا کیا؟" اس نے راجا سے پوچھا۔

"ہاں رفیق پھسل گیا سیڑھیوں سے۔" راجا نے کہا۔

"کیسے..... کہاں؟" شہلا نے پوچھا۔ وہ نہ جانے کب وہاں آگئی تھی۔

"ان لوگوں کو اندر تو آنے دو۔" شہناز نے کہا۔

فوراً ہی یہ خبر ساری حویلی میں پھیل گئی کہ نواب صاحب زخمی ہوگئے ہیں۔ نور اپنے کمرے سے ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ میرا بازو پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر وہ وحشت زدہ ہوکے بولی۔ "کیا ہوا رفیق؟"

"کچھ نہیں۔" راجا جلدی سے بولا۔ "نواب صاحب پھسل کر گر پڑے ہیں۔"

"گرنے سے اتنی زیادہ چوٹ آگئی؟" نور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شہناز نے ایک مرتبہ پھر کہا۔ "ارے بھئی، رفیق کو اندر تو آنے دو۔"

نور نے راستہ چھوڑ دیا۔ راجا اور ناصر مجھے کمرے کی طرف لے گئے۔ مجھ سے اس وقت کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا لیکن خود پر جبر کرکے کھڑا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نور یا شہناز میری وجہ سے زیادہ پریشان ہوں۔

میں جانتا تھا کہ جب شہناز میری ڈریسنگ کرے گی تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ میں گولی لگنے سے زخمی ہوا ہوں لیکن فوری طور پر راجا نے اس بات کو چھپا کر بہت اچھا کیا تھا۔

پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہی ڈاکٹرز کے ایک سہ رکنی میڈیکل بورڈ نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ میڈیکل بورڈ ڈاکٹر شہناز، ڈاکٹر مہدی حسن اور ڈاکٹر احمد حسن پر مشتمل تھا۔ ان تینوں نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور حسب توقع چونکے۔

ڈاکٹر شہناز نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ زخم گرنے سے آیا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ زخم کھانے کے بعد تو میں گرا تھا۔ یہ زخم اپنی اونچی اڑانوں کے ہیں، زمیں پر بھی



خواب آسمانوں کے ہیں! مزید تفصیلات کے لیے معروف صحافی راجا سے رجوع کریں۔ غنی بھی اس مسئلے پر مناسب روشنی ڈال سکتا ہے۔"

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں رفیق!" شہناز نے آنکھیں نکالیں۔

"کیا پوچھتے ہو، کیا تم سے کہوں، میں کس لیے جیتا ہوں؟ بھئی اب پوچھ ہی رہی ہو تو بتائے دیتا ہوں۔ یہ زخم دراصل اس نابکار گولی کا ہے جو کسی کی رائفل سے نکلی اور ہمارے بازو کو چھوتی ہوئی نہ جانے کہاں نکل گئی۔"

اس دوران میں ڈاکٹر احمد حسن میرا زخم صاف کرنے کے بعد اب پٹی کررہے تھے۔

"مجھے اس وقت آرام کی شدید ضرورت ہے ڈاکٹر صاحبہ!" میں نے کہا تاکہ وہ اس وقت مزید سوال وجواب نہ کرے۔ میری بات سن کر وہ انجکشن تیار کرنے لگی۔

"میں راستے بھر سوتا ہوا آیا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ مجھے خواب آور انجکشن نہ لگادے۔

"یہ اینٹی بائیوٹک ہے۔" شہناز نے کہا۔ اس نے دوسرا انجکشن تیار کیا۔ "یہ باڈی ٹشوز کی بحالی کے لیے ہے۔"

اس نے یکے بعد دیگرے مجھے تین انجکشن لگائے، پھر غنی سے کہا کہ نواب صاحب کو ان کے بیڈروم میں لے جاؤ۔ میں غنی کا سہارا لے کر باہر نکلا تو مجھے چکر سا آگیا۔

میں نے شہناز کی طرف دیکھا تو وہ ہنس کر بولی۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہیں نیند کا انجکشن دے دیا ہے۔"

میں غنی کا سہارا لے کر اپنے کمرے تک پہنچا۔ غنی نے میرے گلے میں لٹکا ہوا آرم سلنگ اتارا اور میرے بازو کے نیچے ایک نرم وملائم تکیہ رکھ کر مجھے بہت احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا۔

نور میرے پاس ہی بیٹھی کچھ کہہ رہی تھی لیکن اس کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہورہی تھی۔ پھر نہ جانے کب ساری آوازیں، سارے منظر غائب ہوگئے۔

میری آنکھ کھلی تو مجھے شدید سردی کا احساس ہوا۔ پھر میری نظر دائیں جانب پڑی تو مجھے نور نظر آئی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے کمبل اوڑھنے کی کوشش کی تو مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا اور میرے حلق سے بے اختیار ایک کراہ بلند ہوگئی۔ نور نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، پھر جھپٹ کر میرے پاس آئی اور بولی۔ "کیا بات ہے رفیق!

**پولسکی** نے محکمۂ صحت کے ڈائریکٹر کے پاس جاکر شکایت کی: "ہم چار بھائی ہیں اور چاروں کے چاروں ایک ایسے چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں جس میں صرف ایک کمرہ ہے۔ میرے ایک بھائی نے چھ بلیاں پال رکھی ہیں، دوسرے نے آٹھ کتے پالے ہوئے ہیں اور تیسرے کے پاس ایک بکرا اور دو بکریاں ہیں۔ کمرے میں تازہ ہوا بالکل نہیں آتی۔ میں تازہ ہوا کے لیے ترس گیا ہوں۔ کمرہ سڑانڈ اور بدبو سے بھرا ہوا ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟"

ڈائریکٹر نے پوچھا، "کیا تمہارے کمرے میں کھڑکیاں نہیں ہیں؟"

"یقیناً ہیں۔"

"پھر تازہ ہوا حاصل کرنے کے لیے تم ان کھڑکیوں کو کیوں نہیں کھولتے؟"

"کیا کہا؟" پولسکی نے گرج کر کہا۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میرے درجن بھر کبوتر اڑ جائیں؟"

تکلیف زیادہ ہورہی ہے؟"

"مجھے سردی لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

نور نے میرے جسم پر کمبل پھیلا دیا۔

میرے منہ کا ذائقہ بھی عجیب ہورہا تھا۔ حلق میں بھی کڑواہٹ اور خشکی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے نور سے پانی مانگا اور پانی پی کر پھر مجھے غنودگی آگئی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ میری تکلیف اب کسی حد تک کم تھی۔ تھکاوٹ کے بجائے تروتازگی کا احساس ہورہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں نیم گرم پانی سے غسل کروں لیکن اس وقت یہ ممکن نہ تھا۔ ریشم نے میرے نزدیک ہی پانی کا تسلہ رکھ دیا اور میرا منہ دھلانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ناشتا لے کر آگئی۔ نور نے مجھے اپنے ہاتھ سے ناشتا کرایا۔ ناشتے کے بعد میں نے گرما گرم کافی پی تو مجھے ایک نئی توانائی کا احساس ہوا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

نور نے اچانک کہا۔ "تمہیں ابھی تک رابعہ سے ہمدردی ہے؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔" نور نے کہا۔ "تم اسی کے بلانے پر رلا ہور گئے تھے۔"
"اس نے اپنی مظلومیت کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔" میں نے اس سے نظریں چرا کر کہا۔
"تمہاری یہ ہمدرد دواخانے والی عادت تمہیں لے ڈوبے گی۔" نور نے کہا، پھر اچانک اس کے آنسو بہنے لگے۔ "اگر تمہیں وہاں کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی، تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے؟"
"جانو...... نور جہاں...... جان...... میری بات سنو!" میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں نے ہائے کہہ کر اپنا زخمی بازو پکڑ لیا۔
نور نے ندامت بھرے انداز میں مجھے دیکھا، پھر اچانک اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ میں نے اس سے کہا۔ "جان! آج میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ یوں بغیر سوچے سمجھے کسی کی مدد کو نہیں دوڑوں گا۔" میں نے اس کے ریشمی بال سہلاتے ہوئے کہا۔
دروازے پر دستک ہوئی تو وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ راجا اور ناصر کمرے میں داخل ہوئے۔ ناصر نے مسکرا کر پوچھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے نواب صاحب؟"
"اس وقت تو طبیعت ہری ہو رہی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویسے میری طبیعت اب بہت بہتر ہے۔"
"اور آپ کی طبیعت میں یہ رنگینی کہاں سے آئی؟" راجا نے پوچھا۔ "میں نے تو دھانی رنگ چوڑیوں کا سنا تھا، خوب صورت لڑکیاں بھی بعض اوقات دھانی چنریا اوڑھ لیتی ہیں۔ بعض اوقات پتنگ بھی دھانی ہوتی ہے۔ جیسے ایک گانا ہے، رنگ میری پتنگ کا دھانی!"
اس کی باتوں پر نور بے اختیار مسکرانے لگی۔ ناصر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔
راجا ہنس کر بولا۔ "فکیے پتر! تو خوش قسمت ہے کہ تجھے اتنے چاہنے والے لوگ ملے ہیں۔"
"ہاں واقعی! میری خوش قسمتی میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔" میں نے نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، نور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ اب میں اس کے بارے میں کچھ کہنے والا ہوں۔

اس کے جانے کے بعد راجا نے کہا۔ "یار، وہ اس رابعہ کا کیا کرنا ہے؟"
"اسے کچھ دن آرام کرنے دے۔" میں نے کہا۔
"میں نے مزید کنفرم کر لیا ہے کہ رانا اور دلاور میں سے کوئی بھی ملک میں موجود نہیں ہے۔" ناصر نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کارروائی رابعہ نے اپنے طور پر کی ہے۔"
"رابعہ نے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "اس کا تعلق کبھی بھی انڈر ورلڈ سے نہیں رہا۔ ورنہ میں بھی یہی سوچتا۔"
"میں بہت جلد معلوم کر لوں گا کہ اس "واردات" کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟"
"یار، ناصر کی بات دل کو لگتی ہے۔" راجا نے کہا۔ "رانا سے تو رابعہ کا کوئی رابطہ ہی نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کے کورٹ نہ پہنچنے پر رانا بھی مشتعل ہوگا۔ وہ تو رابعہ کے خون کا پیاسا ہوگا۔ رہا دلاور، تو وہ رفیق کے خلاف اتنی لمبی چوڑی کارروائی کیوں کرے گا۔ وہ تو موقع ملتے ہی نواب صاحب کو راہیِ ملکِ عدم کر دے گا اور کوئی رفیق کا ایسا دشمن ہے نہیں۔ چودھری سلطان مر چکا ہے۔ فریال اپنے ہی حال میں مست ہے، پھر یہ سب کچھ کون کر سکتا ہے؟"
"اس میں سر کھپانے کے بجائے اس شخص کی زبان کھلوانا چاہیے جسے ہم نے ریلوے اسٹیشن کے اس کمرے سے پکڑا ہے۔" میں نے کہا۔
"کون......! وہ مجھو؟"
"ہاں وہ مجھو ہے یا کوئی اور، ہمیں اس کی زبان کھلوانا ہوگی۔"
"میں کوشش کروں؟" ناصر اٹھتے ہوئے بولا۔
"چلو میں بھی چل رہا ہوں۔" میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر راجا سے پوچھا۔ "تم نے کسی کو رابعہ کے بارے میں بتایا تو نہیں ہے کہ ہم لوگ اسے ست بدھائی لے آئے ہیں؟"
"اگر میں کسی کو بتا دیتا تو حویلی میں اب تک زلزلہ آ چکا ہوتا۔" راجا نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ "تو آرام کر فکیے پتر! ہم لوگ ہیں نا!"
"یار، اب میں اتنا بھی نازک اندام نہیں ہوں کہ ذرا سے زخم پر بستر پکڑ لوں۔" میں نے کہا اور آرم سلنگ گلے سے اتار دیا۔ مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا لیکن میں نے برداشت کیا اور آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ نیچے لٹکا لیا۔
میں ان دونوں کے ساتھ کمرے سے نکلا تو ڈاکٹر شہلا پر نظر پڑی۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ اس نے نزدیک



آ کر پوچھا۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے نواب صاحب؟"
"اب میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحبہ!" میں نے ہنس کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔
"یار، کل دو دفعہ صوبیدار میجر صاحب بھی تجھے دیکھنے آئے تھے۔" راجا نے کہا۔ "لیکن تو سو رہا تھا۔"
"اچھا!" میں نے کہا۔ "یار، ان بیچارے سے بھی ملاقات کرنا چاہیے تھی۔" میں نے کہا۔ "چل پہلے ان ہی سے ملاقات کر لیں۔"
صوبیدار میجر صاحب مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بولے۔ "رفیق میاں! مجھے آپ کی طرف سے بہت فکر تھی۔ کل میں نے آپ کو دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت تو آپ کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ شکر ہے اللہ کا آپ خیریت سے ہیں۔" پھر وہ سنجیدگی سے بولے۔ "آپ کہیں بھی جانے سے پہلے کم سے کم مجھے یا غنی کو تو بتا ہی دیا کریں اور ہاں، اب آپ تنہا کہیں نہیں جائیں گے۔"
"جیسے آپ کا حکم!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "دراصل میں اب تک مجھے کسی نے اس انداز میں حکم نہیں دیا تھا۔ آپ کا لہجہ سن کر تو ابا یاد آ گئے۔"
"خیر اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" صوبیدار میجر صاحب مسکرا کر بولے۔
"اب تو کافی بہتر ہے۔" میں نے جواب دیا۔
غنی سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ راجا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ تو خوش قسمت ہے جس کے اتنے چاہنے والے ہیں۔ میں واقعی خوش قسمت تھا جسے راجا جیسا دوست، غنی جیسا ہمدرد، شہناز جیسی محبت کرنے والی بہن اور نور جیسی محبوبہ ملی تھی۔
میں نے غنی سے کہا۔ "ذرا تہ خانے کی چابیاں لے آؤ۔"
"چابیاں میں نے پہلے ہی لے لی ہیں سر!" غنی نے کہا۔
میں نے پہلے اس سیل کا رخ کیا جس میں غنی نے مجھو کو رکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں کمبل اوڑھے بیٹھا تھا۔ تہ خانے میں سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔
مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"بہت سردی لگ رہی ہے؟" غنی نے اس سے پوچھا۔
"مجھے شاید بخار ہو گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ورنہ مجھے اتنی سردی نہیں لگتی۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "نواب صاحب! آپ نے مجھے یہاں قید کیوں کر رکھا ہے؟"

## نیا انداز

انوکھے وقتوں کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ ان کا ایک عجیب انداز ہے۔ جب نئے سال کی رات آتی ہے تو سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں۔ نہ ٹریفک نظر آتا ہے نہ راہ گیر یہاں تک کہ پولیس بھی نہیں ہوتی۔ پھر بارہ بجتے ہی مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلتے ہیں، اندر سے موسیقی اور قہقہوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور گھر کا ہر فرد ہر قسم کی ٹوٹی پھوٹی اشیاء، ناقابل استعمال فرنیچر اور بے شمار ایسی ہی چیزیں پھینکنا شروع کر دیتا ہے جو گزشتہ سال کسی ایسی یاد سے وابستہ ہوتی ہیں جسے وہ ذہن سے نکال پھینکنا چاہتا ہے۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "دیکھو، میں تمہیں پانچ منٹ دے رہا ہوں۔ اگر تم اب بھی سچ نہ بولے تو پھر میں تمہیں اپنے اس گارڈ کے حوالے کر دوں گا۔ یہ تمہارے ہاتھ پیر توڑ کر تمہیں کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے گا۔ پھر بقیہ زندگی بھیک مانگتے گزرے گی۔"
"نواب صاحب! میں......"
"اتنی جلدی مت کرو۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں سچ کے سوا کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔" میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب!" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا اور غنی سے مخاطب ہوا۔ "پانچ منٹ بعد اس کے ہاتھ پیر باندھ دینا۔" میں تہ خانے سے باہر آ گیا۔
چار منٹ بعد میں پھر تہ خانے میں داخل ہوا۔ غنی ہاتھ میں ایک مضبوط رسی لیے کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے مجھو کے ہاتھ پشت پر باندھے، پھر اسے بے رحمی سے گرا کر اس کے دونوں پاؤں بھی جکڑ دیے۔
"ہاں، اب شروع ہو جاؤ۔" میں نے مجھو سے کہا۔
"مجھے جو کچھ بتانا تھا، بتا چکا ہوں۔" مجھو تھوک نگل کر بولا۔
"بکواس کی ہے تم نے، جھوٹ بولا ہے۔" میں دہاڑ کر بولا۔
"اگر آپ اسے جھوٹ سمجھتے ہیں تو میں کیا کر سکتا

ہوں۔'' مجھو نے ڈھٹائی سے کہا۔
''اچھا!'' میں نے ہنس کر کہا اور جیب سے رانا کی تصویر نکال لی۔ ''اسے پہچانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
اس نے تصویر پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے اس آدمی کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔''
''تم رانا کے لیے کام کرتے ہو اور اس آدمی کو نہیں جانتے؟'' میرا غصہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔
''ہوسکتا ہے یہ رانا کا کوئی خاص آدمی ہو؟'' مجھو نے کہا۔ ''لیکن میں نے اسے کبھی رانا صاحب کے پاس نہیں دیکھا۔''
''الو کے پٹھے!'' میں نے اس کے شانے پر زوردار لات مارتے ہوئے کہا۔ ''تو اس آدمی کو نہیں جانتا۔'' میں نے دوسری لات اس کے منہ پر ماری۔ ''تو اس کے لیے کام کرتا ہے اور اسی کو نہیں جانتا۔ یہ رانا ہے، اسی کے لیے تو کام کرتا ہے۔''
اس کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کو اڑ گیا، پھر اس نے فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پالیا۔ ''ممکن ہے، مجھ سے ملنے والا شخص رانا نہ ہو۔'' اس نے پینترا بدلا۔ ''لیکن مجھے اس نے یہی بتایا تھا کہ میں رانا ہوں۔''
''غنی!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''ترکیب نمبر گیارہ استعمال کرو۔''
غنی سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ترکیب نمبر گیارہ کا میں خود بھی شکار ہوچکا تھا۔ لندن میں جب چیف کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ تو میں نے یادداشت گم ہونے کی اداکاری کی تھی۔ اس پر چیف کے ایک آدمی نے کہا تھا کہ اس پر ترکیب نمبر گیارہ استعمال کرو۔ ترکیب گیارہ کوئی فارمولا نہیں تھا۔ بس چیف کے اس آدمی نے یوں ہی تشدد کے اس طریقے کو ترکیب نمبر گیارہ کا نام دے دیا تھا۔
غنی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی ایک ہانڈی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ غنی جانتا تھا کہ ترکیب نمبر گیارہ سے میری کیا مراد ہے۔ ایک دفعہ میں نے ہی اسے اپنے اغوا کا واقعہ سنایا تھا۔
غنی نے مجھو کے پیروں میں ایک لمبی سی رسی باندھی اور اس کا دوسرا سرا کمرے میں لگے ہوئے پنکھے کی طرف پھینکا، پھر دوسری طرف سے آہستہ آہستہ اسے کھینچنے لگا۔
ایک ہی منٹ میں مجھو سر کے بل لٹک رہا تھا۔
''میں تمہیں سچ بولنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔'' میں نے آگے بڑھ کے مجھو کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا۔ چٹاخ کی آواز آئی اور وہ پینڈولم کی طرح جھولنے لگا۔
''مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں بتا چکا ہوں۔'' مجھو نے ڈھٹائی سے کہا۔
میں نے غنی کو اشارہ کیا اور خود کمرے سے باہر نکل آیا۔
غنی نے مٹی کی وہ ہانڈی مجھو کے سر کے نیچے رکھ دی۔ مجھو کا سر ہانڈی سے بہت اوپر تھا لیکن دہکتے ہوئے کوئلوں کی تپش اوپر تک جارہی ہوگی۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں مجھو کا چہرہ پسینے میں تر ہوگیا لیکن اس نے زبان نہ کھولی۔
غنی نے اچانک دہکتے ہوئے کوئلوں میں مرچیں جھونک دیں۔ مرچوں کی دھانس اس کے کمرے سے باہر تک آرہی تھی۔ مرچوں کی بدبو میری ناک میں چڑھی تو میں بری طرح کھانسنے لگا۔ میں نے جلدی سے رومال نکال کر ناک اور منہ پر رکھ لیا۔ راجا اور ناصر بھی کھانس رہے تھے۔
میں نے دیکھا، مجھو کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ وہ بری طرح اپنا سر جھٹک رہا تھا، اپنے جسم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کررہا تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا، کھانس رہا تھا اور حلق سے اذیت ناک کراہیں نکال رہا تھا۔
غنی نے بھی اپنے چہرے پر رومال رکھ لیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر انگاروں پر سرخ مرچیں ڈالیں۔ اس میں سے گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھا اور مجھو ذبح ہونے والے مرغے کی طرح جھٹکے کھانے لگا۔ میرے اشارے پر غنی نے ہانڈی اس کے سر کے نیچے سے ہٹالی کیونکہ مجھو کا سر ڈھلک گیا تھا اور وہ بے جان لاش کی طرح رسی میں جھول رہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد غنی نے ایک جگ میں پانی لے کر اس کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ مجھو کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہوگیا۔
''اب سچ بولو گے یا نہیں؟'' میں نے کہا۔ ''اپنا نام بتاؤ۔''
''سلامت علی!'' اس نے یوں کہا جیسے مداری کا بچہ جمورا بولتا ہے۔ ''لوگ مجھے مجھو کے نام سے جانتے ہیں۔''
''تم رانا زوہیب کو جانتے ہو؟''
''نہیں، میں اسے نہیں جانتا۔'' مجھو نے جواب دیا۔
''تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''جہاں سے مجھے پیسے ملیں، میں اسی کے لیے کام کرنے پر تیار ہوجاتا ہوں۔''
''ریلوے اسٹیشن کیوں گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔
''میڈم رابعہ نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔'' اس نے کہا۔



''میں اب کچھ نہیں چھپاؤں گا نواب صاحب! آپ کو خدا کا واسطہ، مجھے نیچے اتاریں۔ میری حالت بہت خراب ہورہی ہے۔ مجھے نیچے اتاریں۔''
''نیچے بھی اتارلوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے تم میرے سوالات کا جواب دو۔ رابعہ تمہیں کہاں ملی تھی؟''
''میڈم رابعہ مجھ سے نہیں بلکہ شاکر سے ملی تھیں۔'' مجھو نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ ناک کے بجائے منہ سے سانس لے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت اس کی کیا کیفیت ہوگی۔
''رابعہ شاکر کو کیسے جانتی ہے؟'' راجا نے پوچھا۔
''شاکر دلاور کے لیے کام کرتا ہے۔ دلاور نے شاکر سے کہا تھا کہ میڈم رابعہ کا خیال رکھنا۔ میں کچھ ضروری کاموں سے لندن جارہا ہوں۔''
اس نے پھر سر جھکا اور خوشامد بھرے لہجے میں بولا۔ ''نواب صاحب! آپ کو اللہ کا واسطہ! مجھے معاف کردیں اور نیچے اتارلیں ورنہ میں مرجاؤں گا۔''
میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ غنی نے اس کی رسی آہستہ آہستہ ڈھیلی کی اور اسے نیچے اتارلیا۔
نیچے اترتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔
''اسے بستر پر آرام سے لٹادو۔'' میں نے غنی سے کہا۔ ''اور اس کے ہاتھ پیر بھی کھول دو۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔'' میں ناصر اور راجا کے ساتھ تہ خانے سے باہر آگیا۔ میری حالت بھی مرچوں کی اس دھانس سے خراب ہوگئی تھی۔ راجا اور ناصر کا بھی یہی حال تھا، وہ دونوں بھی کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔
''نواب صاحب!'' ناصر ہنس کر بولا۔ ''آپ واقعی نواب ہیں۔''
''او بھائی!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے ابھی تم سے سچ بولنے کو نہیں کہا۔ تم تو دہکتے ہوئے کوئلوں اور مرچوں کی دھانس سے بہت دور تھے۔''
میری بات پر ناصر بے اختیار ہنسنے لگا اور بولا۔ ''میرا مطلب تھا کہ آپ میں بھی نوابوں اور جاگیرداروں والی خصوصیات موجود ہیں۔ ہر جاگیردار اور نواب تشدد اور تھرڈ ڈگری کے بے شمار طریقے جانتا ہے۔''
میں نے ناصر کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ تم طنز کررہے ہو یا میری تعریف کررہے ہو؟''
''نواب صاحب!'' ناصر بھی سنجیدہ ہوگیا۔ ''میں جن لوگوں پر طنز کرتا ہوں، ان کے ساتھ قیام نہیں کرتا، ان کے

Mob: 0300-2219514,0344-2609328
Tel:021-34519074
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
بذریعہ ڈاک
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام اور پتہ ضرور لکھیے
نوٹس برائے داخلہ
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد، کراچی 75080

ساتھ کھانا بھی نہیں کھاتا۔ کھانا تو دور کی بات ہے، میں تو ان کے گھر کا پانی بھی خود پر حرام سمجھتا ہوں۔"

"اوہو، تم تو واقعی سیریس ہو گئے۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہی تھی۔"

"تو پھر میں بھی یوں ہی سیریس ہو گیا تھا۔" ناصر نے مسکرا کر کہا۔ "میں بھی اداکار ہوں یا نہیں؟"

"تم تو اداکاری کا اکیڈمی ایوارڈ بھی جیت سکتے ہو۔" میں نے کہا، پھر راجا سے مخاطب ہوا۔ "میں اب اپنے کمرے میں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔"

وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی میرے کمرے میں آ گئے۔ راجا نے کہا۔ "یار تو آرام کر، ہم لوگ تھوڑی دیر بعد آ جائیں گے۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ راجا نے شہناز کو بھیج دیا تھا۔

شہناز نے تشویش سے مجھے دیکھا، پھر بولی۔ "تم نے وہ آرم سلنگ کیوں نکال دیا؟ ہاتھ لٹکا ہونے کی وجہ سے تکلیف ہو رہی ہوگی۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔"

"مجھے تکلیف نہیں ہے بلکہ تھکن ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تھکن بھی کمزوری کی وجہ سے ہوتی ہے۔" اس نے زبردستی مجھے لٹا دیا اور بولی کہ میں تمہیں ایک انجکشن اور دیتی ہوں۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ "اس وقت خواب آور انجکشن مت دے دینا۔ یوں بھی پرسوں سے لے کر اب تک مجھے اتنے خواب آور انجکشن دیے گئے ہیں کہ میرا ذہن بوجھل ہو کر رہ گیا ہے۔"

"فکر مت کرو، میں تمہیں نیند کا انجکشن نہیں دوں گی۔" شہناز نے مسکرا کر کہا۔

اچانک غنی گھبرایا ہوا آیا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا ہوا غنی، تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"پولیس آئی ہے سر!" اس نے کہا۔

"تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟" مجھے غصہ آ گیا۔ "راجا کو بلاؤ۔"

شہناز مجھے انجکشن دے کر چلی گئی۔ راجا اور ناصر ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

میں نے راجا سے کہا۔ "بھئی وہ تیرے پرانے دوست آئے ہیں۔"

"کون! وہ تیرے سسرالی رشتے دار؟" راجا ہنس کر بولا۔ "ان سے تو نا صرنمٹ لے گا۔ تو تو یوں بھی اس وقت ملاقات کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"یار، وہ کہیں تلاشی کا وارنٹ لے کر نہ آئے ہوں۔"

"تلاشی!" راجا نے کہا۔ "وہ کیوں تلاشی لیں گے اور کس کی تلاشی لیں گے؟"

"آپ آرام کریں، ہم ابھی آتے ہیں۔" ناصر نے کہا اور راجا کو لے کر باہر نکل گیا۔

مجھے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ملازم کو بلایا اور کافی کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ریشم کافی لے کر آ گئی۔ اس کے ساتھ نور بھی تھی۔ ریشم کے جانے کے بعد نور بولی۔ "رفیق! اس سے بہتر تو ہم لندن میں تھے۔ یہاں تو ایک ہی گھر میں ہونے کے باوجود تم سے گھنٹوں ملاقات ہی نہیں ہوتی ہے۔ میں یہاں پڑے پڑے بور ہو گئی ہوں۔ وہاں تو میں اتنی مصروف رہتی تھی اور یہاں....."

مجھے ہنسی آ گئی۔ "تم تو واقعی اس وقت کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی سی ای او نظر آ رہی ہو۔"

"مذاق مت کرو۔" نور جھینپ کر بولی۔

اس وقت وہ خوب صورت سیاہ ساڑی اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ سیاہ ساڑی اس کے سفید رنگ پر بہت اچھی لگ رہی تھی اور اس کی شخصیت میں جو وقار، جو رعب پیدا ہوا تھا، اس سے وہ مجھے کسی کمپنی کی سی ای او ہی لگ رہی تھی۔

دروازے پر دستک دے کر راجا اندر آ گیا اور بولا۔ "پولیس کی یہ پارٹی لاہور سے آئی ہے۔ یہ سب ناصر کا کمال ہے۔ اس نے پولیس کے ڈائریکٹر جنرل کو فون کر کے کہا تھا کہ نواب صاحب پر لاہور میں قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ اسی قسم کا ایک فون اس نے ہوم منسٹر کو کیا تھا۔ نتیجے میں پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہلچل مچ گئی۔ میں پولیس پارٹی کے انچارج ایس پی کو یہاں بلوا لیتا ہوں۔ وہ تجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔" راجا یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔ میں نے نور سے دوسرے کمرے میں جانے کو کہا۔

نور نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا یا سکون کا، ہجر کا۔

تھوڑی دیر بعد غنی دستک دے کر اندر آ گیا اور بولا۔ "سر! ایس پی صاحب آئے ہیں۔"

"انہیں اندر بلاؤ۔" میں نے کہا۔ میں اس وقت بیڈ سے اٹھ کر آرام کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔



ایس پی اندر آیا اور اس نے مجھے بہت مودبانہ انداز میں سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹھے ہی بیٹھے اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جی ایس پی صاحب!" میں نے کہا۔ "حکم کریں۔"

"حکیم کیا کرتا ہے نواب صاحب!" ایس پی ہنس کر بولا۔ "آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔"

"اٹ از آل رائٹ آفیسر!" میں نے باوقار لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ ایس پی کی یہ فرماں برداری اور تابعداری ڈی جی پولیس کی وجہ سے ہے۔

"سر، ماڈل ٹاؤن میں آپ کی کوٹھی پر حملہ ہوا تھا، میں اسی سلسلے میں تحقیقات کر رہا ہوں۔"

"میں نے اس کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں لکھوا دی تھی آفیسر!" میں نے باوقار لہجے میں کہا۔ "میں نے سب کچھ تفصیل سے پولیس کو بتا دیا تھا۔"

"سر، آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ پر یہ حملہ کون کرا سکتا ہے؟" ایس پی نے پوچھا۔

"مجھے اگر ذرا بھی اندازہ ہوتا تو میں پہلے ہی پولیس کو بتا دیتا۔" میں نے کہا۔

"وہ کوٹھی آپ کی ہے؟" ایس پی نے پوچھا۔

"کس کوٹھی کی بات کر رہے ہو آفیسر!" میں نے پوچھا۔

"ماڈل ٹاؤن کی وہ کوٹھی جہاں آپ پر حملہ ہوا تھا۔" ایس پی نے کہا۔

"اس سوال کا حملے سے کیا تعلق ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ کوٹھی میرے ایک ملازم کی ہے۔"

"میں اس لیے پوچھ رہا تھا کہ ممکن ہے کوئی پہلے سے وہاں آپ کی تاک میں بیٹھا ہو لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ کوٹھی آپ کی نہیں ہے۔"

"آفیسر! تم کیا یہی معلوم کرنے کے لیے لاہور سے یہاں تک آئے ہو؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ایس پی نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے دل ہی دل میں مجھے گالیاں دے رہا ہو۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ "نواب صاحب! آپ نے پولیس کو جو اسٹیٹمنٹ دیا تھا، اس پر سائن نہیں کیے تھے۔ میں آپ کا وہ بیان لے کر آیا ہوں، آپ اس پر سائن کر دیں۔ یہ ضابطے کی کارروائی ہے نواب صاحب!"

"میں تو اس وقت بھی سائن کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "میری طرف سے میرا سیکریٹری دستخط کر دے گا۔"

ایس پی کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس نے فائل کھول کر میرا وہ بیان نکالا جو میں نے لاہور میں پولیس انسپکٹر کو دیا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ پرچہ اس سے لے لیا۔ اسے پڑھنا بھی ایک مسئلہ تھا کیونکہ تحریر ایسی جناتی تھی کہ اسے وہ شخص خود بھی مشکل ہی سے پڑھ پاتا جس نے لکھا تھا۔

میں نے ایس پی سے کہا۔ "آفیسر! کیا تم اسے پڑھ سکتے ہو؟"

"آف کورس سر!" اس نے کہا۔

"تو پھر ذرا مجھے پڑھ کر سناؤ۔" میں نے وہ پرچہ دوبارہ اسے دے دیا۔

اس نے پرچہ میرے ہاتھ سے لے کر پڑھنا شروع کیا۔ "میں نواب رفیق احمد شیرازی بہ قائمی ہوش و حواس..... یہ....." وہ پڑھتے پڑھتے اٹک گیا۔ "یہ....."

"آفیسر!" میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "میرا یہ بیان ٹائپ کر کے لاؤ تاکہ میں اسے آسانی سے پڑھ سکوں۔ اب میں تو نہیں جانتا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ تمہارا وہ انسپکٹر اس میں کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔ مثلاً وہ لکھ سکتا ہے کہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے دو آدمیوں کو قتل کر کے ان کی لاش فلاں جگہ دبا دی ہے اور میں اس بیان پر اپنے دستخط بھی کر دوں۔ نیچے تم "ب س ص ت" لکھ کر اس پر اپنے سائن بھی کر دو تو مجھے تو پریشانی ہو جائے گی نا! "ب س ص ت، دراصل مخفف تھا "بیان سن کر صحت تسلیم کی" کا۔

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں نواب صاحب!" ایس پی نے کہا۔ "پولیس کا کوئی ذمے دار افسر ایسی حرکت کر سکتا ہے؟"

"پولیس کے ذمے دار افسران تو اس سے بھی بڑی بڑی حرکتیں کرتے ہیں آفیسر!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ تو ایک غیر ذمے دار افسر کی حرکت ہے۔" پھر میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اس بیان کو ٹائپ کروا کر لے آؤ، میں اس پر اپنے سیکریٹری سے دستخط بھی کرا دوں گا اور اپنی اسٹیمپ بھی لگا دوں گا اور کچھ پوچھنا ہے؟"

"نواب صاحب!" ایس پی خون کے سے گھونٹ پی کر بولا۔ "اصل میں ہم نے ایک آدمی کو گرفتار کیا ہے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ وہ ان آدمیوں میں سے ایک ہے جنہوں نے آپ پر حملہ کیا تھا۔ کیا آپ اس آدمی کو شناخت کر سکتے ہیں؟"

''کیسی باتیں کرتے ہو آفیسر!'' میں نے ناگواری سے کہا۔ ''میں اسے کیسے شناخت کرسکتا ہوں۔ میں نے کسی بھی حملہ آور کی شکل نہیں دیکھی تھی۔''

''میرا مطلب ہے کہ آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ آپ اس آدمی کو پہچانتے ہیں یا نہیں۔''

''اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ اب مجھے واقعی غصہ آنے لگا تھا۔ ''کیا تمہارے کسی تھانے میں حاضر ہو کر ملزم کو شناخت کرنا ہوگا یا پھر تم خود مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے؟''

''میں صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیتے۔''

''کیا ملزم کو اپنے ساتھ لائے ہو؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا نواب صاحب کہ آپ اتنے زخمی ہیں ورنہ میں یہاں نہ آتا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ آپ معمولی زخمی ہوئے ہوں گے، اسی لیے تو ایک ہی دن میں اسپتال سے ڈسچارج ہو گئے۔ سوری سر، میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ ایک نظر اس شخص کو دیکھ لیں لیکن آپ کی طبیعت خراب ہے۔''

''وہ شخص کون ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''اس کا نام پتا تو معلوم کیا ہوگا تم نے؟''

''وہ لاہور کا ایک کرمنل شاکر علی ہے۔'' ایس پی نے کہا۔

شاکر علی کا نام سن کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ میں نے اپنے چہرے سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں شاکر کا نام اس سے پہلے بھی سن چکا ہوں۔

''میں نے اس سے پہلے یہ نام نہیں سنا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کرتا کیا ہے؟''

''شاکر علی ہر قسم کا غیر قانونی کاروبار کرتا ہے۔ اسمگلنگ سے لے کر بردہ فروشی تک اور منشیات سے لے کر اسلحے کی فروخت تک وہ ہر کام کرتا ہے۔''

''اور ابھی تک قانون کی نظروں سے بچا ہوا تھا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میرے اس طنز کا ایس پی نے برا نہیں مانا۔ ہاں اگر کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ مجھے فوری طور پر گرفتار کر کے تھانے لے جاتا اور میری اچھی طرح چھترول کرنے کے بعد کہتا۔ ''قانون تو بہت کچھ کرسکتا ہے اوئے، تو کیا سمجھتا تھا، قانون بے بس ہے۔''

''اسے پولیس نے کئی دفعہ گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ وہ عدم ثبوت کی بنا پر بچ گیا۔'' ایس پی نے کہا۔

''ہاں، پاکستان میں ہر وہ مجرم بچ جاتا ہے جس کے پاس پیسا ہو یا کوئی سیاست داں یا بیوروکریٹ اس کا پشت پناہ ہو۔ قانون کو پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ پیسے کی چمک دمک اور سفارش کی دیوار کے پیچھے پہنچ کر وہ مجرم باعزت شہری بن جاتا ہے اور پولیس کے افسران اسے گرفتار کرنے کے بجائے صبح شام سلام کرتے ہیں۔''

ایس پی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ میں بار بار اس کے اختیارات کو چیلنج کر رہا تھا اور وہ ہر بار خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔

''نواب صاحب!'' اس نے کہا۔ ''میں صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ شاکر علی کو جانتے ہیں یا نہیں؟''

''میں بتا تو چکا ہوں کہ میں اسے نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ شاکر علی دراصل ہمیں کئی اور وارداتوں میں مطلوب تھا۔ اگر آپ اس کے خلاف بیان دے دیں تو ہم اس کے خلاف مضبوط کیس بنا سکتے ہیں ورنہ وہ عدالت سے ایک مرتبہ پھر بری ہو جائے گا۔''

''ایس پی! تم کہنا کیا چاہتے ہو! میں بغیر جانے بوجھے کسی بھی شخص کے خلاف بیان دے دوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ سے جھوٹا بیان لینا چاہتے ہو۔''

''اس نے آپ پر حملہ کیا تھا۔'' ایس پی جز بز ہو کر بولا۔

''یہ تمہارا بیان ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں کسی شاکر علی کو نہیں جانتا۔''

''لیکن وہ آپ کو جانتا ہے۔'' ایس پی نے کہا۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' میں نے کہا۔ ''لاہور میں، پنڈی میں، ست بدھائی میں بے شمار لوگ مجھے جانتے ہیں۔'' پھر میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ایس پی صاحب! آپ جا سکتے ہیں۔''

اچانک باہر سے شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں، پھر غنی کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ کسی کو بلا رہا تھا۔ میں نے چونک کر ایس پی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

**یہ پر پیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے**
**مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں**

مغربی معاشرے میں بھی محبت کی تال پر دل ایسے ہی دھڑکتا ہے جیسے مشرقی معاشرے میں عشق کی داستانیں جنم لیتی ہیں... اگرچہ جذبات کا تلاطم اور سوچوں کی جنوں خیزی کا انداز ذرا جدا ہوتا ہے مگر اس مسافت کا تقاضا محبوب کی رفاقت ہی ہے... اور ان دونوں نے بھی یہ تقاضا پورا کرنا تھا۔

**چاہت کے مہکتے جذبوں سے معطر ایک دلربا کا انداز محبت**

رضوانہ منظر

# تحفۂ رفاقت

اس وادی میں آئے ہوئے لارسن کو ابھی صرف چار ماہ ہوئے تھے مگر یہاں کے پرسکون ماحول سے وہ اکتا گیا تھا۔ حالانکہ وہ تنہائی کا عادی تھا۔ شاید اس کے دل میں کسی سے کچھ کہنے، کچھ سننے کی شدید خواہش انگڑائی لے رہی تھی۔ لارسن نے ابتدا میں اسے ایک معمولی ''مرض'' گردانتے ہوئے اس کا علاج محدود پیمانے پر کرنے کی کوشش کی اور ادھر ادھر کاموں میں مصروف رہا۔ جانوروں سے باتیں کرتا رہا۔ مگر اس کی بے کلی دور نہ ہوئی۔ پچھلے چند روز سے تو وہ اپنے لیے بہت فکرمند تھا اور یہ تشویش اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب اس نے اپنے کھیتوں کے گرد لگے ہوئے جنگلے کے ایک بانس کو اپنی بات کا جواب دیتے سنا۔ اس روز اس نے دن کے باقی کام ادھورے چھوڑے، لباس تبدیل کیا اور وادی میں نشیب کی طرف روانہ ہو گیا جہاں جھیل کے اس پار جورن اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا، وہ لارسن کا اکلوتا چچا تھا۔

جورن اسے جھیل کے کنارے ہی بیٹھا مل گیا۔ وہ اس وقت بے حد مایوسی کے عالم میں اپنے فش ہکس کا معائنہ کر رہا تھا۔ لارسن نے اندازہ لگا لیا کہ اس افسردگی کی وجہ وہ مچھلیاں ہیں جو ہاتھ آ کر نکل گئی ہوں گی۔ پژمردگی جورن کے چہرے سے ہی نہیں، حلیے سے بھی عیاں تھی۔ اس کے بال بکھرے

ہوئے تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔

"لعنت ہے!" جورن نے افسردہ مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "کل رات ہونے والی برف باری سے پہاڑی سڑک اگلے ایک ہفتے تک استعمال کے قابل نہیں رہے گی۔" اس نے مایوس کن نگاہیں آسمان اور پھر فلک بوس پہاڑ کی چوٹی کی طرف اٹھائیں۔ "اور میری اب تک پکڑی ہوئی مچھلیاں یوں ہی پڑی رہیں گی۔" پھر وہ اپنے خیالات سے چونک کر اپنے بھتیجے کی طرف متوجہ ہو گیا اور آنے کا مقصد دریافت کیا۔

"میں نے سوچا، بال ہی کٹوا لیے جائیں۔" لارسن نے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں اس کے سنہرے بال کانوں سے نیچے تک بڑھ گئے تھے۔

"میں دیکھ رہا ہوں۔ اب تک تو انہیں تمہارے پیروں سے الجھ کر تمہیں گرا دینے کا سبب بن جانا چاہیے تھا۔ آؤ چلو۔" وہ گھر کی طرف بڑھا۔ "میں بھیڑ کے بال کاٹنے کے بعد اپنی قینچی ہمیشہ تیز کر کے رکھتا ہوں۔"

جورن کے مکان کے دو حصے تھے۔ اگلے میں اس نے جنرل اسٹور کھول رکھا تھا جس میں نہ صرف ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی بلکہ وہ اس وادی کا پوسٹ آفس بھی تھا۔ اس کی رہائش عقبی حصے میں تھی۔ لارسن جورن کی معیت میں اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی ایک عورت دھلے ہوئے کپڑے سکھانے کے لیے الگنی پر ڈال رہی تھی۔ لارسن کو دیکھ کر اس نے اپنے ایپرن سے ہاتھ پونچھے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "آؤ لارسن، بے مروت لڑکے! تمہیں آج اپنی آنٹی کا خیال آ گیا!"

لارسن اس سے لپٹ گیا۔ "میں تو بہت عرصے سے آنا چاہ رہا تھا مگر..... آپ تو جانتی ہیں کہ فارم کی زندگی کس قدر مصروف ہوتی ہے۔"

"پہاڑی علاقے کے فارم پر مصروفیت..... اور وہ بھی موسم سرما میں!" آنٹی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا تمہارے چچا فارم پر کام نہیں کرتے یا تم کسی اور دنیا میں رہتے ہو؟" اس نے طنزاً کہا اور اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی پھر آواز لگائی۔ "لیزلی! دیکھو تو کون آیا ہے۔" وہ لارسن کو ساتھ لیے نشست گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگی "اس تارک الدنیا کو اپنے گوشۂ تنہائی سے نجات مل گئی۔ اس کے لیے ذرا کافی تو بنا لاؤ۔"

"گناہ کی طرح سیاہ اور ابلتی ہوئی..... ہے نا؟" لیزلی نے کمرے سے باہر آ کر لارسن کو دیکھتے ہوئے چھیڑا۔

لارسن نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کسی نوخیز کلی کے مانند تر و تازہ تھی۔ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں سرگوشی کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کا جسم مائل بہ فربہی ہونے کے باوجود بے حد پرکشش تھا۔ "تم کچھ بھول رہی ہو۔" لارسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ چٹکی بھر کالی مرچ مجھے یاد ہے۔" لیزلی نے جواب دیا۔

لارسن کی مسکراہٹ کھسیانی ہو گئی۔ لیزلی کافی بنانے چلی گئی۔ لارسن کو وہ ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی تھی۔ وہ ان چند لڑکیوں میں سے تھی جن کی موجودگی میں لارسن خود کو بے حد پرسکون محسوس کرتا تھا۔ کئی سال دور دراز مقامات پر تنہا گزارنے کے باوجود وہ گھر کی آسائش اور سکون بالکل نہیں بھولا تھا اور کم از کم صنفِ نازک سے دلکش لب و لہجے میں بات کرنے کی اہلیت اب بھی رکھتا تھا۔

لیزلی کے ساتھ شروع ہی سے عجیب واقعات پیش آئے۔ آج سے سات برس قبل جب وہ میکس کے ساتھ اس پہاڑی بستی میں آئی تو بے حد شگفتہ مزاج اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ میکس، انکل جورن کا اکلوتا لڑکا تھا۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں برجن گیا تھا جہاں یہ من موہنی لڑکی اس کے دل میں گھر کر گئی۔ انہوں نے فوراً شادی کر لی۔ جس روز وہ بستی میں پہنچے اسی رات ڈانس کلب میں لیزلی نے ایک ڈانس میں لارسن کو پارٹنر بنایا۔ دونوں دیر تک رقص کرتے رہے۔ لارسن اس دوران میں اپنے گرد و پیش سے جیسے بے خبر ہو گیا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب رقص ختم ہو چکا تھا اور لیزلی دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ اب اس وقت بھی وہ لارسن کو دیکھ کر بالکل اسی انداز میں مسکرائی تھی۔ لارسن کو بے اختیار میکس یاد آ گیا۔ میکس پیشہ ور اسکیٹر تھا اور اے کلاس جمپنگ چیمپئن۔ اس کی ہمت و جرأت کا بستی کا ہر شخص معترف تھا۔ اس کے کارناموں کا آج بھی چرچا تھا۔ وہ ایسے ہی ایک مقابلے میں شریک تھا جب حادثے کا شکار ہوا۔ بستی کے گرجا سے ملحق قبرستان میں اسے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں دفنایا گیا تھا۔

آنٹی پھر سے کپڑوں کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔ لارسن اٹھ کر باہر احاطے میں آ گیا۔ یہاں انکل جورن کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ ان میں سے ایک کو اس نے دور سے ہی پہچان لیا۔ وہ وادی کے دوسرے سرے پر واقع فارم کے مالک کا بیٹا البرٹ تھا۔ لارسن کو اس کے بچپن کی کچھ باتیں دھندلی دھندلی سی یاد تھیں مگر اب تو وہ پورا سانڈ کا سانڈ ہو چکا تھا۔ قد میں لارسن سے بھی کچھ نکلتا ہوا تھا۔ حالانکہ لارسن چھ



فٹ کا تھا۔ لارسن نے ہلکے سے اشارے سے اس کے ہیلو، کا جواب دیا اور پھر اس کی موجودگی کو بھول ہی گیا۔ اچانک ہی وہاں موجود دوسری ہستی کو اس نے قریب سے دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ لمحہ لارسن کے لیے یادگار رہا۔ جب اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب تم یہ نہ کہنا کزن لارسن، کہ تم مجھے بھول چکے ہو اور نہیں پہچانے۔"

"یا میرے خدا!" لارسن نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ وہ اتنی سنسنی سے دوچار تھا کہ کافی دیر تک کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے ماریا کے خوبصورت تراشے ہوئے سنہرے بالوں سے لے کر قیمتی اور مضبوط فلی بوٹ تک کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور شفاف تھیں۔ رنگت سرخ و سپید، ہونٹ نازک اور پتلے جبکہ جسم بہت متناسب تھا۔ لارسن نے حیرت کے عالم میں قدرت کی صناعی کے اس شاہکار کو دیکھا اور جیسے اس پر یہ عقدہ کھل گیا کہ جنگلے کے بانس نے اس کی باتوں کا جواب کیوں دینا شروع کر دیا تھا۔ اب تو جیسے اسے اپنے مرض کی دوا مل گئی تھی۔

"ماریا!" بالآخر وہ بولنے کے قابل ہوا۔ "تم تو بالکل ہی بدل گئی ہو۔" اب سے چند ماہ پیشتر جب وہ لوٹا تھا تو ماریا اس وقت وادی میں نہیں تھی۔

"یہ..... یہ تو عمر کا تقاضا ہے۔" ماریا نے بناوٹی شرم سے جواب دیا۔ "اگلے ماہ میں انیس برس کی ہو جاؤں گی۔ وقت ہم سب پر ہی اثر انداز ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ادا سے سر جھکا لیا جیسے شرما رہی ہو اور کچھ اس طرح لارسن کو دیکھا کہ اس کا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا گویا ہر آنا چاہتا ہو۔

"یہ شکاری لوگ ہر چیز کو اس قدر غور سے دیکھتے ہیں کہ کیا کہیں۔ نظریں کسی عقاب کی طرح تیز اور آر پار دیکھنے والی۔" بولنے والا البرٹ تھا۔ وہ لارسن کو اب کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لارسن کو اچانک محسوس ہوا کہ البرٹ سے دوستی کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

"احمق مت بنو البرٹ!" ماریا نے تیزی سے کہا۔ "لارسن نے محض ایک تبصرہ کیا ہے کیونکہ وہ ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوا ہے۔ تم بھی کہنے کے لیے ایسے ہی الفاظ کیوں نہیں سوچتے!"

"میرا خیال ہے، اسے ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جورن رکھائی سے بولا جو ابھی ابھی اسٹور میں سے کچھ سامان لیے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔ "ماریا ایسے تمام الفاظ سے آگاہ ہے، چلو لڑکے۔" اس نے لارسن سے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ، کہیں رات نہ ہو جائے۔"

وہ لارسن کو لیے ہوئے فارم کے انتہائی سرے پر واقع ایک شیڈ کے نیچے آ گیا۔ وہاں اسے ایک بینچ پر بٹھا کے خود اس کے سامنے دوسری بنچ پر بیٹھ گیا۔ ایک بینچ پر پرانی سی قینچی، دو ٹوٹے دندانوں والے کنگھے، دو مگ اور استعمال شدہ موم بتیوں کے ٹوٹے رکھے تھے۔ جورن نے لارسن کو کسی بھیڑ کی طرح اپنے گھٹنوں کے درمیان جکڑنے کا سوچا مگر فوراً ہی اسے خیال آ گیا کہ اس مرتبہ اس کا سابقہ انسان سے ہے اور اس نے لارسن کی حجامت انسانوں کی طرح بنانا شروع کر دی۔

"اس جھاڑ جھنکاڑ کا کتنا حصہ باقی رہنے دوں؟" اس نے کچھ دیر بعد لارسن سے پوچھا۔

"بس اتنا کہ میں ان میں کنگھا پھیر سکوں۔"

حجامت کرنے کے دوران جورن مسلسل بولتا رہا۔ کئی بار تکلیف کے باعث لارسن کا چہرہ بگڑ گیا اور اس نے آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔ جورن گلی بندھی عادات کا آدمی تھا۔ وہ بھیڑوں کے بال کاٹتا تھا اور کسی انسان کی حجامت بنانے کا اس کے لیے یہ پہلا اتفاق تھا مگر عادت کے مطابق وہ لارسن کے بال بھی اسی طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا جس طرح بھیڑ کی پشت کا اون جکڑتا تھا۔

جب لارسن حجامت بنوا چکا اور اسے سر اٹھانے اور خراشیں سہلانے کی اجازت ملی تو اس نے کسی ردِعمل کے اظہار کے بغیر جورن سے کہا۔ "میں ایک معاملے میں آپ کا مشورہ چاہتا ہوں۔ میں نے شکار اور کھالوں کا دھندا وغیرہ جیسے کام چھوڑ دیے ہیں اور گھر واپس آ گیا ہوں۔ اب گھر میں محض ایک ہی چیز کی کمی ہے۔ میرا مطلب ہے، انکل..... میں سوچ رہا ہوں کہ گھر میں ایک بیوی لے آؤں۔"

"لیزلی سے شادی کر لو۔" جورن نے فوراً کہا۔ "بڑا عمدہ کھانا پکاتی ہے۔"

"میں آپ کی بیٹی کو ترجیح دوں گا۔" لارسن نے بے جھجک کہا۔

"میں پہلے ہی خطرہ محسوس کر رہا تھا۔" جورن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ہاں..... اچھی لڑکی ہے ماریا، مگر آج کل وہ احمق مردوں کے دل جمع کرنے کا مشغلہ اختیار کیے بیٹھی ہے۔ تم نے غالباً غلط لڑکی کا انتخاب کیا ہے بچے۔"

"مجھے بہ طور داماد قبول کرنے میں آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟" لارسن نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "میں جوان ہوں، طاقتور ہوں اور خاصے بڑے فارم کا تنہا مالک۔ اس کے علاوہ میرا اپنک بینفٹس بھی خاصا ہے۔"

"تم بہت اچھی فطرت کے مالک ہو۔" جورن نے

دنیا بھر سے اچھے برے انسانوں کی
سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں،

ماہنامہ سرگزشت

منفرد و خاص شمارہ

پراسرار [illegible] نمبر

حیران کن واقعات جو عقل کو ماؤف کردیں جن کا کوئی علمی جواز نہ ہو مگر وہ زندگی کی اٹل حقیقتیں ہوں...

اپنے سحر میں جکڑ لینے والی پراسرار، انوکھی اور محیر العقول سچ بیانیاں، قصے اور کہانیاں

تحقیقی مضامین سے سجا ایک ایسا خصوصی شمارہ جو سرگزشت ہی پیش کرسکتا ہے

بہت جلد پیش کیا جارہا ہے



Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil


اس کی گنوائی ہوئی خوبیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم میری عمر بھر کی کمائی، میری کل جمع پونجی کو لے جانے کے واقعی حق دار ہو۔ تم میرے گھر کی کشید کردہ شراب کو مردوں کی طرح اپنے گھر لے جاسکتے ہو۔ بعض اوقات وہ جن احمقوں کو ٹھکراتی ہے۔ وہ اس سے محبت کرنے کے دعوے دار تو ہوتے ہیں مگر اس شراب کے دو ایک گھونٹ ہی انہیں زمین چاٹنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ رہا میرے معترض یا رضامند ہونے کا سوال، تو میں تمہیں صاف طور پر بتادوں کہ تمہیں رضامندی میری نہیں بلکہ ماریا کی درکار ہے۔''

''میں اس سے پوچھ لوں گا۔'' لارین اٹھتے ہوئے بولا۔

جورن نے اسے دوبارہ بینچ پر دھکیل دیا اور ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بچے، بات اتنی آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ عورت...... عورت سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا گھی نہیں ہوتی۔ کسی لڑکی سے یوں کہنا کہ مجھے تمہاری اس لیے ضرورت ہے کہ مجھے پکا کردے سکو، کپڑے سی سکو اور بچے پال سکو وغیرہ، تو یہ قطعاً مناسب نہیں ہے۔ گو کہ یہ حقیقت ہے لیکن وہ اسے انتہائی ناگوار اور اپنے خلاف کھلی جارحیت تصور کرے گی۔ تمہیں طلب برآری کے لیے پیچیدہ اور پرفریب طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ تمہیں اسے یہ یقین دلانا ہوگا کہ تم اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کرسکتے۔''

''انکل! آپ کا دماغ...... کیا ہوگیا ہے آپ کو!'' لارین خاصے اہانت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کی بیٹی سے شادی اس لیے ہرگز نہیں کرنا چاہتا کہ وہ میرے موزے دھویا کرے اور کپڑے رفو کیا کرے۔ میرے احساسات تو اس سے کہیں ارفع اور گہرے ہیں۔''

''شاباش!'' جورن نے خوش مزاجی سے کہا۔ ''تم تو پہلے ہی سب کچھ سیکھے ہوئے ہو، تمہیں تو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس تم دماغ میں یہی خیالات رکھتے ہوئے آج سے ہی اس منصوبے پر کام شروع کردو۔ اپنے التفات اور تحائف کی نرم و گرم پھوار سے اسے بھگودو۔ چھوٹے چھوٹے جذباتی تحفے عورت کے اندر طوفان برپا کردیتے ہیں، وہ ان پر جان دیتی ہے اور ایک عجیب بات...... وہ یہ کہ تحفے جس قدر غیر اہم ہوں گے......'' اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''اتنے ہی وہ عورتوں کو عزیز ہوں گے۔''

''مثلاً؟'' لارین نے سر کھجاتے ہوئے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''مثلاً خوبصورت چھوٹا سا رومال اور پرفیوم اس کی نذر کرو، پھر دیکھو کہ وہ کیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوکر نہیں رہ جاتی۔''

''رومال، پرفیوم!'' لارین نے زیر لب دہرایا جیسے یاد کر رہا ہو۔

جورن نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں عورت کی فطرت کے عین مطابق ہیں اور اس کے دل کے نرم اور حساس گوشوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ خود میں نے تمہاری آنٹی ربی کو ایک خوبصورت موزے کی جوڑی دے کر بالآخر خود کو قبول کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ بعد میں، میں نے اسے ایک ریشمی بیلٹ بھی دی تھی اور پھر ایک رومال...... وہ ان چیزوں کو دھلے ہوئے کپڑوں کے ساتھ لٹکاتی ہے تو یہ رنگ برنگی چیزیں عجیب بہار دکھاتی ہیں۔ اس نے ان میں سے کوئی بھی چیز کبھی استعمال نہیں کی مگر وہ پڑوسیوں کو دکھانے کی غرض سے انہیں الگنی پر لٹکاتی رہتی ہے۔''

لارین کے لیے یہ حیران کن انکشافات تھے۔ جورن کی بعض باتوں سے اسے عدم اعتماد کی بو آئی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ایسے شخص سے محتاط رہنا چاہیے جو گھر کی کشید کی ہوئی شراب میں بھی ملاوٹ کرنے سے باز نہ آئے۔

☆☆☆

لارین اور جورن گھر میں آئے تو لیزلی کافی تیار کیے ان کی منتظر تھی۔ جورن اسٹور میں سامان واپس رکھنے کی غرض سے گیا اور کمرے میں لارین اور لیزلی تنہا رہ گئے تو لارین نے موقع غنیمت جانتے ہوئے، اس معاملے میں لیزلی کی رائے جاننے کی کوشش کی۔

''فرض کرو۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ حماقت اور معصومیت برس رہی تھی۔ ''صرف فرض کرنا اچھا...... ایک لڑکا کسی لڑکی سے مراسم استوار کرنا چاہتا ہے، اس کی عزت نفس کو مجروح کیے بغیر اور نسوانی تقاضوں اور حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے تو...... کیا یہ مناسب ہوگا کہ اسے کچھ تحفے وغیرہ دیے جائیں؟'' آخری جملہ اس نے تیزی سے ادا کیا تھا۔

''یہ تو عام رواج ہے۔'' لیزلی نے پرخیال انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ اب تو یہ ضروری سمجھا جاتا ہے، بالخصوص جب لڑکی غیر معمولی طور پر حسین ہو۔''

''ہوں!'' لارین نے تفہیمی لہجے میں کہتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ انکل جورن ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔'' وہ جلدی سے اسٹور میں پہنچا اور وہاں رکھے ہوئے سامان کا جائزہ لیا۔ تمباکو کے چھوٹے ڈبے، اسکیٹنگ اسٹک کے جوڑے، موٹے اونی موزے اور اسی قسم کی دوسری اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ وہ دیر تک کھڑا سوچتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچ

کہ یہاں کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو انکل کے بقول بظاہر معمولی اور جذباتی تحفہ کہلا سکتی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے اس کی نگاہ سرخ رومالوں کے ایک ڈھیر پر پڑی جو غالباً جورن نے جمع کیے ہوں گے۔ لارسن نے بھویں سکیڑیں اور باورچی خانے کی طرف چل دیا جہاں لیزلی تازہ کافی کے ساتھ اس کی منتظر تھی۔

"فرض کرو۔" اس نے پرامید لہجے میں کہا۔ "کوئی آدمی ایک عورت کے پاس جائے اور اس سے براہ راست یہ کہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو یہ مناسب ہوگا؟ آدمی مشکل مراحل سے گزرے بغیر اپنا مقصد حاصل کرلے گا؟"

لیزلی نے نرمی سے کہا۔ "اگر کوئی شخص کسی لڑکی سے شادی کا خواہش مند ہو تو شادی سے قبل اسے لڑکی کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارنا چاہیے۔ اس طرح باہمی اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے اور مزاج ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ دوسرے، اس دوران میں دی جانے والی محبت کی چھوٹی چھوٹی نشانیاں لڑکی کو..... خاص طور سے نوعمر دوشیزہ کو سرشاری کی سی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہیں۔ میرے نزدیک اس بات کی بہت اہمیت ہے۔"

"ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے اٹھا اور بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ باہر آکر وہ اپنے فارم کی سمت چل دیا۔

ابھی لیزلی نے کافی کی پیالیاں پوری دھوئی بھی نہ تھیں کہ وہ واپس آگیا۔ اس کے کندھے سے ایک بنڈل لٹک رہا تھا۔ "اب تم مجھے اپنی بالکل بے لاگ رائے دینا۔" اس نے لیزلی سے کہا اور بنڈل فرش پر رکھ کر اسے کھولنا شروع کردیا۔ "اتنے مختصر سے نوٹس پر میں اس سے بہتر کوئی انتظام نہیں کرسکتا تھا۔ تم یہ بتاؤ کہ ہماری فرض کردہ وہ لڑکی اس قسم کے تحفے بہ طور نشانی قبول کرنے میں دلچسپی لے گی؟"

"یہ ہے کیا؟"

"برفانی ریچھ کی کھال۔" لارسن نے فخر سے اسے بتایا۔ "یہ بے حد قیمتی ہوتی ہے، اور میں نے ریچھ کو شوٹ کرنے میں خاصی احتیاط برتی تھی کہ گولی اس کی آنکھ میں لگے تاکہ کھال ضائع نہ ہو۔ اس سے بہت گرم اور شاندار اوور کوٹ تیار ہوسکتا ہے۔"

"یہ..... یہ واقعی بہت عمدہ تحفہ ہے۔" لیزلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مگر ہم اسے خالص نشانی یا یادگار کا نام نہیں دے سکتے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ تم کسی لڑکی کو سونا دے کر کہو کہ وہ تمہاری طرف سے اس کی انگوٹھی بنوا کر پہن لے۔"

"ہاں واقعی، یہ تو ہے۔" لارسن نے تسلیم کیا۔ "مگر اب اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں کہ میں قریبی قصبے کی مارکیٹ جاؤں اور وہاں دکانوں میں کوئی ڈھنگ کی چیز تلاش کروں۔"

"اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔" لیزلی نے اسے یاد دلایا۔ "کل رات برفانی طوفان کے نتیجے میں سڑک بند ہوگئی ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "میں پہاڑی شارٹ کٹ سے واقف ہوں۔"

لیزلی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "لارسن! دماغ تو ٹھیک ہے! پہاڑوں پر شدید برفانی ہوائیں چل رہی ہیں اور طوفان کی آمد آمد ہے۔ یہ بہت خطرناک ہوگا۔"

لارسن نے شانے اچکا کر ان چھوٹی موٹی پہاڑیوں اور کسی ضعیف کی پھونکوں جیسی ہواؤں کے بارے میں تحقیر آمیز الفاظ کہے اور قطب شمالی میں چلنے والے جھکڑوں کے بارے میں بتانے لگا جو لوہے کی سلاخوں کو موڑ دیں اور یخ بستہ اس قدر کہ تھوکا جائے تو لعاب چند لمحوں بعد جب زمین پر گرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زمین پر کوئی ٹھوس چیز گری ہو۔ وہ کافی دیر تک بولتا رہا اور اس دوران میں لیزلی اسے اس طرح دیکھتی رہی جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ "تم یقیناً شدید محبت میں گرفتار ہوچکے ہو۔" لیزلی نے اس کی باتیں ختم ہونے پر تبصرہ کیا۔ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ معاملہ صرف فرض کرنے کی حد تک نہیں ہے۔" لارسن نے کہا۔ "وہ آدمی جسے فرض کیا گیا ہے، میں ہوں اور لڑکی ماریا۔ میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔"

"لارسن! تم واقعی عاشق مزاج اور بہادر ہو!" لیزلی نے ستائش سے کہا۔

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔" لارسن برجستگی سے بولا۔ "میری ماں آئسلن تھی۔ میں نے اپنے خاندان میں دور تک ایسا کوئی دیکھا نہ سنا۔"

"اوہ، وحشی! تم نہیں سدھرو گے۔" لیزلی نے زچ ہوکر کہا۔ لارسن ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ "ارے، بات تو سنو!" لیزلی نے اسے پکارا وہ قریب آیا تو بولی۔ "دیکھو، تمہیں آج رات کھانے کے وقت سے پہلے واپس آجانا چاہیے پھر تم اپنا بہترین سوٹ پہننا اور تحفے کے ساتھ یونین آفس آنا۔ کسانوں کی یونین کے ڈنر کے بعد ڈانس کا پروگرام ہے اور تمہیں اس میں شامل ہونا ہے۔ ماریا وہیں ہوگی۔"

"مگر میں ٹھیک طرح ڈانس کرنا نہیں جانتا۔" لارسن نے احتجاج کیا۔ "ٹانگیں باندھنے سے تو میرا دم گھٹنے لگے گا اور میں محفل میں کھانستا ہی رہوں گا۔"

"کم ہمت اور بزدل لوگ اچھی لڑکی کبھی حاصل نہیں



کرسکتے۔" لیزلی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ لارسن خاموشی سے روانہ ہوگیا۔

"یہ معاملہ تو میری توقع سے کہیں زیادہ دشوار ثابت ہورہا ہے۔" لارسن نے اسکیٹنگ کرتے ہوئے سوچا۔ جھیل کی طرف مڑ کر اس نے دوبارہ جورن کے فارم کی جانب دیکھا۔ دروازے میں ایک سایہ کھڑا اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور جھیل کے کنارے اوپر کی جانب چڑھنا شروع کردیا۔ یہ اس وادی کا اور لارسن کے مسکن کا مشکل اور بلند ترین حصہ تھا۔

☆☆☆

قصبے تک پہنچنے کا یہ نسبتاً مختصر راستہ تھا۔ لارسن نے اس سے پہلے اس دشوار گزار راستے پر دو ایک مرتبہ ہی سفر کیا تھا اور وہ بھی موسم گرما میں۔ اس سردی کے موسم میں تو کوئی بھی یہ راستہ استعمال کرنے کے متعلق نہیں سوچ سکتا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ میں ریکارڈ قائم کردوں گا۔" اس نے چڑھائی کا سفر شروع کرتے ہوئے سوچا۔ برفیلے راستے پر پھسلتے ہوئے وہ جلد ہی ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں تیز ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اپنی ہمت بندھاتا وہ سفر طے کرتا رہا۔ وادی اس کے پیچھے اب آہستہ آہستہ کھائی میں تبدیل ہوتی جارہی تھی۔ اوپر سر اٹھائے پہاڑ کی سفید چوٹی تھی جو آسمان سے باتیں کرتی محسوس ہورہی تھی۔ یہ اس کے سیدھے ہاتھ کی طرف اس چوٹی کی پہلی منزل تھی جو اس سے پانچ سو فٹ مزید بلند تھی۔ اس کے بعد لارسن کو وہی عبور کرنا تھی۔ پہلی چوٹی تک پہنچنے میں اسے ایک گھنٹا لگا۔ اب ہواؤں کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا اور ڈھلوان تک پہنچنے سے پہلے اس نے اپنے موٹے گرم کوٹ کے کالر کھڑے کرلیے اور ٹوپی کو کان سے نیچے تک کھینچ لیا۔ ڈھلوان طے ہوتے ہوتے دوپہر ہوگئی اور اس کے اختتام پر اس نے رک کر لیزلی کے دیے ہوئے سینڈوچ کھائے، تھرماس میں سے کافی پی، ایک سگریٹ سلگا کر چند کش لیے اور کچھ دیر بعد پھر سے سفر شروع کردیا۔

☆☆☆

جب وہ وادی میں واپس پہنچا تو رات ہوچکی تھی۔ اپنے گھر پہنچ کر اس نے آدھا گھنٹا خود پر صرف کیا۔ شیو کیا، غسل کرکے کپڑے بدلے اور پھر اسکیٹنگ کرتا یونین آفس کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کی کالی پتلون کے پائنچے موزوں میں اڑسے ہوئے تھے اور جوتے ایک بنڈل کے ساتھ کندھے سے لٹکے ہوئے تھے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت تقریباً ڈنر بج رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت تک کھانا ختم ہوچکا ہوگا، ہال سے میزیں ہٹا کر اسے رقص کے لیے تیار کیا جارہا ہوگا اور نوجوان جوڑے وہاں پہنچنا شروع ہوگئے ہوں گے۔ برآمدے کے تاریک گوشے میں پہنچ کر وہ رکا، اپنا حلیہ مزید درست کیا۔ اسی وقت ایک سفید سراپا ایک طرف سے نکل کر اس کی جانب بڑھا۔

"لارسن! یہ تم ہی ہو نا؟ خدا کا شکر ہے۔" لیزلی نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ "تم نے تو ہماری آدھی جان نکال دی تھی۔ معلوم ہے، میں..... ہم کتنے پریشان ہوتے رہے تمہارے لیے!"

"خوامخواہ پریشان ہوئے تم لوگ۔" لارسن نے چہکتے ہوئے کہا۔ "ہم جیسوں کو اتنی آسانی سے موت نہیں آتی۔ ہماری تو ساری زندگی ہی پہاڑوں اور برف میں گزری ہے۔ یہ لو۔" اس نے اسکیٹنگ کے جوتے اور بنڈل لیزلی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم ذرا میرے اس سامان کا خیال رکھنا۔"

لیزلی نے اس کے ہاتھ سے وہ چیزیں لے لیں۔ اس کی آنکھیں لارسن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "وہ اندر ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"شکریہ۔" لارسن نے یہ کہتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپایا اور روشنی کی جانب بڑھا۔

جورن کی گھر کی کشید کردہ شراب اپنی توبہ شکن اداؤں اور دوران خون کو تیز کردینے والے سنگار کے ساتھ ایک نشست پر جلوہ افروز تھی۔ سفید بلاؤز اور کالی اسکرٹ میں اس کا حسن اور بھی غضب ڈھا رہا تھا۔ لارسن کو دیکھ کر اس نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

"ہیلو!" لارسن نے اس کے نزدیک پہنچ کر خوش دلی سے کہا اور اس کے برابر والی نشست میں دھنس گیا۔ "بہت سہانی رات ہے۔"

"بہت خراب رات ہے، نفرت انگیز!" ماریا نے کہا۔ اس کی آواز غیر متوقع طور پر بہت تیکھی تھی۔ "آخر تم نے میری خاطر ایسا کیا کیسے؟"

"کیا ہوا؟" لارسن نے حیرت کے شدید جھٹکے سے دوچار ہوتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ اتنی شدید اور طوفانی ہواؤں میں پہاڑوں کے اس پار گئے اور کیا....." ماریا نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ "ڈیڈی یہاں ہر ایک کو بتاتے پھر رہے ہیں اور میں خود کو دنیا کی احمق ترین ہستی سمجھ رہی ہوں۔ فرض کرو، اگر تم مر مرا جاتے تو میں بھی اپنا سر اٹھانے کے قابل نہ رہتی۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے۔" لارسن نے اس کی تائید کی اور کھڑے ہوکر اپنی کزن کا بازو تھاما اور ڈانسنگ فلور کی طرف

بڑھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس طرح کی خاندانی محبتیں مجھے احساس تفاخر عطا کرتی ہیں.....“

ماریا کے ہونٹوں پر اچانک ہی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اس نے ایک ادائے دلبری سے لارن کی جانب دیکھا اور اس کی بانہوں میں سما گئی۔ دوران رقص اس نے سرگوشی کی۔ ”تمہیں معلوم ہے وحشی شکاری، کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔“

”یہی بہتر ہے۔“ لارن نے اسے ایک طرف گھماتے ہوئے کہا۔ رقص کا یہ دور بہت مختصر تھا۔ اسی وقت البرٹ اپنے چند دوستوں کے ساتھ وہاں آپہنچا۔ وہ تیزی سے لارن کے نزدیک آیا اور ایک بھرپور گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔

”کسی محو رقص شخص کے ساتھ یہ سلوک ہرگز ہرگز مناسب نہیں۔“ لارن اس غیر متوقع حملے کے نتیجے میں زمین بوس ہوگیا تھا، وہیں پڑے پڑے شکایت آمیز لہجے میں بولا۔

البرٹ نے دانت پیسے اور آگے قدم بڑھا کر کہا۔ ”اٹھ کھڑا ہو۔“ وہ اپنے مکے باکسنگ کے انداز میں ہلا رہا تھا۔ ”اٹھ اور مرد کی طرح مقابلہ کر۔“

”ڈیڈی! پلیز، انہیں روکیں۔“ ماریا نے دخل اندازی کی اور جورن کا بازو تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔

”نہیں بھئی، میں کچھ نہیں بولوں گا۔“ جورن اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لارن کھڑا ہوگیا اور تصور میں اس دیو قامت بلا کو سبق سکھانے لگا۔ وہ خیالوں میں اس کے سر پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ اچانک یہ تمام خیالات جیسے بھاپ بن کر اڑ گئے اور اس نے اپنے دکھتے ہوئے جبڑے کو سہلاتے ہوئے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ اس کے اردگرد کھڑے لوگوں کے چہروں پر شدید حیرت کے آثار تھے۔ معاً لارن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن وہ زیادہ ہنسنے کی وجہ سے تھے۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے جورن کے ہاتھ سے جام لیا اور تازہ ہوا کے لیے ایک طرف چل دیا۔ وہ اس کمرے سے متصل ایک بالکونی میں گیا تو نیم تاریکی میں اسے سفید لباس کی جھلک نظر آئی۔ وہ لیزلی تھی جو وہاں کھڑی خالی خالی نظروں سے آسمان کو تک رہی تھی۔

”جو کچھ ہوا وہ سب میں نے دیکھا۔“ لیزلی نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا اور ذرا ہٹ کر جنگلے پر اس کے لیے جگہ خالی کی۔ ”مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔“

”حالانکہ ہونا نہیں چاہیے۔“ لارن نے کشادہ دلی سے کہا۔ ”ایسے لڑکوں کے لیے یہ اچھا سبق ہے جو اس قسم کی شوخ و چنچل لڑکیوں سے شادی کرنے کی خواہش دل میں رکھتے ہیں۔“

”لیکن میرا خیال ہے.....“ لیزلی نے کچھ کہنا چاہا مگر لارن نے اسے روک دیا اور اس سے اپنا بنڈل لے لیا جو وہ لیے کھڑی تھی۔ اس نے پیکٹ کھولا اور گتے کا ایک ڈبا اپنی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

”یہ..... یہ حقیر سا نذرانہ تمہارے لیے ہے۔“ اس نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

”م..... میرے لیے!“ لیزلی نے حیرت سے کہا۔

”ارے لڑکی!“ لارن نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ ”میں نے بہت کٹھن دن گزارا ہے۔ میں خطرناک پہاڑی راستے پر گیا اور آیا، عورتوں کی چیزوں کی دکان میں اذیت ناک دن گزارا، اپنے جبڑے پر ایک دیوانے نوجوان کا گھونسا برداشت کیا اور پھر قمیص پرانی باندھے یہاں موجود ہوں۔“

”لیکن لارن.....“

”مجھے بات ختم کر لینے دو۔“ لارن نے کہا اور ڈبا کھول کر اس میں رکھی ہوئی اشیا نکالنا شروع کیں۔ پہلے اس نے ایک نہایت خوبصورت ریشمی رومال نکالا۔ اس کے بعد اونی موزوں کی نازک سی جوڑی۔ یہ دونوں چیزیں اس نے لیزلی کو دکھا کر ایک طرف رکھ دیں اور اسے بازو سے پکڑ کر آہستگی سے اپنے نزدیک کر لیا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تعلقات کی ابتدا کے لیے مجھے ضرور کوئی تحفہ دینا چاہیے، وہ میں دے رہا ہوں۔“ اس نے ڈبے میں سے آخری چیز نکالی جو ایک بیش قیمت بیلٹ تھی۔ اس کے بکل پر کیوپڈ کا نقش ابھرا ہوا تھا جو ہاتھ میں سنہرا تیر لیے ہوئے تھا۔ اس نے نہایت محبت اور نرمی سے لیزلی کو قریب کیا پھر بیلٹ اس کی کمر کے گرد باندھ دی۔ لیزلی کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ ”اب تم ایمانداری سے بتاؤ کہ میرا کوئی چانس ہے یا نہیں؟“

”لارن! تم بہت..... بہت خراب ہو۔“ وہ ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

”پتا ہے، ان کے پاس جو سب سے بڑا سائز تھا، میں وہی اٹھا لایا۔“ لارن نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ”اس میں محبت کی گرمی ہے جو صرف تمہاری کمر کو ہی نہیں، تمام وجود کو حرارت بخشتی رہے گی۔“

اگلے چند منٹوں میں جو کچھ ہوا، اس کے نتیجے میں لارن نے انکل جورن کے لیے اپنے دل میں بے پناہ احترام محسوس کیا۔ اب وہ انکل جورن کے نظریات کو کسی بھی معاملے میں سند سمجھتا تھا۔

# حضرت الیسع علیہ السلام

رضوانہ ساجد

ہر تاریک دور کی طرح اس زمانے میں بھی بت پرستی کو عروج حاصل تھا۔ اگرچہ کچھ لوگ حضرت موسیٰؑ کی شریعت پر عمل پیرا تھے مگر گمراہی کا اندھیرا اس قدر پھیل چکا تھا کہ اس دور کے نبی حضرت الیاسؑ کو حکم الٰہی ہوا کہ ”قوم کو گمراہی سے نکالیں“۔ ان دنوں آپ کے نقش قدم پر چلنے والے حضرت الیسعؑ آپ کے ساتھ رہ کر دن رات تربیت کے مراحل سے گزر رہے تھے... حضرت موسیٰ کی طرح دریا میں راستہ بنانے کا معجزہ حضرت الیاس کے حصے میں بھی آیا اور آپ کے بعد حضرت الیسع کو وہ تمام خصوصیات ودیعت ہوئیں جو آپ سے پہلے نبی کے پاس تھیں۔

## قدم قدم پر تائید ایزدی پانے والے نبی کے ماہ و سال کا احوال

آپؑ جلجال پہنچے تو دریا کے کنارے، پر فضا یہ شہر خشک، ویران اور بنجر دکھائی دے رہا تھا۔ درخت اپنی چھال تک سے محروم تھے۔ معلوم ہوا ٹڈیوں کے غول نے اس شہر پر حملہ کیا اور منٹوں میں کھیتوں کو چٹ کر گئیں۔ جس پیڑ پر بیٹھیں اس کی چھال اور پتے کھا گئیں۔ اب یہاں کے لوگوں کے لیے کھانے کو کچھ بھی نہیں۔ لوگ بے حد کمزور اور مایوس نظر آ رہے تھے۔ گھاس تک کا نام و نشان نہیں تھا کہ جانوروں کی تو بھوک مٹ جاتی۔

آپؑ نے جلجال کے طالب علموں کو حکم دیا کہ وہ جنگل میں جائیں اور جنگلی لوبیا اور دوسری چیزیں جو کھانے کے قابل ہوں جلد

لے کر آئیں۔

جتنی دیر میں وہ آئے آپؑ نے لکڑیاں جمع کر کے دیگ چڑھا دی۔

طالب علم جنگل میں چاروں طرف پھیل گئے۔ ایک طالب علم اس طرف چلا گیا جہاں اندرائن کے بہت سے درخت لگے ہوئے تھے اور ان میں پھل بھی تھے۔ یہ پھل زہریلے ہوتے ہیں مگر وہ ان سے ناواقف تھا۔ اس نے وہ پھل توڑ لیے۔

جب یہ طالب علم واپس آئے تو اپنے ساتھ لائی ہوئی ترکاریاں دیگ میں انڈیل دیں۔ اندرائن کے پھل بھی دیگ میں ڈال دیے۔ کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ وہ کیا ڈال رہا ہے۔

کھانا کیا ایک قسم کی پسی تیار ہو گئی جسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا جا سکتا تھا۔ وقتِ بھوک مٹانے کے لیے یہی بہت تھا۔ لوگ بھوکے تو تھے ہی فوراً ٹوٹ پڑے لیکن ایک گھونٹ کے بعد ہی تھوکنے پر مجبور ہو گئے۔

''اے مردِ خدا! یہ تو ہمیں کیا کھلا رہا ہے۔ اس میں تو زہر ہے۔''

''میں نے تو وہی کچھ پکایا ہے جو تم لوگ لائے تھے۔''

''تم نے جان بوجھ کر اس میں کوئی ایسی چیز ملا دی ہے کہ ہم سب مر جائیں۔''

اس شہر میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو حضرت المسیع علیہ السلام کے خلاف تھے اور ان کو کہنے کا موقع مل گیا۔ کچھ لوگ اور بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

آپؑ نے نہایت تحمل سے سب کی باتیں سنیں اور ایک شخص سے کہا۔ ''ایک مٹھی آٹا کہیں سے لے آؤ تاکہ اس کھانے کو میں کھانے کے قابل بنا دوں۔'' وہ دوڑ کر مٹھی بھر آٹا لے آیا۔ آپؑ نے اس آٹے کو دیگ میں ڈال کر ایک لکڑی سے ہلایا۔

''اب یہ دیگ کھانے کے قابل ہو گئی ہے۔ تم اسے کھاتے رہو۔''

جن لوگوں کو حضرت المسیع علیہ السلام پر اعتبار تھا، انہوں نے فوراً ہاتھ بڑھا دیا۔ انہوں نے ایسی مزے دار پسی اس سے پہلے نہیں کھائی تھی۔ انہوں نے تعریف کی تو دوسرے لوگوں نے بھی اپنی بھوک مٹائی۔ تمام لوگ کھا چکے تو بھی دیگ اسی طرح بھری ہوئی تھی۔

''جب تک قحط کا زمانہ ہے تم اس میں سے کھاتے رہنا۔''

لوگوں کو یقین تھا کہ حضرت المسیع علیہ السلام نے جیسا کہا ہے ویسا ہی ہو گا اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ صبح شام اسی دیگ سے لنگر جاری تھا اور ہر روز اس کھانے کا ذائقہ دوسرا ہو جاتا تھا۔ چند ہی روز میں بھوک سے بے حال چہرے پہلے سے بھی زیادہ شاداب ہو گئے۔

اب آپؑ کے یہاں رہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ آپؑ رخصت ہونے لگے تو لوگوں کا ایک گروہ آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے سابقہ عقائد سے توبہ کی۔

''ہمیں ابھی تک بعل دیوتا پر ایمان تھا لیکن ہم نے دیکھا کہ بعل اپنے مندر سے نکل کر ہماری مدد کو نہیں آیا۔ آپؑ کا خداوند سچا ہے کہ اس کی مدد ہمیں ملی۔ آج کے بعد سے ہم بعل سے نفرت اور خدا سے محبت کریں گے۔''

☆☆☆

شاہ ارام کے لشکر کا سردار نعمان، بادشاہ کے نزدیک نہایت معزز تھا اس لیے کہ بادشاہ کو تمام فتوحات اسی سردار کی بدولت ملی تھیں۔ کچھ دنوں سے وہ کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کوڑھ کے منحوس نشان اس کے بدن پر نمایاں ہونے لگے تھے لیکن چونکہ ابھی جسم کے پوشیدہ حصوں میں تھے اس لیے اس کا مرض سب پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ شاید بادشاہ کو بھی علم نہ ہوتا لیکن ایک روز اس نے نعمان کی بیوی اور اس کی اسرائیلی لونڈی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی۔

یہ لونڈی نعمان کی بیوی سے کہہ رہی تھی۔ ''کاش میرا آقا اس نبی کے پاس ہوتا جو سامریہ میں ہے تو وہ نبی ایسا ہے جو اسے کوڑھ سے شفا دیتا۔''

''تو کس نبی کی بات کر رہی ہے۔ ہم نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا۔''

''میں المسیع نبی کی بات کر رہی ہوں جو آئے دن معجزے دکھاتا رہتا ہے۔ اس کی دعا میں بڑا اثر ہے۔''

''کہتی ہے تو وہ ایسا ہی ہو گا لیکن اسرائیل سے تو ہماری دشمنی رہتی ہے۔ نعمان وہاں کیسے جا سکتا ہے؟'' نعمان کی بیوی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

بادشاہ نے یہ گفتگو سنی اور اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ نعمان کو کوڑھ ہو گیا ہے۔ نعمان اسے بہت عزیز تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ



سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اسرائیلی لونڈی کو اپنے پاس بلایا اور پوری تفصیل معلوم کر لی۔ پھر نعمان کو بلایا اور اسے بتایا کہ وہ سب کچھ جان گیا ہے۔

''تو فکر مت کر، ہر چند کہ اسرائیلیوں سے ہمارے تعلقات اچھے نہیں ہیں لیکن تیری جان بچانے کے لیے دشمن کو بھی گلے لگا لوں گا۔ میں یورام کے نام خط لکھ کر تجھے دے رہا ہوں۔ تو فوراً سامریہ کی طرف روانہ ہو جا اور یہ خط یورام تک پہنچا دے۔''

نعمان سپہ سالار تھا۔ وہ پورے کروفر کے ساتھ سپاہیوں کے ایک دستے کو لے کر سامریہ کے پھاٹک پر جا ٹھہرا ہوا۔ شہر کے باہر خیموں کا بازار لگا دیا اور خود بادشاہ یورام سے ملنے شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ شاہی محل میں یورام سے ملا اور اپنے بادشاہ کا خط اس کے حوالے کیا۔ بادشاہ نے اسے مہمان خانے پہنچا دیا اور خود شاہ ارام کی طرف سے بھیجے گئے خط کو پڑھنے لگا۔

خط میں لکھا تھا۔ ''یہ نامہ جب تجھ کو ملے تو جان لینا کہ میں نے اپنے خادم نعمان کو تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ تو اس کے کوڑھ سے اسے شفا دے۔''

یورام کے درباریوں نے دیکھا کہ یورام چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ ''کیا میں خدا ہوں کہ ماروں اور جلاؤں جو یہ شخص ایک آدمی کو میرے پاس بھیجتا ہے کہ میں اس کو کوڑھ سے شفا دوں۔''

اس نے عالمِ پریشانی میں اپنی قبا چاک کر لی۔ ''یہ کچھ اور نہیں۔ شاہ ارام مجھ سے لڑائی کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ میں چاہوں تو اس کے سردار لشکر کو اپنے محل میں قید کر لوں مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ قاصد کے روپ میں آیا ہے۔ ہماری یہ روایت نہیں کہ ہم قاصد کو گرفتار کر لیں۔''

اس نے اسی وقت اپنے وزیروں اور مشیروں کا اجلاس طلب کر لیا اور ان سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ سب کی رائے یہی تھی کہ نعمان کو واپس بھیج دیا جائے۔ شاہ ارام کو ایک خط اس مضمون کا بھیجا جائے کہ شاہ اسرائیل بادشاہ ہے خدا نہیں۔ اور جنگ کی تیاری کی جائے کیونکہ شاہ ارام کی نیت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔

ابھی یہ اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ کسی نے حضرت المسیع علیہ السلام کے آنے کی اطلاع دی۔ بادشاہ نے حضرت المسیع علیہ السلام کا نام سنا تو اسے خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے اس جنگ کے بارے میں حضرت المسیع علیہ السلام نے کوئی پیغام بھیجا ہو، اس نے خادم کو فوراً بلا لیا۔

''میرے آقا نے کہلوایا ہے کہ اے بادشاہ! تو نے اپنے کپڑے کیوں پھاڑے۔ تو اسے میرے پاس آنے دے۔ وہ جان لے گا کہ اسرائیل میں ایک نبی ہے۔''

یورام کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے ہی حضرت المسیع علیہ السلام کو کیوں نہیں بلا بھیجا تھا۔ شاید وہ اپنے معجزے سے نعمان کے کوڑھ کا علاج کر دیں۔

بادشاہ نے اسے پورے اعزاز کے ساتھ حضرت المسیع علیہ السلام کی قیام گاہ کی طرف بھیج دیا۔ گھوڑوں اور رتھوں کا قافلہ حضرت المسیع علیہ السلام کے دروازے پر پہنچ گیا۔

نعمان تو وہ تھا کہ اطلاع ملتے ہی شاہی محل کے دروازے اس پر کھل گئے تھے لیکن یہاں اس کی اطلاع پر حضرت المسیع علیہ السلام کا خادم باہر نکلا۔

''آقا کہتے ہیں جا اور یردن میں سات بار غوطہ مار تو تیرا جسم پھر سے بحال ہو جائے گا اور تو پاک صاف ہو گا۔''

اپنے اعزاز اور مرتبے کو دیکھتے ہوئے نعمان کو یہ پیغام بہت ناگوار ہوا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ حضرت المسیع علیہ السلام باہر نکلیں گے، اس کا استقبال کریں گے اور کھڑے ہو کر خدا سے دعا کریں گے اور میرے زخموں پر ہاتھ رکھیں گے۔ حضرت المسیع علیہ السلام کی بے توجہی پر اسے غصہ آ گیا۔

''میں ارامی لشکر کا سردار ہوں۔ بادشاہ اسرائیل تک میرا احترام کرتا ہے۔ حضرت المسیع علیہ السلام نے باہر نکل کر میرا استقبال بھی نہیں کیا۔'' اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔

''حضور، اس وقت وہ عبادت میں مشغول ہوں گے۔ انہوں نے جو کہا ہے اس پر عمل کر کے دیکھ لیں۔''

''کیا دمشق کے دریا ابانہ اور فرفر اسرائیل کی سب ندیوں سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ کیا میں ان ندیوں میں نہا کر پاک صاف نہیں ہو سکتا جو وہ مجھے یردن میں غوطے مارنے کا حکم دے رہے ہیں۔''

اس کے آدمیوں نے پھر اسے سمجھایا۔ ''اے ہمارے باپ! اگر وہ نبی کوئی بڑا کام کرنے کا حکم تجھے دیتا تو کیا تو اسے نہ کرتا۔ یہ تو معمولی سا کام ہے۔ یہ تجھے کر لینا چاہیے۔''

وہ ارام جانے کے لیے مڑ چکا تھا لیکن اپنے خدمت گاروں کے سمجھانے پر دریائے یردن (اردن) پر چلا گیا اور حضرت الیسع علیہ السلام کے کہنے کے مطابق سات مرتبہ اپنے جسم کو دریا میں بھگویا اور دریا سے باہر نکل آیا۔ قریب ہی اس کا خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ وہ خیمے میں چلا گیا اور اثر دیکھنے کے لیے شب بھر ٹھہرا رہا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے گھبرا کر اپنے جسم کو ٹٹولا۔ کسی زخم کا نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی دوا لگائے بغیر کس طرح شفا مل سکتی ہے۔ اسے جب اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا تو اس نے ایک خدمت گار کو بلایا۔

''میرے بدن کو دیکھنا۔ تمہیں کوئی نشان نظر آ رہا ہے؟''

''مبارک ہو، آپ کو تو صحت مل چکی ہے۔ اس پانی میں تو جادو ہے۔''

''جادو پانی میں نہیں ہے۔ جادو تو اس نبی کی دعا میں ہے۔ میں سمجھ رہا تھا اس نے مجھے ٹال دیا ہے مگر اس نے تو واقعی میرا علاج کر دیا ہے۔ اب مجھ پر لازم ہو گیا ہے کہ میں اس مردِ خدا کے پاس جاؤں اور اس کا شکریہ ادا کروں۔''

وہ اپنے رتھ پر سوار ہوا اور ایک مرتبہ پھر حضرت الیسع علیہ السلام کے دروازے پر آ گیا اور آپؑ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس مرتبہ اسے باریابی کی اجازت مل گئی۔

وہ اندر داخل ہوا اور حضرت الیسع علیہ السلام کے سامنے پہنچا تو اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ''میں نے جان لیا کہ آپؑ سچے نبی ہیں لہٰذا کرم فرما کر اپنے خادم کا ہدیہ قبول کیجیے۔''

''کیسا ہدیہ!''

''دس قنطار چاندی اور چھ ہزار مثقال سونا اور دس جوڑے کپڑے آپ کی نذر کے لیے لایا تھا۔''

''خداوند کی حیات کی قسم جس کے آگے میں کھڑا ہوں، میں کچھ نہیں لوں گا۔''

''آپؑ نہ لیں مگر مجھے دینے تو دیں۔ میری خوشی اسی میں ہو گی کہ آپ اسے قبول کریں۔''

''میں نے کہہ دیا کہ میں تجھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ اگر دینا ہی ہے تو یہ وعدہ دے کر توبت پرستی چھوڑ دے گا۔''

''میں آپؑ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ خداوند کے سوا کسی غیر معبود کے حضور نہ تو سوختنی قربانی کروں گا نہ ذبیحہ چڑھاؤں گا اور دوسروں کو تلقین کروں گا لیکن ایک بات کے لیے آپؑ مجھے معاف کر دیں کہ جب میرا بادشاہ پرستش کے لیے رمون کے مندر میں جائے اور مجھے ساتھ لے جائے اور میں اس کی خوشنودی کے لیے رمون کے آگے سر جھکا دوں تو میں مجبور ہوں گا۔''

''جا اور سلامتی کے ساتھ جا۔''

نعمان نے ایک مرتبہ پھر ہدیہ قبول کرنے کے لیے اصرار کیا لیکن آپؑ نے ایک مرتبہ پھر سختی سے انکار کر دیا۔ نعمان نے رخصت کا سلام پیش کیا اور باہر نکل گیا۔

وہ بہ مشکل شہر کے پھاٹک سے باہر نکلا ہو گا کہ اس کے آدمیوں نے اسے باخبر کیا کہ کوئی ہے جو رتھ کے پیچھے دوڑا آ رہا ہے اور ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ نعمان نے رتھ بان سے کہا، وہ گھوڑوں کی لگام کھینچ لے۔ دیکھا تو حضرت الیسع علیہ السلام کا خادم جیحازی تھا۔ دوڑ کر آنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔

''خیر تو ہے۔'' نعمان نے پوچھا۔ ''میں نے تمہیں حضرت الیسع علیہ السلام نبی کے پاس دیکھا تھا، تم تو ان کے خادم ہو۔''

''میں نبی کا خادم ہوں۔ میرا نام جیحازی ہے۔''

''اس طرح بھاگے ہوئے کیوں آ رہے ہو۔ کیا کام ہے مجھ سے؟''

''میرے نبی نے مجھے یہ کہنے کو بھیجا ہے کہ انبیا زادوں میں سے ابھی دو جوان افرائیم کے کوہستانی ملک سے میرے پاس آئے ہیں سو ذرا ایک قنطار چاندی اور دو جوڑے کپڑے ان کے لیے دیدے۔''

''میں نے تو پہلے ہی ہدیہ دینا چاہا تھا مگر تیرے آقا نے انکار کر دیا تھا بہرحال اب تو آیا ہے تو خوشی سے دو قنطار لے۔''

نعمان نے دو قنطار چاندی تھیلیوں میں باندھی اور دو جوڑے کپڑوں سمیت ان کو اپنے دو نوکروں پر لادا اور جیحازی کے ساتھ کر دیا۔ جیحازی نے یہ ساری چیزیں باغ کے اس برج میں چھپا دیں جس میں وہ سویا کرتا تھا۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد وہ حضرت الیسع علیہ السلام کے پاس آیا۔



''جیحازی تو اتنی دیر سے کہاں تھا؟''

''میں تو کہیں نہیں گیا، یہیں تھا۔''

''افسوس کہ تو نے میرے نام پر کسی کو دھوکا دیا اور اب جھوٹ بول رہا ہے۔ کیا تو نعمان کے پیچھے نہیں دوڑا تھا؟ کیا تو اس سے چاندی اور کپڑے لے کر نہیں آ رہا ہے؟''

اب جیحازی کے سامنے بچاؤ کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ اس نے آپؑ کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''مجھے معاف کر دیں۔ میں لالچ میں اندھا ہو گیا تھا۔''

''جیحازی تو میرے پاس اس وقت سے ملازم ہے جب ہم دونوں کم عمر لڑکے ہوا کرتے تھے۔ اس لیے مجھے تجھ سے محبت بھی بہت ہے۔ تو میرے کرب کو میرے چہرے پر دیکھ رہا ہو گا لیکن کیا کروں حق دار کو حق دینا میرا شیوہ ہے۔ تیرا حق یہ ہے کہ تجھے سزا ملے۔ اگر میں تجھے چھوڑ دوں تو لوگ یہی کہیں گے کہ تو میرا اپنا تھا اس لیے تیری طرفداری کی۔ اس لیے نعمان کا کوڑھ تجھے اور تیری نسل کو سدا لگا رہے گا۔''

جیحازی نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ کوڑھ کے نشانات ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر باہر کی طرف بھاگا۔ اس دن کے بعد سے اسے کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کدھر چلا گیا۔

☆☆☆

حضرت الیسع علیہ السلام کے معجزے اور ان کی شہرت دور دور تک ہو رہی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آپؑ کے حامیوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ نعمان کو اس کے کوڑھ سے نجات ملی تو آپؑ کی شہرت اسرائیل سے نکل کر ارام تک پہنچ گئی۔

ملک میں آپؑ کا حلقۂ اثر اس تیزی سے بڑھ رہا تھا کہ کبھی کبھی یورام سوچنے لگتا تھا کہ اس نے انہیں ڈھیل دے کر شاید غلطی کی لیکن وہ خود آپؑ کے اتنے معجزے دیکھ چکا تھا کہ آپؑ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا تھا۔

ملک کے نوجوان طبقے میں آپؑ کے نظریات کو ایسی مقبولیت حاصل ہو رہی تھی کہ آپؑ کے شاگردوں میں بے حد اضافہ ہو رہا تھا۔ ملاقاتیوں کی اتنی بھیڑ رہنے لگی کہ آپؑ کی قیام گاہ تنگ ہو گئی اور حجروں کی تعداد کم پڑنے لگی۔ اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ عمارت میں توسیع ہو۔

انبیا زادوں میں سے کچھ آپؑ کے پاس آئے اور یوں کہنے لگے۔ ''یہ گھر اب تنگ ہو گیا ہے۔ اسی لیے ہم نئی درس گاہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ آپؑ اجازت دیں تو ہم دریائے یردن کے کنارے کھڑے جنگلات سے لکڑی کاٹ کر لے آئیں۔''

''چلے جانا۔ ایسی جلدی کیا ہے۔''

''ہم چاہتے ہیں یہ کام بارش شروع ہونے سے پہلے ہو جائے۔''

''میری طرف سے اجازت ہے۔ تم جب چاہو اس کام کے لیے جا سکتے ہو۔''

''آپؑ بھی ہمارے ساتھ چلیں تو کام جلدی ہو گا اور وقت ضائع نہیں ہو گا۔ ہم کام کرتے رہیں گے اور آپؑ ہمیں تعلیم دیتے رہیے گا۔''

''چلو اس شرط پر تو چلنے کو تیار ہوں کہ ہمارا درس جاری رہے گا۔ تم لوگ چلنے کی تیاری کرو۔''

اگلے چند دن اس مہم پر روانگی کی تیاری میں گزرے۔ آخر ایک صبح طلوعِ آفتاب سے پہلے یہ کارواں یردن کی طرف رواں دواں ہو گیا۔ اس قافلے میں بیل گاڑیاں بھی تھیں۔ اس وقت تو یہ تقریباً خالی تھیں اور صرف کلہاڑے اور آرے وغیرہ رکھے تھے لیکن واپسی میں انہیں بہت کام آنا تھا۔ واپسی پر ساری لکڑی ان بیل گاڑیوں پر لاد کر لانی تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ پہاڑی پر جانے والی سڑکوں پر ہوا خشک اور گرم تھی۔ جیسے جیسے دن چڑھنے لگا گرمی کی شدت میں بھی اضافہ ہونے لگا لیکن پرجوش نوجوان گرمی سے بے نیاز زور گاتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے اور پھر ایک مناسب جگہ پہنچ کر لکڑی کاٹنے کا کام شروع کر دیا۔

کام کا تیسرا دن تھا کہ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ہاں، اسے حادثہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ ایک طالب علم کی کلہاڑی کا اگلا سرا یعنی لوہے والا حصہ دستے سے نکل کر نیچے دریا میں گر پڑا۔ شڑاپ سے آواز آئی اور پھر سناٹا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ ایک کلہاڑی ہی تو تھی۔'' کسی طالب علم نے کہا۔

''وہ صرف کلہاڑی نہیں تھی۔ میں اسے ہمسائے سے مانگ کر لایا تھا۔ اب میں اسے کیا واپس کروں گا۔''

"جب کسی کی امانت تھی تو اسے واپس آنا چاہیے۔" حضرت الیسع علیہ السلام نے کہا۔ "لکڑی کی ایک شاخ لے کر میرے پاس آؤ۔" وہ لڑکا ایک لکڑی لے کر آپؑ کے پاس آگیا۔ آپؑ اس کے ساتھ کنارے پر گئے۔ "کچھ یاد ہے کلہاڑی کس جگہ گری تھی؟"

اس لڑکے نے نشاندہی کی۔ آپؑ نے لکڑی کی شاخ اس طرف پھینکی۔ یہ دیکھ کر سب خوشی سے تالیاں بجانے لگے کہ لکڑی پھینکتے ہی کلہاڑی کا پھل پانی کے اوپر آگیا۔ لوہے کو پانی پر تیرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا اور پھر یہ بھی نہیں دیکھا ہوگا کہ تیرتا ہوا کنارے تک آگیا ہو۔

"اب تم اسے لکڑی کے دستے میں لگا لو۔ کام تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ واپس جا کر جس کا ہے اسے دے دینا۔"

واپس آکر نئے حجروں کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ کئی مہینے کی محنت کے بعد اتنی تعداد میں حجرے قائم ہوگئے کہ دوسرے شہروں سے آنے والے زائرین بہ سہولت یہاں ٹھہرنے لگے۔

بادشاہ کی نظروں میں حضرت الیسع علیہ السلام کی عزت روز بہ روز بڑھتی جارہی تھی کیونکہ آپؑ کے مشوروں سے کئی مرتبہ اس کی جان بچی تھی۔

شاہ ارام اور شاہ اسرائیل کے درمیان جنگوں اور جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے یہ ہونے لگا تھا کہ شاہ ارام، یورام کے خلاف جو بھی قدم اٹھاتا تھا، یورام کو پہلے سے اس کا علم ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ شاہ ارام نے یورام کو شکار کے دوران قتل کرانا چاہا لیکن یورام بچ نکلا۔

ان پے در پے واقعات نے شاہ ارام کو شک میں مبتلا کر دیا۔ اسے یہ شک ہونے لگا تھا کہ ارامیوں میں کوئی غدار موجود ہے جو یورام سے ملا ہوا ہے اور اسے بروقت اطلاع کر دیتا ہے۔ اس کا شک سپاہیوں کے اس دستے کی طرف گیا جو سپہ سالار نعمان کے علاج کے لیے اس کے ساتھ سامریہ گیا تھا۔ اس نے تمام سپاہیوں کو اپنے حضور طلب کیا اور ان سے باز پرس کی۔

"تم میں سے کون ہے جو یہاں ہونے والے فیصلے شاہ اسرائیل تک پہنچاتا ہے۔" بادشاہ نے پوچھا لیکن دوسری طرف مسلسل خاموشی تھی۔ بادشاہ کی آواز پھر گونجی۔ "اس سے پہلے کہ میں تم سب کی گردنیں قلم کرادوں، تم خود اپنے ساتھی کا نام بتا دو جو مخبری کرتا ہے اور اپنی جان بچالو۔"

"ہم سب آپ کے جاں نثار ہیں۔ ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ ہم کیوں یہاں کی باتیں وہاں پہنچانے لگے۔"

"پھر کیا اسے الہام ہو جاتا ہے۔ میں جب اس کا محاصرہ کرتا ہوں وہ وقت سے پہلے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔"

یہ سپاہی حضرت الیسع علیہ السلام سے متاثر تھے اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ ان کا نام درمیان میں آئے لیکن جب انہیں اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی تو ان میں سے ایک نے حقیقت ظاہر کر دی۔

"اے میرے مالک! اے بادشاہ! ہم میں سے کوئی مجرم نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ الیسعؑ جو اسرائیل میں نبی ہے تیری ان باتوں کو جو تو اپنی خلوت میں کہتا ہے، شاہ اسرائیل کو بتا دیتا ہے۔"

"جا کر دیکھو، وہ کہاں ہے تاکہ میں اسے پکڑ سکوں۔"

سپاہیوں کا ایک دستہ ان کی تلاش میں نکلا۔ حضرت الیسع علیہ السلام چونکہ اکثر سفر میں رہتے تھے اس لیے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں۔ سپاہیوں کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس وقت وہ مصر کو سامان لے جانے والی شاہراہ پر واقع شہر "دوتین" میں قیام کیے ہوئے ہیں۔

بادشاہ کو اطلاع مل گئی تو اس نے ایک بڑا لشکر ترتیب دیا اور "دوتین" کی طرف روانہ کر دیا کہ جس طرح ہو الیسعؑ کو گرفتار کر کے اس کے پاس پہنچیں۔ گھوڑوں اور رتھوں کا ایک بڑا لشکر اس طرح روانہ ہوا جیسے ایک نہتے شہری کو نہیں کسی بڑے بادشاہ کی گرفتاری کے احکام ہوں۔ راستے میں پڑنے والی بستیاں خوف سے لرز گئیں کہ یہ لشکر جرار کسی تنظیم طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لیے روانہ ہوا ہے۔ منزلوں پر منزلیں مارتا ہوا یہ لشکر رات کے کسی حصے میں "دوتین" شہر کے محاصرے کے لیے پہنچ گیا۔

حضرت الیسع علیہ السلام کا خادم صبح کو اٹھ کر باہر نکلا تو دوڑتا ہوا اپنے آقا کے پاس چلا آیا۔

"اے آقا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ ارامی لشکر مع گھوڑوں اور رتھوں کے شہر کو محاصرے میں لیے ہوئے ہے۔ میں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر دوڑ دریافت کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا، وہ تو آپ کو گرفتار کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ حاکم شہر سے بات چیت چل رہی ہے، ابھی کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہائے اے میرے مالک! اب ہم کیا کریں۔"



"خوف نہ کر کیونکہ ہمارے ساتھ والے ان کے ساتھ والوں سے زیادہ ہیں۔" حضرت الیسع علیہ السلام نے فرمایا اور دعا کی۔

"اے خداوند اس نوجوان (خادم) کی آنکھیں کھول دے تاکہ اسے وہ سب نظر آجائے جو میں دیکھ رہا ہوں۔"

اب خادم کو وہ نظر آرہا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جو نگاہ کی تو دیکھا حضرت الیسع علیہ السلام کی قیام گاہ کے چاروں طرف جو پہاڑ ہیں ان پر ہزارہا جوان ہتھیاروں سے لیس کھڑے ہیں۔ پورا پہاڑ گھوڑوں اور رتھوں سے بھرا ہوا ہے۔

"اے جوان! کیا تو نے دیکھ لیا؟ یہ سب اللہ کے فرشتے ہیں جو ہماری مدد کو آئے ہیں۔ کیا اب بھی تو خوفزدہ ہوگا؟"

"نہیں آقا! اب تو بڑے سے بڑا لشکر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

حضرت الیسع علیہ السلام نے فرمایا۔ "اب تو باہر جا اور لشکر پر نظر رکھ۔ وہ میری طرف بڑھنے لگے تو مجھے خبر کر۔"

جب لشکر کے سپاہی آپؑ کی قیام گاہ تک پہنچ گئے اور خادم نے خبر کر دی تو حضرت الیسع علیہ السلام نے دعا کی۔ "خداوندا! میں تیری منت کرتا ہوں تو ان لوگوں کو اندھا کر دے۔"

حضرت الیسع علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی، آپؑ باہر نکلے تو دیکھا پورا لشکر ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا ہے۔ حضرت الیسع علیہ السلام بے کھٹک ان کے پاس پہنچ گئے۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا اور تمہیں کس کی تلاش ہے؟"

"کیا یہ دوتین شہر نہیں ہے؟ کیا یہاں الیسعؑ نہیں رہتا۔ ہم تو اسی کی تلاش میں یہاں آئے تھے اور ہمارا یہ حال ہو گیا۔"

"اب تمہیں الیسعؑ مل بھی گیا، تمہارے سامنے بھی آگیا تو تم اسے کیسے گرفتار کر سکو گے، تمہیں تو راستہ تک نظر نہیں آتا۔"

"ہائے، اب ہم کیا کریں۔ اب تو ہم ارام تک واپس بھی نہیں جا سکتے۔ اے مرد نیک! تو جو کوئی بھی ہے کیا ہمیں ارام کی راہ دکھا سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ میں اپنے خادم کو تمہارے ساتھ کیے دیتا ہوں۔ وہ آواز لگاتا ہوا تمہارے آگے آگے چلتا رہے گا اور تم اس کے پیچھے پیچھے ارام کی سرحد تک بہ حفاظت پہنچ جاؤ گے۔"

ان لوگوں میں سے کسی نے پوچھا۔ "اے شخص! سچ بتا، کیا الیسعؑ اتنا طاقتور ہے کہ اس نے ہم سب کو اندھا کر دیا ہے؟"

"شاید ایسا ہی ہو۔" حضرت الیسع علیہ السلام نے کہا۔ "اس وقت تو تم لوگ یہاں سے نکلنے کی کرو۔ اگر الیسعؑ کے آدمیوں نے دیکھ لیا تو تم سب یہیں قتل کر دیے جاؤ گے۔"

وہ لوگ گھبرا گئے اور نکلنے کی جستجو کرنے لگے۔ حضرت الیسع علیہ السلام نے اپنے خادم کو لشکر کے آگے کر دیا اور خود پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ خادم کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

یہ لشکر چلتا رہا لیکن اس کا رخ ارام کی طرف نہیں سامریہ کی جانب تھا۔ حضرت الیسع علیہ السلام کا خادم اپنے آقا کے حکم کے مطابق انہیں سامریہ لے جا رہا تھا۔

یہ لشکر سامریہ کے اندر داخل ہوا اور شاہ اسرائیل کو اطلاع ہوئی تو وہ ملاحظے کے لیے آئے۔ تب حضرت الیسع علیہ السلام نے دعا کی "خداوندا! ان کی بینائی واپس کر دے۔"

بینائی بحال ہوتے ہی سپاہیوں نے خود کو سامریہ میں دیکھا تو اپنی موت صاف نظر آنے لگی اور یہ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ شاہ اسرائیل بار بار کہہ رہا تھا۔ "کیا میں انہیں قتل کر دوں، کیا میں انہیں مار ڈالوں؟ جب میں ان کے کٹے ہوئے سر، شاہ ارام کے پاس بھیجوں گا تو وہ جان جائے گا کہ شاہ اسرائیل کیسی طاقت والا ہے۔"

"اے بادشاہ! انہوں نے تیرے خلاف تلوار نہیں اٹھائی ہے۔ یہ تیرے قیدی ہیں۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کر۔ یہ بھوکے ہیں انہیں روٹی کھلا۔ یہ پیاسے ہیں انہیں پانی پلا تاکہ یہ جب یہاں سے جائیں تو تیرے مطیع ہو چکے ہوں۔" شاہ اسرائیل پر آپؑ کے اتنے احسانات تھے کہ آپؑ کے حکم کے برخلاف نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے لشکر کے لیے کھانا تیار کرایا اور کھلایا۔

لشکر کے سپاہی اتنی دیر میں یہ جان چکے تھے کہ حضرت الیسع علیہ السلام کون ہیں۔ وہ ان کی روحانی قوت کے قائل ہو گئے تھے اور سمجھ گئے تھے کہ وہ سچے نبی ہیں۔

جب رخصت ہونے لگے تو انہوں نے حضرت الیسع علیہ السلام سے ملاقات کی اور اپنے گناہوں کی معافی چاہی اور یہ عہد کیا کہ ان میں سے ہر ایک بقیہ سے نفرت کرے گا اور خدا کی عبادت میں مشغول رہے گا۔

حضرت المسیع علیہ السلام کا یہی طریق تبلیغ تھا جسے وہ کامیابی سے انجام دے رہے تھے۔

یہ لشکر اپنی سرحد میں پہنچ تو وہاں اس گمشدہ لشکر کا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنے گھوڑوں اور رتھوں کو آتے ہوئے دیکھ تو صبر اکر شہر کی دیوار پر آ گیا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس لشکر پر کیا گزری ہے۔ لشکر والوں نے اسے تمام حالات سے آگاہ کیا اور درمیان میں حضرت المسیع علیہ السلام کی تعریف بھی کر دی۔ شاہ ارام یہ سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔

''یہی شخص سارے فساد کی جڑ ہے جس کی تم تعریف کر رہے ہو، تم ایک معمولی سے آدمی سے فریب کھا کر آ گئے۔ اب میں دیکھتا ہوں، وہ اور اس کا آقا یورام میرے ہاتھ سے کیسے بچتا ہے۔''

''ہم نے اس سے فریب نہیں کھایا۔ اس کے پاس روحانی قوت ہے۔ اس نے ہماری بینائی چھین لی تھی۔''

''یہ سب تمہارے بہانے ہیں تاکہ تم اپنی کمزوری چھپ سکو۔ جاؤ جنگ کی تیاری کرو۔''

ارام میں جنگ کے نرسنگے پھونکے جانے لگے۔ مندروں میں قربانیاں چڑھائی جانے لگیں۔ اس جنگ میں شاہ ارام کو خود جانا تھا اس لیے تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ ان تیاریوں میں کئی مہینے لگ گئے۔

اس عرصے میں سامریہ کو ایک اور مصیبت کا سامنا درپیش ہو گیا۔ اس سال کی بارشوں کے لیے سب کی امیدیں رائگاں گئیں۔ کھڑی فصلیں جنہیں پنپنے کے لیے پانی کی ضرورت تھی سوکھ گئیں۔ غلے کے جو ذخائر پچھلے سال کے موجود تھے ان پر گزارہ ہونے لگا۔ جب یہ ذخائر ختم ہو گئے تو جلعاد سے گاڑیاں بھر بھر کر آنے لگیں اور شہریوں میں تقسیم ہونے لگیں۔ اس نازک وقت میں کچھ بے صبروں نے ''بعل'' کو آواز دی کیونکہ وہ بارش کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ ایک بت شاہی محل میں بھی نصب ہو گیا۔

بعل کی پرستش کی خبریں حضرت المسیع علیہ السلام کو بھی مل رہی تھیں لیکن ابھی وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کتنے لوگ ہیں جو اس صبر کے وقت میں اپنے ایمان کو قائم رکھتے ہیں۔ خط کی خبریں شاہ ارام تک بھی پہنچ رہی تھیں جو پہلے ہی جنگ کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور سامریہ پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔

یہ محاصرہ اتنا شدید اور مکمل تھا کہ جب فصیل پر چڑھ کر دیکھا گیا تو شاہ ارام کی فوج چیونٹیوں کی طرح، دائرے کی شکل میں ڈیرے ڈالے ہوئی نظر آئی۔ کوئی ایسا سوراخ بھی انہوں نے نہیں چھوڑا تھا جہاں سے باہر نکلا جا سکے۔

آنے جانے کے تمام راستے بند ہو گئے تو شہر میں خوراک کی قلت انتہا کو پہنچ گئی۔ یورام اس قحط کو اب تک سرسری نظر سے دیکھ رہا تھا لیکن اب اسے تشویش ہونے لگی۔ وہ شاہ ارام کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنے شہریوں کو بھوک سے نجات دلا سکتا تھا لیکن اس کی انا اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ حضرت المسیع علیہ السلام کسی مصلحت کے تحت بارش کی دعا نہیں کر رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کی موجودگی کے باوجود یورام نے بعل کا بت شاہی محل میں نصب کرا دیا تھا اور اس کی پرستش پھر سے شروع کر دی تھی اور ایسے لوگوں کو خود سے قریب کر لیا تھا جو بعل کے پرستار تھے۔

جب قلت غذا اپنے عروج کو پہنچ گئی اور لوگ بادشاہ کو دہائی دینے لگے۔ اس سے اصرار کرنے لگے کہ وہ شہر کے دروازے کھول دے تو بادشاہ کو کسی ممکنہ بغاوت کا احساس ہوا لہٰذا وہ باہر نکلا اور شہر کا دورہ کرنے لگا تاکہ لوگوں کو تسلی دے۔

وہ ایک جگہ سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت نے اسے پکارا۔ ''اے بادشاہ، میری مدد کر۔''

''میں تیری کیا مدد کروں جب خدا ہی ہماری مدد نہیں کر رہا ہے۔ دیکھتی نہیں بارش کا ایک قطرہ نہیں گرا۔ باہر دشمن کی فوج راستہ روکے کھڑی ہے اور تیرا نبی سو رہا ہے۔'' بادشاہ نے کہا۔

''خدا کو تو چھوڑ۔ جو کام تیرے کرنے کا ہے وہ تو کر۔''

''بتا میں تیری کیا مدد کروں۔ تجھے کیا ہوا ہے جو سب کے ساتھ نہیں ہو رہا ہے۔''

تب اس عورت نے قریب کھڑی ایک عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس عورت نے مجھ سے کہا ہے کہ اپنا بیٹا دے تاکہ ہم آج کے دن اسے کھائیں اور میرا بیٹا جو ہے اسے ہم کل کھائیں گے۔ میں اتنے دن کے فاقے میں تھی کہ میں نے اس کی بات مان لی اور اپنے بیٹے کو ذبح کر کے اس کا گوشت پکا لیا۔ اب آج اس کی باری تھی لیکن اس نے اپنا بیٹا چھپا لیا ہے۔''

یہ ایسا دل خراش واقعہ تھا کہ بادشاہ نے ایک چیخ ماری اور اپنا چوغہ تار تار کر لیا اور اپنے مشیروں سے کہنے لگا کہ لوگ اپنی اولادوں کو کھانے لگیں، میرے لیے یہ کتنے شرم کا مقام ہے۔

خوشامدی مشیروں نے کہا۔ ''آپ کی اس میں کیا خطا۔ یہ بلا تو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور خدا کا نمائندہ المسیع خاموش بیٹھا ہے۔ اس کا ذمے دار تو المسیع ہے، ناکہ آپ۔''



بادشاہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ حضرت المسیع علیہ السلام ہی یہ سب کچھ کر رہے ہیں تاکہ میں بدنام ہو جاؤں اور لوگ میرے بجائے انہیں اپنا بادشاہ بنا لیں۔ وہ غصے میں پاؤں پٹختا ہوا محل میں آیا۔ یہاں بھی کان بھرنے والوں نے اس کے کان بھرے۔ اس نے حضرت المسیع علیہ السلام کو قتل کرانے کا ارادہ کر لیا۔

''آج ساقط کے بیٹے المسیع کا سر اس کے تن پر رہ جائے تو خدا مجھ سے ایسا بلکہ اس سے بھی زیادہ کرے۔'' اس نے ایک آدمی کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''زہر میں بجھا خنجر لے اور اسی وقت جا کر المسیع کو قتل کر دے۔''

اس آدمی نے بادشاہ کے سامنے گردن خم کی اور المسیع کی طرف روانہ ہو گیا۔

حضرت المسیع علیہ السلام اس وقت اپنے گھر میں بیٹھے، چند لوگوں کے ساتھ محو گفتگو تھے کہ اچانک کچھ کہتے کہتے رک گئے اور کسی ایسی آواز کو سننے لگے جس کی سماعت سے دوسرے لوگ محروم تھے۔

''میں بھاری قدموں کی آواز سن رہا ہوں۔ اس قاتل زادے نے میرا سر اڑا دینے کو ایک آدمی بھیجا ہے۔ دیکھو وہ جیسے ہی آئے دروازہ بند کر لینا اور اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا۔''

ابھی یہ ہدایت پوری نہیں ہوئی تھی کہ قاتل اپنے ہاتھ میں خنجر لیے پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے یورام بھی تھا۔ بادشاہ نے آپ کو دیکھتے ہی ان کے قریب بیٹھے لوگوں کو ہٹا دیا اور ان سے کہا۔

''ساقط کے بیٹے المسیع۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ یہاں عورتیں اپنی اولادوں کو کھانے لگی ہیں؟''

''یہ بلا تو خدا کی نازل کی ہوئی ہے۔'' حضرت المسیع علیہ السلام نے کہا۔

''میں خدا کی راہ کب تک تکوں۔ اس سے پہلے ہی تیرا کام تمام نہ کر دوں۔''

''تو میرے قتل سے باز رہ۔'' حضرت المسیع علیہ السلام نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے قاتل کو اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''تو خداوند کی بات سن۔ خداوند یوں فرماتا ہے کہ کل اسی وقت کے قریب سامریہ کے پھاٹک پر ایک مثقال میں ایک پیمانہ میدہ اور ایک ہی مثقال میں دو پیمانے جو بکے گا۔''

''تیرا مطلب ہے ایک دن میں قحط ختم ہو جائے گا اور ارامی محاصرہ بھی ختم کر دیں گے۔''

''خداوند جو چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔''

''اگر خداوند آسمان میں کھڑکیاں بھی لگا دے تو کیا یہ بات ہو سکتی ہے؟'' قاتل نے کہا۔

''سن!'' حضرت المسیع علیہ السلام کی غضبی آواز گونجی۔ ''تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا پر اس میں سے کھانے نہ پائے گا۔''

''بہت خوب! یہ تو بڑا دلچسپ تماشا ہوگا۔'' قاتل نے خنجر کو نیام کر لیا۔ بادشاہ نے بھی کہا کہ کل تک کی مہلت دے دی جائے لیکن یہ تاکید بھی کر دی کہ اگر اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی تو پھر تجھے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔

حضرت المسیع علیہ السلام کی کہی ہوئی بات کو خدا سچ ثابت کرنے کے لیے اسباب مہیا کر رہا تھا۔ رات آئی، ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تو شہر کے پھاٹک کے باہر چار کوڑھی جو کسی جگہ چھپے ہوئے تھے بھوک سے بے تاب ہو کر باہر نکل آئے۔

ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''اگر ہم کسی طرح شہر کے اندر جائیں تو وہاں بھی بھوک ہی بھوک ہے۔ یہیں بیٹھے رہیں تو بھی مر جائیں گے تو کیوں نہ ایسا کریں کہ ارامی لشکر میں جائیں۔ اگر وہ ہمیں جیتا چھوڑیں تو چھوڑ دیں اور اگر مار دیں تو مرنا تو ہے ہی۔''

اس کی تائید باقی دو نے بھی کی اور وہ اس طرف چل دیے جہاں ارامیوں نے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اندھیرے کے باوجود ان کے خیمے صاف نظر آ رہے تھے۔

جب یہ کوڑھی خیموں کے نہایت نزدیک پہنچ گئے تو انہیں تعجب ہوا۔ کسی پہرے دار نے انہیں ٹوکا تک نہیں تھا۔ یہ تعجب اس وقت ختم ہو گیا جب انہوں نے دیکھا کہ خیمے خالی پڑے ہیں۔ لشکر تو کیا کوئی ایک آدمی بھی وہاں موجود نہیں۔ خیموں کا ایک شہر ہے جو خالی پڑا ہے۔ ساز و سامان سمیت۔ گھوڑوں اور گدھوں سمیت۔

توریت کا بیان ہے کہ خداوند نے رتھوں کی آواز اور گھوڑوں کی آواز بلکہ ایک بڑی فوج کی آواز ارامیوں کے لشکر کو سنوائی۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو شاہ اسرائیل نے حتیوں کے بادشاہوں اور مصریوں کے بادشاہوں کو ہمارے خلاف اجرت پر بلایا ہے تاکہ وہ ہم پر چڑھ آئیں۔ اس لیے وہ اٹھے اور بھاگ نکلے۔ اپنے ڈیرے اور اپنے گھوڑے اور اپنے گدھے بلکہ ساری لشکر گاہ جیسی کی تیسی چھوڑ دی اور اپنی جان لے کر بھاگ گئے۔

ان کوڑھیوں کو اب یقین ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی نہیں۔ وہ ایک خیمے میں داخل ہوئے۔ اتفاق سے ارامیوں کی طعام گاہ تھی۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ جتنا تھا سب چٹ کر گئے۔ چاندی سونے کے پیالے الٹ پلٹ رکھے تھے، انہیں سمیٹا۔ پھر دوسرے خیمے میں گئے۔ ریشمی کپڑے سمیٹے اور ان سب چیزوں کو ایک جگہ لے جا کر چھپا دیا اور پھر خیموں کی طرف لوٹ آئے۔ ایک شاہ ارام بن کر بیٹھ گیا اور باقی تین اس سے ہنسی مذاق کرنے لگے۔

اس کھیل تماشے میں جب خاصا وقت گزر گیا اور صبح نمودار ہونے کو تھی، ان میں سے ایک نے کہا۔ ”اس کھیل کود سے کیا فائدہ۔ اب صبح ہونے کو ہے۔ ہم شاہی گھرانے کو جا کر خبر دیں کہ ارامی فوج فرار ہو گئی ہے۔ اس کا ہمیں انعام بھی ملے گا اور شہر میں محصور لوگوں کو کھانے کو ملے گا جو نہ جانے کب سے بھوکے ہیں۔ بھوک کا مرہ ہم سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔ آؤ یہ نیک کام بھی کر دیں۔“

وہ چاروں شہر پناہ کی فصیل کے نیچے آئے اور چیخ چیخ کر دربان کو پکارنے لگے۔ دربان نے کسی خفیہ جگہ سے جھانک کر دیکھا اور وہیں سے انہیں للکارا۔

”تم لوگ کون ہو اور کیوں پکار رہے ہو؟“

”ہم اسرائیلی ہیں، ارامی نہیں۔ دروازہ کھولو تو ہم بتائیں ہم کیوں آئے ہیں۔“

”دیکھتے نہیں۔ ارامی فوج محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ ہم دروازہ نہیں کھول سکتے۔“

”کس ارامی فوج کی بات کر رہے ہو۔“ کوڑھیوں نے کہا۔ ”ارامی لشکر تو کب کا فرار ہو چکا۔ ہم وہیں سے آ رہے ہیں۔ وہاں نہ آدمی ہے نہ آدمی کی آواز، صرف گھوڑے اور گدھے بندھے ہوئے ہیں اور خیمے جوں کے توں ہیں۔“

یہ ایسی خبر تھی کہ دربان خود بھاگتا ہوا گیا اور بادشاہ کے محل میں خبر دی۔ یہ خبر آناً فاناً پورے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ آ آ کے پھاٹک کے سامنے جمع ہونے لگے۔ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے کہ کسی طرح شہر سے باہر نکل کر ارامیوں کی لشکر گاہ سے کھانے کا سامان لوٹ لیں۔ اتنی دیر میں بادشاہ بھی دروازے پر پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر لوگ شور مچانے لگے کہ دروازے کھولے جائیں لیکن بادشاہ دروازے کھلوانے پر تیار نہیں تھا۔

”اس وقت دروازے کھولنا مصلحت کا تقاضا نہیں ہے۔“ بادشاہ نے اپنے خادموں سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ارامی ہمیں دھوکا دینے کے لیے کہیں چھپ گئے ہوں۔ جب ہم شہر سے نکلیں تو وہ ہمیں جیتا پکڑ لیں اور شہر میں داخل ہو جائیں۔ ذرا اور اجالا پھیل جائے پھر دیکھا جائے گا۔“

لوگوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا اور بادشاہ دروازہ کھولنے پر تیار نہیں تھا۔ آخر اس کے ایک خادم نے دانش مندانہ تجویز پیش کی۔

”اے بادشاہ! ہم سب باہر نہیں نکلتے۔ صرف پانچ گھوڑے باہر نکالے جائیں۔ ان گھوڑوں پر پانچ قاصدوں کو روانہ کیا جائے جو ارامی لشکر کو تلاش کریں۔ اگر وہ کہیں چھپے ہوں گے تو ضرور باہر نکل آئیں گے۔“

بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے دو رتھ گھوڑوں سمیت باہر نکال دیے جن پر قاصد سوار تھے۔ یہ قاصد رتھ دوڑاتے یردن تک چلے گئے۔ سارا راستہ کپڑوں اور برتنوں سے بھرا پڑا تھا جن کو ارامیوں نے جلدی میں پھینک دیا تھا۔ قاصدوں نے لوٹ کر بادشاہ کو خبر کر دی۔

یہ خبر سنتے ہی اسرائیلی فوجی، ارامیوں کے چھوڑے ہوئے خیموں میں گھس گئے اور غلے کے ذخیروں پر قبضہ کر کے لے آئے۔ ایک مثقال میں ایک پیمانہ میدا اور ایک ہی مثقال میں دو پیمانے ”جَو“ خداوند کے کلام کے مطابق بکنے لگا۔

وہ قاتل جو حضرت الیسع علیہ السلام کو قتل کرنے آیا تھا، اسے بادشاہ نے پھاٹک پر مقرر کیا۔ لوگوں کا ایسا ریلا آیا کہ وہ لوگوں کے پاؤں کے نیچے آ کر دب مرا۔

حضرت السیع علیہ السلام کا یہ کہا بھی پورا ہوا۔ آپؑ نے فرمایا تھا۔ ”تو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا پر اس میں سے کھانے نہ پائے گا۔“ یہی ہوا کہ اس نے چیزوں کو ارزاں نرخ پر بکتے ہوئے دیکھا ضرور لیکن کھانے سے پہلے ہی مر گیا۔ اس نے کہا تھا، اگر خداوند آسمان میں کھڑکیاں بھی لگا دے تو بھی کیا ایسی بات ہو سکتی ہے۔ کھڑکیاں لگیں یا نہیں لیکن ہوا وہی جو خداوند نے کہا تھا۔

☆☆☆

شاہ اسرائیل یورام کو تخت نشیں ہوئے دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ان برسوں میں قحط سالی کے ناخوشگوار دن بھی تھے اور بہت سارے خوشگوار دن بھی۔ حضرت الیسع علیہ السلام کے معجزوں نے انہیں دور دور تک مشہور کر دیا تھا۔ ارامی سپہ سالار کی شفایابی کے بعد تو ارامی دارالسلطنت دمشق میں انہیں ”مردِ خدا“ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ البتہ بادشاہ بن ہدد اور یورام شاہ اسرائیل میں دشمنی برابر چلی آ رہی تھی بلکہ شاہ ارام خود حضرت الیسع علیہ السلام کا بھی دشمن تھا لیکن پے در پے ایسے واقعات دیکھ چکا تھا کہ اس کا دل انہیں ”مردِ خدا“ کہنے پر بضد تھا۔

حضرت الیسع علیہ السلام سامریہ کی قحط سالی کے صدمے سے نکل آئے تھے لیکن بہت دن سے شونیم کے سوا کہیں اور کا سفر نہیں کیا تھا۔

ایک شام آپؑ چند بزرگوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ یکا یک شمال مشرق کی جانب پہاڑی ڈھلانوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے بزرگ جانتے تھے کہ ایسے موقعوں پر جب حضرت الیسع علیہ السلام کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوں تو انہیں کیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے گفتگو کا سلسلہ ختم کر دیا اور انتظار کرنے لگے کہ آپؑ کی محویت ختم ہو اور آپؑ خود کوئی بات کریں۔

حضرت الیسع علیہ السلام کا حال یہ تھا جیسے وہ دل ہی دل میں کسی سے باتیں کر رہے ہوں۔

یہ محویت ختم ہوئی اور آپؑ نے ارشاد فرمایا۔ ”کل ہم دمشق روانہ ہو جائیں گے۔“

”دمشق!“ سب نے ہکا بکا ہو کر ایک ساتھ پکارا۔

”ہاں دمشق“ آپ نے اسی اعتماد سے جواب دیا۔

”وہاں تو بن ہدد کی حکومت ہے جو آپ کا دشمن ہے۔“

”مجھے یقین ہے اس دشمنی کے باوجود اسے میری ضرورت ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگا۔“

وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو آپؑ کے اس بیان پر شک تھا لیکن کوئی مخالفت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ حضرت الیسع علیہ السلام وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں خدا دیتا ہے۔

دوسرے دن طلوع آفتاب سے قبل ہی آپؑ نے قیام گاہ چھوڑ دی۔ صرف ایک خادم آپؑ کے ساتھ تھا جس نے معمولی سا سامان اپنے سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ یہ سفر پیدل طے کرنا تھا اس لیے زیادہ سامان لے جانے کی گنجائش نہیں تھی۔

”مالک، راستہ طویل ہے۔ اگر ہم خچر پر چلتے تو بڑی آسانی ہو جاتی۔“

”مصیبت کا سفر پیدل ہی کیا جاتا ہے۔“

آپؑ نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ خادم سوچ میں پڑ گیا تھا۔ دمشق میں ایسی کون سی مصیبت آنے والی ہے جس کی طرف مالک اشارہ کر رہے ہیں۔

چند پراٹھے اور خشک انجیر زادِ راہ کے طور پر ساتھ تھے۔ خادم یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ ختم ہو گئے تو کیا ہوگا لیکن اس کی یہ پریشانی جلد ہی دور ہو گئی۔ وہ ایک گاؤں کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ گاؤں کے لوگ باہر نکل آئے جیسے انہیں کسی نے پہلے سے بتا دیا ہو کہ حضرت الیسع علیہ السلام آ رہے ہیں۔ یہ لوگ نہایت مروت سے پیش آئے۔ ضد کر کے گاؤں میں لے گئے اور خاطر تواضع میں لگ گئے۔ یہی کچھ راستے میں آنے والے ہر گاؤں میں ہوا اور راستہ آرام سے کٹتا رہا۔

غرض اسی طرح سفر کرتے، رکتے اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی راہ لیتے۔ پانچواں دن ہو گیا۔ اب دمشق ایک منزل سے بھی کم رہ گیا تھا لیکن حضرت الیسع علیہ السلام نے بہتر سمجھا کہ شہر میں داخل ہونے کے بجائے کچھ دیر کے لیے سرائے میں قیام کریں۔ خادم نے پھر مشورہ دینے کی جسارت کی۔

”اب دمشق تھوڑی ہی دیر کی مسافت پر ہے۔ ہم یہاں ٹھہرنے کے بجائے شہر میں داخل ہو کر کسی سرائے کا رخ کیوں نہ کریں۔“

”نہیں۔ آنے والا یہیں آئے گا۔“

حضرت الیسع علیہ السلام نے پھر ایک ایسی بات کر دی تھی کہ خادم سوچ میں پڑ گیا تھا۔ آنے والا کون ہے؟ آپؑ کو کس کا انتظار ہے؟ وہ بے چینی سے آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا۔

ایک دن اور ایک رات اسی سرائے میں گزر گیا۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت سرائے میں اچانک کھلبلی سی مچ گئی۔ سرائے کا مالک ادھر ادھر دوڑتا پھر رہا تھا جیسے کسی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ پھر وہ حضرت الیسع علیہ السلام کے سامنے آیا۔

”مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو، تو معاف کر دیجیے گا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ آپ تو شاہی مہمان ہیں۔“

”شاہی مہمان؟“

”اسی لیے تو بادشاہ کا افسرِ خاص حزائیل آپؑ سے ملنے کے لیے سرائے کے دروازے پر کھڑا ہے۔“

"اچھا تو آنے والا آ گیا۔" حضرت الیسع علیہ السلام نے وہی الفاظ پھر دہرائے اور سرائے کے دروازے کی طرف بڑھے، آپؑ کا خادم بھی آپؑ کے پیچھے دوڑا۔ دیکھا کہ چالیس اونٹوں پر بیش قیمت سامان لدا ہوا ہے۔ ایک رتھ پر حزائیل بیٹھا ہے جو حضرت الیسع علیہ السلام کو دیکھ کر نیچے اتر آیا اور تعظیم کے لیے جھکا۔

"اے مردِ خدا! میرے بادشاہ کو معلوم ہوا کہ آپؑ کے بابرکت قدم اس سرائے میں ہیں تو اس نے مجھے بھیجا کہ میں آپؑ کی خدمت میں یہ تحائف پیش کروں۔ آپؑ انہیں قبول فرمائیں۔"

"میرے پاس تو اتنی جگہ بھی نہیں کہ ان تحائف کو سینتے سے رکھ سکوں۔ تو انہیں تو واپس لے جا اور یہ بتا کہ تیرے بادشاہ کو مجھ سے کیا کام ہے جو یہ تحائف بھیجے ہیں۔"

"بدوشاہ بہت بیمار ہے اور آپؑ سے یہ جاننے کا خواہش مند ہے کہ وہ اس بیماری سے شفا پائے گا یا نہیں؟"

"آپؑ کچھ دیر آسمان کی طرف دیکھتے رہے پھر حزائیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔" تیرا بادشاہ ضرور شفا پائے گا۔ خداوند نے مجھ کو بتایا ہے کہ وہ یقیناً مر جائے گا۔"

"شفا بھی پائے گا اور مر بھی جائے گا، یہ کیسے؟"

"تو خود دیکھ لے گا بلکہ تو سمجھ بھی گیا ہوگا۔" حضرت الیسع علیہ السلام نے کہا۔ "اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوگا۔"

"وہ کیا میرے مالک؟"

"مجھے تو یہ بتاتے ہوئے رونا آتا ہے کہ تو بنی اسرائیل کے قلعوں کو آگ لگائے گا اور ان کے جوانوں کو اپنی تیغ سے رنگین بنائے گا اور ان کے بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرے گا اور ان کی حاملہ عورتوں کو چیر ڈالے گا۔"

"یا حضرت! یہ سب کچھ میں کروں گا۔ میری حیثیت کیا ہے جو میں یہ سب کروں گا۔ میں تو بن ہدد بادشاہ کا معمولی سا کتا ہوں۔"

"تو ہمیشہ کتا نہیں رہے گا۔ خدا نے مجھے بتایا ہے کہ تو ارام کا بادشاہ ہوگا۔ میرے آقا ایلیاہ نبی کو حوراب میں یہی بتایا گیا تھا۔ جو کام ایلیاہ ادھورے چھوڑ گئے، وہ مجھ ہی کو کرنے ہیں۔"

بادشاہت کی خوش خبری سن کر حزائیل اتنی جلدی میں تھا کہ پوری بات سنے بغیر ہی رتھ میں سوار ہوا اور دمشق کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ ہی تحفوں سے لدے اونٹ بھی مڑ گئے کیونکہ حضرت الیسع علیہ السلام نے ہدیہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

حضرت الیسع علیہ السلام کو اس دن سے زیادہ غم زدہ کسی نے کسی اور دن نہ دیکھا ہوگا۔ وہ خود سے باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے، نیا سال شروع ہوتے ہی حزائیل، اسرائیل پر حملہ کر کے اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ افسوس کہ میں یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ ہوں گا۔

وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے تین راستے نکلتے تھے۔ ایک شونیم کی طرف جاتا تھا۔ آپؑ اس مقام پر رک گئے اور خادم کو سامریہ جانے کا حکم دیا۔

"جب اسرائیل میں آگ لگے تو تم شونیم چلے آنا جہاں میں اس وقت جا رہا ہوں۔ اس عرصے میں تم خدا کے نیک بندوں کو میرا پیغام پہنچاتے رہنا کہ وہ تباہی سے پہلے اپنا بچاؤ کر لیں اور کسی ایسے مقام کی طرف نکل جائیں جہاں وہ محفوظ رہیں۔ اسرائیلیوں کی بت پرستی کی سزا خداوند انہیں دینے والا ہے۔"

خادم کو سامریہ کی طرف روانہ کیا اور خود شونیم کی طرف چلے گئے جہاں آپؑ کو اس مالدار عورت کے گھر قیام کرنا تھا، آپؑ کی دعا سے جس کے گھر بیٹا پیدا ہوا تھا۔

حزائیل، حضرت الیسع علیہ السلام سے رخصت ہونے کے بعد بن ہدد کے پاس گیا اور اسے خوش خبری سنائی۔ "حضرت الیسع علیہ السلام نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ضرور شفایاب ہوں گے۔"

اور حزائیل نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت الیسع علیہ السلام نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ضرور شفایاب ہوگا اور یقیناً مرے گا۔

بادشاہ اپنی شفایابی کی خبر سن کر بہت خوش ہوا۔ وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ اس کی صحت بڑی تیزی سے لوٹ رہی ہے لیکن حزائیل کچھ اور سوچ رہا تھا۔ حضرت الیسع علیہ السلام نے اسے خبر دی تھی کہ وہ بن ہدد کی جگہ ارام کا بادشاہ بنے گا۔ بن ہدد کی موت سے پہلے وہ کیسے بادشاہ بن سکتا ہے۔ اب پوری بات اس کی سمجھ میں آئی۔ بادشاہ کو شفا ملے گی اور وہ یقیناً مرے گا۔ پہلی خبر درست ہوئی۔ اس خبر کا دوسرا حصہ باقی ہے۔ بادشاہ کو مرنا ہے۔ اگر میں بادشاہ کو مار دوں تو مجھ پر یقیناً گناہ نہیں ہوگا۔ اس کی تقدیر میں یہی لکھ دیا گیا ہے۔ حضرت الیسع علیہ السلام نے اشاروں میں یہی کہا ہے۔ وہ موقعے کی تاک میں لگا رہا۔ ایک روز اسے موقع مل گیا۔ اس نے گیلا



کمبل لیا اور بیماری سے اٹھے ہوئے کمزور بادشاہ کے منہ پر بچھا دیا اور خود اس کے اوپر بیٹھ گیا۔ بیمار بادشاہ نے کچھ دیر ہاتھ پاؤں چلائے اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

حضرت الیسع علیہ السلام کے خادموں نے بستی بستی جا کر حضرت الیسع علیہ السلام کا پیغام پہنچا دیا تھا کہ اس علاقے سے نقل مکانی کر جائیں۔ اہلِ ایمان نے اس پیغام پر یقین کیا اور نقل مکانی کی تیاری شروع کر دی۔ انہی دنوں یہ خبر آ گئی کہ بن ہدد بادشاہ کی موت کے بعد شاہی گھرانے کا مختار حزائیل تخت شاہی پر قابض ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ حضرت الیسع علیہ السلام نے جو کہا تھا، درست تھا اور آئندہ کے لیے جو کہا ہے وہ بھی جلد سامنے آ جائے گا۔

ارام میں یہ بات عام ہو گئی تھی کہ بن ہدد بادشاہ کی موت فطری نہیں تھی بلکہ حزائیل اسے قتل کر کے تخت پر بیٹھا ہے لہٰذا وہاں شاہی حلقوں میں اور خود فوج میں بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ اس کا احساس شاہ اسرائیل یورام کو بھی تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر حزائیل پر حملہ کر دیا تاکہ وہ جلعاد کا شہر واپس لے لے جو اس سے چھین لیا گیا تھا اور جسے وہ ہمیشہ اپنا کہا کرتا تھا۔ اس کوشش میں اخزیاہ نے اس کا ساتھ دیا جو یروشلم کا حکمران اور یورام کا رشتے دار تھا۔

اگرچہ یورام نے جنگی اہمیت کا یہ قلعہ لے لیا مگر وہ خود جنگ میں زخمی ہو گیا۔ اسے رتھ میں سوار کر کے بڑی احتیاط سے یزرعیل لایا گیا۔ اخزیاہ بھی اس کے ساتھ آ گیا۔ فوج ابھی جلعاد ہی میں تھی جس کی کمان سپہ سالار یاہو کر رہا تھا۔

یہ وہی یاہو تھا جس کے لیے حضرت الیاس علیہ السلام نے پیش گوئی کی تھی کہ جو حزائیل کی تلوار سے بچ جائے گا اسے یاہو قتل کرے گا۔

اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ حضرت الیسع علیہ السلام شونیم میں تھے کہ انہیں ان سب حالات کا علم ہوا۔ حضرت الیاس علیہ السلام کے ذریعے خداوند نے جو کہا تھا وہی ہو رہا تھا۔ حزائیل ارام کا بادشاہ بن گیا تھا اور اب یاہو کی باری تھی کہ وہ یورام کی جگہ اسرائیل کا بادشاہ بنے۔

حضرت الیسع علیہ السلام نے اپنے ایک خادم کو سامریہ سے بلوایا کیونکہ آپؑ کے خیال میں وہی یہ کام کر سکتا تھا۔ اس خادم کو سامریہ میں پیغام ملا تو ٹھہرانے کے سوا اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ وہ یہی سوچ سکتا تھا کہ اس کے آقا یقیناً کسی مشکل میں ہیں ورنہ اسے ہرگز طلب نہ کرتے۔ ان کی خدمت کرنے والے وہاں بھی بہت ہیں۔ وہ بھاگم بھاگ شونیم پہنچ گیا۔

حضرت الیسع علیہ السلام، حضرت الیاس علیہ السلام کی کالی، سفید دھاریوں والی چادر اوڑھے بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ نہایت سنجیدہ اور متفکر نظر آ رہا تھا۔

"دیکھو میں ایک کام تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ کام خطرناک بھی ہے اور ہوشیاری سے کرنے کا بھی لیکن یہ خدائی فیصلہ ہے اس لیے خدا تمہاری مدد کرے گا۔ بس جو میں کہتا ہوں اسے غور سے سن لو۔"

"میں فطری طور پر بزدل ہوں لیکن آپؑ کی مدد میرے ساتھ ہے تو مجھے فکر نہیں۔"

"خدا کا فیصلہ آ چکا ہے۔ اب یورام کی جگہ یاہو بن یہوسفط بن نمسی اسرائیل کا بادشاہ ہوگا۔ یہی میرے آقا ایلیاہ (الیاسؑ) کی پیش گوئی بھی تھی۔"

"میرے آقا، یورام تو ابھی زندہ ہے۔"

"اسی لیے تو یہ کام خطرناک ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ خدا کے دشمنوں کو یہی شخص قتل کرے گا اس لیے اسے بادشاہ بنایا جا رہا ہے۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"طاق پر جو تیل کی کپی رکھی ہے وہ اٹھا کر مجھے دے۔"

خادم نے تیل کپی اٹھائی۔ آپؑ نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا۔ "تو کمر کس لے اور یہ کپی اپنے ساتھ لے جا۔ یاہو اس وقت جلعاد میں فاتح فوجوں کے ساتھ ہے۔ تو جلعاد جا کر یاہو کے بارے میں پوچھنا۔ جب وہ تجھے مل جائے تو اسے کسی اکیلی جگہ لے جانا جہاں اس کے بھائی بند نہ ہوں۔ پھر اس سے کہنا، خداوند یوں کہتا ہے کہ میں نے تجھے مسح کر کے اسرائیل کا بادشاہ بنایا ہے اور تیل کی یہ کپی اس کے سر پر انڈیل دینا۔ پھر تو وہاں سے بھاگ آنا، ٹھہرنا مت۔"

یہ خادم انبیاء زادوں میں سے تھا اور کہا جاتا ہے اس کا نام میکائل تھا۔ وہ خادم تیل کی کپی اپنی کمر سے باندھ کر جلعاد کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ابھی جلعاد کی سرحد پر ہی تھا کہ پکڑا گیا۔

"میں جاسوس نہیں ہوں۔ مجھے تو یاہو بن یہوسفط سے ملنا ہے۔" خادم نے کہا۔

"اس سے کیوں ملنا ہے؟"

"یہ میں اسی کو بتاؤں گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

سپاہیوں نے اسے ایک قریبی گاؤں میں پہنچا دیا جہاں یاہو ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ اس گاؤں کے ایک گھر میں پہنچا تو یاہو چند سرداروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ خادم نے کہا۔ "ان سب کو اپنے پاس سے ہٹا دے تو میں تجھے وہ پیغام سناؤں جو میں تیرے لیے لایا ہوں۔" یاہو نے ان سب سرداروں کو اپنے پاس سے ہٹا دیا اور خادم کو لے کر ایک کوٹھری میں چلا گیا۔ تب خادم نے بتایا کہ اسے الیسع نبی نے بھیجا ہے۔ یاہو، حضرت الیسع علیہ السلام کا مداح تھا اس لیے پیغام سننے کے لیے بے چین ہو گیا۔

خادم نے تیل کی کپی کمر سے نکالی اور تیل اس کے سر پر انڈیل دیا۔ "خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے مسح کر کے خداوند کی قوم یعنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا ہے۔"

حضرت الیسع علیہ السلام نے کہا تھا، مسح کر کے وہاں رکنا مت، بھاگ آنا چنانچہ اس نے یہی کیا۔ کوٹھری کا دروازہ کھولا اور بھاگتا ہوا باہر آ گیا۔

یاہو باہر نکلا تو خوشی کی گھبراہٹ اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ ساتھی سرداروں نے اس کی طرف دیکھا تو پیغام کی نوعیت جاننے کی فکر ہوئی۔

"یہ دیوانہ تیرے پاس کیوں آیا تھا؟"

"الیسع نبی کا نمائندہ تھا اور ایسی بات کہہ گیا ہے کہ تم لوگ یقین نہیں کرو گے لیکن الیسع نے اب تک جتنی باتیں کہی ہیں وہ سب درست ثابت ہوئی ہیں اس لیے یقین کرنا پڑے گا۔"

"ایسی کیا بات کہہ گیا وہ؟"

"اس نے کہا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے مسح کر کے اسرائیل کا بادشاہ بنایا ہے۔"

یہ ایسا پیغام تھا کہ سرداروں کے چہرے خوف زدہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے اطمینان کے لیے ایک مرتبہ پھر یاہو سے پوچھا۔

"کیا تجھے یقین تھا کہ یہ کوئی خبطی نہیں تھا۔"

"مجھے یقین ہے وہ الیسع کے انبیازادوں میں سے تھا۔"

"پھر وہ بھاگا کیوں؟"

"اس لیے کہ جو میں اب کرنے والا ہوں وہ اس سے واقف تھا۔"

"تم کیا کرنے والے ہو یاہو!"

"میرا حکم ہے کہ شہر کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ فوجیوں کو حکم دو کہ کوئی یہاں سے نکل کر باہر نہ جانے پائے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے یزرعیل پہنچنے سے پہلے یہ خبر وہاں تک پہنچے۔"

"تم یزرعیل جاؤ گے؟"

"الیسع کے پیغام بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ خدائی فیصلہ تو ہو چکا ہے لیکن اس فیصلے کو عملی جامہ میری تلوار پہنائے گی۔ ابھی یورام مرا نہیں ہے۔"

ان سرداروں نے اسے بادشاہ تسلیم کر لیا اور اپنے چوغے اتار کر اس کے قدموں کے نیچے بچھا دیے اور نرسنگا پھونک کر اس کی بادشاہت کے نعرے بلند کیے۔

"یاہو بادشاہ ہے۔ یاہو بادشاہ ہے۔"

یاہو نے بااعتماد سپاہیوں کا جتھا ساتھ لیا، خود رتھ پر سوار ہوا اور یزرعیل کی طرف روانہ ہوا۔ وہ نبوت کے تاکستان تک پہنچا تھا کہ برج پر کھڑے نگہبان نے یورام کو خبر پہنچائی۔ "مجھے ایک جتھا آتا دکھائی دیا ہے جو نبوت کے تاکستان کے پاس پہنچ کر رک گیا ہے۔"

یورام جو زخمی تھا، اس نے کہا جلد قاصد بھیج کہ معلوم ہو کون ہے؟ قاصد بھیجا گیا لیکن وہ واپس نہ آیا، دوسرا قاصد اور پھر تیسرا قاصد۔ جو جاتا وہ واپس ہی نہ آتا تھا۔ یورام تڑپ کر اپنے بستر سے اٹھا۔ رتھ تیار کھڑا تھا وہ اس پر بیٹھ گیا۔ دوسرے رتھ پر اخزیاہ سوار ہوا جو یورام کی تیمارداری کے لیے یزرعیل میں موجود تھا۔



یہ دونوں بادشاہ نبوت کی ملکیت تک پہنچے ہی تھے کہ انہوں نے یاہو کو اپنے سامنے پایا اور اس کے پیچھے اس کے سپاہی تھے۔

"یاہو خیر ہے؟" یورام نے یاہو کو دیکھ کر پوچھا۔

"جب تک میری ماں ایزبل زندہ ہے تب تک کیسی خیر۔" یاہو نے گستاخی سے جواب دیا۔

اس جواب کے بعد یورام کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ اس نے باگ موڑی اور بھاگا اور اخزیاہ سے کہا، تو بھی بھاگ یہاں تو فتنہ بپا ہے۔

یاہو نے تیر جوڑا اور سارے زور سے کمان کھینچی۔ تیر یورام کے دل سے پار ہو گیا اور وہ اپنے رتھ میں گرا۔ اخزیاہ نے دیکھا تو وہ نبوت کے باغ کی راہداری سے نکل بھاگا۔ یاہو نے گھوڑا پکڑا اور اس کا تعاقب کر کے اسے بھی رتھ ہی میں ڈھیر کر دیا۔ اس کے رتھ بان نے رتھ کو بھگایا اور مردہ اخزیاہ کو یروشلم تک پہنچا دیا۔

یاہو نے اپنے لشکر کے سردار بدقر سے کہا۔ "یورام کی لاش کو نبوت کی ملکیت کے کھیت میں ڈال دے کہ اس کے باپ نے اس نیک مرد نبوت کی ملکیت پر قبضہ کیا تھا اور اسے مروا دیا تھا۔"

پھر یورام نے اسے یاد دلایا۔ "یاد کر کہ جب میں اور تو اس کے باپ اخی اب کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تو خداوند نے فتویٰ دیا تھا کہ میں نے کل نبوت کے خون اور اس کے بیٹوں کے خون کو دیکھا ہے۔ خداوند فرماتا ہے اور میں اسی کھیت میں تجھے بدلہ دوں گا۔ سو جیسا خداوند نے فرمایا ہے اسے لے کر اسی جگہ ڈال دے۔"

اس کام سے نمٹنے کے بعد وہ شہر کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ اس کے آدمی اس وقت تک شہر میں ادھر ادھر پھیل چکے تھے۔ وہ جیسے ہی شاہی محل کے سامنے پہنچا، ایزبل نے کھڑکی سے منہ نکال کر اسے شرمندہ کرنے کو کہا۔

"اے اپنے آقا کے قاتل خیر تو ہے؟"

وہ یہ بھول گئی تھی کہ یاہو کے سپاہی محل تک پہنچ گئے ہیں۔ اس نے جیسے ہی یاہو کو مخاطب کیا، یاہو کے سپاہی کھڑکی پر آ گئے۔

"اس لعنتی عورت کو کھڑکی سے نیچے پھینک دو۔" یاہو نے کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔

سپاہیوں نے ایزبل کو کھڑکی سے نیچے پھینک دیا۔ خون کے چھینٹے پڑے اور دیواروں کو رنگین کر گئے۔

یاہو دو پہر تک شہر کے انتظامات میں مصروف رہا۔ پھر وہ محل میں گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اسے ایزبل کی لاش کا خیال آیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

"ایزبل کی لاش اٹھا کر کسی جگہ دفن کر دو کیونکہ وہ شہزادی ہے۔"

سپاہی وہاں گئے تو ایزبل کی لاش کو کتے کھا رہے تھے۔ کھوپڑی، پاؤں اور ہتھیلیوں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

یاہو نے کہا۔ "یہ خداوند کا وہی سخن ہے جو اس نے اپنے بندے ایلیاہ کی معرفت فرمایا تھا کہ یزرعیل کے علاقے میں کتے ایزبل کا گوشت کھائیں گے۔ یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی۔"

اب اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت تھا کہ یاہو اخی اب کی آل اولاد اور بعل کے پجاریوں کا قتل عام کرے گا اور ہر طرف امن قائم کر دے گا۔

یاہو نے قدم جماتے ہی عمل کرنا شروع کر دیا۔

سامریہ میں اخی اب کے ستر بیٹے تھے۔ اس وقت یہ ستر شہزادے ان بڑے آدمیوں کے پاس تھے جو ان کے پالنے والے تھے۔ یاہو نے انہیں خط لکھا کہ اگر تم میری طرف ہو اور میری بات ماننا چاہتے ہو تو اپنے آقا کے بیٹوں کے سر اتار کے یزرعیل میں کل اسی وقت میرے پاس آ جاؤ۔

جب یہ نامہ ان لوگوں کے پاس آیا تو انہوں نے ان ستر آدمیوں کو قتل کیا اور ان کے سر ٹوکروں میں رکھ کر یزرعیل بھیج دیے۔

یاہو سامریہ پہنچا اور اخی اب کے باقی ماندہ قرابت داروں کو چن چن کر قتل کیا۔ یہاں تک کہ اس نے جیسا خداوند نے ایلیاہ (الیاس) سے کہا تھا، انہیں نیست و نابود کر دیا۔

یہاں تک کی کارروائی کے بعد اب بعل کے پجاریوں کی باری تھی۔ یاہو نے خود کو بعل کا پرستار ثابت کر کے یہ اعلان کرایا کہ بعل کے تمام پجاری میرے پاس حاضر ہوں کیونکہ میں بعل کے لیے بڑی قربانی کرنے والا ہوں۔

یاہو نے سارے اسرائیل میں لوگ بھیج دیے اور بعل کے سب پوجنے والوں کو بلا لیا۔ یہاں تک کہ بعل کا مندر ایک سرے

سے دوسرے سرے تک بھر گیا۔ جب وہ ذبیحے اور سوختنی قربانی کے لیے اندر گئے تو یاہو نے اسی جوان باہر مقرر کر دیے اور کہا کہ اگر کوئی ان میں سے نکل بھاگے تو چھوڑنے والے کی جان اس کی جان کے بدلے لی جائے گی۔
جب سوختنی قربانی چڑھائی جا چکی تو یاہو نے پہرے والوں سے کہا کہ گھس جاؤ اور ان کو اس طرح قتل کرو کہ ایک بھی زندہ نہ بچنے پائے۔

ان پجاریوں کے قتل عام کے بعد بعل کے ستون توڑ دیے گئے اور مندر مسمار کر دیا۔
یاہو نے بعل پرستی کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن خود کو بت پرستی سے مکمل پاک نہ کر سکا اور نہ ہی خدا کی شریعت کی پیروی کر سکا۔
اس نے سونے کے بچھڑوں کو ماننے سے جو بیت ایل اور دان میں تھے کنارہ کشی نہ کی اس لیے خداوند نے یاہو کو خبردار کیا، تیرے بعد تیرے بیٹے صرف چوتھی پشت تک بادشاہ ہوں گے۔

دراصل بنی اسرائیل کا مزاج ہی کچھ ایسا بن گیا تھا کہ وہ بار بار کی توبہ کے بعد دوبارہ بت پرستی کا شکار ہو جاتے تھے۔ یاہو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ جلد ہی سونے کے بچھڑے کی پرستش کرنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی عوام میں بھی یہ وبا پھیلنے لگی۔ سیاسی اعتبار سے بھی وہ کمزور ہو گیا تھا۔ اس نے جن قوتوں کو نیست و نابود کیا تھا وہ پھر سے سر اٹھانے لگی تھیں۔ ارامی بادشاہ حزائیل بار بار اس کے علاقوں میں گھس آتا تھا اور بالآخر جلعاد کا اہم فوجی قلعہ اس نے چھین لیا۔
یاہو کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا یہوآخز تخت نشین ہوا تو ان کمزوریوں نے اسرائیل کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بت پرستی شاہی سرپرستی میں شروع ہو گئی۔ شاہی محل، برائیوں اور عیاشیوں کا گڑھ بن گیا۔
حضرت الیسع علیہ السلام اس پوری صورت حال کو دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے جو انہوں نے حزائیل کو بادشاہت کی خوش خبری سناتے وقت کی تھی کہ تو اسرائیلیوں کا قتل عام کرے گا۔
آپ یہوآخز کی بت پرستی اور برائیوں سے مایوس ہو کر کوہ کرمل چلے گئے اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔
حزائیل نے اسرائیل میں حکومت بدلنے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور ارامی تسلط کو افرائیم کے کوہستانی علاقے تک بڑھا لیا۔ وہ عذاب عظیم کی طرح اسرائیل پر چھپٹا اور حضرت الیسع علیہ السلام کے اندیشوں کو سچ کر دکھایا۔ اسرائیلی اس خطرناک انداز میں قتل ہوئے کہ لگتا تھا اب کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ اس نے نہ جوان دیکھے نہ بوڑھے اور نہ حاملہ عورتوں کو بخشا۔ جتنے اہم قلعے تھے، ان سب پر قبضہ کر لیا۔
اسرائیلی فوج گھٹ کر پچاس گھڑ سواروں، دس رتھوں اور دس ہزار پیادوں تک محدود ہو گئی۔ ارام بتدریج اسرائیل پر چھاتا چلا گیا۔ یہوآخز کی طاقت اتنی کمزور ہو گئی کہ وہ حملہ آوروں کا سامنا کرنے کے لائق ہی نہ رہا۔ آس پاس کی قومیں ادومی، عمونی، فلستی......... اور صوری سب اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے لگیں۔
جب یہوآخز کے ہاتھوں سے ملک کی باگ ڈور بالکل ہی نکل گئی تو وہ کوہ کرمل کی طرف بھاگا۔ حضرت الیسع علیہ السلام اس وقت وہیں تھے اور یہوآخز جانتا تھا کہ خدا کے عذاب سے اسے وہی بچا سکتے ہیں۔
حضرت الیسع علیہ السلام نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ ”کیا میں نے تیرے باپ سے اور تجھ سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ بت پرستی نہ کرنا۔ تم نے سونے کے بچھڑے بنا لیے۔ تمہاری فطرت ایک مرتبہ پھر بت پرستی کی طرف لوٹ گئی۔ پھر تو یہ ہونا ہی تھا کہ حزائیل تم پر مسلط ہو جائے۔ اب میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔“
”اگر حزائیل اسی طرح حملہ آور ہوتا رہا تو اسرائیل کے وہ نیک لوگ بھی ختم ہو جائیں گے جو ابھی تک تیرے نام لیوا ہیں۔“
”میں اس بڑھاپے میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“
”آپ حزائیل سے کہیں کہ وہ اس ظلم سے باز آ جائے۔“
”وہ جو کچھ کر رہا ہے اس میں خدا کی رضا شامل ہے۔ خدا نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ تیری جگہ تیرے بیٹے یوآس کو بادشاہ بنا دیا جائے۔“
”میں تو اب بے بس بادشاہ ہوں۔ مجھے بادشاہت سے غرض بھی نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اسرائیل کی مظلومی کو دیکھیں اور خدا سے دعا کریں۔“
”اسرائیل کی بدحالی پر میرا دل بھی دکھتا ہے۔ میں ضرور دعا کروں گا۔“
یہوآخز کو کچھ امید تو بندھی تھی لیکن وہ اب بھی مایوس تھا۔ منہ لٹکا کر چلا آیا۔



عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن کسی نخلستان سے گزر رہے تھے، سامنے ایک غلام بکریاں چرا رہا تھا۔ اتنے میں کہیں سے ایک کتا آیا اور غلام کے پاس بیٹھ کر اس کا منہ تکنے لگا۔ غلام نے اسے دیکھ کر اپنی چادر میں سے ایک روٹی نکالی اور اس کتے کے آگے ڈال دی۔ کتا اسے کھا گیا اور پہلے کی طرح پھر اس غلام کا منہ تکنے لگا۔ غلام نے ایک اور روٹی نکالی اور کتے کے آگے پھینک دی۔ کتا اسے بھی کھا گیا اور بدستور غلام کی طرف دیکھتا رہا۔ غلام نے تیسری روٹی بھی اسے ڈال دی۔ عبداللہؓ کھڑے ہوئے یہ دیکھ رہے تھے۔ غلام کے پاس گیا اور اس سے پوچھا۔ ”تجھے ایک وقت میں کتنی روٹیاں کافی ہوتی ہیں؟“ غلام نے جواب دیا۔ ”تین۔“ میں نے کہا۔ ”تو آج کیا کھائے گا اپنے حصے کی روٹیاں تو تُو نے کتے کو ڈال دیں؟“ بولا۔ ”یہ کتا کہیں سے بھوکا پیاسا آ نکلا ہے اور اس علاقے میں اجنبی ہے میرا دل نہ مانا کہ صبح ہی صبح اسے بھوکا رکھوں میں شام تک صبر کر سکتا ہوں۔“
عبداللہ بن جعفرؓ غلام کی اس بات سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے اسے اس کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیا اور وہ نخلستان بھی خرید کر اس کے نام کر دیا۔
**

مرسلہ: محمد [illegible] عاصی۔ روہڑی۔ [illegible]

یہ حضرت الیسع علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہی تھا کہ حزائیل نے حملوں سے ہاتھ کھینچ لیا یا پھر اسے جتنی تباہی پھیلانا تھی پھیلا چکا تھا۔ وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ کبھی کبھی اس کا کوئی جتھا اسرائیلی سرحدوں میں چلا آتا تھا اور لوٹ مار کر کے چلا جاتا تھا ورنہ اب کوئی بڑا معرکہ دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا اور بنی اسرائیل پہلے کی طرح اپنے ڈیروں میں مطمئن تھے۔
ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اتنی نصیحتوں کے بعد یہوآخز بت پرستی سے ہاتھ کھینچ لیتا، اس نے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ وہ اسی راستے پر چلتا رہا۔
آخر وہ وقت آ گیا جب سترہ سال حکومت کرنے کے بعد یہوآخز بیمار پڑا اور وفات پا گیا۔ اسے سامریہ میں دفن کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا یوآس تخت پر بیٹھا۔
حضرت الیسع علیہ السلام ابھی تک کرمل کی پہاڑی پر تھے اور بہت بیمار تھے۔ عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک روز آپ کا خادم بھاگتا ہوا آپ کے پاس آیا اور خبر دی کہ بادشاہ یوآس کا رتھ کھڑا ہے۔ بادشاہ آپ کی عیادت کے لیے اجازت کا طلب گار ہے۔
آپ نے اجازت دے دی اور تمام لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔
بادشاہ اندر آیا اور آپ کے پلنگ کی پٹی کے ساتھ فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر بستر کی چادر سے منہ ڈھانپ کر رونے لگا۔
”اب کیا روتا ہے۔ بت پرستی تو تُو نے بھی ترک نہیں کی۔ تو بھی ہاتھی دانت کے بنے محل میں عیش کرتا ہے۔ اسرائیل کے جو علاقے چھین لیے گئے ہیں تو نے انہیں حاصل کرنے کے لیے انگلی تک نہیں ہلائی۔“
”میں ایسے وقت میں بادشاہ بنا ہوں کہ دس رتھوں کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔ کبھی ہم دو ہزار رتھوں کے مالک ہوا کرتے تھے۔“
”تیرے بت اگر کچھ نہیں دیتے تو عہد کر کہ آئندہ صرف خدا سے مانگے گا۔ تجھے معلوم ہے میں لڑکا تھا، اس وقت سے بنی ایلیاہ (الیاسؑ) کے ساتھ ہوں۔ میں اسرائیل کو بت پرستی کی لعنت سے بچانے کے لیے کوشاں رہا ہوں۔ اب تجھ سے کہتا ہوں کہ بت پرستی سے باز آتا کہ تیرے حق میں دعا کروں۔“
اس نے عہد کر لیا تو حضرت الیسع علیہ السلام جو نقاہت کے سبب اٹھ کر نہیں بیٹھ سکتے تھے پٹی کا سہارا لے کر کسی قدر اوپر اٹھنے کی کوشش کی۔ بادشاہ نے بھی سہارا دیا۔
”خالی ہاتھ آیا ہے یا تیر کمان بھی ساتھ لایا ہے؟“ حضرت الیسع علیہ السلام نے پوچھا۔
”میرے ساتھ کمان بھی ہے اور تیروں سے بھرا ترکش بھی لیکن یہ دنیاوی سامان آپ کے پاس لانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس

لیے باہر ہی چھوڑ آیا ہوں۔"

"مجھے اس وقت تیر کی بھی ضرورت تھی اور کمان کی بھی۔" حضرت الیسع علیہ السلام نے کہا۔ "اچھا ٹھہر! میں کسی سے کہتا ہوں وہ تیری کمان اور ترکش لاکر مجھے دیدے گا۔"

آپؑ نے ایک خادم کو بلایا اور وہ باہر جاکر بادشاہ کے رتھ سے ترکش اور کمان لے آیا۔

"تیر، کمان ہاتھ میں پکڑلے۔" حضرت الیسع علیہ السلام نے فرمایا۔

بادشاہ حیران تھا کہ وہ کیوں ایسا کہہ رہے ہیں۔ یہاں کون دشمن ہے جس کا مجھے نشانہ لینا ہے لیکن وہ انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بادشاہ نے خاموشی سے ایسا ہی کیا۔

"کمان پر اپنا ہاتھ رکھ۔" بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور حضرت الیسع علیہ السلام نے بادشاہ کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"کھڑکی میں سے تیر چلا۔"

بادشاہ نے مشرق کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے تیر چلایا۔

"یہ فتح کا تیر خداوند کا یعنی ارام پر فتح کا تیر ہے کیونکہ اس تیر کی برکت سے تو افیق میں ارامیوں کو مارے گا یہاں تک کہ ان کونابود کردے گا۔"

حضرت الیسع علیہ السلام نے دوبارہ تکیے پر سر رکھ دیا اور اس طرح سانس لینے لگے جیسے کوئی کسی اہم کام سے نمٹنے کے بعد اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔

اس کے بعد آپؑ نے بادشاہ کو حکم دیا۔ "ان تیروں کو ہاتھ میں لے اور ایک ایک کرکے زمین پر مار۔"

بادشاہ نے ترکش سے تیروں کو نکالا اور زمین پر مارنے لگا لیکن چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بددل ہے اور اس کام کو نہایت احمقانہ سمجھ رہا ہے۔

ایک۔ دو۔ تین اور پھر وہ ٹھہر گیا۔ نہ صرف ٹھہر گیا بلکہ ترکش کو ایک کونے میں پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی اس حرکت کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس کا یہ طرز عمل حضرت الیسع علیہ السلام کو غصہ دلانے کے لیے بہت تھا۔ غالباً اس نے توقع سے بہت کم کام کیا تھا۔

"تجھے پانچ یا چھ بار مارنا چاہیے تھا۔ تب تو ارامیوں کو اتنا مارتا کہ ان کو نابود کردیتا۔ اب تو ارامیوں کو فقط تین بار مارے گا۔"

یہ سن کر بادشاہ تھوڑی دیر کے لیے تذبذب اور بے یقینی کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر رخ پھیر کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

بادشاہ کے جاتے ہی کمرے میں ایک ٹھنڈی خاموشی طاری ہوگئی۔ خادموں کو احساس ہوا کہ کوئی آواز نہیں ہے تو وہ کمرے میں گئے۔ حضرت الیسع علیہ السلام کی طرف جھک کر دیکھا۔ پھر کسی نے آہستہ سے ہلا کر دیکھا اور یہ دیکھا کہ اس عظیم القدر ہستی کو خداوند اپنے پاس بلا چکا ہے۔

کچھ عرصے بعد حزائیل کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا بدو ارام کا بادشاہ بنا۔ بادشاہت تبدیل ہوئی تو یہوآس کو اپنی جنگی طاقت میں اضافے کا موقع ملا۔ اس نے حزائیل کے بیٹے بدو سے وہ علاقے چھین لیے جو اس نے اس کے باپ یہوآخز کے ہاتھ سے چھین لیے تھے۔ تین بار یوآس نے اسے شکست دی۔ حضرت الیسع علیہ السلام کے سامنے اس نے تین مرتبہ ہی تیر زمین پر مارے تھے۔ یہ معجزہ حضرت الیسع علیہ السلام کی موت کے بعد ظاہر ہوا۔

اس معجزے کو دیکھنے کے بعد یوآس کو نصیحت ہوجانی چاہیے تھی لیکن ہوا یہ کہ حضرت الیسع علیہ السلام کی موت سے وہ رنجیدہ اور پریشان تو ضرور ہوا کہ اب اس کے لیے کون دعا کرے گا مگر اپنے عہد سے جلد ہی پھر گیا۔ خدا کی عبادت کرنے پر خلوص دل سے مائل نہ رہا بلکہ بت پرستی میں پڑا رہا۔

اس کے مختصر سے دور حکومت میں اسرائیل کے حالات نے بہتری کی طرف پلٹا کھایا۔ یہ حضرت الیسع علیہ السلام کی پیش گوئی کے عین مطابق تھا۔

**ماٰخذات:** قصص القرآن۔ توریت۔ عہد عتیق کا تاریخی سفر۔ الیسع علیہ السلام کی تلوار



# عجیب آدمی

ڈاکٹر ساجد امجد

دنیا میں کچھ بھی عجیب نہیں ماسوائے... ہمارے رویوں کے... جو ہمارے حالات پر اثر انداز ہوکر ان کی نوعیت ہی بدل ڈالتے ہیں۔ وہ بھی عجیب آدمی تو نہیں تھا مگر... اپنی سوچ اور رویے کی وجہ سے ان حالات کا شکار ہوا جن کا کبھی خیالات میں بھی گزر نہ تھا اور اگر وہ ان کی وجہ سے حوالات کی بھی سیر کرلیتا تو کچھ عجیب نہ تھا۔

**محبت کا کاروبار کرنے والے ایک بیوپاری کا ماجرا**

ترشے ہوئے بدن، سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی وہ لڑکی ایک جھٹکے سے بس میں چڑھی اور ایک عورت سے چپک کر کھڑی ہوگئی۔ میں عورتوں کے حصے سے ملی ہوئی سیٹ پر بیٹھا تھا اس لیے لڑکی کی حرکات وسکنات کا اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا۔ اس نے جینز پہنی ہوئی تھی اور اوپر سے ایک موٹی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ صحرا میں بھٹکی ہوئی ہرنی کی طرح ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی جیسے کسی کو تلاش کررہی ہو۔ اس کی اسی گھبراہٹ نے مجھے اس کی طرف متوجہ کردیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا وہ یا تو کسی سے اپنے آپ کو بچا کر بس میں سوار ہوئی ہے یا وہ پہلی مرتبہ بس میں بیٹھی ہے۔ اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مجھے بس اتنی دیر گزری تھی کہ ایک بس اسٹاپ درمیان میں آیا تھا۔ اس بس اسٹاپ سے دو عورتیں سوار ہوئیں۔ ان میں سے ایک کے گلے میں بڑا سا ہینڈ بیگ پڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکی اپنی جگہ سے ہٹی

اور تتلی کی طرح ایک پھول سے دوسرے پھول پر جا بیٹھی۔ اب وہ اس بیگ والی عورت کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ میری آنکھوں نے بھی اس باغ کا وہی گوشہ منتخب کرلیا جہاں اس لڑکی نے خیمہ لگایا تھا۔ پھولوں کی خوشبو سے حواس' عطر تھے کہ ڈرائیور نے پھڑکتا سا ایک گانا لگا دیا۔ میرے کان گانے پر اور آنکھیں لڑکی پر لگی ہوئی تھیں کہ ڈرائیور نے ایک زوردار بریک لگایا، عورتیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ اسی وقت میں نے اس عورت کے مخروطی ہاتھ کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس کا دودھیا ہاتھ برابر میں کھڑی عورت کے ہینڈ بیگ پر گیا اور اس نے اک جنبشِ بدن سے اپنی چادر اپنے ہاتھ پر ڈال لی اور پھر بجلی کی سی تیزی سے اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالا اور وہاں سے ہٹ کر گیٹ کی طرف آ گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ اس لڑکی نے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر اس میں رکھا ہوا چھوٹا پرس نکالا ہے اور اپنے گریبان میں رکھ لیا ہے۔ میں نے اپنی سیٹ چھوڑی اور کھڑے ہوئے لوگوں کو چیرتا ہوا گیٹ پر پہنچ گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کرنے والی ہے۔ مجھے بھی وہی کرنا تھا۔ بس اسٹاپ جونہی قریب آیا اور ٹائروں نے زمین پکڑی اس لڑکی نے پاؤں زمین پر رکھ دیے۔ میں نے بھی بس چھوڑ دی۔ وہ لڑکی اطمینان سے ایک صرف کو چل دی۔ میں کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وقت ابھی زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن جس جگہ ہم اترے تھے عموماً وہاں سناٹا رہتا تھا۔ یہاں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ اس سے ملنے میں اکثر یہاں آتا تھا اس لیے راستوں سے واقف بھی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جس طرف وہ چل رہی ہے ایک چھوٹا سا میدان آئے گا اور پھر وہ سڑک آئے گی جس پر بسیں وغیرہ چلتی ہیں۔ یہ لڑکی وہاں سے یقیناً واپسی کی بس پکڑے گی۔

اس لڑکی کو احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور پھر تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ میں نے بھی رفتار تیز کر دی۔ اب ہم دونوں میدان میں تھے۔

''اے لڑکی ٹھہر جاؤ۔'' میری آواز سنتے ہی اس نے تقریباً بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ میں پھر چیخا۔ ''ٹھہر جاؤ ورنہ گولی چلانے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔''

وہ بھاگتے بھاگتے رک گئی جیسے کسی نے سرکش گھوڑے کی لگام کھینچ لی ہو۔ میدان کے کونے پر لگے بجلی کے بلب کی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی مجھے اس کا اندازہ بس ہی میں ہو گیا تھا لیکن بلب کی روشنی میں تو اس نے چاندی کا زیور پہن لیا تھا۔ اسے ڈانٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس وقت اسی رویے کی ضرورت تھی۔

''کیا بات ہے۔ کیوں روکا ہے مجھے۔ اکیلا دیکھ کر چھیڑتے ہو۔''

''پرس میرے حوالے کر دو۔''

''کیا بکواس ہے، کیسا پرس، دماغ تو صحیح ہے۔''

''وہی پرس جو تم نے بس میں کھڑی عورت کے ہینڈ بیگ سے نکالا ہے۔''

''کسی اور کو دیکھا ہوگا، میں تو بس میں بیٹھی ہی نہیں۔''

''تم ایسے نہیں مانو گی۔'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''ک.....ک.....کون ہو تم؟''

''میں سادہ کپڑوں میں پولیس والا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں، جو کچھ اس پرس میں ہوگا آدھا تمہارا آدھا میرا۔''

''اس پرس میں ہوگا کیا۔ سو دو سو روپے یا زیادہ سے زیادہ پانچ سو روپے۔'' وہ اتنی دیر میں اپنے گریبان سے پرس نکال چکی تھی۔

''جب تمہیں معلوم ہے کہ ایسی وارداتوں میں تمہارے ہاتھ معمولی سی رقم لگتی ہے تو ایسے ہاتھ مارتی ہی کیوں ہو؟''

''تمہیں اس سے کیا مطلب۔ یہ لو پرس اور چلتے نظر آؤ۔ مجھے معلوم ہے تم پولیس والے نہیں ہو۔ کوئی اناڑی جیب کترے ہو جو دوسروں سے ان کی محنت چھینتے ہو۔''

''تم نے ٹھیک کہا، میں پولیس والا نہیں ہوں لیکن تمہاری طرح جیب کترا بھی نہیں ہوں۔ تمہاری ہی برادری کا ہوں لیکن میرا طریقہ کچھ اور ہے۔ ویسے اتنی خوبصورت جیب کتری میں نے پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔''

''میں جیب کاٹنے والی نہیں ہوں۔ سمجھے تم۔''

''پھر یہ کیا ہے؟'' میں نے پرس دکھاتے ہوئے کہا۔

''سچی بات یہ ہے کہ یہ میرا شوق ہے، میں ایڈونچر کی قائل ہوں۔ خطروں سے کھیلنا میری ہابی ہے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں۔''

''ہاں تم تو بڑی لکھ پتی ہو۔''

''لکھ پتی نہیں تو کھاج بھی نہیں ہوں۔ بس خطروں سے کھیلتی ہوں، تمہاری طرح اٹھائی گیری نہیں ہوں۔ محنت میری اور پرس تم نے تھمیا لیا۔''



''اٹھائی گیرا میں بھی نہیں ہوں۔ تم اگر ساتھ دو تو اسی سامنے والی سڑک پر تمہیں دکھا دوں کہ واردات کسے کہتے ہیں۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارے ساتھ مل کر واردات کرنے کی۔''

''تم مجھ سے ڈرو مت۔ میں بھی تمہاری طرح پڑھا لکھا ہوں۔ میں بھی سب کچھ ایڈونچر کے لیے کرتا ہوں۔ قسمت نے دو ایک جیسے خیالات رکھنے والوں کو ایک جگہ ملا دیا ہے۔ ابھی ابھی ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ تمہارے ساتھ مل کر ہی یہ کام ہو سکتا ہے۔ ذرا ہمت کرو تو بڑا مزہ آئے گا۔''

''تم مجھے کسی بڑے جھگڑے میں مت پھنسا دینا۔''

''میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔''

''اچھا بتاؤ کیا کرنا ہے؟''

میں نے اسے وہیں کھڑے کھڑے سب کچھ سمجھا دیا۔ وہ اس ٹیپ تجویز پر بڑی دیر تک ہنستی رہی اور پھر میرے ساتھ چلتے ہوئے میدان پار کر گئی۔

ایک گاڑی دور سے آتی نظر آئی۔ پروگرام کے مطابق وہ آگے بڑھی اور گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کی رفتار اچانک کم ہوئی لیکن رکنے کی زحمت نہیں کی اور ایک زناٹے سے گزرتی چلی گئی۔

''اچھی ترکیب تھی آپ کی۔'' اس نے طنزاً کہا۔ ''آج کل کوئی کسی کو لفٹ دیتا ہے؟''

''یہ نہیں رکا تو کیا کوئی بھی نہیں رکے گا؟''

''تو کیا ہم رات بھر یہیں کھڑے رہیں گے۔ یہ علاقہ یوں بھی ایسا ہے کہ یہاں سے اکا دکا ہی گاڑیاں گزرتی ہیں۔''

''دیکھو وہ ایک اور گاڑی آ رہی ہے۔''

میں پھر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آگے بڑھی اور زور زور سے ہاتھ ہلانے لگی۔ اس گاڑی والے کے دل میں کچھ رحم آ گیا۔ لڑکی کو دیکھ کر وہ خطرے کا احساس بھی نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر جا کر رکی تھی۔ ہم دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے گاڑی تک پہنچے۔ پہلے اطمینان کر لیا کہ گاڑی میں دو آدمی تو نہیں ہیں۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ وہ اکیلا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف پہنچی اور دروازے پر منہ رکھ دیا۔

''ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ بہت دور سے میں اور میرے شوہر پیدل چلے آ رہے ہیں کیا آپ ہمیں لفٹ دیں گے؟''

''کہاں خراب ہوئی ہے آپ کی گاڑی؟''

''پیچھے کسی جگہ۔''

''میں تھوڑا بہت کام جانتا ہوں، آپ میرے ساتھ بیٹھ جائیں، میں دیکھتا ہوں کیا خرابی ہے۔''

''آپ کہاں زحمت کریں گے، بس آپ ہمیں جہاں تک جا رہے ہیں چھوڑ دیں۔ یہ سڑک بھی ایسی ہے کہ ہمیں کوئی ٹیکسی نہیں ملے گی۔''

''یہ جو سامنے سگنل نظر آ رہا ہے مجھے اس کے لیفٹ جانا ہے۔''

''ارے آپ درخشاں سوسائٹی تو نہیں جا رہے؟'' میں نے آگے بڑھ کر کہا تاکہ اسے میری موجودگی کا بھی علم ہو جائے۔

''درخشاں سے آگے خیابانِ حالی جاؤں گا۔''

''بس ہمیں درخشاں پر چھوڑ دیجیے گا۔''

''بیٹھیے۔''

میں اور وہ لڑکی (ابھی تک میں نے اس کا نام نہیں پوچھا تھا) اس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور وہ لڑکی پچھلی سیٹ پر۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ سگنل سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ پھر لیفٹ کو مڑنا تھا اور پھر تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر درخشاں سوسائٹی تھی۔ مجھے سگنل سے مڑنے کے بعد ایک فرلانگ کے فاصلے کے درمیان اپنے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ جیسے ہی گاڑی سگنل سے الٹے ہاتھ کو مڑی میں نے جیب میں رکھا ہوا پستول باہر نکالا اور گاڑی چلانے والے کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

''اپنا والٹ مجھے دے دو۔''

اس آدمی کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر کانپ کر رہ گیا۔ ''میں نے تمہاری مدد کی ہے اور تم میرے ساتھ.....''

''جلدی کرو ورنہ یہاں کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا تمہارے ساتھ کیا ہو گیا۔''

اس آدمی کا سیدھا ہاتھ اس کی بیک پاکٹ میں گیا۔ اس نے والٹ نکال لیا۔ سیدھے ہاتھ سے میں نے پستول پکڑا ہوا تھا الٹے ہاتھ سے والٹ جھپٹ لیا۔

''آپ کو رقم چاہیے رقم نکال لیں اور والٹ مجھے واپس دے دیں۔ اس میں میرے کاغذات ہیں جو آپ کے کام کے نہیں۔''

میں نے پستول اس لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا جو اس نے مرد کی گردن پر رکھ دیا اور میں نے اس کے والٹ میں سے نوٹ نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیے۔ میں صحیح طرح دیکھ نہیں سکا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ رقم میری توقع

سے بہت زیادہ ہے۔

"بس یہاں گاڑی روکو۔"

اس نے گاڑی روک لی۔ میں گاڑی سے اترا اور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گیا۔ میں نے اس لڑکی سے پستول لے لیا اور اس آدمی سے نیچے اترنے کو کہا۔ وہ یہ سمجھا ہوگا کہ میں اسے نیچے اتار کر گولی ماردوں گا۔ وہ گڑگڑانے لگا، زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا لیکن ظاہر ہے مجھے اسے مارنا نہیں تھا۔ میں نے پھر اسے حکم دیا کہ وہ نیچے اتر آئے۔ وہ گاڑی سے باہر آیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ مرنے کا خوف بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ وہ تو جوان آدمی تھا۔ صحت مند بھی تھا، اگر میرے ہاتھ میں پستول نہ ہوتا تو وہ مجھے اٹھا کر پٹخ دیتا لیکن اس وقت وہ سرکس کے شیر کی طرح بے بس تھا۔

"میں تمہاری گاڑی لے جاتا ہوں، اسی سڑک پر سیدھے چلے آنا۔ تمہیں تمہاری گاڑی مل جائے گا لیکن خبردار پیدل آنا، کسی سے لفٹ لے کر مت آنا۔"

یہ میں نے احتیاطاً کہہ دیا تھا حالانکہ اکیلے آدمی کو رات کے وقت کون لفٹ دیتا ہے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا جیسے یہ میری باپ کی گاڑی ہو۔

اس دوران دو کاریں ہمارے قریب سے گزری تھیں۔ انہیں اگر یہ اندازہ ہو بھی گیا ہو کہ کوئی واردات ہو رہی ہے تو بھی کسی نے رکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور ایکسی لریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

"اس کے پاس موبائل بھی ہوگا جو میں نے اس سے نہیں لیا۔"

"چلو رقم تو آ گئی۔ موبائل کا ہم کیا کرتے۔"

"بات رقم کی نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی بے وقوفی ہے جو ہم سے ہوئی ہے۔ وہ موبائل پر پولیس کو اطلاع کر سکتا ہے بلکہ کر بھی دی ہوگی، پولیس ہمیں کسی بھی جگہ دبوچ سکتی ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟"

"میرا ارادہ یہ تھا کہ میں اسی گاڑی پر تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر گاڑی راستے میں کہیں چھوڑ دوں گا اور ٹیکسی کر کے اپنے گھر چلا جاؤں گا لیکن اب یہ گاڑی یہیں چھوڑنی پڑے گی کیونکہ اگر اس آدمی نے اپنی گاڑی کا نمبر نوٹ کرا دیا تو وائرلیس کے ذریعے یہ نمبر آگے بھیج دیا جائے گا اور ہم پکڑے جائیں گے اس لیے میں گاڑی یہیں چھوڑ رہا ہوں اور یہاں سے ہم لوگ الگ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوں گے کیونکہ اس نے یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ اسے لوٹنے والے ایک مرد اور ایک عورت ہیں۔"

سڑک کے ساتھ ساتھ گھر بنے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی کو سڑک سے اتار کر ایک گلی میں موڑ دیا اور ایک جگہ پارک کر دیا۔ ہم دونوں جلدی جلدی اترے۔ گاڑی کی چابی زمین پر پھینک دی اور اس گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہو گئے۔

"تم جو چادر اوڑھی ہوئی ہو، زیادہ قیمتی تو نہیں؟"

"نہیں کوئی ایسی خاص تو نہیں۔"

"اسے اتار کر کسی جگہ پھینک دو۔ اس لیے کہ اس آدمی نے ممکن ہے تمہارا حلیہ بتاتے ہوئے یہ بھی کہا ہو کہ عورت نے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔"

اس نے چادر اتاری اور قدموں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے خشک نالے میں پھینک دی۔ جب ہم اس گلی سے بھی گزر گئے تو خوش قسمتی سے ایسی جگہ آ گئے جہاں کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اسے الگ بھیجوں گا اور خود الگ جاؤں گا، پھر میں نے یہ خیال بدل دیا۔ ٹیکسی اتنی جلدی مل گئی تھی کہ مزید احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس طرح اس کا گھر بھی دیکھ لوں گا۔

"اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی رکوا لینا۔" میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ ٹیکسی والا تمہارا گھر نہ دیکھ سکے۔ اگر کسی طرح پولیس والوں نے یہ پتا لگا لیا کہ ہم کسی ٹیکسی میں فرار ہوئے تھے تو ٹیکسی والا تمہارے گھر تک نہ پہنچ سکے۔"

اس نے یقیناً میری ذہانت کی داد دی ہوگی۔ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس پوری صورت حال سے خوف زدہ ہو گئی ہو۔

"رقم میری جیب میں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی نوٹ گنے نہیں ہیں۔ گھر جا کر گن لوں گا۔ تمہارا حصہ بھی دینا ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔ "کل شام کو کسی جگہ مل سکتی ہو؟"

"کہاں؟"

"صدر کے علاقے میں میلوڈی ریسٹورنٹ بہت مشہور ہے، دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"اچھا ایسا کرتے ہیں۔ جہاں ابھی تم اترو گی، کل وہاں پہنچ جانا۔ میں بھی آ جاؤں گا، پھر کہیں چل کر بیٹھ جائیں گے۔"

مجھے یوں لگا تھا جیسے ٹیکسی ڈرائیور ایک طرف کو جھک کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اس لڑکی کا



ہاتھ دبا دیا۔ وہ شاید میرا اشارہ سمجھ گئی تھی اسی لیے کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ اب ٹیکسی میں مکمل خاموشی تھی۔

"لیفٹ کو لے کر پھر رائٹ کو لے لیجیے گا۔" اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

ڈرائیور لیفٹ رائٹ کر چکا تو اس نے ڈرائیور کو رکنے کی ہدایت کی۔ ٹیکسی ایک مکان کی دیوار کے ساتھ رک گئی۔ یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے ہم نے ٹیکسی کو اپنے مکان کے سامنے رکوایا ہے اور ہمیں اسی مکان میں جانا ہے۔ ڈرائیور نے ٹیکسی موڑی اور واپس چلا گیا۔

"تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"بس دو گلیاں چھوڑ کر۔"

"آؤ، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔"

"نہیں، میں چلی جاؤں گی، میں نہیں چاہتی کہ ابھی آپ میرا گھر دیکھیں۔"

"تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"ابھی ہم نے ایک ساتھ وقت ہی کتنا گزارا ہے۔"

"ابھی تک ہم ایک دوسرے کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔"

"میرا نام شہلا ہے۔"

"نام تو صحیح بتا رہی ہو؟"

"اتنا وقت تو گزار لیا ہے کہ نام صحیح بتا دوں۔"

"میرا نام مجیب ہے، میں کل پانچ بجے اسی جگہ ملوں گا۔"

"میں پہنچ جاؤں گی۔"

☆☆☆

سائرہ نے میری طرف دیکھا ضرور تھا لیکن پھر ٹائپ رائٹر میں کاغذ لگانے کے بہانے ٹائپ رائٹر پر جھک گئی تھی۔ میں بھی اس کی میز کے سامنے سے گزرتا ہوا اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ کئی معنی خیز نظریں ایک دوسرے کی طرف اٹھی تھیں اور پھر سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔

کچھ نہیں تو پچھلے پندرہ دنوں سے میرے اور سائرہ کے درمیان باتوں کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ مجھے یاد ہے جب اسے اس دفتر میں آئے بہ مشکل پندرہ دن ہوئے تھے تو وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"آپ کلرک ہیں یا مفکر؟"

"شاید مفکر ہوں اور مجبوریوں نے کلرک بنا دیا ہے یا پھر کلرک ہوں اور حالات نے مفکر بنا دیا ہے۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"اس لیے کہ میں نے جب بھی آپ کی طرف دیکھا، کچھ سوچتا ہوا ہی پایا ہے۔"

"ان دنوں تو میں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ اللہ نے آپ کی تنخواہ میں کتنی برکت دی ہے۔ قیمتی کپڑے پہن لیتی ہیں، کئی افسروں سے اچھی گاڑی آپ کے پاس ہے۔"

"یہ سب میری تنخواہ کی نہیں میرے والدین کی برکت ہے۔ میرے والد بہت بڑے سرکاری افسر ہیں۔ تنخواہ سے زیادہ تو مجھے پاکٹ منی ملتی ہے۔ یہ نوکری تو میں ٹائم پاس کرنے کے لیے کرتی ہوں۔ گھر میں پڑے پڑے بور ہو جاتی تھی۔"

"کہیں افسر بن جاتیں۔ ٹائپ رائٹر پر انگلیاں کیوں تھستی رہتی ہو۔"

"جب میں نے میٹرک سے آگے پڑھا ہی نہ ہو تو اور کیسی نوکری ملتی۔"

"کمال ہے! آج کل تو غریب لڑکیاں بھی بی اے تو کر ہی لیتی ہیں۔"

"بس، مجھے شوق ہی نہیں تھا۔"

اس دن کے بعد سے وہ اکثر میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے بہت سی معلومات ہو گئی تھیں۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ پورے دفتر میں اس کی کسی سے بات چیت نہیں تھی۔ وہ مغرور سمجھی جاتی تھی لیکن مجھ سے گھل مل گئی تھی۔ پھر ایک دن مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھے چاہنے لگی ہے۔ یہ وہ دن تھا جب اس نے مجھے دعوت دی تھی کہ میں اس کے ساتھ باہر چل کر لنچ کروں۔ اب تک میں یہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھا کہ وہ دفتر کا ساتھی سمجھ کر قربت کی چاندی بکھیر دیتی ہے لیکن وہ مجھے باہر لے جانے پر بضد ہے، اس کا مطلب ہے وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ میں اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔ دفتر کے ساتھیوں کی حیرت، مایوسی میں بدل گئی تھی۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ ان کے ہاتھوں سے گئی۔ بڑے زور شور سے باتیں بننے لگی تھیں لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

اس دن میں اس کی شاندار گاڑی میں بیٹھا تو خوش ہونے کے بجائے اداس ہو گیا تھا۔ مجھے یہ احساس شدت سے ہوا تھا کہ میرے پاس تو سائیکل بھی نہیں ہے اور وہ اتنی شاندار گاڑی کی مالک ہے۔ اگر میں اسے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہوں تو ٹیکسی کے سوا میرے پاس کیا ہے۔ جس ہوٹل میں وہ مجھے لے کر گئی وہاں اکیلے جانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں مزید اداس ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا میں کس راہ پر چل نکلا ہوں۔ وہ تو مجھے یہاں لے

آئی ہے، میں اسے یہاں کیسے لے کر آسکتا ہوں۔ دوستی اس سے رکھی جائے جس سے دل ہی نہیں معیار بھی ملتا ہو۔ اس نے بھی شاید میری کیفیت کو بھانپ لیا تھا لیکن میں نے کوئی بہانہ کر کے اسے مطمئن کر دیا تھا۔

اس دن کے بعد ہی سے میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ میں دولت کماؤں گا، چاہے اس کے لیے مجھے غلط راستے ہی کا انتخاب کیوں نہ کرنا پڑے۔

اس رات میں بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ رہ رہ کر سائرہ کا خیال آرہا تھا۔ میں اس کے سامنے فقیر نظر آرہا تھا۔ مجھے یاد آرہا تھا جب وہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی تو اس کی چال میں کیسی اکڑ تھی۔ سمجھ رہی ہوگی کہ کسی مفلس کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے لے جارہی ہے۔ مجھے اس کا بدلہ اتارنا پڑے گا پھر خیال آیا تنخواہ ملنے میں تو ابھی دیر ہے۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ میں اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاؤں۔ ایک مصنوعی خفگی خود پر طاری کرلوں۔

وہ مجھ سے پوچھتی رہی تھی۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میری پسند ہے لیکن جب میں اس کے معیار کا بن جاؤں گا، اس کے ساتھ گھومتا پھرتا اچھا لگوں گا۔ وہ بڑی زور سے ہنسی تھی۔

"اس وقت تک تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔"

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ تم دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔"

"کیا کرو گے۔ کوئی بینک لوٹ لو گے۔ بچے مت بنو، میں نے کبھی اپنی دولت پر گھمنڈ نہیں کیا۔ تمہیں حقیر نہیں سمجھا۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں، میرے پاس جو کچھ ہے تمہارا ہی تو ہے۔"

بہرحال دولت کمانے کے کئی طریقے میں نے سوچے کبھی سوچا سائرہ نے تو مذاق ہی کیا تھا، میں واقعی بینک لوٹ کر دکھا دوں۔ کبھی سوچتا کسی سنسان مقام پر کھڑا ہو جاؤں اور آنے جانے والوں کی جیبوں سے رقم نکلوالوں لیکن ظاہر ہے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا، بس یہی کر سکتا تھا کہ سائرہ کی حوصلہ شکنی کروں اور وقت کا انتظار کروں۔ دفتر کے لوگوں نے اب مجھے مذاق کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سائرہ نے مجھے ڈانٹ پلا دی ہے جبکہ سائرہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ دولت اور غربت کا جو فرق میں نے اپنے ذہن میں بنا لیا ہے اسے مٹا دے۔ جب وہ تھک گئی تو اس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

پریشانی کے یہی دن تھے جب شہلا سے میری ملاقات ہوئی اور پہلی ہی واردات میں چالیس ہزار کی رقم میرے ہاتھ لگ گئی۔ بیس میرے تھے اور بیس سائرہ کے۔ میں چاہتا تو اس سے کہہ سکتا تھا کہ والٹ سے دس ہزار نکلے تھے۔ پانچ میں لے لیتا ہوں پانچ تمہارے ہیں لیکن میں نے ایمانداری سے اس کے بیس ہزار الگ کر کے رکھ دیے تھے اور میرے بیس میری جیب میں تھے۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھا یہ سب سوچ رہا تھا۔ کبھی کبھی سائرہ کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ میری جیب میں بیس ہزار روپے ہیں آج میں غریب بھی نہیں ہوں، میں نے سوچا اور اٹھ کر سائرہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت دن کی بھولی مسکراہٹ روشن ہوگئی۔ اس نے قریب پڑی ہوئی کرسی میرے لیے پیش کر دی۔

"کیسی ہو؟"

"تمہارے سامنے ہوں۔"

"آج تم لنچ کے لیے میرے ساتھ باہر چلو گی۔"

"میں تمہیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اتنے دن سے کیا ہو گیا تھا۔"

"آج میں تمہیں اچھے ہوٹل میں لے جاسکتا ہوں۔"

"واہ، یہ کیا بات ہوئی، جب آپ کی جیب میں پیسے نہیں ہوں گے، آپ بات بھی نہیں کریں گے۔"

"واقعی یہ میری غلطی تھی۔ اب یہ کرتے ہیں پیسے نہیں ہوں گے تو باتیں کریں گے، پیسے ہوں گے تو کسی اچھی جگہ جا کر بیٹھیں گے۔" اس کی وہی ہنسی لوٹ آئی تھی جو بھی مجھے دیکھ کر بکھر جاتی تھی۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ لنچ ٹائم ہو گیا۔ وہ واش روم میں گئی، میک اپ وغیرہ درست کیا اور ہم باہر نکل گئے۔

"کہاں چلیں؟"

"وہیں جہاں اس روز تم مجھے لے کر گئی تھیں۔"

"اس سے اچھی ایک اور جگہ نہ بتاؤں؟"

"جیسی تمہاری مرضی لیکن جگہ ایسی ہو جو تمہارے شایانِ شان ہو۔ میرے پاس آج بہت پیسے ہیں۔"

"اچھا بادشاہ سلامت۔ یہ کنیز آپ کو نہایت مہنگے ہوٹل میں لے کر جائے گی۔"

میں اس کی گاڑی میں بیٹھا تو میرے بدن میں ایک مرتبہ پھر کانٹے پیوست ہو گئے۔ میرے پاس ایک موٹر سائیکل بھی نہیں ہے۔ ہوٹل تک جانے کے لیے اس کا مرہون منت ہونا پڑ رہا ہے۔ فتح تو سائرہ ہی کی ہوگی۔ بیس ہزار کا نشہ تھا کہ میں یہ وار سہ گیا اور اس کے ساتھ ہوٹل تک چلا گیا۔ یہ فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ یہاں کی شان ہی دوسری تھی۔



میرے دفتر کا کوئی کلرک یہاں بیٹھنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا جبکہ میں یہاں بیٹھا تھا اور وہ بھی سائرہ جیسی لڑکی کے ساتھ۔ میرا دھیان اچانک رات کی واردات کی طرف چلا گیا۔ اگر رات شہلا نہ ملی ہوتی تو آج میں سائرہ کے ساتھ یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔ یہ رقم خرچ ہونے کے بعد کیا ہوگا۔ کیا ایسے مواقع روز ملتے رہیں گے؟

"کیا سوچ رہے ہو، کوئی بات کرو۔" سائرہ نے مجھے ٹوکا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"میں تمہاری اس عادت سے بہت تنگ ہوں، بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جاتے ہو۔"

"سوچ رہا ہوں ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔"

"زندگی ان ہوٹلوں میں بیٹھنے کا ہی نام نہیں ہے۔ ہم کسی پارک میں، میرے گھر، تمہارے گھر میں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی مجیب۔"

"میری آمدنی بہت محدود ہے۔ اتنی محدود کہ محبت کے جذبات کسی بھی وقت دم توڑ سکتے ہیں۔"

"تم کہو تو میں ڈیڈی سے کہہ کر تمہیں کوئی بزنس کرا دوں لیکن تم تو اسے بھی احسان سمجھو گے، اپنی توہین کہو گے۔"

"احسان لوں گا اور وہ بھی تمہارے ڈیڈی کا؟"

"مجھے تمہاری یہ ادا اچھی بھی لگتی ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ خودداری اچھی چیز ہے لیکن انسان، انسانوں سے مدد لیتا بھی ہے۔"

"میں نے انکار نہیں کیا ہے لیکن مجھے پہلے اپنے طور پر کوشش کر لینے دو۔ اگر میں کسی وقت ناکام ہو گیا تو ضرور تمہارے ڈیڈی سے کہوں گا۔"

لنچ ٹائم گزار کر میں اور سائرہ دفتر پہنچے تو ہر آنکھ جیسے ہمارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ ہر آنکھ میں ہزار سوال تھے لیکن آج سائرہ کو تو کیا خود مجھے بھی کسی کی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

میں اور شہلا ایک ہوٹل میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے اس کے حصے کی رقم نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اتنے نوٹ دیکھ کر وہ ایک مرتبہ چونکی ضرور تھی۔ وہ میری طرح ضرورت مند نہیں تھی لیکن پیسا ضرورت سب کی ہے۔

"گن لو، بیس ہزار ہیں۔"

"تم نے اپنا حصہ نہیں نکالا؟"

"چالیس ہزار تھے۔ بیس میں نے رکھ لیے ہیں۔"

## احساسات

لڑکی بہت امیر تھی، اسے چاہنے والا نوجوان غریب لیکن دیانت دار اور راست گو تھا۔ لڑکی اسے پسند ضرور کرتی تھی لیکن اس سے زیادہ اس کے دل میں لڑکے کے لیے کچھ نہیں تھا وہ اس سے شادی کے لیے تیار نہیں تھی، لڑکا بھی اس حقیقت سے آگاہ تھا۔ ایک روز وہ معمول سے کچھ زیادہ ہی اداس نظر آرہا تھا۔

"تم ایک دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی ہو۔" لڑکے نے بات شروع کی۔

"ہاں۔" لڑکی نے تسلیم کیا۔ "میں اپنے والد کی دولت اور جائداد کی اکلوتی وارث ہوں جس کی مالیت پانچ کروڑ روپے ہے۔"

"اور میں غریب ہوں۔" لڑکے نے دیانت داری سے کام لیا۔

"بے شک۔" لڑکی نے کہا۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"ہرگز نہیں۔"

"مجھے معلوم تھا تم یہی جواب دو گی۔" لڑکا اداسی سے بولا۔

"تو پھر تم نے پوچھا ہی کیوں؟" لڑکی حیرت سے بولی۔

"بس میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ جب انسان کے ہاتھ سے پانچ کروڑ روپے جاتے ہیں تو وہ کیا محسوس کرتا ہے۔" لڑکے نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

ماہا ایمان ..... حافظ آباد

"تم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ بیس تھے۔"

"میں ہر کام ایمانداری سے کرنے کا قائل ہوں۔"

"سچ بتاؤ، یہ ایمانداری کا کام تم اس سے پہلے کتنی مرتبہ کر چکے ہو؟"

"اسے چھوڑو، یہ بتاؤ ہے نا مزیدار ایڈونچر۔"

"مزہ تو بہت آیا۔" اس نے کہا۔ "خطروں سے کھیلنا کتنا اچھا لگتا ہے لیکن میں دن بھر یہ بھی سوچتی رہی تھی اگر کبھی پکڑے گئے تو کیا ہوگا؟"

"تم دیکھتی جاؤ۔ میں چوری کو بھی سائنس بنا دوں گا، ایسی ایسی ترکیبیں وضع کروں گا کہ پکڑے جانے کا امکان ہی نہ رہے۔ تم ساتھ رہیں تو میرے لیے یہ کام مشکل نہیں۔"

"مجھے اپنا یہ شوق گھر والوں سے چھپ کر کرنا پڑتا ہے۔ میں ہر وقت تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"ہم بھی ہر وقت تو سڑکوں پر لوٹ مار نہیں مچا سکتے۔ ایسا کرتے ہیں ہفتے کا دن مقرر کر لیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ہفتے کی رات۔ دوسرے دن اتوار ہوتا ہے، آرام کا موقع بھی مل جائے گا۔ میں تمہیں یہیں مل جایا کروں گا۔ یہاں سے ہم جائیں گے جہاں بھی جانا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ابھی ہفتہ آنے میں چار دن باقی ہیں۔ میں ان علاقوں کا سروے کرتا ہوں جہاں ہم واردات کر سکتے ہیں۔"

ہم اگلے ہفتے ملنے کا وعدہ کر کے جدا ہو گئے، اس کا مجھے معلوم نہیں لیکن میں اپنے گھر آ گیا۔ اس ملاقات میں مجھے کئی باتیں معلوم ہوئی تھیں، اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ دو بھائی تھے اور ایک بہن جو معذور تھی۔ والدہ تھیں، وہ بھی بیمار رہتی تھیں۔ ایک بھائی ڈاکٹر تھا دوسرا کسی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ دونوں شادی شدہ تھے اور گھر کی اوپری منزل پر رہتے تھے۔ نچلے حصے میں وہ، اس کی معذور بہن اور والدہ رہتی تھیں۔ اس نے بتایا نہیں لیکن اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بھائیوں سے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ اسی لیے وہ چھوٹی موٹی وارداتیں کر کے اپنا خرچ چلا رہی ہے۔ میں اور وہ ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ وہ بھی میری طرح دن کے وقت ایک اسکول میں پڑھاتی تھی اور رات کے وقت بسوں میں سفر کر کے اپنی آمدنی بڑھاتی تھی۔ حلیہ اور وضع قطع ایسی تھی کہ کوئی اس پر شک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ماں سے اس نے یہ کہا ہوا تھا کہ وہ رات کے وقت ایک نائٹ اسکول میں پڑھانے کے لیے جاتی ہے۔

میں گھر کے سناٹے میں بیٹھا تھا۔ کبھی سائرہ کے بارے میں سوچنے لگتا کبھی شہلا کی طرف دھیان چلا جاتا تھا۔ شہلا میری کمائی کا ذریعہ تھی، سائرہ میرا مستقبل۔ دونوں کشتیاں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ کبھی میں ایک کشتی میں بیٹھ جاتا تو کبھی دوسری کشتی میں سوار ہو جاتا تھا۔ اس سناٹے میں اچانک کسی نے آواز لگائی۔ اماں کی آواز تھی۔ وہ مجھے بلا رہی تھیں۔ وہ جب بلاتی تھیں تو اتنی فرصت بھی نہیں دیتی تھیں کہ کوئی پاؤں میں چپل ہی ڈال لے۔ اس وقت بھی میں ننگے پاؤں دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔

"کتنی دیر سے بلا رہی ہوں۔ جانے کن خیالوں میں گم رہتا ہے۔"

"ذرا آنکھ لگ گئی تھی اماں۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی، صالحہ آئی تھی۔ اب تو سنجیدہ ہو جا۔ شگفتہ کب سے تیرے نام پر بیٹھی ہوئی ہے۔"

"اماں، میں خود آپ سے کچھ کہنے والا تھا۔"

"شگفتہ کے سلسلے میں؟"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ میرے دفتر میں ایک لڑکی ہے، مجھے پسند کرنے لگی ہے۔"

"جو لڑکیاں خود پرائے لڑکوں کو پسند کرنے لگیں، سوچ وہ کیسی ہوں گی۔"

"نہیں اماں، وہ بہت اچھی ہے۔"

"تجھے بھی پسند ہے تو اسی سے کر لے۔ کہیں تو کر۔ اب نہیں ہوتا مجھ سے گھر کا کام دھندا۔"

"وہ لڑکی بہت پیسے والی ہے۔"

"اچھا ہے نوکر چاکر ساتھ لائے گی۔ وہیں کر لے، میں صالحہ سے کوئی بہانہ کر دوں گی۔"

"میں پہلے اس کے معیار کا بنوں گا پھر کروں گا اس سے شادی۔"

"بیٹا، میری عمر اتنا انتظار کرے گی؟"

"اماں، ابھی تمہاری عمر ہی کتنی ہے، یہی کوئی بیس یا بائیس سال۔"

"ہر بات کو مذاق میں مت ٹالا کر۔ جب تک تو دولت جمع کرے گا وہ کسی اور کی ہو جائے گی۔ عشق کا بھوت ہمیشہ سر پر سوار نہیں رہتا۔ یا تو ابھی اس سے شادی کر لے، نہیں کر سکتا تو شگفتہ سے کر لے ورنہ ایک دن وہ آئے گا نہ میں رہوں گی، نہ وہ لڑکی اور نہ شگفتہ تیرے نام پر بیٹھی رہے گی۔ دولت درختوں سے نہیں جھڑتی۔ جو پیسے والے ہوتے ہیں، وہ ہوتے ہیں۔ تو ہزاروں کما لے گا لاکھوں پھر بھی نہیں کما سکے گا۔ اتنا تیز مت دوڑو کہ اوندھے منہ گر پڑو۔ یہ ہمارے بڑوں نے کہا ہے۔"

اماں کی باتیں دل کو ضرور لگی تھیں لیکن ذہن انہیں قبول نہیں کر سکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ دنوں یہ وارداتیں کروں گا اور پھر کوئی بزنس کر کے ٹھاٹ سے زندگی گزاروں گا۔

دیکھتے دیکھتے چار دن گزر گئے تھے۔ ہفتے کی رات کو میں شہلا کے ساتھ نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس رات بھی یہی ہوا۔ کئی گاڑیاں ہمیں منہ چڑاتی ہوئی گزر گئیں اور پھر ایک مرغا پھنس



گیا۔ اس کے ساتھ بھی ہم نے وہی کیا جو پہلے کے ساتھ کر چکے تھے لیکن اس مرتبہ کاروبار میں نقصان ہو گیا۔ اس بندۂ خدا کے والٹ میں صرف پانچ ہزار روپے تھے۔ سونے کی ایک انگوٹھی تھی جو میں نے اتروا لی۔ نہایت معمولی قسم کا موبائل تھا جو احتیاطاً چھین لیا۔

اس واردات کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کوئی شکار ایسا بھی تو ہو سکتا ہے جس کے والٹ میں صرف ہزار کا نوٹ منہ چڑا رہا ہو۔ اپنی جان کو خطرے میں بھی ڈالیں اور معمولی رقموں کے پیچھے دوڑتے رہیں۔ اس طرح تو واقعی بہت دیر ہو جائے گی کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جس میں چند مہینوں میں لکھ پتی بنا جا سکے اور خطرے کا امکان بھی کم سے کم ہو۔

میں ان ترکیبوں پر غور بھی کرتا رہا لیکن شہلا کے ساتھ مل کر وارداتیں بھی کرتا رہا۔ کبھی کوئی لمبا ہاتھ لگ جاتا اور کبھی ہزار دو ہزار پر ہی بات ٹل جاتی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں سائرہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ گیا تھا۔ جیب میں اتنے پیسے ضرور رہنے لگے تھے کہ اسے چائے پلانے کے لیے کسی اچھے ہوٹل میں لے جا سکوں۔

شہلا میری پارٹنر تھی دوست نہیں تھی لیکن ہر وقت کی قربت نے رشتوں کو بدل دیا۔ میں غیر محسوس طریقے سے اس کے قریب جانے لگا۔ اب ہم روزانہ ملنے لگے تھے۔ بیشتر باتیں آمدنی بڑھانے سے متعلق ہوتی تھیں لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں کرنے لگے تھے۔

ایک شام میں اس کے ساتھ پارک میں بیٹھا تھا کہ سائرہ کی یاد آ گئی۔ میں نے ذہن کے ترازو میں دونوں کا وزن کیا۔ ایک طرف شہلا تھی ایک طرف سائرہ۔ میں نے تجزیہ کیا۔ سائرہ سے میں جب بھی ملتا تھا ایک قسم کی شرمندگی اور کمتری کا احساس رہتا تھا جبکہ شہلا کے ساتھ برابری سے ملتا تھا بلکہ اس کے مقابلے میں میری حیثیت زیادہ تھی۔ وہ زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ میری مرہون منت رہ سکتی تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ جس راستے پر میرے ساتھ چلی ہے، میں اس کے ایک ایک قدم کا عینی شاہد ہوں۔ وہ کبھی میرے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکے گی۔ وہ احساس فخر اس کے چہرے سے کبھی ظاہر نہیں ہوگا جو سائرہ کی پیشانی سے جھلکتا رہتا تھا۔

میری سوچوں پر میری گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ میں جب دفتر جاتا اور سائرہ سے سامنا ہوتا تو میرا دل اس کی طرف جھکنے لگتا، شہلا سے ملاقات ہوتی تو اس کے حق میں فیصلہ کر لیتا۔ ایک دل میں دو محبتیں آباد ہو سکتی ہیں..... کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

کچھ دنوں سے اخبارات میں ہم سے متعلق خبریں شائع ہونے لگی تھیں۔ اخباروں میں سرخیاں لگ رہی تھیں کہ ایک جوڑا ہے جو کار والوں سے لفٹ لیتا ہے اور راستے میں انہیں لوٹ لیتا ہے۔ ان سے ہوشیار رہا جائے۔ ان خبروں میں شہلا کا حلیہ واضح طور پر شائع ہو رہا تھا۔ سنہری لمبے بالوں کا خاص طور پر ذکر کیا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے بالوں کی کٹنگ کرا لے۔ اسے اپنے بال بہت عزیز تھے، وہ تیار نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے آمادہ کرنے کے لیے اپنی پسند شامل کر دی۔

"مجھے لڑکیوں پر اسٹیپ کٹنگ بہت اچھی لگتی ہے۔"

"آپ کو اچھی لگتی ہے تو میں آج ہی بیوٹی پارلر چلی جاؤں گی۔"

"تمہیں میری پسند اتنی عزیز ہے؟"

"شاید اس سے بھی زیادہ جتنا آپ سوچ سکتے ہیں۔"

"شہلا، ہمیں ایک حادثے نے ملایا تھا۔ اب میں یہ نہیں چاہوں گا کہ کوئی حادثہ ہمیں جدا کر دے۔ پولیس نے ہماری وارداتوں کا نوٹس لے لیا ہے۔ لوگ بھی باخبر ہو گئے ہیں اور پولیس بھی الرٹ ہے۔ گشت بڑھا دیا گیا ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ہمیں محتاط ہونا پڑے گا۔"

"ہم کچھ اور بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"ہم کسی سے لفٹ لینے کے بجائے ٹیکسی والوں کو لوٹ سکتے ہیں۔"

"ممکن تو ہے لیکن ان کے پاس سے کتنے پیسے نکل سکتے ہیں۔ دن بھر کی کمائی بھی ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہوگی، میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ اگر تم ساتھ دو۔"

"میں تو اب آپ کے ساتھ ہی ہوں۔"

"میں ایک میرج بیورو کھولنے کے حق میں ہوں۔"

"آپ کو معلوم ہے، میں تو ایڈونچر چاہتی ہوں۔ اس سیدھے سادے بزنس میں کوئی سسپنس تو ہے نہیں۔ لوگ آئیں گے، اپنے بچوں کی رجسٹریشن کرائیں گے اور ہم ان کی ملاقات ایک دوسرے سے کرائیں گے۔ یہ تو بڑا خشک بزنس ہے۔"

"ہمارا یہ دفتر عام شادی دفتروں سے مختلف ہوگا۔ اس میں کوئی رجسٹریشن نہیں ہوگی۔ اس میں صرف تم رجسٹرڈ ہوگی۔"

"میں رجسٹر ہوں گی.....؟"

"ہاں تم ہی وہ لڑکی ہو گی جس کے لیے امیدوار آئیں گے۔"

"عجیب اب زیادہ تنگ مت کرو، کیا کرنے والے ہو صاف صاف بتاؤ۔"

"وقت آنے پر بتا دوں گا۔ اسکیم ایسی ہے کہ ہم چند مہینوں میں لکھ پتی ہو جائیں گے۔ پھر تمہاری شادی ہو جائے گی۔ میرج بیورو پر تالا پڑ جائے گا۔ پھر ہم کچھ اور سوچیں گے۔"

"شادی کے بعد میں تمہارا ساتھ کیسے دے سکوں گی؟"

"اس لیے کہ میں تمہارے ساتھ ہی ہوں گا، تم سے شادی کرنے والا میں ہی تو ہوں گا۔"

اس کے چہرے کی سفید جلد سرخ ہو گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔ میں بھی اتنی بڑی بات اچانک کہہ کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

"عجیب، تمہاری زبان سے یہ بات سننے کے لیے میرے کان ترس رہے تھے۔ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں یہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"بس اب مجھے کسی اچھی جگہ دفتر کا انتظام کرنا ہے۔"

"میرے پاس ایک لاکھ روپے ہیں، اگر تمہیں ضرورت ہو۔۔۔"

"اس میں کیا ہو گا۔ میں کچھ اور سوچوں گا۔"

سچ یہ ہے کہ اس وقت تک میں نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ شہلا سے بات کرنے کے بعد میں نے سنجیدگی سے غور کیا۔ سائرہ کا خیال آیا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا وہ بزنس کے لیے اپنے ڈیڈی سے رقم دلا سکتی ہے لیکن جی نہیں چاہا کہ اس کا احسان لوں۔ کئی دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔ پھر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ میں اگر اپنا مکان بیچ دوں اور چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لوں تو اتنی رقم مل سکتی ہے کہ کسی پوش علاقے میں شاندار دفتر کھول سکوں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اماں سے بات کی لیکن یہ مکان ان کے بقول ان کے میاں کی نشانی تھی۔ وہ اسے بیچنے پر قطعی تیار نہیں تھیں۔ ہماری ضرورت سے کہیں بڑا مکان چھوڑ کر کسی اور مکان میں رہنا انہیں پسند ہی نہیں تھا۔ میں اٹھتے بیٹھتے انہیں سمجھاتا رہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ میں ان کی طرف سے مایوس ہو کر سائرہ سے بات کرنے ہی والا تھا کہ اماں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ بیمار تو وہ رہتی ہی تھیں لیکن اب طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ میں انہیں اسپتال لے گیا جہاں انہیں داخل کر لیا گیا۔

ان کی حالت بگڑتی چلی گئی اور تین چار دن ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس دنیا میں ایک وہی میرا سہارا تھیں۔ یوں لگا جیسے میں اچانک چھاؤں سے دھوپ میں آ گیا ہوں کچھ دنوں تو یہ رہا کہ نہ سائرہ مجھے یاد رہی نہ شہلا۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے مکان کو دیکھا جو اب پہلے سے بھی زیادہ خالی ہو گیا تھا۔

میں نے مکان کی فروخت کے لیے اخبار میں اشتہار دے دیا۔ اب اماں اس دنیا میں نہیں تھیں۔ اب مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔

ان دنوں قیمتیں بہت بڑھی ہوئی تھیں مجھے بہت اچھے پیسے مل گئے۔ میں نے ایک فیشن ایبل علاقے میں ایک دفتر کرائے پر لے لیا۔ اپنے رہنے کے لیے بھی اسی دفتر میں ایک کمرا مخصوص کر لیا۔

شہلا کو میں سمجھا چکا تھا کہ دفتر میں نے کس مقصد کے لیے لیا ہے اور اس کا کیا کردار ہو گا۔

ان اخراجات کے بعد پانچ لاکھ روپے جو باقی بچے تھے وہ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں رکھوا دیے۔

میں نے اخبار میں اشتہار دے دیا کہ ہمارے پاس ایک ایسی لڑکی ہے جو نہایت خوبصورت، کم عمر ہے اور نہایت اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر آپ اس کے معیار پر پورے اترے یا اس نے آپ کو قبول کر لیا تو خوش قسمتی آپ کے دروازے پر دستک دے گی۔

میں اس دفتر کا منیجر تھا اور شہلا وہ لڑکی تھی جس کے لیے اشتہار دیا گیا تھا۔ میں دفتر سے آ کر اپنے میرج بیورو میں بیٹھ جاتا تھا۔ کیونکہ اب تو میری قیام گاہ بھی یہی تھی۔ شہلا بھی یہیں آ جاتی تھی۔ کوئی رشتہ آئے نہ آئے شہلا تو میرے ساتھ تھی۔ چار دن گزر گئے تو مجھے خیال آیا اشتہار کے جواب میں کوئی آیا ہی نہیں۔ میں نے ایک اشتہار اور دے دیا۔

اس شام میں اور شہلا حسبِ معمول دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بیل بجی۔ میں نے شہلا کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور خود دروازہ کھول دیا۔ ایک صاحب جن کی عمر چالیس کے قریب ہو گی، دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں اندر آنے کے لیے کہا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"فرمایئے، میں کیا خدمت کروں آپ کی؟"

"میرا نام نوید احسن ہے، آپ کے اشتہار کے سلسلے میں آیا ہوں۔"

"پانچ ہزار روپے ہماری رجسٹریشن فیس ہے جو ناقابلِ واپسی ہے۔ شادی کے لیے ضروری ہے لڑکی آپ کو پسند کر لے۔ اس کے بارے میں تحقیق وغیرہ آپ خود کریں گے۔ ایک رجسٹریشن ایک لڑکی کے لیے ہے۔ ہم زیادہ کیس نہیں لیتے۔ کوئی دوسری لڑکی آئی تو اس کے لیے اشتہار الگ ہو گا۔ جب تک اس لڑکی کی شادی نہیں ہو جاتی ہم دوسرا اشتہار نہیں دیں گے۔"

ان صاحب نے ان شرائط کو قبول کر لیا۔ میں نے فیس وصول کی اور ان سے ایک فارم پر کرا لیا جس پر ان سے متعلق ضروری معلومات لی گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے، آپ کل تشریف لائیے۔ میں اس لڑکی کو کل بلوا لوں گا۔ آپ اس سے ملاقات کر سکیں گے۔"

وہ صاحب چلے گئے تو ایک اور امیدوار آ گیا۔ اسے بھی میں نے شرائط بتائیں اور فیس وصول کر لی۔ اس سے کہا کہ آپ پرسوں آئیے اور وہ بھی چلا گیا۔

بیٹھے بٹھائے میرے پاس دس ہزار آ گئے تھے اور وہ بھی ایک دن میں۔ ان کے جانے کے بعد شہلا بھی کمرے سے نکل آئی۔ وہ بھی بہت خوش تھی کہ کسی خطرے میں پڑے بغیر دس ہزار آ گئے۔ اس سے منافع بخش کاروبار اور کیا ہو گا۔

دوسرے دن وہ خوب تیار ہو کر آئی اور اس کمرے میں بیٹھ گئی جو ہم نے ملاقاتیوں کے لیے مخصوص کیا تھا۔ آنے والے کی تواضع کے لیے میں نے کولڈ ڈرنک اور کچھ بسکٹ بھی منگوا لیے۔ پانچ ہزار میں سے اتنا خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

امیدوار آ گیا تو میں نے اسے شہلا کے پاس بھیج دیا۔ میں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے اور میں کمرے سے باہر آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

تقریباً پون گھنٹے کے بعد وہ صاحب باہر آئے تو بہت مایوس تھے۔ میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ پروگرام کے مطابق شہلا ان کے سامنے باہر آئی اور دفتر سے باہر نکل گئی۔

"کیا رہا نوید صاحب۔" میں نے ان سے پوچھا۔

"بات بنی نہیں۔ وہ لڑکی کہتی ہے میری عمر زیادہ ہے جبکہ کوئی بات میں نے چھپائی نہیں تھی۔ فارم میں لکھ دی تھی، مجھے بلانا ہی نہیں تھا۔ میری دی ہوئی فیس واپس ہو جاتی۔"

"آپ نے یہی بات اس سے نہیں کہی۔"

"کہا تھا میں نے۔ فرمانے لگیں بعض لوگ دیکھنے میں کم عمر نظر آتے ہیں مگر آپ کی عمر تو ظاہر ہوتی ہے۔"

"ارے صاحب، کچھ نہ پوچھیے، بڑے نخرے ہو گئے ہیں، بڑے گھروں کی لڑکیاں ہیں انہیں کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ ہم تو بیچ کے لوگ ہیں باتیں تو ہمیں سننے کو ملتی ہیں۔"

وہ صاحب چلے گئے۔ دوسرے دن شہلا پھر آ گئی۔ تھوڑی دیر میں امیدوار بھی آ گیا۔ اسی طرح ملاقات ہوئی، شہلا نے اسے بھی ناپسند کر کے باہر بھیج دیا۔ اسی دن ایک رجسٹریشن اور ہو گئی۔

میرے کاروبار میں برکت ہو رہی تھی۔ ایک مہینے میں نوے ہزار میرے پاس آ چکے تھے۔ میں نے الفاظ میں ردوبدل کر کے ایک اشتہار اور دے دیا۔ الفاظ سے ظاہر ہو رہا تھا، یہ کوئی دوسری لڑکی ہے۔ بس مجھے یہ خیال رکھنا تھا کہ ان امیدواروں میں سے کوئی دوبارہ نہ آ جائے جو پہلے آ چکے ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں تھا۔

دوسرے تیسرے دن کوئی امیدوار آ جاتا تھا اور شہلا کو یہی ڈراما کرنا پڑتا تھا۔ اتنے امیدواروں میں سے وہ کسی کو بھی منتخب نہیں کر سکی تھی۔ کرنا بھی نہیں تھا۔ یہی تو میری اسکیم کا حصہ تھا۔

یہ کاروبار کرتے ہوئے ہمیں پانچ مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ لوگ آرام سے لٹ رہے تھے۔ چار لاکھ روپے ہم کما چکے تھے، دو لاکھ میں نے شہلا کو دیے، دو لاکھ میرے پاس تھے۔ میں نے شہلا سے کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال ہم اور یہ کاروبار کریں گے اس کے بعد اتنی


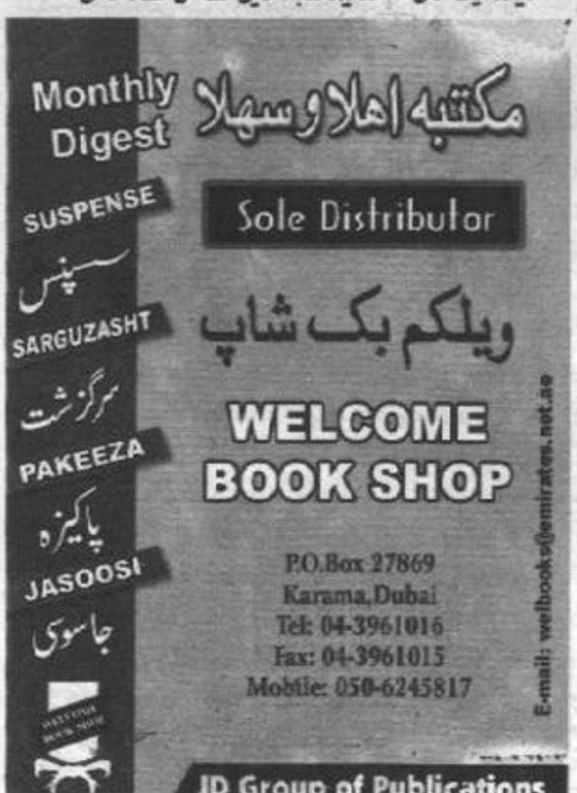

دولت کما چکے ہوں گے کہ آرام سے شادی کرلیں گے۔ شادی کے بعد بھی اگر یہ کاروبار کرنا پڑا تو ہم کسی لڑکی کا بندوبست کرلیں گے۔

''شادی کے بعد بھی چند سال تک تو میں لڑکی رہوں گی۔ کسی اور لڑکی کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ ایک شاندار سی گاڑی لوں گا جو تمہارے نام ہوگی۔''

''کتنا مزہ آئے گا عجیب۔''

ہم جب بیٹھتے تھے یہی باتیں کرتے تھے۔ سائرہ کو اب میں نے بالکل ہی نظرانداز کردیا تھا۔ میں اب اسے اچھے سے اچھے ہوٹل میں کھانا کھلا سکتا تھا لیکن اب تو مجھ پر شہلا کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ دفتر میں سائرہ سے بات ضرور ہوجاتی تھی لیکن میرے پاس ایک اچھا بہانہ تھا کہ میں کوشش کررہا ہوں، تمہارے معیار کے مطابق زندگی گزار سکوں۔

دفتر میں اتنے طعنے اسے مل رہے تھے کہ اس نے نوکری چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ کوئی مجبور لڑکی تو تھی نہیں کہ نوکری چھوڑتے ہوئے اسے دکھ ہوتا۔ وہ ایک روز میرے پاس آئی اور مجھے بتایا کہ وہ استعفیٰ دے چکی ہے۔

''میں اب زیادہ دن لوگوں کی نگاہوں کا سامنا نہیں کرسکتی۔ میں نے تم سے محبت کی تھی لیکن تم نے میری قدر نہیں کی۔ میں تم سے وہ محبت کرتی ہوں جو تم نے ناولوں میں پڑھی ہوگی مگر تم معیار کی تلاش میں مجھ سے دور ہوتے چلے گئے۔ کبھی تمہیں پچھتاوا ہو تو میرے پاس چلے آنا۔ اگر میں اس وقت تک کسی اور کی نہیں ہوگئی تو تمہارا استقبال ضرور کروں گی۔''

اس نے میرے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور اٹھ کر چلی گئی تھی۔ میں بھی ایسا سنگ دل بن گیا تھا کہ اسے روکنے کی کوشش تک نہیں کی تھی۔

ایک روز میں اپنے میرج بیورو کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک نہایت خوبصورت لڑکا امیدوار کی حیثیت سے میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے فارم وغیرہ بھروالیا اور اسے دوسرے دن آنے کا کہہ دیا۔ شہلا کو بھی میں نے بتادیا۔

دوسرے دن شہلا آگئی۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکا بھی آگیا۔ میں نے اسے اس کمرے میں بھیج دیا جہاں شہلا بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ ''لو، ایک اور شکار قربان ہوا۔''

ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا اور انٹرویو ختم نہیں ہوا تھا۔ مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔ اتنا وقت عام طور پر لگتا نہیں تھا۔ میں نے انٹرکام پر شہلا سے بات کی۔

کوئی پانچ منٹ بعد وہ لڑکا باہر آیا اور میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ شہلا دفتر سے باہر نکل گئی۔ وہ ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کرتی تھی اس لیے میرے لیے اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

''میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ شہلا نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ اس لیے شرائط کے مطابق میں بیس ہزار مزید آپ کو دینے کا پابند ہوں۔'' اس نے رقم نکال کر میری میز پر رکھ دی۔

''مجھے پوچھنے تو دیجیے کہ اس نے آپ کو پسند کیا بھی ہے یا نہیں۔''

''اگر پسند نہ کیا ہوتا تو یہ بیس ہزار مجھے کاٹ نہیں رہے تھے جو میں آپ کو دے رہا ہوں، اب مزید معلومات اور تحقیق میری ذمے داری ہے۔''

''نہیں، وہ آپ کو پسند نہیں کرسکتی۔ آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔ اٹھاؤ اپنے پیسے۔'' میں نے اس کے دیے ہوئے نوٹوں کو ہوا میں اڑا دیا۔

''آپ پاگل تو نہیں ہیں۔'' نوجوان نے کہا اور آفس سے نکل گیا۔

اس کے نکلتے ہی میں نے جلدی جلدی دفتر کو تالا لگایا۔ باہر کی طرف بھاگا اور رکشا پکڑ کر اس جگہ پہنچا جہاں شہلا سے ملا کرتا تھا۔ یہاں پہنچ کر پہلی مرتبہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں بے وقوف ہوں۔ اس سے ملنے سے سروکار رکھا اور اس کے گھر کا پتا تک معلوم نہیں کیا۔ اس نے کہا تھا، یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر اس کا مکان ہے۔ میں اس طرف دوڑ پڑا۔ کسی مکان کی پیشانی پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ سب مکان ایک سے تھے۔ دروازوں سے باتیں کرتے کرتے گلی ختم ہوگئی۔ کس مکان پر دستک دوں۔ کون سے گھر میں شہلا ہے، ایک بچے سے پوچھا، شہلا کہاں رہتی ہے تو وہ کندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا۔ پھر میں خود پر ہنس پڑا۔ شہلا کا نمبر بھی تو میرے پاس ہے۔ میں موبائل پر اس سے بات کیوں نہیں کرلیتا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ گھبراہٹ میں موبائل دفتر میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ نمبر زبانی یاد نہیں تھا، میں دوبارہ دفتر آگیا۔ اس کا نمبر ملایا۔ موبائل بند جارہا تھا۔ ہوسکتا ہے اس وقت وہ کسی ایسی جگہ ہو جہاں موبائل بند کرنا پڑا ہو، کچھ دیر بعد ملا کر دیکھوں گا۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ میں نے رجسٹر کھول کر دیکھا۔ ایک امیدوار کو اگلے دن آنا تھا۔ اگر شہلا کل نہیں آئی؟..... وہ آئے گی۔ اگر اس نے کسی کے حق میں فیصلہ کر بھی لیا ہے تو میری خاطر آئے گی ضرور۔ وہ شخص جھوٹ بول رہا ہوگا۔ شہلا مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ کسی اور کے حق میں فیصلہ کیسے کرسکتی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس وقت کوئی امیدوار آگیا تو اس کے



استقبال کے بجائے اس کی بے عزتی کر بیٹھوں گا لہٰذا میں ایک مرتبہ پھر دفتر سے نکل گیا۔

وہ رات میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح ہوئی تو اپنے آفس پہنچ گیا۔ نوکری تو بہرحال کرنا تھی۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سائرہ نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ اس کی سیٹ خالی پڑی تھی۔ اسے استعفیٰ دیے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا تھا لیکن میرے لیے تو جیسے وہ آج ہی گئی تھی۔

میں اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ فائلیں رکھی تھیں انہیں نمٹانا تھا۔ میں ان میں مصروف ہوگیا۔ کام کرتے ہوئے اچانک مجھے یاد آیا کہ شہلا اسکول میں بھی تو پڑھاتی ہے۔ اسکول کا نام اس نے بتایا بھی تھا۔ ذرا یاد کیا تو نام یاد آگیا۔ میں نے سوچا اس کے اسکول جاؤں۔ وہ اسکول تو آئی ہوگی، اگر نہیں بھی آئی ہوگی تو اسکول سے اس کے گھر کا پتا مل جائے گا۔ میں اس کے اسکول چلا گیا۔ پرنسپل سے ملا۔ اس نے بتایا اس نام کی کوئی ٹیچر ان کے اسٹاف میں نہیں ہے۔ اس اسکول کی کوئی اور برانچ بھی نہیں تھی کہ وہاں دیکھ لیتا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ کسی اسکول میں نہیں پڑھاتی تھی۔

شام ہوئی اور میں اپنے میرج بیورو میں جا کر بیٹھ گیا کہ شاید شہلا آجائے۔ اس کا موبائل مسلسل بند جارہا تھا۔ امکان کم تھا کہ وہ آئے گی لیکن امید پر دنیا قائم ہے۔

شہلا نہیں آئی لیکن وہ امیدوار آگیا جس سے انٹرویو کی تاریخ طے تھی۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ آئے گا تو اس سے کیا کہنا ہے۔

''معاف کیجیے۔ آپ ایک دن لیٹ ہوگئے۔''

''آپ نے جو تاریخ دی تھی میں تو اسی تاریخ پر آیا ہوں۔''

''جی ہاں، کل بھی ایک امیدوار کی ڈیٹ تھی۔ ان کا معاملہ طے ہوگیا۔ آپ کی فیس میں آپ کو واپس کیے دیتا ہوں۔ اب کوئی نیا اشتہار آئے تو آپ ضرور تشریف لائیے گا۔''

میں نے اس کی فیس واپس کی تو وہ خوش ہوگیا ورنہ تو گھبرا گیا تھا کہ فیس بھی گئی لڑکی بھی گئی۔

شہلا نہیں آئی، میں اس کے موبائل پر فون کرتا رہا لیکن شاید اس نے ''سم'' ہی بدل لی تھی، میں کئی دن اس کے علاقے کے چکر کاٹتا رہا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔

میں اتنے بڑے میرج بیورو کا کیا کرتا۔ میں نے وہ بلڈنگ چھوڑ دی اور اپنے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا۔

شہلا کی تلاش اب بھی جاری تھی۔ میں یونہی بے مقصد کسی بس میں بیٹھ جاتا کہ شاید وہ کہیں جیب کاٹتے ہوئے نظر آجائے پھر یہ سفر اس خیال سے رک گیا کہ اس نے تو شادی کرلی ہوگی۔ اب وہ کہاں نظر آئے گی۔

میں شہلا کی طرف سے مایوس ہوا تو سائرہ کی یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔ ''اگر کبھی پچھتاوا ہو تو میرے پاس چلے آنا۔ اگر میں کسی اور کی نہیں ہوگئی تو تمہارا استقبال ضرور کروں گی۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس سے ایڈریس پوچھا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ وہ میرے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑی تھی۔ ہم کئی مہینے بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر وہ ساکت کھڑی رہی پھر جیسے اسے ہوش آگیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔

''کتنے دن بعد میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ میں تو سمجھ رہی تھی تم اپنی گاڑی پر آؤ گے۔''

''میری گاڑی؟''

''تمہی نے تو کہا تھا کہ جب تم میرے معیار کے ہوجاؤ گے تو میرے پاس آؤ گے۔''

''میں نے غلط کہا تھا مگر تم نے بھی تو یہ کہا تھا کہ اگر کبھی پچھتاوا ہو تو میرے پاس چلے آنا۔ میں نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا لیکن چند لاکھ روپے سے زیادہ جمع نہ کرسکا۔''

''عجیب، تم تھے ہی عجیب سے۔ میں نے کبھی معیار کی بات نہیں کی لیکن تم محبت کو بھی معیار میں تولتے رہے۔ اب آگئے ہو تو جانا مت۔'' باتوں کے دوران ایک تصویر پر میری نظر پڑی اور میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''یہ تصویر کس کی ہے؟''

''میری بھابی ہیں۔ ابھی حال میں شادی ہوئی ہے۔''

''آپ کے خاندان کی ہیں؟''

''ارے نہیں، بھائی نے اپنی پسند سے کی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے، کچھ دیر بیٹھو تو ملواتی ہوں۔''

میں اس تصویر کو کیسے نہ پہچانتا۔ یہ شہلا تھی اور اس کے برابر میں وہی لڑکا تھا جس کے دیے ہوئے بیس ہزار میں نے ہوا میں اڑا دیے تھے۔ اب اگر میں شہلا کی حقیقت بتاتا تو اس کا گھر خراب ہوجاتا اور اگر شہلا مجھے دیکھ لیتی تو سائرہ پر میرا پول کھل جاتا۔ سائرہ کسی کام سے اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر گئی تو میں اس کے گھر سے نکل آیا، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ شہلا کو معلوم بھی نہ ہوا ہوگا کون آیا تھا اور کیوں چلا گیا۔ سائرہ نے پھر سوچا ہوگا میں بھی کتنا عجیب آدمی ہوں۔

# انجانے پہلو

ایچ اقبال

"محبت راز ہے ایسا کسی پر جو نہیں کھلتا... کبھی یہ خواب کی مورت، کبھی یہ چاند کی صورت... چنکتی مسکراتی ہے... حسیں اک گیت گاتی ہے..." چاہت کے دلگداز لمحات میں ہر دل کچھ ایسے ہی گنگناتا ہے ... آنکھوں میں کسی کے ساتھ کے سپنے ڈیرے ڈالتے ہیں... کسی کی باتوں کی خوشبو اپنے حصار میں رکھتی ہے۔ وہ بھی چاہتوں کے اس سفر پر بڑی سبک رفتاری سے گامزن تھی کہ اچانک پھولوں کی روش پر چلتے چلتے کانٹوں نے پیروں کو لہولہان کر ڈالا... وہ کہ جس پر محبت سایہ فگن تھی... دولت اس کی باندی اور حسن اس کا غلام تھا، اس کے باوجود وہ تہی دامن رہی... کبھی چاہتیں ضرورت بن کر اس کا امتحان لیتی رہیں اور کبھی ضرورتیں چاہتوں میں ڈھلتی رہیں... اس کے ساتھ بھی عجیب معاملات درپیش رہے۔ اسے کیا خبر تھی جسے وہ ذرہ سمجھ کر نظر انداز کر رہی ہے، کل وہی اس کے مقدر کا ستارہ بن کر اس کی نظر کا انداز ہی بدل ڈالے گا... جبکہ اس کے سر پر رسوائی کی خاک ڈالنے والے بھول رہے تھے کہ رفتہ رفتہ انہیں بھی اک روز خاک میں ہی مل جانا ہے۔

**منفی خیز حالات اور معاشرتی استحصال کا شکار، ایک حسینہ کی پرفگر داستان**

حیدر نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے آہستہ روی سے پھاٹک کی طرف لے جانے لگا۔ چوکیدار نے اسے کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انجن اسٹارٹ ہوتے ہی یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس کا صاحب کہیں جا رہا تھا۔ وہ جلدی سے پھاٹک کھولنے لگا۔

حیدر کی کار جیسے ہی پھاٹک کے قریب پہنچی، پھاٹک کے بالکل سامنے ایک رکشا آ کر رکا۔ اس میں تین افراد سوار تھے۔ ادھیڑ عمر ایک مرد اور ایک عورت! ان کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت نوجوان لڑکی تھی۔

حیدر ان تینوں کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ ان تینوں کے نام سے بھی واقف تھا۔ نوجوان لڑکی حمیدہ تھی جس کے ساتھ اس کے والدین تھے۔ ادھیڑ عمر مرد کا نام عدیل احمد اور اس کی بیوی کا نام قدسیہ تھا۔ وہ تینوں معمولی لیکن صاف ستھرے لباس میں تھے۔ ان کے ساتھ سامان بھی تھا لیکن مختصر! صرف ایک اٹیچی کیس!

رکشا والے نے ایک زائد فرد اور اٹیچی کیس کے باعث ان سے زیادہ ہی رقم طے کی ہوگی۔

حیدر نے کار تیزی سے ریورس کی۔ روش کے کنارے لگا ہوا ایک گملا کار کے پچھلے پہیے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ حیدر ان تینوں کو دیکھ کر ایسی ہی بوکھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

برآمدے کے سامنے کار روک کر، اترنے کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے اس نے ایک ملازم کو پکارا جو برآمدے کے قریب ہی تھا۔

ملازم لپک کر قریب آ گیا۔

حیدر نے کار سے اترتے ہوئے اسے بہ عجلت ہدایت کی۔ ''دیکھو کچھ لوگ آئے ہیں۔ چوکیدار انہیں شاید اندر نہ آنے دے۔ تم دوڑ کر جاؤ اور ان لوگوں کو چھوٹے ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔''

بنگلے میں دو ڈرائنگ روم تھے۔

ملازم دوڑتا ہوا پھاٹک کی طرف چلا گیا۔ حیدر نے اسے اس خیال سے دوڑایا تھا کہ چوکیدار ان ''معمولی'' نظر آنے والے لوگوں کے لیے رکاوٹ بنتا جس سے ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ ادھیڑ عمر میاں بیوی تو ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے لیکن حمیدہ مزاج کی بہت تیز تھی۔

چھوٹے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ صورتِ حال اس کے لیے بے حد پریشان کن تھی۔ اس میں اطمینان کا تھوڑا سا پہلو صرف یہ ضرور تھا کہ اس وقت اس کی بیوی مرینہ گھر میں نہیں تھی۔

رکشا سے آنے والے تینوں افراد اس کے لیے غیر نہیں، اس کے اپنے تھے۔ اس کے ماں باپ اور چھوٹی بہن حمیدہ! وہ لوگ لاہور میں رہتے تھے۔ حیدر دو سال پہلے کراچی آیا تھا اور اب امیر گھرانے کی ایک لڑکی مرینہ کا شوہر تھا۔ اس کی ساری شان و شوکت مرینہ ہی کے دم سے تھی۔

آنے والے تینوں افراد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو حیدر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کچھ کہنا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی حمیدہ ''بھیا'' کہتی ہوئی لپک کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

حیدر نے اس کا شانہ تھپکا اور اپنے والدین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ یہاں کیوں آ گئے بابو جی!''

''نہ آتے تو کیا کرتے!'' بوڑھی قدسیہ نے قریب آ کر اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ ''آنکھیں ترس گئی تھیں تجھے دیکھنے کے لیے! ہمیشہ خط میں لکھتا رہتا تھا کہ بس آؤں گا جلدی ہی، لیکن تیری جلدی پتا نہیں کون سی جلدی ہے۔''

بوڑھا عدیل احمد مسکراتا ہوا بولا۔ ''بس یہ حمیدہ سر ہو گئی تھی کہ ہم ہی چلے چلیں بھیا کے پاس۔''

''ہاں۔'' قدسیہ نے لقمہ دیا۔ ''کہہ رہی تھی، بھیا کو سرپرائز دیں گے۔''

حمیدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ''سرپرائز نہیں، سرپرائز اماں!''

''ارے ہوگا!'' قدسیہ نے سر جھٹکا۔ ''میں نے تیری طرح بارھویں کلاس تو پاس کی نہیں ہے۔''

''اچھا سب لوگ بیٹھ جائیں۔'' حیدر نے کہا۔ ''اور سکون سے میری بات سنیں۔''

''تم نے تو حیدر بڑی ترقی کر لی ہے۔'' عدیل احمد نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی طائرانہ نظریں آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم کی ہر شے پر پڑ رہی تھیں۔

''اب ہم نہیں رہیں گے۔'' حمیدہ چہکی۔ ''میں یہاں کسی کالج میں داخلہ لے کر ہی اے کر لوں گی۔''

''نہیں۔'' حیدر نے سختی سے کہا۔ ''تم تینوں کو یہاں سے ابھی واپس جانا ہوگا۔''

وہ تینوں جو اب تک بے حد خوش نظر آ رہے تھے، یک لخت سنجیدہ ہو کر حیدر کا منہ تکنے لگے۔

''ماں جی!'' حیدر نے قدسیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھ نہیں سکتیں، بلکہ تم تینوں ہی نہیں سمجھ سکتے کہ آج کی دنیا میں ترقی کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ مجھے بہت پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ میں نے یہاں کچھ جھوٹ بھی



بولے ہیں۔ خاص طور پر اپنی بیوی مرینہ سے کہہ چکا ہوں کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ تم لوگوں کو ہر مہینے اچھی خاصی رقم بھی بھیجتا رہا ہوں لیکن تم لوگ آئے بھی ہو تو اتنے معمولی کپڑوں میں۔''

''تمہاری ماں پر مکان بنانے کی دھن سوار ہو گئی ہے۔'' عدیل احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''سب پیسا جمع ہو رہا ہے۔''

اسی وقت اونچی ایڑی کے سینڈلوں کی ''کھٹ کھٹ'' سنائی دی۔ حیدر کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی کیونکہ آنے والی مرینہ ہی ہو سکتی تھی۔

حیدر جلدی سے بولا۔ ''تم لوگ.....''

اس کو اپنی بات مکمل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مرینہ اندر آ چکی تھی۔ اس نے حیدر کے والدین اور اس کی بہن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی پیشانی پر بل ڈال لیے اور حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ملازمت کے لیے آنے والوں کو کیا صوفوں پر بٹھایا جاتا ہے حیدر؟''

''وہ..... وہ دراصل.....'' حیدر ہکلا گیا۔

مرینہ فوراً ہی پھر بول پڑی۔ ''ان لوگوں کو ڈاکٹر افضال ہی نے بھیجا ہے نا؟ انہی سے ہم نے کہا تھا کہ ہمیں دو ادھیڑ عمر ملازموں کی ضرورت ہے لیکن یہ لڑکی!'' مرینہ نے تیکھی نظروں سے حمیدہ کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں اس کی ضرورت تو نہیں۔''

عدیل احمد اور قدسیہ تو اس دوران میں سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہے تھے لیکن حمیدہ کے چہرے کا رنگ بار بار بدل رہا تھا۔

یکایک مرینہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں ان تینوں سے کہا۔ ''کھڑے ہو کر اپنے بارے میں بات کرو۔ ملازمت کے لیے آئے ہو یا صوفوں پر بیٹھ کر لاٹ صاحبی دکھاؤ گے؟''

اس وقت حیدر کی تو جیسے جان نکلی ہوئی تھی۔ وہ اس ماحول میں شدید بے بسی کا شکار نظر آ رہا تھا۔

حمیدہ کے چہرے سے تنک مزاجی آشکارا ہونے لگی تھی۔ اس نے مرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ قدسیہ نے اس کا بازو بڑے زور سے دبایا اور خود کھڑے ہوئے کے ساتھ اسے بھی کھڑا کر دیا۔ ایسا ہی عدیل احمد نے بھی کیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' مرینہ نے عدیل احمد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا نام عدیل احمد ہے۔'' دھیمے لہجے میں جواب دیا گیا۔ ''یہ میری بیوی قدسیہ ہے اور یہ میری بیٹی ہے، حمیدہ۔''

''اچھا! تو یہ بیٹی ہے تمہاری؟ خیر! تم دونوں اسے اپنے ساتھ رکھ لو۔ تمہیں ایک سرونٹ کوارٹر مل جائے گا۔ ملازموں کو کھانا دینے میں بھی ہم لوگ کنجوس نہیں ہیں۔ تنخواہ بھی تم لوگوں کو اچھی ملے گی۔ ڈاکٹر افضال نے تمہیں بتا ہی دیا ہوگا کہ ملازمین کے ساتھ ہم کوئی زیادتی نہیں کرتے، لیکن کام صرف تم دونوں میاں بیوی کو کرنا ہوگا۔ یہ لڑکی خود کو سرونٹ کوارٹر تک محدود رکھے۔ اسے یہاں گھر کے اندر نہیں آنا چاہیے، البتہ میں اس کے بارے میں سوچوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ میں اسے بھی کسی مناسب کام پر لگا دوں، کیوں؟'' وہ حیدر کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''ٹھیک ہے نا حیدر!''

''ہوں۔'' حیدر نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ وہ اس وقت اپنے ماں باپ اور بہن سے نظریں چرا رہا تھا۔

عدیل احمد اور قدسیہ بڑی حسرت سے بیٹے کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن حمیدہ نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ صدمے سے بھی دوچار ہوئی ہو اور اسے غصہ بھی آ رہا ہو۔

مرینہ نے ایک ملازم کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا۔ ''ان تینوں کو لے جاؤ۔ جو سرونٹ کوارٹر خالی پڑا ہے، وہ دکھا دو انہیں۔'' پھر وہ عدیل احمد سے بولی۔ ''ابھی تو تم لوگ جا کے آرام کرو، کل صبح تمہیں تمہاری ذمے داریاں بتا دی جائیں گی۔''

عدیل احمد نے ایک نظر حیدر پر ڈالی، پھر اپنا اٹیچی کیس اٹھایا۔

اٹیچی کیس پر مرینہ کی نظر اب پڑی تھی۔ وہ بولی۔ ''اپنا سامان بھی اندر ہی لے آئے تھے؟ معلوم ہوتا ہے، پہلے بھی کسی گھر میں کام نہیں کیا۔''

''جی۔'' عدیل احمد نے کچھ بھرائی ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔ ''ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کوئی ایسا وقت بھی آئے گا۔''

''اوہ!'' اس مرتبہ مرینہ کے لہجے میں نرمی آ گئی۔ ''گویا تم لوگ حالات کے مارے ہوئے ہو۔'' اس نے جواب میں کچھ سننے کے بجائے مزید کہا۔ ''انسان پر بھلا برا وقت آتا ہی ہے۔ سمجھوتا کرنا پڑتا ہے اس سے۔''

عدیل احمد کچھ نہیں بولا۔ قدسیہ شروع ہی سے خاموش رہی تھی۔ حمیدہ کو بھی اس نے بولنے سے روک دیا تھا۔

ڈرائنگ روم سے جاتے جاتے حمیدہ نے ایک نظر حیدر پر ڈالی تھی۔ وہ اس وقت ایسی نظر آئی تھی جیسے رو پڑے

گی۔ حیدر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا تھا۔ مرینہ بھی اس وقت حیدر کی طرف متوجہ تھی اس لیے حمیدہ کی آنکھوں میں آجانے والی نمی وہ بھی نہ دیکھ سکی۔

"اب ٹھیک ہوجائے گا حیدر!" مرینہ کہہ رہی تھی۔ "عدیل احمد کو ہم گھر کا سودا سلف لانے یا اور چھوٹے موٹے کاموں پر لگا دیں گے۔ اس کی بیوی گھر کی صفائی کا خیال رکھا کرے گی۔ امجد کا کام اب صرف یہ رہ جائے گا کہ وہ گھر میں آنے والے مہمانوں کی آمد و رفت کا خیال رکھے، یوٹیلیٹی بلز جمع کرا دیا کرے۔ اس کے علاوہ اچانک کوئی کام پڑ جائے تو وہ بھی اس سے لیا جاسکے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہوں۔" حیدر نے پھر سر ہلا دیا۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہو۔" مرینہ ہنسی۔ "وہ لڑکی ..... کیا نام..... حمیدہ! اس کا خیال تو نہیں آرہا ہے تمہیں؟..... ہے وہ بہت خوبصورت! معلوم نہیں ہوتا کہ کسی معمولی گھر کی ہوگی۔ اگر فیشن ایبل لباس پہنے اور میک اپ کرے تو ہماری ہی سوسائٹی کی لگے گی۔" مرینہ کھلکھلائی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم ایسی لڑکیوں کو کن انکھیوں سے ضرور دیکھتے ہو۔"

حیدر کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ مرینہ نے یہ تبصرہ اس کی سگی بہن پر کیا تھا۔ یہ بات کسی بھی بھائی کے لیے ناقابل برداشت ہونا چاہیے لیکن حیدر نے اپنے جذبات قابو میں رکھے۔

مرینہ مسکراتے ہوئے کہتی رہی۔ "اسی لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ گھر میں آئے جائے اور تمہاری نظر اس کے سراپا کا کھوج لگانے لگے۔"

"بس کرو مرینہ!" حیدر چیخ پڑا۔

"ہوش میں تو ہو!" مرینہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"ایسا کیا کہہ دیا میں نے کہ آپے سے باہر ہونے لگے۔"

حیدر کی سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔ اس نے کہا۔ "تمہیں اپنے شوہر کے کردار پر گندگی نہیں اچھالنا چاہیے۔"

"میں نے کوئی گندگی نہیں اچھالی۔ جو کچھ کہا، وہ ایک فطری بات ہے۔ ہر مرد خوبصورت لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔"

حیدر ایک جھٹکے سے اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

مرینہ بڑبڑائی۔ "یہ تو پر پرزے نکالنے والی بات ہوئی۔" پھر اس نے اس طرح اپنے شانے جھٹکے جیسے اسے حیدر کے کسی بھی ردعمل کی ذرہ برابر پروا نہ ہو۔ وہ اب تک کھڑی ہی رہی تھی۔ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس نے سائڈ ٹیبل سے انگریزی کا ایک فیشن میگزین اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

☆☆☆

سرونٹ کوارٹر میں ضروریات کا مناسب سامان موجود تھا۔ دو چارپائیوں پر بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک چارپائی پر گم صم حمیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ عدیل احمد اور قدسیہ دوسری چارپائی پر تھے۔

"وہ حیدر کی بیوی معلوم ہوتی ہے۔" قدسیہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں۔" عدیل احمد نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ "باتیں کرنے کا انداز تو ایسا ہی تھا۔"

قدسیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اور اس نے ہمیں اطلاع تک نہیں دی کہ اس نے شادی کرلی ہے۔"

"خدا جانے، کن حالات میں اس نے اپنی یہ پوزیشن بنائی ہے۔"

"ہم سب کو جیتے جی مار کر۔" گم صم حمیدہ یکایک تڑخ کر بولی۔ "ہم سب کو مار کر یہ پوزیشن بنائی ہے بھیا نے! یہی کہہ رہے تھے نا وہ؟ یہاں انہوں نے سب سے کہا ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی نہیں ہے۔ وہ عورت تو ایسا لگتا ہے کہ بھیا پر حکومت کرتی ہوگی۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔" عدیل احمد ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ "وہ اب بہرحال تمہاری بھابی ہے۔"

"بھابی؟" حمیدہ تلخی سے بولی۔ "میں تو اب یہ سوچ رہی تھی کہ اب بھیا کو بھی بھیا کہوں یا نہ کہوں!"

"حمیدہ!" قدسیہ نے غصے سے کہا۔ "زیادہ بک بک نہ کرا!"

"بک بک نہیں ہے یہ اماں!" حمیدہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے ہمیں یہاں ملازمت کرنے کی! بس واپس اپنے گھر چلنے کے بارے میں سوچو۔ بھیا اگر ناراض ہو کر پیسے بھیجنا چھوڑتے ہیں تو چھوڑ دیں۔"

"تمہاری پڑھائی کا خرچ کیسے چلے گا؟" عدیل احمد بولا۔ "مجھ سے اب ٹیوشن نہیں پڑھائی جاتیں۔ بہت تھک گیا ہوں۔"

عدیل احمد ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر رہا تھا۔ اس نے ٹیوشن پڑھا کے اپنے بیٹے اور بیٹی کو پڑھایا تھا۔ حیدر نے میٹرک کرنے کے بعد ایک معمولی ملازمت کرلی تھی جس سے کچھ سہارا ہوگیا تھا مگر تین سال پہلے عدیل احمد ریٹائر ہوگیا تھا۔ ٹیوشن اس نے بہ مشکل جاری رکھے تھے۔ پھر اسے اس



مشکل سے نجات اس وقت ملی جب حیدر کو گریجویشن کرنے کے بعد ایک معقول ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت کے ایک ماہ بعد ہی اس نے اپنے گھر والوں کو بتایا کہ کراچی میں اس کے کسی دوست نے اس کے لیے ایک بہت ہی اچھی ملازمت ڈھونڈ لی ہے لہٰذا وہ کراچی جارہا ہے اور وہاں خود کو اچھی طرح "سیٹل" کرلینے کے بعد ان تینوں کو بھی اپنے پاس بلا لے گا۔

ماں باپ نے دل پر جبر کر کے بیٹے کو اجازت دے دی تھی۔ حیدر کراچی چلا آیا تھا۔ ایک ماہ بعد ہی اس نے ایک اچھی خاصی رقم اپنے گھر والوں کو بھیجی تھی اور بھیجتا ہی رہا تھا لیکن یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ وہ ان تینوں کو بھی کراچی بلا لیتا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے اس معاملے کو ٹالتا ہی رہا تھا۔ ماں باپ اور بہن اسے دیکھنے کو بھی ترس گئے تھے اس لیے آخرکار انہوں نے خود ہی کراچی کا رخ کیا۔ اسٹیشن پر رکشا والے نے کاغذ پر لکھا ہوا پتا دیکھ کر انہیں ان کی منزل پر پہنچا دیا تھا۔ حیدر کا خوب صورت بنگلا دیکھ کر ان تینوں کے دل باغ باغ ہوگئے تھے لیکن اس کے بعد جو صورت حال پیش آئی تھی، اس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اب حمیدہ کہہ رہی تھی۔ "جب حالات ایسے ہوجائیں تو ضروری نہیں کہ میں اپنی پڑھائی جاری رکھوں۔ مجھے کسی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی جگہ مل ہی جائے گی۔ گھر کا خرچ جیسے تیسے چل ہی جائے گا۔ ہمیں اس حرافہ کی ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

مرینہ کے لیے "حرافہ" کا لفظ استعمال کرنے پر قدسیہ نے اسے پھر ڈانٹا لیکن حمیدہ نے اس کا اثر نہیں لیا۔

"دیکھو بیٹا!" عدیل احمد نے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا۔ "ہمیں یہ سمجھنا ہی نہیں ہے کہ ہم یہاں ملازمت کررہے ہیں۔ یہ ہمارے بیٹے کا گھر ہے اور بیٹے کے گھر کی دیکھ بھال کرنا ماں باپ کے لیے توہین کی بات نہیں ہے۔"

"بیٹے کا گھر ہو، تب نا!" حمیدہ پھر تڑخی۔ "مجھے تو ایسا لگا ہے جیسے بھیا بھی یہاں ملازمت کررہے ہیں اس عورت کی۔"

"چند دن میں سب اندازہ ہوجائے گا۔" عدیل احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ ضروری بھی ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا بیٹا یہاں کس قسم کے حالات میں ہے۔"

"تو آپ ملازمت کرو گے یہاں!" حمیدہ جز بز ہوئی۔

"میں نے کہا نا کہ ہم اسے ملازمت نہیں سمجھیں گے، اپنے بیٹے کے گھر کی دیکھ بھال کریں گے۔"

حمیدہ نے نظریں جھکا لیں۔ وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

قدسیہ ایک شوہر پرست عورت تھی۔ اس نے عدیل احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم! کیوں ملازمت سمجھیں ہم اسے! بس اپنے بیٹے کے گھر کی دیکھ بھال کرنا ہے ہمیں۔"

حمیدہ جو کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی، سر اٹھا کر بولی۔ "میں تو یہاں کچھ نہیں کروں گی۔"

"تم سے تو اس نے کہا بھی یہی ہے۔" عدیل احمد نے کہا۔ "تمہیں سرونٹ کوارٹر تک محدود رہنا ہے۔"

حمیدہ بولی۔ "اس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ وہ میرے بارے میں سوچے گی کہ مجھے کس کام پر لگائے! اگر ایسا ہوا تو اسے مجھ سے بڑا کھرا جواب سننے کو ملے گا۔"

"حمیدہ!" عدیل احمد نے نرمی سے کہا۔ "تم بھی میرے جگر کا ٹکڑا ہو میری بچی! میں بھی ہرگز نہیں چاہ سکتا کہ تمہیں کوئی اذیت ہو لیکن جب تک حیدر کے معاملات پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں، تمہیں ضبط سے کام لینا ہوگا۔ تم اسے زہر کا گھونٹ سمجھ کر ہی پی جانا لیکن اسے اپنی بھابی ہی سمجھنا اور اس سے کوئی بدتمیزی نہیں کرنا۔"

حمیدہ کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ ماں سے تو وہ خوب زبان چلا لیتی تھی لیکن باپ کے سامنے اس کا انداز گفتگو کبھی تیز نہیں ہوا تھا۔

عدیل احمد اور قدسیہ نے بھی اس وقت خاموشی اختیار کرلی تاہم ان کے چہروں پر فکرمندانہ سنجیدگی پھیلی رہی۔

یکایک حمیدہ اٹھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

"کہاں چلی؟" قدسیہ نے جلدی سے پوچھا۔

"ذرا غور سے جائزہ تو لے آؤں اپنے بھیا اور بھابی کے گھر کا۔" حمیدہ نے رکے بغیر جواب دیا۔ "بھیا" اور بھابی" کہتے ہوئے اس کا لہجہ بڑا کٹیلا تھا۔

قدسیہ نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن عدیل احمد نے اسے اشارے سے خاموش کردیا۔

حمیدہ باہر نکلی۔ بنگلے کے پھاٹک سے کچھ آگے، پھاٹک کی بالکل سیدھ میں گیراج تھا۔ گیراج کے قریب ہی ایک بیرک سی بنی ہوئی تھی جس میں تین دروازے اور تین ہی کھڑکیاں تھیں۔ اس طرح ایک ہی بیرک میں تین کمرے بنائے گئے تھے جنہیں سرونٹ کوارٹرز کا نام دیا گیا تھا۔ عدیل احمد کو جو کرا دیا گیا تھا، وہ گیراج کے قریب تھا۔

بیرک کے سامنے ڈرائیو وے تھا جو گیراج کے پاس سے دائیں جانب گھومتا ہوا بنگلے کے برآمدے تک چلا گیا تھا۔ برآمدے کے سامنے خاصا وسیع و عریض لان تھا۔

لان میں ایک پودا ھالی کام کرتا نظر آیا۔ اس کی اچٹتی سی نظر حمیدہ پر پڑی تھی جس کے بعد وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا تھا۔ پھاٹک کے قریب کھڑا ہوا چوکیدار نسوار کی چٹکی اپنی داڑھ میں کسی جگہ پھنسا رہا تھا۔ حمیدہ پر اس نے بھی بس ایک بار اچٹتی سی نظر ڈالی تھی۔

ایک کوارٹر سے وہ ملازم نکلا جس نے عدیل احمد، قدسیہ اور حمیدہ کو بنگلے میں حیدر کے پاس پہنچایا تھا۔ وہ حمیدہ کو دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر کچھ عجیب سے انداز میں مسکراتا ہوا تیزی سے برآمدے کی طرف بڑھا۔ وہ جب تک زیادہ آگے نہیں بڑھ گیا تھا، کن انکھیوں سے حمیدہ کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے لگ بھگ ہوسکتی تھی۔ اس کی شکل صورت کوئی خاص نہیں تھی لیکن جسم بے حد متناسب تھا۔ وہ چست بنیان شاید اسی لیے پہنتا ہوگا کہ اپنے خوب صورت جسم کی خوبصورتی آشکارا کرسکے۔ اس کا سینہ چوڑا چکلا اور بھرے بھرے بازو خاصے بل دار سے تھے۔ بنیان کے ساتھ اس نے جینز پہن رکھی تھی۔ اس حلیے میں وہ کوئی گھریلو ملازم نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اس کا کن انکھیوں سے دیکھنا حمیدہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا لیکن یہ اس کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کے کالج کے وہ لڑکے جو بے باک نہیں تھے، اسے کن انکھیوں سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ تھی ہی اتنی خوبصورت اور اسے اپنی خوبصورتی کا احساس بھی تھا۔

کالج میں اس کی دوستی لڑکوں، لڑکیوں سبھی سے تھی۔ لڑکوں میں وارث اس کا بہت قریبی دوست تھا۔ ان کی دوستی اس حد تک آگے بڑھی ہوئی تھی کہ اگر اس حد سے آگے بڑھتی تو محبت میں تبدیل ہوجاتی۔

ممکن ہے کہ وہ دونوں لاشعوری طور پر ایک دوسرے سے محبت بھی کرنے لگے ہوں لیکن اظہار محبت کی نوبت شاید اسی لیے بھی نہیں آئی تھی کہ اگر ایسا کوئی معاملہ تھا تو وہ ابھی شعور کی سطح پر نہیں آیا تھا۔

حمیدہ سرونٹ کوارٹر کے قریب ہی ٹہلتی اور سوچتی رہی۔

وہ تیسرے پہر کا وقت تھا۔ مغربی سمت سرونٹ کوارٹرز کی طرف تھی اس لیے حمیدہ اس وقت سرونٹ کوارٹرز کی دیواروں کے سائے میں تھی۔ اس کے دماغ میں اس وقت صرف یہ خیال کھد بد رہا تھا کہ اس بنگلے میں رہنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ وہ فطری طور پر متجسس تھی اس لیے ہر معاملے میں اس کا جذبۂ تجسس انگڑائی لینے لگتا تھا۔

انتالیس سالہ ملازم اسے جس طرح کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا گزرا تھا، اسی کی وجہ سے حمیدہ کو خیال تھا کہ وہ اس کے لیے معلومات کا ذریعہ بن سکتا ہے، لیکن خود اس کی طرف متوجہ ہونا وہ مناسب نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ ملازم خود اس کی طرف متوجہ ہو۔ اس وقت تک حمیدہ کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس ملازم کا نام امجد تھا۔

کچھ دیر بعد امجد برآمدے کی طرف سے واپس آتا نظر آیا۔

حمیدہ نے قریب ہی ایک چوکور سا پتھر رکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہاں اس پتھر کی موجودگی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکی اور اس نے اس بارے میں غور نہیں کیا۔ بس چھونک مار کر پتھر کی گرد اڑائی اور نہایت بے پروایانہ انداز میں اس پتھر پر بیٹھ گئی۔ اب وہ امجد کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اسے خیال تھا کہ امجد اسے پتھر پر بیٹھ دیکھ کر ضرور اس کی طرف آئے گا۔

خیال درست ثابت ہوا۔ حمیدہ نے امجد کی طرف نہیں دیکھا لیکن محسوس کرلیا کہ وہ اس کی طرف آرہا تھا۔

"یہاں کیوں بیٹھ گئیں؟"

حمیدہ تیزی سے اس طرح اٹھی جیسے امجد کی آواز نے اسے چونکا دیا ہو۔

"بس یوں ہی۔" اس نے امجد کی طرف دیکھتے ہوئے بے پروایانہ انداز میں کہا، پھر اس نے پوچھا۔ "تم یہاں کب سے کام کررہے ہو؟"

"سال بھر سے زیادہ ہوگیا۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"امجد۔" اس نے حمیدہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک آگئی تھی۔

مردانہ آنکھوں کی وہ چمک کسی بھی عورت کے لیے بے معنی نہیں ہوتی۔ حمیدہ نے تو کالج کا ماحول دیکھا تھا۔ وہ اس چمک کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

وہ بولی۔ "میں یہاں بیٹھی تمہارے صاحب اور بیگم صاحبہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کوئی کاروبار ہے ان کا یا یہ کچھ اور کرتے ہیں؟"

"مزے کرتے ہیں۔" امجد نے ہنس کر جواب دیا۔

حمیدہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔

امجد بولا۔ "مطلب یہ کہ یہ کوئی کام نہیں کرتے۔ بیگم صاحبہ ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی ہیں۔ بھی شارب موٹرز کا نام سنا ہے؟"



"شارب موٹرز" کے نام نے حمیدہ کو چونکا دیا تھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ لاہور میں اس کے بھائی حیدر کو شارب موٹرز ہی میں ملازمت ملی تھی۔

"چونک کیوں گئیں؟" امجد بولا۔

حمیدہ کو جواب دینے کے لیے کوئی اچھا جواز نہ سوجھ سکا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "اخباروں میں اس کے اشتہار بہت چھپتے ہیں۔"

"بہت تو نہیں چھپتے۔" امجد نے جواب میں کہا۔ "بس اتوار کو وہ ایک اخباروں میں چھپتے ہیں۔ پاکستان کے سارے بڑے شہروں میں اس نام سے کاروں کے بہت بڑے بڑے شوروم ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بڑے صاحب کے بہت سے کاروبار ہیں۔ شارب موٹرز تو بڑے صاحب کے بیٹے شارب صاحب کا شوقیہ کاروبار ہے۔"

"بڑے صاحب؟" حمیدہ سوالیہ انداز میں کہہ کر چپ ہوگئی۔

"ان کا نام جاذب ہے، جاذب فاروقی۔" امجد نے جواب دیا۔ "لیکن جب سے ان کی ٹانگوں پر فالج گرا ہے، سارے کاروبار ان کے بیٹے شارب فاروقی ہی دیکھتے ہیں۔ انہیں ہم لوگ چھوٹے صاحب کہتے ہیں۔ بیگم صاحبہ ان کی چھوٹی بہن ہیں۔"

"وہ سب لوگ یہیں رہتے ہیں؟"

"نہیں۔" امجد نے جواب دیا۔ "ان کا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔ یہاں تو بس صاحب اور بیگم صاحبہ رہتے ہیں یا ہم ملازمین۔"

"کتنے ملازم ہیں؟"

"مالی ہے، چوکیدار ہے، ان دونوں کا سرونٹ کوارٹر وہ ہے۔" امجد نے بیرک کے اس دروازے کی طرف اشارہ کیا جو پھاٹک کی طرف کے سرے پر تھا۔ "بیچ والا کوارٹر میرا ہے۔ تم لوگوں کو جو کوارٹر دیا گیا ہے، اس میں پہلے دو ملازم اور رہتے تھے۔ پچھلے مہینے وہ ملازمت چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ تم لوگوں کو انہی کی جگہ رکھا گیا ہے۔"

"صرف میرے اماں ابا کو۔" حمیدہ نے جواب دیا۔ "مجھے تمہاری بیگم صاحبہ نے ملازم نہیں رکھا ہے۔ میں تو یہاں اپنے ماں باپ کی وجہ سے ہوں۔"

"یہ مت سمجھو۔" امجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیگم صاحبہ بہت موڈی ہیں، وہ کسی وقت تمہیں بھی کسی کام سے لگا سکتی ہیں۔ موڈی کا مطلب جانتی ہو؟"

"کیوں نہیں جانوں گی!" حمیدہ نے منہ بنا کر کہا۔



کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

"اسکول میں پڑھا ہے میں نے! چھ جماعتیں پاس ہوں۔" اس نے دانستہ جھوٹ بولا۔

"میں نے نمل کیا ہے۔" امجد فخریہ انداز میں بولا۔

"اوہ! تم مجھ سے زیادہ ایجوکیٹڈ ہو!" حمیدہ نے اپنی ماں کی طرح انگریزی کے ایک لفظ کا حلیہ بگاڑا۔

امجد ہنسا۔ "ایجوکیٹڈ نہیں، ایجوکینڈ۔"

"ہاں وہی۔" حمیدہ نے تیزی سے کہا۔ "جلدی میں منہ سے ایجوکیٹڈ نکل گیا۔"

اسی وقت سرونٹ کوارٹر کی طرف سے پکارا گیا۔

"حمیدہ!"

پکارنے والی قدسیہ تھی جو کھڑکی سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"آرہی ہوں اماں!" حمیدہ نے جواب دیا اور پھر امجد سے مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے سرونٹ کوارٹر کی طرف بڑھ گئی۔

جب وہ کوارٹر میں داخل ہوئی تو قدسیہ اسے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔ "کیا باتیں کر رہی تھی اس سے!"

حمیدہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اس گھر میں رہنے والوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ کون کون رہتا ہے یہاں، کتنے ملازم ہیں؟"

"یہ سب باتیں خود ہی معلوم ہو جاتیں۔" قدسیہ نے کہا۔ "یہاں تجھے سنبھل کر رہنا ہوگا حمیدہ! یہ ملازم تیرے اسکول یا کالج کا دوست نہیں ہے جس سے تو اتنی گھل مل کر باتیں کرے۔"

"اس سے مجھے ایک بڑی عجیب بات معلوم ہوئی ہے اماں!"

عدیل احمد جو خاموش بیٹھا رہا تھا، یکایک بول اٹھا۔

"عجیب بات کیسی؟"

"بھیا نے شارب موٹرز میں ملازمت کی تھی نا؟"

"ہاں! لاہور میں تو وہیں کی تھی، کیوں؟"

"یہ جو بیگم صاحبہ ہیں۔" حمیدہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہ شارب موٹرز کے مالک جاذب فاروقی کی صاحبزادی ہیں۔"

"اچھا!" عدیل احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔

حیرت کا تاثر قدسیہ کے چہرے پر بھی ابھرا تھا۔

"ہاں۔" حمیدہ بولی۔ "امجد نے مجھے یہی بتایا ہے۔"

"امجد کون؟" قدسیہ پوچھ بیٹھی۔

"وہی ملازم جس سے میں باتیں کر رہی تھی۔"

عدیل احمد اور قدسیہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں سے غور و فکر کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"یہ تو واقعی بڑی عجیب بات ہے۔" عدیل احمد بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "حیدر جس کا ملازم تھا، اسی کی بیٹی سے اس کی شادی آخر کیسے ہوگئی!"

قدسیہ خاموش رہی۔ وہ اپنے شوہر کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی۔

عدیل احمد پھر حمیدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "اور کیا بتایا اس نے؟"

"امجد نے؟"

"ہاں۔"

دوسری باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن حمیدہ نے سب کچھ بتا دیا۔

عدیل احمد نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر سوچ بچار کا تاثر قائم رہا تھا۔

قدسیہ نے حمیدہ سے کہا۔ "اب اس ملازم سے زیادہ گھلنے ملنے کی ضرورت نہیں!"

"میں کیوں ملوں گی!" حمیدہ جیسے چیخ کر بولی۔ "سرخاب کے پر تو لگے نہیں ہیں اس کے۔"

"کبھی کسی بات کا سیدھا جواب بھی دے دیا کر۔" قدسیہ نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

حمیدہ کچھ کہے بغیر چارپائی پر بیٹھ گئی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "سوئیں گے کیسے؟ چارپائیاں تو یہاں دو ہیں!"

"وہ ایک دری تہ کی ہوئی رکھی ہے۔" عدیل احمد نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں وہ بچھا لیا کروں گا فرش پر!"

"نہیں ابا!" حمیدہ بولی۔ "یہ اچھا نہیں لگے گا۔ آپ چارپائی پر ہی سونا۔ میں دوسری چارپائی پر اماں کے ساتھ لیٹ جایا کروں گی۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔" قدسیہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

حمیدہ بستر پر لیٹ گئی جو چارپائی پر پہلے ہی سے لگا ہوا تھا۔ عدیل احمد کی طرح اس کا دماغ بھی اسی بات میں الجھنے لگا کہ اس کے بھائی کی شادی اس لڑکی سے کیسے ہوگئی جو ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی اور حیدر جس کا ملازم تھا۔

دوسری چارپائی پر عدیل احمد اور قدسیہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ حمیدہ کو ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔



جب ایک ہی سوچ سے حمیدہ کا دماغ بری طرح تھک گیا تو وہ باپ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آپ دونوں تو کل سے یہاں ملازمت کرو گے۔ میں یہاں پڑے پڑے بور ہوتی رہوں گی۔ ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ میں شمع کے گھر چلی جاؤں گی۔"

شمع اس کے کالج کی دوست تھی۔ وہ جب فرسٹ ایئر میں تھی تو اس کی شادی اس کے چچازاد سے ہوگئی تھی جو کراچی میں رہتا تھا۔ شمع بھی کراچی کی ہو کر رہ گئی تھی، لیکن کبھی کبھی موبائل فون پر ان دونوں کا رابطہ ہوتا رہتا تھا۔

"تو کیسے چلی جائے گی۔" قدسیہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہاں کے راستے معلوم ہیں تجھے؟"

"فون کر کے اس کا پتا اچھی طرح سمجھ لوں گی اور رکشا والے کو بتا دوں گی۔ یہ رکشا والے سارا شہر چھانے ہوئے ہوتے ہیں۔ دیکھا نہیں تھا تم نے؟ رکشا والے نے ہمیں اسٹیشن سے سیدھا یہیں پہنچا دیا تھا۔ اسی بنگلے کے سامنے رکشا روکا تھا۔"

"یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں بیٹا!" عدیل احمد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اور پھر یہ شہر بھی تمہارے لیے نیا ہے۔ یہاں اکیلی لڑکی کا رکشا پر نہیں جانا ٹھیک نہیں!"

"میں شمع سے بات کر کے سوچ لوں گی کوئی طریقہ۔"

"اپنا موبائل تو بند رکھا ہے نا تو نے؟" قدسیہ نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں، بند ہے۔"

"اسے بند ہی رکھنا۔ یہاں کسی کو پتا نہ چلے کہ تیرے پاس موبائل فون ہے۔"

"ہاں۔" حمیدہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم لوگوں نے ملازمت کر لی ہے نا یہاں۔"

قدسیہ وہ کڑوا کسیلا جواب خاموشی سے پی گئی۔

حمیدہ نے موبائل اس وقت خریدا تھا جب حیدر نے ان لوگوں کو دس ہزار روپے ماہانہ بھیجنا شروع کیے تھے۔ اس نے بڑی منت سماجت کر کے اس کے لیے قدسیہ سے ڈیڑھ ہزار روپے لیے تھے۔ موبائل فون سیکنڈ ہینڈ لیکن اچھی حالت میں تھا۔ حمیدہ نے اپنی شلواروں کے نیفوں کے ساتھ کپڑے کی جیبیں بنائی تھیں۔ موبائل فون رکھنے کی اس نے ایک انوکھی ہی تدبیر سوچی تھی۔ کراچی پہنچنے کے بعد اس نے اسٹیشن پر ہی موبائل کا سوئچ آف کر دیا تھا۔ دراصل وہ بڑی چاہت کے ساتھ اپنے بھیا سے ملنے آئی تھی اور چاہتی تھی کہ جب وہ اپنے بھیا سے ملے تو اس وقت لاہور سے اس کی کسی دوست، حتیٰ کہ وارث تک کی کال نہ آئے۔ اپنے بھیا سے باتیں کرتے ہوئے وہ کسی کی بھی رخنہ اندازی سے بچنا چاہتی تھی لیکن اب موبائل بند رکھنے کا جواز کچھ اور ہی بن گیا تھا۔

رات نو بجے کے قریب کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولنے کے لیے عدیل احمد اٹھا۔

دستک دینے والا امجد تھا۔

"میرے ساتھ کچن میں چلو بابا!" اس نے عدیل احمد سے کہا۔ "اپنا کھانا اور ناشتا تم خود ہی خانساماں سے لے آیا کرو۔ میں ابھی تم کو یہ بھی بتا دوں گا کہ کل سے تم میاں بیوی کو یہاں کیا کام کرنا ہے۔"

عدیل احمد اس کے ساتھ چلا گیا۔

امجد کی آواز حمیدہ نے بھی سن لی تھی۔ اسے خیال آیا کہ امجد نے اسے گھر کے ملازمین کے بارے میں بتاتے ہوئے خانساماں کا ذکر نہیں کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں عدیل احمد ایک بڑی سی ٹرے لے کر آیا جو انواع و اقسام کے کھانوں سے مہک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی امجد بھی آیا تھا۔ وہ وائر کور دروازے پر رکھ کر چلا گیا۔ کمرے میں کئی گلاس پہلے ہی سے موجود تھے جو ایک چھوٹے سے نعمت خانے پر رکھے ہوئے تھے۔

کھانے کے دوران میں عدیل احمد کچھ تذبذب کے ساتھ حمیدہ سے بولا۔ "امجد بتا رہا تھا کہ اس کی بیگم صاحبہ نے تمہارے لیے بھی کوئی کام سوچ لیا ہے۔"

"کیا!" حمیدہ چونکی اور بھنا کر بولی۔ "میں اس کی ملازمت ہرگز نہیں کروں گی۔"

"کتنی بار سمجھاؤں ایک بات!" عدیل احمد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ہمیں فی الحال یہ سمجھ لینا ہے کہ ہمیں اپنے بیٹے کے گھر کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ تم بھی سمجھ لیتیں کہ تم سے کوئی کام کرانے والی تمہاری مالکہ نہیں، تمہاری بڑی بھاوج ہے۔"

"لیکن....."

"میری بات بھی نہیں، نو گی؟" عدیل احمد نے اس کی بات کاٹی۔

حمیدہ کے چہرے پر بے بسی کا تاثر ابھر آیا۔ وہ کچھ بول نہیں سکی۔

"کچھ دن کی بات ہے بیٹی!" عدیل احمد نے بہت نرمی سے کہا۔ "میں نے کہا تھا نا! حالات سمجھ لینے کے بعد ہم واپس لاہور اپنے گھر چلے چلیں گے۔"

حمیدہ خاموش رہی۔

قدسیہ مسکرا کر بولی۔ ''باپ کی بات تو سن لیتی ہے! بس مجھ سے زبان چلانا آتی ہے تجھے!''

ماں کو مسکراتے دیکھ کر حمیدہ نے جل کر کہا۔ ''تم تو ایسی خوش نظر آرہی ہو جیسے کسی محل میں آگئی ہو۔''

''محل جیسا تو ہے میرے بیٹے کا بنگلا۔''

''بیٹا۔'' حمیدہ نے بچی سے کہا۔ ''بیٹے کا بنگلا!'' اس نے سر جھٹکا۔ ''جورو کے غلام لگتے ہیں وہ!''

''حمیدہ!'' اس مرتبہ عدیل احمد کے لہجے میں سختی تھی۔

حمیدہ روہانسی ہوگئی۔ ابھی اس کا پیٹ نہیں بھرا تھا لیکن اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

عدیل احمد اور قدسیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن نہ تو آپس میں کچھ بولے، نہ حمیدہ سے کچھ کہا۔

گھنٹا بھر کے بعد جب وہ لوگ سونے کے لیے لیٹے تو قدسیہ نے کسی نہ کسی طرح بیٹی کو منا کر اسے تھوڑا سا کھانا اور کھلا دیا تھا۔

سونے سے پہلے عدیل احمد نے حمیدہ کو پھر سمجھایا کہ وہ اپنی بڑی بھاوج سے کوئی بدتمیزی ہرگز نہیں کرے گی۔

حمیدہ کی وہ رات بڑی بے چینی میں گزری۔ اسے رہ رہ کر اپنے بھیا پر غصہ آرہا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتی تھی۔

دوسری صبح عدیل احمد اور قدسیہ بنگلے میں چلے گئے تاکہ وہ کام کریں جو انہیں سونپے گئے تھے۔ حمیدہ وہیں رہی۔ ابھی اس کے علم میں نہیں آیا تھا کہ اس سے کس قسم کی خدمت لی جانے والی تھی۔

کچھ دیر تک بستر پر پڑا رہنے کے بعد حمیدہ نے اپنی شلوار کے نیفے کے ساتھ لگی ہوئی جیب سے موبائل نکالا.... اسے آن کیا اور پھر اس پر اپنی دوست شمع کا نمبر ملایا۔

''کیا حال ہے شمع!'' دوسری طرف سے ہیلو کہنے والی کی آواز سن کر حمیدہ نے کہا۔

''ٹھیک ہوں۔'' دوسری طرف سے شمع نے جواب دیا۔ ''آج اتنی صبح کیسے فون کر لیا؟ کالج نہیں گئیں کیا؟''

''بدھو!'' حمیدہ بولی۔ ''کالج چھوڑ اتو وہاں کی سب باتیں بھی بھول گئیں! چھٹیاں ہیں آج کل۔''

''ارے ہاں! واقعی! میں بھول ہی گئی تھی کہ سیکنڈ ایئر کے امتحانات ہو چکے ہیں، پرچے کیسے ہوئے؟''

''ٹھیک ہوئے۔'' حمیدہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ ''میں نے تمہیں یوں فون کیا ہے کہ تم سے تمہارے گھر کا پتا اچھی طرح سمجھ لوں۔''

''کیوں؟ خیریت؟''

''میں کسی وقت ملنے آؤں گی تم سے۔ کل سے میں کراچی آئی ہوئی ہوں بدھو پرشاد!''

یہ حمیدہ کی عادت تھی۔ وہ شمع کو اکثر ''بدھو'' یا ''بدھو پرشاد'' کہا کرتی تھی جس کا شمع نے کبھی برا نہیں مانا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی سیدھی کہ کالج میں سبھی اسے بے وقوف بنایا کرتے تھے۔

اس وقت وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ حمیدہ کراچی آئی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے گھر کا پتا بتایا اور بولی۔ ''بہت سیدھا پتا ہے۔ کوئی بھی ٹیکسی یا رکشا والا تمہیں آسانی سے یہاں پہنچا دے گا۔''

پتا واقعی ایسا تھا کہ حمیدہ نے اسے لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، فوراً ذہن نشین کر لیا۔

''ارے ہاں!'' شمع بولی۔ ''یہ تو بتاؤ کہ آئی کس کے ساتھ ہو؟''

دروازے پر ہونے والی دستک نے حمیدہ کو چونکایا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''کوئی آیا ہے، میں تم سے پھر بات کروں گی۔'' اس نے جواب سنے بغیر نہ صرف رابطہ منقطع کیا بلکہ موبائل کا سوئچ بھی آف کر دیا۔ اسے شلوار کی جیب میں رکھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو بیٹا!'' عدیل احمد کی آواز آئی۔ ''میں تمہارے لیے کھانا لے کر آیا ہوں۔''

حمیدہ نے دروازہ کھول دیا۔ اسے یہ بہت گراں گزرا تھا کہ اس کے باپ کو اس کے لیے کھانا لے کر آنا پڑا تھا۔

اب کھانے کا وقت بھی ہو چکا تھا یا شاید گزر چکا تھا کیونکہ ایک بج کر کچھ منٹ ہو چکے تھے۔ حمیدہ اپنے خیالوں میں ایسی ڈوبی رہی تھی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ جب وہ شمع سے فون پر بات کر رہی تھی، اس وقت بھی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ کیا بج چکا تھا۔

عدیل احمد اسے کھانا دے کر واپس چلا گیا۔

حمیدہ نے کھانے کی ٹرے نعمت خانے میں رکھ دی۔ اسے اب بھی بالکل بھوک نہیں تھی، یا شاید ایسا ہو کہ باپ کو اپنے لیے کھانا لاتے دیکھ کر اسے اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ اس کی بھوک اڑ ہی گئی تھی۔

وہ پھر بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے شمع سے موبائل فون پر دوبارہ رابطہ نہیں کیا۔ پہلے اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ شمع اس سے اس قسم کے سوالات ضرور کرے گی کہ وہ کس کے ساتھ کراچی آئی تھی۔

Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

اب اس کے دماغ میں یہ سوال بھی گردش کرنے لگا کہ وہ شمع سے ملاقات کر بھی سکے گی یا نہیں! اسے ابھی تک علم نہیں تھا کہ بنگلے میں اسے کس قسم کی خدمات سرانجام دینا ہوں گی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کا سارا دن ہی مصروف گزرتا اور رات ہونے کے بعد اسے اپنے والدین سے شمع کے گھر جانے کی اجازت ہی نہیں ملتی۔

دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ اسے اپنے باپ یا ماں ہی کی آمد کا خیال تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا بھی نہیں کہ کون ہے اور پھر دروازہ کھولتے ہی وہ کچھ گھبرا بھی گئی۔

سامنے امجد کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی چمک تھی جس کا مطلب حمیدہ کو اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ گھبرائی اس لیے کہ اس وقت کوارٹر میں وہ تنہا تھی۔ امجد اتنا قدآور اور مضبوط ہاتھ پاؤں کا مالک تھا کہ اگر وہ حمیدہ کا منہ دبا دیتا تو وہ ذرا بھی آواز نکالنے سے قاصر ہی رہتی۔

☆☆☆

اس دوپہر کو بھی حیدر اپنی خواب گاہ میں اکیلا تھا۔ شادی کے بعد بھی تنہائی اس کا مقدر بنی رہی تھی۔ ابتدائی کچھ دنوں میں تو سرینہ کا ساتھ رہا تھا لیکن وہ ''ساتھ'' بھی ایسا تھا جسے ''میاں بیوی کا ساتھ'' نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس کی اس نئی زندگی کی بنیاد لاہور میں شارب موٹرز کی ملازمت کی وجہ سے پڑی تھی۔

ملازمت کے ابتدائی دنوں میں ہی اسے شارب موٹرز اور اس کے اصل مالک جاذب فاروقی کے بارے میں ساری باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔

لاہور میں شارب موٹرز کا وہ شوروم اسی مہینے کھلا تھا۔ ملازمت کرنے کے بعد اسے پہلی ہی تنخواہ ملی تھی کہ اسے معلوم ہوا تھا کہ شارب فاروقی صرف اس شوروم کے معائنے ہی کے لیے کراچی سے وہاں آنے والا تھا۔

تنخواہ ملنے کے دوسرے دن حیدر نے شارب فاروقی کو دیکھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ بشرے سے وہ بہت تیز و طرار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لاہور پہنچنے کے بعد اس نے اسی دن شوروم کے تمام ملازمین کے چھوٹے چھوٹے انٹرویو کیے۔

ملازمت کے سلسلے میں حیدر اور دوسرے لوگوں کے انٹرویو شارب فاروقی کے منیجر نے کیے تھے جسے کراچی سے وہ شوروم قائم کرنے ہی کے لیے لاہور بھیجا گیا تھا۔

حیدر جب انٹرویو کے لیے اپنی باری پر شارب فاروقی کے کمرے میں گیا تو خاصا پریشان تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ملازمت مل جانے کے بعد دوسرا انٹرویو آخر کیا معنی رکھتا ہے۔

شارب فاروقی کے ابتدائی سوالات حیدر کے لیے قطعی متوقع تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ملازمت کے خواہش مند افراد کو ہر انٹرویو میں اس قسم کے سوالات کا سامنا تو کرنا ہی ہوگا۔

ان سوالات کے بعد شارب نے جو بات کہی، وہ ایسی ہی تھی کہ حیدر کا سارا جسم سنسنا گیا تھا۔

''تم ابھی غیر شادی شدہ ہو!'' شارب فاروقی نے کہا۔ ''اور تمہاری خواہش ہے کہ اگر تم کسی امیر گھرانے کے گھر داماد بن سکے تو تمہیں زندگی کی وہ ساری آسائشات مل جائیں گی جن کے تم خواب ہی دیکھ سکتے ہو۔''

حیدر کو تھوڑا سا بوکھلایا ہوا دیکھ کر شارب فاروقی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی نجومی ہوں اور میں نے علم نجوم کے ذریعے تمہاری یہ خواہش جان لی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں ان انٹرویوز میں ہر شخص سے یہاں کام کرنے والے دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی پوچھتا رہا ہوں۔ انہی میں سے ایک نے مجھے تمہارے ان خیالات کے بارے میں بتایا تھا۔''

اس وقت حیدر کو یاد آیا کہ اس نے یہ بات اپنے ساتھ کام کرنے والے دو ایک آدمیوں سے کہہ دی تھی۔ بات اگرچہ گپ شپ کے ماحول میں کہی گئی تھی لیکن ایسا شخص مذاقاً نہیں کہا گیا تھا۔ حیدر بھی اس انداز میں سوچا ہی کرتا تھا کیونکہ دنیاوی آسائشات کے حصول کے لیے کوئی دوسری تدبیر اس کے دماغ میں آتی ہی نہیں تھی۔

شارب فاروقی سے وہ بات سن کر حیدر نے نظریں جھکا لی تھیں۔ اسے خیال آیا تھا کہ اس کی یہ سوچ شارب فاروقی کی نظر میں اسے ''ڈس کوالیفائی'' کر سکتی ہے جس کے نتیجے میں اسے ملازمت سے سبکدوش کیا جا سکتا ہے۔

''مجھے غلط تو نہیں بتایا گیا؟'' شارب فاروقی نے پوچھا۔

''جی... جی نہیں۔'' حیدر سے جھوٹ نہیں بولا جا سکا۔

''میں کافی دن سے تم جیسے کسی نوجوان کی تلاش میں تھا۔''

شارب فاروقی کی اس بات نے حیدر کو چونکا دیا۔ وہ شارب فاروقی کا منہ تکنے لگا۔

''لیکن تمہارے ساتھ بھی تھوڑا سا ڈرا بیک ہے۔'' شارب فاروقی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''مجھے کسی ایسے



نوجوان کی تلاش تھی جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں اور ایک بہن بھی ہے۔''

''جی۔'' حیدر نے آہستہ سے کہا۔

''کیا تم ایک بہترین زندگی کی خاطر ان لوگوں کو چھوڑ سکتے ہو؟'' شارب فاروقی نے پوچھا۔

''جی نہیں سر!'' حیدر کے لہجے میں استقامت آ گئی۔ ''مجھے اپنے والدین اور بہن سے بہت محبت ہے۔ میں نے آسائشات کے خواب تو دیکھے ہیں لیکن میں یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ اس طرح میں اپنے گھر والوں کی زندگی بھی آسودہ کر سکوں گا۔''

''لیکن گھر داماد بننے کی صورت میں اس قسم کی رشتے داریاں قائم کہاں رہتی ہیں؟''

''قائم تو رہتی ہیں سر! بس فاصلے بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار ہوں اور میرا خیال ہے کہ میرے گھر والوں کو بھی جب آسودگی میسر آئے گی تو وہ مجھ سے دوری گوارا کر لیں گے۔''

یہ باتیں کرتے ہوئے حیدر کا لہجہ آہستہ آہستہ مضبوط ہوتا چلا گیا تھا اور اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ شارب فاروقی کی نظر میں کوئی ایسا امیر گھرانا ضرور تھا جسے گھر داماد بنانے کے لیے کسی نوجوان کی تلاش تھی۔

حیدر کا جواب سننے کے بعد شارب فاروقی چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''دراصل اب دیر کچھ زیادہ ہوتی جا رہی ہے اس لیے تمہارا جو ڈرا بیک ہے، اسے نظر انداز کرنا پڑے گا۔''

حیدر دھڑکتے دل کے ساتھ شارب فاروقی کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کا خواب پورا ہونے والا ہو۔

شارب نے اس کے احساس کی تصدیق کی۔ ''ایک امیر گھرانا ہے جسے اپنی لڑکی کے لیے گھر داماد کی ضرورت ہے لیکن اس معاملے میں لڑکی کی ضد یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا نوجوان ہو جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ تم نے مجھے تو سچ سچ بتا دیا لیکن کیا تم یہ وعدہ نہیں کر سکتے کہ دو تین سال تک اس لڑکی پر یہی ظاہر کرو کہ تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے؟''

''یہ کیسے ہو سکے گا سر؟'' حیدر پریشان ہو گیا تھا۔

''اگر تم چاہو گے تو آسانی سے ہو سکتا ہے۔'' شارب فاروقی نے کہا۔ ''وہ گھرانا لاہور میں نہیں، کراچی میں ہے۔ تمہیں شادی کے لیے کراچی آنا پڑے گا۔ اس طرح اپنے ماں باپ سے تمہارا فاصلہ خود بہ خود بڑھ جائے گا۔ اب یہ تمہاری ذہانت پر منحصر ہے کہ تم انہیں دو تین سال تک خود سے دور رکھو۔''

''مگر دو تین سال کے بعد کیا ہوگا؟''

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزاج اور سوچ میں تبدیلی آتی ہے۔ اس لڑکی کے مزاج میں بھی آ سکتی ہے۔ دو تین سال بعد تم اسے دھیرے دھیرے بتانا کہ لاہور میں تمہارے کچھ عزیز بھی ہیں اور ابتدا میں تم نے مصلحتاً جھوٹ بولا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ لڑکی اس حقیقت کو تسلیم کر لے گی۔ ہاں البتہ یہ شاید وہ اس وقت بھی چاہے گی کہ تم اپنے گھر والوں کو اپنے زیادہ قریب نہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں میری یہ بات مان لینا چاہیے۔ ابھی تمہاری تنخواہ بارہ ہزار ہے۔ جب تم اس امیر گھرانے کے داماد بن جاؤ گے تو اپنے گھر والوں کو اس سے دوگنی رقم بھی بھیج سکو گے اور پھر یہ صرف دو تین سال کی بات ہے۔ پھر معاملہ بڑی حد تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

حیدر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ خوب صورت کار، شاندار بنگلا اور دیگر آسائشات اسے تصور میں دکھائی دینے لگی تھیں۔

''لیکن تم اس بارے میں اچھی طرح سوچ لو!'' شارب فاروقی پھر بولا۔ ''میں کل تک لاہور میں ہوں۔ مجھے کل تک جواب دیدو، لیکن تم اس شرط کی خلاف ورزی نہیں کرو گے کہ تمہیں دو تین سال تک اپنے والدین وغیرہ کو خود سے بالکل دور رکھنا ہے۔ اگر تم نے اس شرط کی خلاف ورزی کی تو بہت ممکن ہے کہ وہ لڑکی تم سے طلاق کا مطالبہ کر دے یا تم سے خلع حاصل کر لے۔''

حیدر کے جسم میں ایسی مسرت آ گیں لہریں دوڑنے لگی تھیں کہ اس نے سوچنے میں وقت ضائع کرنا فضول سمجھا۔

''میں تیار ہوں سر!'' خوشی سے حیدر کی آواز کانپ گئی تھی۔

''ویری گڈ!'' شارب فاروقی مسکرایا۔ ''تم یقیناً بہت ذہین ہو۔ ترقی وہی لوگ کرتے ہیں جو فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام لیں اور فیصلہ بھی صحیح کریں، تم نے فیصلہ بھی صحیح کیا ہے اور وقت بھی ضائع نہیں کیا ہے۔ اب تم جا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاؤ۔ تمہاری چھٹی کے وقت میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں، وقت ختم ہونے سے پہلے تمہیں میرا آرڈر مل جائے گا کہ تمہیں اس ملازمت سے الگ کیا جا رہا ہے۔ تحریری آرڈر ہوگا جس میں تمہیں ڈس مس کرنے کا کوئی جواز بھی لکھا جائے گا مگر کیونکہ تمہیں اچانک اس ملازمت سے الگ کیا جا رہا ہے اس لیے ڈس مس آرڈر کے ساتھ تمہیں ایک ماہ کی تنخواہ نقد ادا

کرکے واؤچر پر دستخط لے لیے جائیں گے۔ یہاں سے تم جا کر کل کراچی جانے والی کسی فلائٹ کا ٹکٹ لے لو۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم آج ہی کی کسی فلائٹ سے کراچی کا رخ کرتے لیکن بہتر ہوگا کہ آج کی رات اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارو۔ انہیں بھی آمادہ تو کرنا ہوگا کہ تم کراچی جا رہے ہو۔ ان سے تم کہہ سکتے ہو کہ کراچی میں تمہارے کسی دوست نے تمہارے لیے کسی بہت اچھی ملازمت کا بندوبست کرلیا ہے۔ اصل بات تم نہ تو اپنے گھر والوں کو بتاؤ گے اور نہ یہاں کام کرنے والوں میں سے کسی کو۔ یہاں تو تم یہی ظاہر کرنا کہ تم ملازمت سے برطرفی کے باعث پریشان ہو گئے ہو۔ میں نے اتنی لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ تم نے میری سب باتیں سمجھ لی ہیں نا؟"

"جی سر!"

"دیری گڈ! میں تمہیں اپنا موبائل فون نمبر دے رہا ہوں۔ تم ٹکٹ لینے کے بعد مجھے اطلاع دے دینا کہ تم کس فلائٹ سے کراچی پہنچو گے۔ میں تو آج ہی شام کو جا رہا ہوں۔ کل جب تم کراچی پہنچو گے تو میں تمہیں لینے ایئرپورٹ آجاؤں گا۔"

حیدر بے تابی سے بولا۔ "یہ تو بتا دیجیے سر، کہ میں کس کا گھر داماد بنوں گا، وہ لڑکی کون ہے؟"

"اس کا نام مرینہ ہے۔" شارب فاروقی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور وہ میری چھوٹی بہن ہے۔"

حیدر کے ذہن کو ایسا جھٹکا لگا کہ وہ بے اختیار کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

شارب فاروقی مسکراتے ہوئے کہتا رہا۔ "میرے والد کو لوگ جاذب فاروقی کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ یہ شارب موٹرز تو ان کے بزنس کے آگے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ مرینہ ان کی بہت لاڈلی بیٹی ہے۔ وہ شادی کرنے پر بہ مشکل اس شرط پر رضامند ہو سکی ہے کہ اس کا ہونے والا شوہر گھر داماد ہو اور وہ دنیا میں تنہا ہو۔"

حیدر کی اس وقت کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ اسے اپنے جسم کی رگ رگ میں شراب دوڑتی محسوس ہونے لگی تھی۔

دوسرے دن وہ کراچی آ گیا۔ ایئرپورٹ پر شارب فاروقی اسی کا منتظر تھا۔ ایئرپورٹ سے روانگی پر کار میں اس نے حیدر کو مرینہ کی تصویر بھی دکھائی۔

اگلے ہی دن مرینہ سے اس کی شادی بھی ہو گئی۔ ان کا محلہ عزیزی جاذب پیلس میں ہی بنا تھا۔

حیدر دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا لیکن اس وقت ایک جھٹکے سے رک گیا جب اس نے مرینہ کو دلہن کی حیثیت سے بستر پر دیکھنے کے بجائے کھڑکی میں کھڑا دیکھا جو غالباً جاذب پیلس کی عقبی سمت میں کھلتی ہوگی۔

مرینہ اس وقت عام لباس میں تھی لیکن وہ عام لباس بھی قیمتی تھا۔ اس نے حیدر کی آہٹ سنی تو پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"ہیلو، مائی سویٹ!" اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے حیدر کا مضحکہ اڑا رہی ہو۔

حیدر جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کے جو جذبات تھے، ان پر جیسے برف گر گئی تھی۔

مرینہ اس کے قریب آئی۔ بے تکلفانہ انداز میں اس نے حیدر کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک کرسی کی طرف لے گئی جو دلہن کی طرح آراستہ بستر کے قریب ہی رکھی تھی۔

"بیٹھو!" اس نے حیدر سے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ میں تم سے اسی وقت کچھ ضروری باتیں کرلوں۔"

وہ خود بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولی۔ "کسی وجہ سے شادی کرنا میری مجبوری بن گئی تھی۔ اسی لیے آج تم میرے شوہر بن گئے لیکن بیوی پر شوہر کو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں، وہ تمہیں نہیں مل سکیں گے۔"

حیدر جس نے خود کو ابتدائی ذہنی جھٹکے کے اثرات سے نکال لیا تھا، نہایت تیز لہجے میں بولا۔ "تم مجاز نہیں ہو کہ میرے حقوق سلب کر سکو!"

"اس طرح بات مت کرو۔" مرینہ نے بگڑ کر کہا۔ "میں کبھی یہ پسند نہیں کروں گی کہ تم مجھ سے ذرا بھی اونچی آواز میں بات کرو۔ اپنے حقوق کی بات تم مجھ سے بھی مت کرنا۔ بس ایک پُرآسائش زندگی پر اکتفا کرو۔ ایک قیمتی کار تمہیں ڈیڈی سے سلامی میں مل چکی ہے۔ زندگی کی دیگر ضروریات بھی تمہاری خواہش کے مطابق پوری ہوتی رہیں گی۔ ماہانہ جیب خرچ کے طور پر بھی تمہیں مجھ سے ایک معقول رقم ملتی رہے گی۔ اگر تمہیں یہ سب کچھ منظور نہ ہو تو مجھے طلاق دیدو۔"

آخری فقرے نے حیدر کی اکڑ ختم کر دی۔ مرینہ کا مہر اسّی لاکھ روپے رکھا گیا تھا۔

"ہمارے خاندان میں اس سے کم مہر کا رواج نہیں ہے۔" شارب فاروقی نے حیدر سے کہا تھا۔ "اور تمہیں اس معاملے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم مرینہ سے شادی اس لیے تو نہیں کر رہے ہو کہ اسے طلاق دو گے۔ ایک پُرآسائش زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تمہیں



اپنے دل و دماغ میں اکتالیس لاکھ روپوں کا خیال بھی نہیں لانا چاہیے۔"

حیدر کو دم بہ خود ہوتا دیکھ کر مرینہ کے ہونٹوں پر بڑی چبھتی ہوئی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے کہا۔ "یقیناً تم مجھے طلاق نہیں دینا چاہو گے اور میری قربت کے حصول پر ایک پُرآسائش زندگی کو ترجیح دو گے۔"

حیدر خاموش رہا۔ وہ جیسے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

مرینہ بولتی رہی۔ "اس کمرے کے باہر یعنی لوگوں کے سامنے ہم دونوں کا انداز ایسا ہوگا جیسے کوئی نو بیاہتا جوڑا ایک دوسرے کو بے حد چاہنے لگا ہو۔ تم کسی کو میری یہ باتیں ہرگز نہیں بتاؤ گے۔ شکایت کا کوئی لفظ کسی کے سامنے تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔" مرینہ کا لہجہ حاکمانہ ہو گیا۔ "اگر تمہیں یہ سب کچھ منظور نہ ہو تو میں اپنی بات دہراؤں گی کہ تم مجھے طلاق دے سکتے ہو۔ آج رات تم ان سب باتوں پر غور کرلو۔ کل تم جیسا چاہو، ویسا کرنا۔ اب مَیں سونا چاہتی ہوں اور تم....." اس نے خاموش ہو کر کمرے کے ایک گوشے میں لگے ہوئے صوفہ سیٹ کی طرف دیکھا۔ "تم وہاں سو سکتے ہو۔"

اور اس کے بعد ایسا ہی ہوا تھا۔ حیدر کو وہ رات صوفے پر لیٹ کر گزارنا پڑی تھی۔ نیند سے اس کی آنکھوں کا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ اس پر ایک بیجانی سی کیفیت طاری رہی تھی لیکن اس کے ساتھ وہ شدید بے بسی بھی محسوس کرتا رہا۔ رات کا بیشتر حصہ سوچ بچار میں ہی گزر گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ مرینہ کا شوہر نہیں، ایک "ملازم شوہر" تھا۔

مرینہ ایسی کیوں ہے؟

حیدر نے اس سوال پر بھی بہت غور کیا۔ بہت سے خیالات دماغ میں آئے۔ ان میں یہ خیال زیادہ قوی تھا کہ مرینہ کسی اور سے محبت کرتی تھی لیکن کسی وجہ سے اس کا باپ جاذب فاروقی اس کی شادی اس کے محبوب سے کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد شاید مرینہ نے طے کرلیا ہو کہ اب وہ کسی سے بھی شادی نہیں کرے گی، لیکن جب اس پر شادی کے لیے دباؤ پڑا ہوگا تو اس نے یہ شرط رکھ دی ہوگی کہ اس کا شوہر گھر داماد ہونا چاہیے۔ شاید اسے خیال ہو کہ یہ ممکن نہیں ہوگا لیکن شارب فاروقی نے اس کی یہ شرط پوری کر دی۔

ان تمام خیالات سے ہٹ کر حیدر کے لیے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

اکتالیس لاکھ روپے سے قطع نظر وہ اگر کسی طرح مرینہ سے علیحدگی اختیار کر بھی لیتا تو اس سے وہ پُرآسائش زندگی بھی چھن جاتی جس کے اس نے ہمیشہ خواب دیکھے تھے۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فی الحال "ملازم شوہر" ہی بنا رہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیکھے کہ کیا حالات سامنے آتے ہیں۔ اس نے اس امکان کو بھی سامنے رکھا کہ وہ شاید اپنی محبت سے مرینہ کو "رام" کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

دراصل حیدر شعوری یا لاشعوری طور پر اس پُرآسائش زندگی کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

اس رات اسے بہت دیر سے نیند آئی تھی اس لیے صبح وہ خود نہ جاگ سکا۔ اسے مرینہ نے جگایا تھا۔

"بہت دیر تک سوتے ہو تم!" وہ سرسری لہجے میں بولی۔

"سویا بھی بہت دیر سے تھا۔" حیدر نے صوفے سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر جبراً خفیف سا مسکرا کر بولا۔ "آج کا کیا پروگرام ہے؟"

مرینہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "تمہارے اس سوال کا مطلب ہے کہ تم نے اس صورتِ حال سے سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ہاں۔" حیدر جبراً مسکراتا رہا۔ "میں دیکھوں گا کہ میری محبت تمہیں کب تک نہیں جیت سکے گی۔"

مرینہ کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات گہرے ہو گئے لیکن اس نے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

پھر دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن مرینہ نے حیدر سے کہا۔ "کل صبح ہم دونوں ہنی مون پر روانہ ہو رہے ہیں۔"

"ہنی مون!" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا جو ایک فطری بات تھی۔ ان دونوں میں کوئی ایسا تعلق ہی نہیں تھا کہ وہ ہنی مون منانے کہیں جاتے۔

مرینہ نے مزید کہا۔ "ہم اس کے لیے بیرونِ ملک نہیں جائیں گے۔ میں نے ڈیڈی سے کہا ہے کہ ہم اپنے ہی وطن کے بڑے بڑے شہر گھومتے رہیں گے اور پھر واپس آجائیں گے لیکن درحقیقت ہم صرف مری ہی میں رہیں گے۔ چھ ماہ بعد وہاں سے واپس آجائیں گے۔"

"چھ ماہ؟" حیدر نے حیرت سے کہا۔ "صرف مری میں؟"

"ہاں۔" مرینہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "مزید وضاحت مت چاہنا مجھ سے!" حیدر کو چپ ہو جانا پڑا۔

ان دو ہی دنوں میں حیدر کے لیے ان گنت موسمات سل کر آچکے تھے۔ اس کے نام سے ایک اکاؤنٹ بھی کھلوا دیا گیا تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ ہر ماہ اس اکاؤنٹ میں پچاس ہزار روپے جمع کرا دیے جایا کریں گے جن کو حیدر اپنی

مرضی سے خرچ کرسکتا ہے۔ گویا وہ اس کا ماہانہ جیب خرچ تھا۔ اس کی دیگر ضروریات پوری کرنے کی ذمے داری مرینہ پر تھی۔

مری روانگی صبح تھی۔ شام کو وہ مرینہ سے چھپ کر شارب فاروقی سے ملا۔ بیس بیس ہزار کے چھ چیک اس کے حوالے کیے تاکہ وہ ہر ماہ بیس ہزار روپے لاہور، اس کے گھر بھجوا دیا کرے۔

اس وقت حیدر کے دل میں صرف ایک بار یہ خیال آیا تھا کہ وہ شارب فاروقی کو مرینہ کے رویے سے آگاہ کردے لیکن پھر اسے مرینہ کی دھمکی یاد آگئی تھی۔ اس نے حیدر کو تنبیہ کی تھی کہ وہ اس کے رویے کے بارے میں کسی سے بھی شکایت نہیں کرے گا۔

دوسری صبح وہ مری روانہ ہوگئے۔

چند دن گھومتے پھرتے ہوئے گزر گئے۔ مرینہ ساتھ ہی ہوتی تھی لیکن حیدر کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تنہا ہو۔ مرینہ خاموشی اختیار کیے رہتی تھی۔ حیدر کچھ بولتا تھا تو وہ صرف جواب دینے پر اکتفا کرتی تھی۔

مری آنے سے حیدر کو ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ اب اسے صوفے پر نہیں سونا پڑتا تھا۔ اسے اس ہوٹل کا ایک بیڈ روم مل گیا تھا جہاں مرینہ نے قیام کرنا پسند کیا تھا۔

چند دن اور گزرے تو ایک صبح حیدر نے کچھ تعجب سے مرینہ کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے مرینہ؟ خاصا وقت گھومنے پھرنے میں گزرتا ہے لیکن تمہارا وزن؟ میں نے آج غور کیا ہے کہ تم کچھ بھاری ہوگئی ہو۔“

”اور زیادہ بھی ہوجاؤں گی۔“

مرینہ کا یہ جواب سن کر حیدر کا منہ حیرت سے کھل گیا اور اس کے منہ سے نکلا۔ ”کیا مطلب؟“

”میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے کسی بات کی وضاحت طلب مت کیا کرو!“ مرینہ نے سرد لہجے میں کہا۔

حیدر کو حسبِ معمول خاموشی اختیار کرنا پڑی اور پھر کچھ دن بعد اسے مرینہ سے وضاحت طلب کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ جسے مٹا پا سمجھا تھا، وہ دراصل مٹاپا تھا ہی نہیں۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ مرینہ حاملہ تھی۔

وہ کسی کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے، حیدر سوچنے لگا اور اس احساس کے باعث تلملا گیا کہ اسے دھوکے سے استعمال کیا گیا تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ مرینہ کو بدنامی سے بچانے اور اس کے ناجائز بچے کو بہ حیثیت باپ حیدر کا نام دلوانے کے لیے اس طرح اس کی شادی کی گئی تھی۔ مری آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جاذب فاروقی کے خاندان والوں اور شناساؤں کو علم ہی نہ ہوسکے کہ مرینہ شادی کے صرف پانچ چھ ماہ بعد ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔ وہ مری ہی میں بچے کو جنم دیتی جہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی شادی کو ابھی اتنا زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ ماں بن سکتی۔

رات گئے تک حیدر سوچتا اور تلملاتا رہا۔ بہ مشکل ہی اسے نیند آسکی اور نیند بھی ایسی جو اچٹتی ہوئی تھی۔ بار بار اس کی آنکھ کھلتی رہی۔

صبح ناشتا کرتے وقت وہ ایک ہی کمرے میں تھے۔ کھانا بھی مرینہ حیدر کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔ ہوٹل میں ان کے نام مسٹر اور مسز حیدر لکھے گئے تھے۔ اگر وہ حیدر سے الگ تھلگ رہتی تو وہاں لوگ سوچنے پر مجبور ہوجاتے کہ یہ آخر کس قسم کے میاں بیوی ہیں!

ناشتے کے دوران میں حیدر بہ مشکل خاموش رہا لیکن ناشتا کرنے کے بعد بول ہی پڑا۔ ”کیا یہاں کسی لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست پہلے ہی سے کرلیا ہے؟“

مرینہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تو تم سمجھ ہی گئے!“

”نابینا تو نہیں ہوں۔“ حیدر نے تلخی سے کہا۔

”کچھ دن پہلے تو تم نے یہی کہا تھا کہ میں موٹی ہوتی جارہی ہوں۔“

”اس وقت تک بات اتنی واضح نہیں ہوئی تھی۔“

”چلو اب تو واضح ہوگئی۔“ مرینہ نے بے پروائی سے کہا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟ مہر کے اکتالیس لاکھ روپے دینے کے لیے تیار ہوگئے ہو کیا؟“

وہ حیدر کی دکھتی رگ تھی، لیکن اس کی دکھتی رگ صرف وہی نہیں، ایک پُرآسائش زندگی بھی تھی جو مرینہ سے علیحدگی کی صورت میں اس سے چھن جاتی۔

وہ تلخی سے بولا۔ ”یہ بچہ اسی کا ہوگا جس سے تم محبت کرتی ہو؟“

”میں تمہاری کسی بات کا جواب دینے کی پابند نہیں لیکن تمہاری بات سے کیونکہ میری محبت اور اس پر حرف آرہا ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں اس لیے میں تمہارے اس سوال کا جواب ضرور دوں گی۔ یہ بچہ جس کا ہے، اس سے میں شدید نفرت کرتی ہوں۔“

حیدر حیرت سے بولا۔ ”تو کیا اس نے زبردستی....“

”اب اس موضوع پر بات ختم کردو۔“ مرینہ نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی اور پھر کرسی سے اٹھ کر بالکونی کی طرف چلی گئی۔



حیدر ساکت بیٹھا رہ گیا۔ اس وقت اس کی کیفیات ایک دوسرے سے متصادم ہورہی تھیں۔ یہ پہلو اس کے لیے اذیت ناک تھا کہ اس کی بیوی کسی اور کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن اس کا دل اس پُرآسائش زندگی کو چھوڑنے پر بھی آمادہ نہیں تھا جو اسے مرینہ کا شوہر بننے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ رہنے کے لیے ایک خوبصورت گھر، قیمتی ملبوسات، ایک شاندار کار اور ماہانہ پچاس ہزار روپے جو وہ اپنی مرضی سے خرچ کرسکتا تھا۔

اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامت برداشت نہیں کرپاتا تو اس کے لیے صرف یہ راہ باقی رہ جاتی تھی کہ وہ خودکشی کرلے۔ وہ مرینہ کو طلاق دینے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اکتالیس لاکھ روپے ایک ایسی رقم تھی جو وہ کسی طرح بھی ادا نہیں کرسکتا تھا۔ اگر وہ اس پُرآسائش زندگی کو لات مارنے کے لیے تیار ہوجاتا اور سوچتا کہ پچاس ہزار روپے ماہانہ ملنے والی رقم جمع کرکر کے طلاق دینے کے قابل ہوجائے تو اس میں بھی اسے آٹھ سال سے زیادہ لگ جاتے۔ اتنے طویل عرصے تک اسے مرینہ کا شوہر بن کر رہنا ہی پڑتا۔

آخر حیدر کو سوچنا ہی پڑا کہ وہ سب کچھ بھلا کر خود کو اس پُرآسائش زندگی میں گم کیسے رہے۔

مری میں شب و روز گزرتے رہے اور آخر ایک شام کو مرینہ ایک بچے کی ماں بن ہی گئی۔

”مبارک ہو۔“ حیدر نے بڑی تلخی سے اس وقت کہا جب لیڈی ڈاکٹر کے بعد نرس بھی کمرے سے چلی گئی تھی۔

مرینہ نے اسے گھور کر دیکھا اور بولی۔ ”نرس کچھ لینے گئی ہے۔ ابھی واپس آجائے گی۔ بچے کی دیکھ بھال کے لیے اسے ابھی دو دن تک میرے پاس رہنا ہے۔ اس کے سامنے کوئی بے تکی بات تمہارے منہ سے نہیں نکلنا چاہیے۔“

حیدر نے اس نوزائیدہ بچے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جسے غالباً نرس ہی مرینہ کے پہلو میں لٹا گئی تھی۔

واپس کراچی کی طرف روانگی ایک ہفتے بعد تھی۔ یہ مرینہ نے حیدر کو گزشتہ شام ہی کو بتا دیا تھا۔

راولپنڈی کی طرف روانگی بذریعہ کار ہوئی۔ راولپنڈی پہنچنے کے بعد وہ کسی ہوٹل یا کسی اور جگہ ذرا بھی آرام کیے بغیر سیدھے ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ مری سے روانگی ایسے وقت ہوئی تھی کہ فلائٹ کے وقت پر وہ ایئرپورٹ پہنچ جائیں۔

کار کرائے کی تھی۔ وہ مرینہ نے رخصت کردی۔ بچہ اس کی گود میں تھا۔ پورٹر کار سے ان کا سامان اتار کر ایک ٹرالی پر لادے ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے ہی کسی جانب سے ایک برقع پوش عورت ان کے قریب آئی۔ حیدر نے حیرت سے دیکھا کہ مرینہ نے بچہ اس کے حوالے کردیا تھا۔ وہ بچے کو لے کر تیزی سے ایک جانب چلی گئی۔ حیدر کی حیران نگاہیں اس کا تعاقب کررہی تھیں۔

”اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھے چلتے رہو۔“ مرینہ نے کسی کٹ کھنی بلی کی طرح غراتے ہوئے حیدر سے کہا۔

حیدر نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر مضبوطی سے ہونٹ بند کرلیے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ دائیں بائیں اور آگے پیچھے کی کئی نشستیں خالی تھیں۔ وہ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کرتے تو کوئی نہیں سن پاتا۔ اس وقت حیدر سے خاموش نہیں رہا گیا۔

”تم نے بچہ اس عورت کو کیوں دے دیا؟“

مرینہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ حیدر کو گھور کر ہی جواب دیتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ ”میں مری کیوں گئی تھی؟“ اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے سوال کیا تھا۔

”وہ تو سامنے کی بات ہے۔“ حیدر نے کہا۔ ”تم نہیں چاہتی تھیں کہ کراچی میں لوگوں کو اس بچے کی پیدائش کا علم ہو۔“

”اور اب میں اسے اپنی گود میں لیے کراچی پہنچتی تو کیا لوگ نہیں پوچھتے کہ شادی کے چھ ماہ بعد میں بچے کی ماں کیسے بن گئی؟“

حیدر چپ رہ گیا۔ مرینہ کا جواب قطعی معقول تھا۔ یہ حیدر کی حماقت تھی کہ اس نے یہ سوال کیا تھا۔ مرینہ کا جواب ملنے کے بعد اسے خیال آیا کہ اس نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

مرینہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔

ایک گھنٹا پینتیس منٹ کی فلائٹ نے انہیں کراچی پہنچا دیا۔

کراچی پہنچنے کے بعد حیدر کو معلوم ہوا کہ اب انہیں ایک نئے بنگلے میں رہنا تھا۔ مرینہ نے اپنے باپ سے یہ بات پہلے ہی کہہ دی تھی کہ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ جاذب پیلس میں نہیں رہے گی چنانچہ ان دونوں کے لیے ایک نیا بنگلا خرید کر ڈیکوریٹ کروا دیا گیا تھا۔

حیدر کے شب و روز پھر معمول کے مطابق گزرنے لگے تھے کہ ایک روز اسے خیال آیا، کیا وہ آزادانہ زندگی نہیں گزار سکتا؟ مرینہ تو اپنی مرضی سے جہاں چاہتی تھی، چلی جاتی تھی۔

اس روز حیدر سلامی میں ملی ہوئی نئی کار میں کراچی کے

سیر سپاٹے کے لیے نکل گیا۔ اس وقت تک کراچی میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ حیدر نے کئی گھنٹے صرف کار ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے گزار دیے اور بے تحاشا پیٹرول پھونکا۔ بنگلے کی طرف اس کی واپسی رات نو بجے کے قریب ہوئی۔ اسے گمان تھا کہ مرینہ اس سے استفسار کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ اس وقت گھر پر موجود تھی لیکن اس نے حیدر سے کوئی سوال نہیں کیا۔

تو ٹھیک ہے، حیدر نے سوچا، اب وہ اپنی زندگی آزادانہ ہی گزارے گا۔

چھ ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں حیدر اپنے گھر والوں کو خط بھی لکھتا رہا اور پیسے بھی بھیجتا رہا۔ اس کے پاس باقی جو تیس ہزار بچتے تھے، انہیں وہ بے دریغ خرچ کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے کئی دوست بنا لیے تھے۔ اپنے گھر والوں کا جواب وہ ہمیشہ پوسٹ باکس کے ذریعے منگواتا تھا۔ گھر پر جواب نہ منگوانے کا جواز اس نے یہ گڑھا تھا کہ گھر میں ملازم بھی ہیں جو کسی وقت کوئی خط ادھر اُدھر کر دیتے ہیں۔ بس ایک بار اس سے یہ حماقت سرزد ہوئی تھی کہ وہ ایک خط میں بنگلے کا پتا لکھ بیٹھا تھا۔ اس کی وہ غلطی اب رنگ لائی تھی جب اس کے ماں باپ اور بہن اچانک وہاں پہنچ گئے تھے۔

ان کی آمد کے دوسرے دن دوپہر کو حیدر اپنے کمرے میں بیٹھا، انہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شارب فاروقی نے اسے تاکید کی تھی کہ مرینہ کو بھی اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے لیکن اب حیدر کو خدشہ ہو رہا تھا کہ بات کھل نہ جائے۔ اس کے ماں باپ نے تو نہ جانے کیا سوچ کر خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن حمیدہ کی وجہ سے حیدر کو ڈر لگا ہوا تھا۔ اس کی وہ تیز طرار بہن کسی وقت بھی، کچھ بھی کہہ سکتی تھی۔

☆☆☆

جس وقت حیدر یہ سب کچھ سوچ رہا تھا، حمیدہ سرونٹ کوارٹر کے دروازے پر امجد کو کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ سکون کا سانس اس نے اس وقت لیا جب امجد نے کوئی ناشائستہ حرکت کرنے کے بجائے اس سے کہا۔ ”تمہیں بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔“

سکون کا سانس لینے کے بعد حمیدہ نے کہا۔ ”اچھا! تم چلو، میں آتی ہوں۔“

”میں یہیں کھڑا ہوں، تم آؤ!“ امجد نے جواب دیا اور مڑ کر چند قدم آگے بڑھ گیا۔

حمیدہ نے ایک طرف رکھا ہوا تالا، چابی اٹھائی۔ وہ تالا چابی امجد نے انہیں اسی وقت دے دی تھی جب انہیں سرونٹ کوارٹر میں پہنچایا تھا۔ حمیدہ نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور زنجیر کی کڑی، ہک میں پھنسا کر اس میں تالا لگا دیا۔

امجد جہاں کھڑا تھا، وہاں سے وہ حمیدہ کے ساتھ چلنے لگا۔

”تمہاری بیگم صاحبہ کی شادی کب ہوئی تھی؟“ حمیدہ نے اس سے پوچھا۔

”دو سال ہونے والے ہیں۔“

یہ جواب ملتے ہی حمیدہ نے سوچا کہ اس کے بھیا نے کراچی آتے ہی شادی کر لی تھی۔

”کوئی بچہ نہیں ہے ابھی؟“ حمیدہ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ امجد نے جواب دیا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”کیا تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟“

”بچے کسے اچھے نہیں لگتے!“

”ہاں یہ تو ہے، بچے مجھے بھی اچھے لگتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ جب میری شادی ہو جائے تو بہت سے بچے ہوں۔“

حمیدہ ڈر گئی کہ امجد بات کس طرح لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ”میرے ابا کہاں ہیں؟“

”ابھی انہیں بیگم صاحبہ نے کچھ لانے کے لیے بازار بھیجا ہے۔“

”اور اماں؟“

”وہ گیسٹ روم کی صفائی کر رہی ہیں۔ پہلے جو میاں بیوی ملازم تھے، ان کے جانے کے بعد گیسٹ روم کی صفائی ہوئی ہی نہیں تھی۔“

باتیں کرتے ہوئے وہ برآمدے میں پہنچ گئے تھے۔

”تم جا کے اپنا کام کرو نا!“ حمیدہ نے کہا۔ ”میں چلی جاؤں گی۔“

”کہاں چلی جاؤ گی؟“ امجد ہنسا۔

”بیگم صاحبہ کے پاس۔“

”کہاں ملیں گی وہ تمہیں؟“

”ہاں، بس یہ بتا دو۔“

وہ دونوں بنگلے میں داخل ہو چکے تھے۔

امجد نے جواب میں کہا۔ ”وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان کا بیڈ روم کہاں ہے؟“

”ڈھونڈ لوں گی۔“ حمیدہ چاہتی تھی کہ امجد سے پیچھا چھڑا لے۔

”یہ بنگلا دو ہزار گز پر ہے۔“ امجد نے کہا۔ ”یہ دو چار کمروں کا مکان نہیں ہے کہ تم کسی کا کمرا تلاش کرو۔ دیر تک بھٹکتی ہی رہو گی۔ اسی لیے بیگم صاحبہ نے مجھے حکم دیا تھا کہ تمہیں ان کے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا کر جاؤں۔“

اب حمیدہ کے پاس امجد سے جان چھڑانے کا کوئی بہانہ نہیں رہا۔ دراصل اس کے دماغ میں یہ اندیشہ سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا کہ امجد اسے دھوکے سے بنگلے کے کسی ایسے کمرے میں نہ لے جائے جہاں سے کوئی آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

بنگلے میں لوگ ہی کتنے تھے؟ گنتی کے تین، اور ایک شاید خانساماں!

حمیدہ بولی۔ ”تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ گھر میں خانساماں بھی ہے؟“

”میں نے تمہیں صرف ان ملازمین کے بارے میں بتایا تھا جو سرونٹ کوارٹرز میں رہتے ہیں۔ خانساماں تو صبح آتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے گھر چلا جاتا ہے، پھر دوبارہ وہ شام کو آتا ہے۔“

ان چند جملوں کے تبادلے کے دوران میں بھی حمیدہ سوچتی رہی تھی کہ اسے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہونے پائے کہ امجد اسے کسی ایسے کمرے میں لے جائے جہاں کوئی اور نہ ہو۔

ایک کمرے کے سامنے امجد رک گیا۔

”یہ ہے ان کا بیڈ روم۔“ امجد نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”آئندہ بھی بھول نہ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ!“

لیکن امجد نے وہاں سے جانے کے بجائے دروازے کو انگلی سے بہ آہستگی کھٹکھٹایا۔

”کون؟“ اندر سے مرینہ کی آواز آئی۔

”امجد ہوں بیگم صاحبہ! حمیدہ کو لے آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ اسے اندر بھیج دو۔“

مرینہ کی آواز سننے کے بعد حمیدہ کو سکون ہو گیا تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھولنے لگی۔ امجد واپس جا رہا تھا۔

حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اتنا آراستہ پیراستہ کمرا اس نے پہلے کبھی دیکھا تھا تو صرف فلموں یا ٹی وی کے ڈراموں میں!

مرینہ ایک شاندار مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ مرینہ کو یہ بات عجیب سی لگی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہاں مرینہ کے ساتھ حیدر بھی ہو گا۔

حمیدہ قدرے ہچکچاتے ہوئے مسہری کے قریب پہنچ گئی۔

مرینہ بولی۔ ”تھوڑی دیر پہلے تک مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ تمہیں کس کام پر لگایا جا سکتا ہے لیکن اب کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے لیٹی تو سمجھ میں آ گیا کہ تم سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ جس ملازمہ کی جگہ تمہاری ماں کو کام پر لگایا گیا ہے، وہ مضبوط ہاتھ پیروں کی مالک تھی۔ میں اس سے اپنی پنڈلیاں بھی دبوا لیتی تھی۔ تمہاری ماں بہت دبلی پتلی اور کمزور ہے۔ وہ یہ کام نہیں کر سکتی لیکن تم صحت مند ہو۔ بس دوپہر کو کھانے کے بعد آ کر کچھ دیر میرے پیر دبا جایا کرو۔“

حمیدہ کا دماغ گرم ہو گیا۔ یہ اس کے لیے شرمناک ہی نہیں، اذیت ناک بات تھی کہ وہ اس عورت کے پیر دبائے جس کو اس کے دل و دماغ نے اب تک اپنی بھاوج تسلیم نہیں کیا تھا۔

”میں یہ نہیں کروں گی۔“ حمیدہ نے کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔ اس کے دماغ میں عدیل احمد کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اس نے حمیدہ کو بہت کچھ سمجھایا تھا۔ اس نے تاکید کی تھی کہ وہ کوئی بدتمیزی نہیں کرے گی۔

عام حالات میں کسی کے پیر دبانے سے انکار کو بدتمیزی کہا بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن ایک ”ملازمہ“ کی حیثیت سے حمیدہ کا اپنی ”مالکہ“ کے حکم کی تعمیل سے انکار بدتمیزی ہی کہا جاتا۔

مرینہ بڑے غور سے حمیدہ کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”یوں ہی کب تک کھڑی رہو گی؟ تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟ بستر سے لگ کر قالین پر بیٹھ جاؤ اور میرے پیر دباؤ!“

اپنے باپ کی باتوں کی وجہ سے حمیدہ بڑی بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ وہ روہانسی سی ہو گئی۔ اسے بہرصورت مرینہ کے حکم کی نہیں، اپنے باپ کی حکم کی تعمیل کرنا تھی۔ وہ بستر کے قریب قالین پر اس طرح بیٹھی جیسے خود کو کسی جہنم میں دھکیل رہی ہو۔

موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ وہ موبائل فون مرینہ کا تھا جو اس کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔ مرینہ نے وہ اٹھا کر کان سے لگایا اور بولی۔ ”ہاں ریحان! اس وقت تمہاری کال میرے لیے غیر متوقع ہے۔ خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں۔ خیریت ہی ہے۔“ دوسری طرف سے ٹھنڈی سانس لے کر کہا گیا۔ ”میں عموماً رات کو فون کرتا ہوں لیکن اس وقت نہ جانے کیوں، اچانک بے چینی سی ہو گئی تھی۔ تمہاری آواز سننے کو جی چاہا تھا۔“

”اچھا ذرا ہولڈ کرو۔“ مرینہ نے کہا اور پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ڈانٹنے والے انداز میں حمیدہ سے کہا۔ ”کیا بس بیٹھی رہو گی؟“

حمیدہ جو خیالوں میں کھو گئی تھی، چونکی اور جلدی جلدی

مرینہ کی پنڈلیاں دبانے لگی۔

"کوٹو نہیں۔" مرینہ نے تصحیح کی۔ "آہستہ آہستہ دباؤ۔"

حمیدہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی دیکھ کر مرینہ کے ہونٹوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے موبائل فون کے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور بولی۔

"تمہاری یہ بے چینی ختم ہوسکتی ہے ریحان! لیکن تم میری بات نہیں مان رہے ہو۔ جو کچھ ہوگیا، اسے بھولنے کی کوشش کرو۔ میرا اور تمہارا مقدر یہی تھا۔" مرینہ کے چہرے پر اداسی آگئی۔ "اگر تم شادی کرلو تو مجھے بھلانا تمہارے لیے آسان ہوجائے گا۔"

"کیا تم شادی کرنے کے بعد مجھے بھول سکی ہو مرینہ؟"

"میری مجبوری کو میری شادی نہ کہو!"

"میں یہی تو جاننا چاہتا ہوں کہ آخر کیا مجبوری تھی؟"

"تم یہ سوال کئی مرتبہ کرچکے ہو اور میں جواب بھی دے چکی ہوں کہ فی الحال تو یہ ممکن نہیں کہ میں تمہیں اپنی مجبوری بتاسکوں۔"

"فی الحال سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"پھر وہی بات! میں تمہیں اس کا جواب بھی دے چکی ہوں۔ مستقبل میں شاید مجھے اپنی مجبوری منظر عام پر لانا پڑے۔ اس وقت تم بھی جان لوگے۔"

حمیدہ بھی یہ باتیں سن رہی تھی اور اس کا جسم سنسنانے لگا تھا۔ اگرچہ وہ ریحان کی آواز نہیں سن سکی تھی لیکن مرینہ کی باتوں سے بہت کچھ آشکارا ہوگیا تھا۔

مرینہ اس وقت کہہ رہی تھی۔ "پلیز ریحان! تم مجھے ایک گھنٹے بعد فون کرلینا۔ کوئی سبب ہے جو میں تم سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا!" دوسری طرف ریحان نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رابطہ منقطع کردیا۔

مرینہ نے موبائل ایک طرف ڈالا اور پھر مرینہ کو گھورتے ہوئے بولی۔ "اب ایسا لگ رہا ہے جیسے تم میری پنڈلیاں دبانے کے بجائے بس سہلا رہی ہو۔"

حقیقت بھی یہی تھی کہ حمیدہ کا دھیان مرینہ کی باتوں کی طرف ہوگیا تھا ورنہ پنڈلیاں بڑے اچھے انداز میں دبانا اسے خوب آتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی پنڈلیاں بڑی محبت سے دبایا کرتی تھی۔

"ہاں، اب ٹھیک ہے۔" مرینہ اس وقت مسکرائی جب حمیدہ اس کی پنڈلیاں قاعدے سے دبانے لگی۔

مرینہ نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملائے۔ رابطہ قائم ہونے پر دوسری طرف سے حیدر کی آواز آئی۔ "فرمایئے!" لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔

"ذرا میرے کمرے میں تو آؤ۔" مرینہ نے کہا۔

"زہے نصیب! خادم ابھی حاضر ہوتا ہے۔"

مرینہ نے موبائل آف کردیا۔

حمیدہ کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ مرینہ نے کسے بلایا تھا۔ وہ اس وقت چونکی جب حیدر کمرے میں داخل ہوا۔

حمیدہ کو مرینہ کی پنڈلیاں دباتے دیکھ کر حیدر بھی دروازے ہی پر ٹھٹک گیا تھا۔

"آؤنا!" مرینہ بولی۔ "رک کیوں گئے؟"

حیدر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ اس وقت اپنے وجود میں پانی پانی ہوا جارہا تھا۔ یہ بات بھی اس کے سان گمان میں نہیں آئی تھی کہ اپنی جس بہن کو وہ بہت چاہتا تھا، وہ ایک ملازمہ کی حیثیت سے اس کی بیوی کے پیر دبائے گی۔

دوسری طرف حمیدہ کے لیے بھی اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوا جارہا تھا۔ اپنے بھائی کو وہاں دیکھ کر اس کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ آنکھوں سے آنسو اب ٹپکے اور اب ٹپکے!

"بیٹھو!" مرینہ نے قریب کی کرسی کی طرف اس وقت اشارہ کیا جب حیدر مسہری کے قریب آچکا تھا۔

وہ بیٹھ گیا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں مرینہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کوشش کررہا تھا کہ دوبارہ اس کی نظر حمیدہ پر نہ پڑے۔ دوسری طرف حمیدہ نے بھی اب مستقل طور پر نظریں جھکالی تھیں۔ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ اس جوار بھاٹا کی عکاسی کررہے تھے جو اس کے دل و دماغ میں اٹھ رہا تھا۔

"پہلے جو ملازمہ تھی، اس کا پنڈلی دبانے کا انداز بہت اچھا تھا لیکن وہ عمر دراز ہونے کی وجہ سے مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔" مرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ لڑکی کیونکہ نوجوان بھی ہے اور خوبصورت بھی اس لیے اس کا پنڈلی دبانا مجھے اچھا لگ رہا ہے۔"

وہ خاموش ہوئی تو حیدر نے کہا۔ "کیا یہی بتانے کے لیے مجھے بلایا تھا؟"

"کیا میرا یہ بتانا تمہیں برا لگا؟" مرینہ کی مسکراہٹ میں کٹیلا پن آگیا۔

حیدر نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "میں ابھی اپنے ایک دوست سے ملنے کے لیے روانہ ہونے ہی والا تھا۔ اگر تمہیں کوئی خاص بات نہیں کرنا ہو تو میں جاؤں۔"

"مجھے تمہارے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگ رہا ہے جیسے اس لڑکی کا میرے پیر دبانا تمہیں اچھا نہیں لگ رہا ہے، بلکہ برا لگ رہا ہے یا شاید تمہیں اذیت ہورہی ہے۔"

"کیوں؟" حیدر نے پہلو بدلا۔ "مجھے اذیت کیوں ہوگی؟"

"یہ تو تم ہی جان سکتے ہو! میں کیا بتاؤں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں جاؤں۔" حیدر کھڑا ہوگیا۔ "تمہیں یقیناً مجھ سے کوئی خاص بات نہیں کرنا ہے۔"

"ٹھیک سمجھے ہو تم! بس دل چاہا تھا تمہیں دیکھنے کو، بس اسی لیے بلالیا۔"

مرینہ کا یہ انداز، یہ رویہ حیدر کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ حیدر کی اس قسم کی باتوں پر عموماً ڈانٹنے کا انداز اختیار کرلیتی تھی۔

وہ پھر بولی۔ "اس وقت تم اور یہ لڑکی، دونوں ہی مجھے بہت اچھے لگ رہے ہو۔"

حیدر جھٹکے سے مڑا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت مرینہ کی مسکراہٹ بہت زہریلی ہوگئی تھی۔

حمیدہ بدستور سر جھکائے اس کی پنڈلیاں دباتی رہی۔ اس کی سانسیں کچھ تیز چلنے لگی تھیں اور چہرے پر پسینے کی چمک آگئی تھی۔ اس کا سبب یہی ہوسکتا تھا کہ اسے اپنے بپھرتے ہوئے جذبات کو دبانے کے لیے شدید جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔

"بس اتنا کافی ہے۔" مرینہ نے اس سے کہا۔ "اب تم جاسکتی ہو!"

حمیدہ تیزی سے کھڑی ہوگئی لیکن پھر رک کر نظریں جھکائے ہوئے اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "کیا روز آنا ہے اس وقت؟"

"ضروری نہیں ہے۔" مرینہ نے جواب دیا۔ "اگر تمہیں بلوانا ہوا تو امجد سے کہہ دوں گی۔"

حمیدہ دروازے کی طرف مڑ گئی۔ اس نے مرینہ سے نظریں چرائے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مرینہ نے اس کا سبب بھی سمجھ لیا تھا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے جو وہ مرینہ سے چھپانا چاہتی تھی۔

مرینہ نے اس کی اور حیدر کی ان کیفیات سے لذت حاصل کی تھی۔ جب سے وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بنی تھی، اذیت رسانی کا جذبہ اس میں جیسے کوٹ کوٹ کر بھر گیا تھا۔ کسی کو بھی اذیت میں دیکھ کر اسے خوشی حاصل ہوتی تھی اور خود اذیت پہنچا کر وہ زیادہ لذت حاصل کرتی تھی۔ صرف ریحان ایک ایسا شخص تھا جس کو وہ تکلیف میں نہیں دیکھنا

## حرام و حلال جانوروں کی پیدائش

یہ بھی کم حیران کن بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو ہمارے کھانے کے لیے حلال قرار دیا ہے۔ مثلاً گائے، بکری، مرغی، مچھلی وغیرہ ان کی پیدائش میں ازحد برکت بھی رکھ دی ہے۔ روزانہ لاکھوں کی تعداد میں ذبح ہورہے ہیں مگر ان کی نسلیں ہیں کہ ختم ہی نہیں ہونے کو آتیں۔ جبکہ وہ جاندار جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے ذبح نہ ہونے کے باوجود ان کی نسلیں ختم ہورہی ہیں اور ان کی نسلوں کے تحفظ کی فکر دامن گیر ہے۔

☆☆☆

## سطح زمین پر پہاڑوں کا کردار

زمین کی سطح پر بلند و بالا پہاڑوں نے زمین کی محوری گردش میں ایک نپا تلا توازن قائم کیا ہوا ہے۔ (ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم اپنی گاڑی کے پہیوں میں چھوٹے چھوٹے لوہے کے ٹکڑے چپکا کر کے پہیوں کی محوری گردش کو Balance رکھتے ہیں) بصورتِ دیگر اگر یہ پہاڑ نہ ہوں تو زمین کا محور جغرافیائی اعتبار سے کسی ایک جہت میں قائم نہ رہے بلکہ بدلتا رہے۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلاستون بنایا تم ان کو دیکھ رہے ہو اور زمین پر پہاڑ ڈال رکھے ہیں کہ وہ تم کو لے کر ڈانواڈول نہ ہونے لگے اور اس پر ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام اگائے۔" (سورۃ لقمان 31: آیت 10)

سعید الظفر صدیقی کی کتاب

"ماورائے آب و گل" سے اقتباس

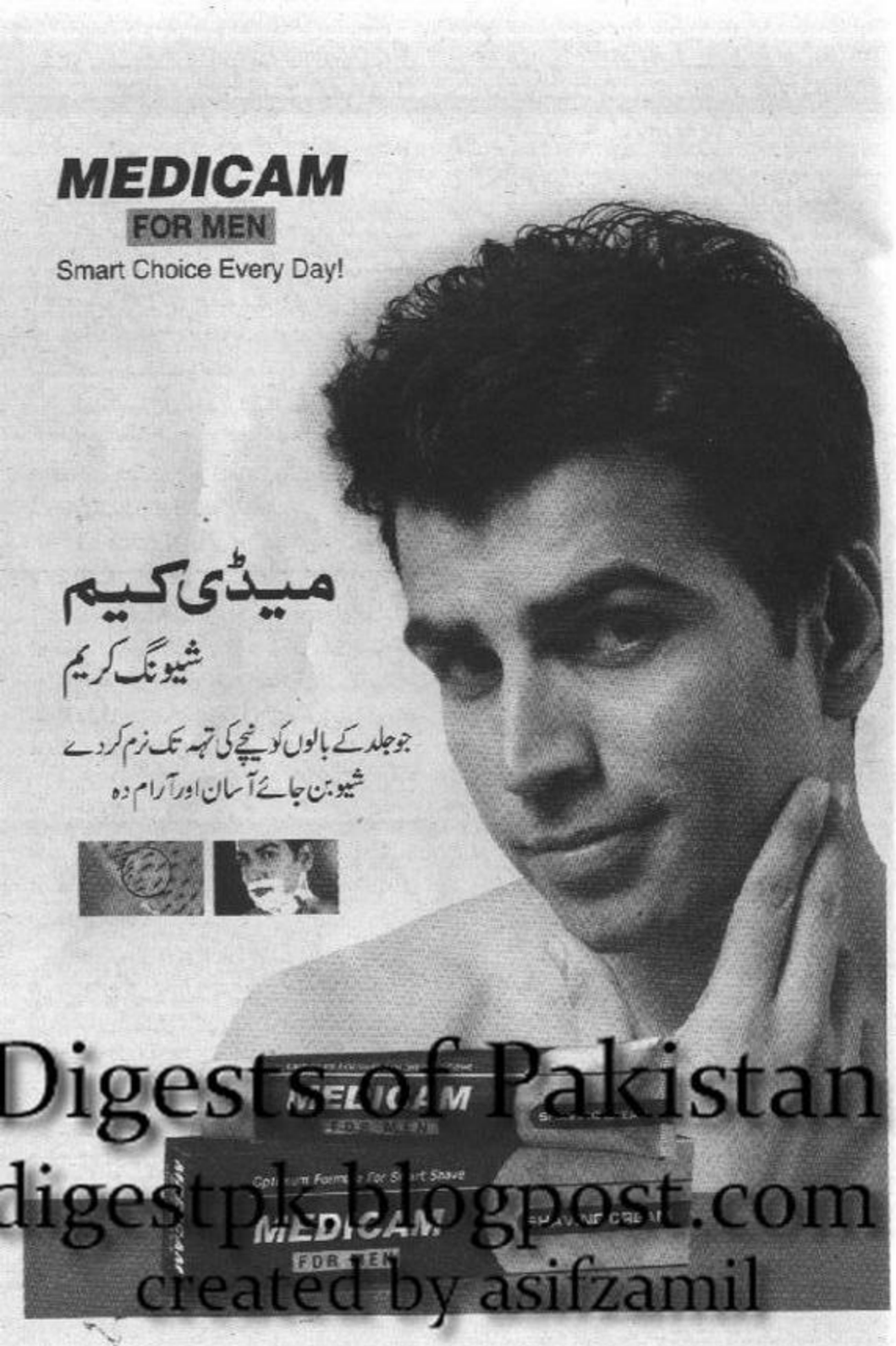

Digests of Pakistan
digestpk.blogpost.com
created by asifzamil

چاہتی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ انہوں نے عہد و پیماں بھی کیے تھے لیکن پھر یکبارگی ایسا ہوا کہ مرینہ کے پُرجوش جذبات کسی سیل آب میں بہہ گئے۔ وہ محبت کے معاملے میں برف کی سل کی طرح ٹھنڈی پڑ گئی اور اداس رہنے لگی۔ ریحان اس کی اداسی کا سبب جاننے کے لیے بہت بے چین رہا لیکن مرینہ نے اسے کچھ نہیں بتایا، اور پھر ایک دن تو ریحان کو جیسے سکتہ ہو گیا۔

''میں کسی سے شادی کر رہی ہوں ریحان!'' مرینہ نے کہا تھا۔ ''تم بھی کسی اچھی لڑکی کا انتخاب کر لو۔ اب میری اور تمہاری زندگی کے دھاروں کو الگ الگ سمتوں میں بہنا ہے۔''

ریحان نے یہ جاننے کی بھی بہت کوشش کی تھی کہ مرینہ کسی اور سے شادی کیوں کر رہی ہے؟ کیا اس شادی کے لیے اس کے باپ کا دباؤ ہے؟ کیا اس کے بڑے بھائی شارب فاروقی نے اسے کسی اور سے شادی پر مجبور کیا ہے؟

اس نوعیت کے ان گنت سوالات ریحان کی زبان پر آئے تھے مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

پھر ایک دن مرینہ نے اس سے فون پر کہا۔ ''میری شادی ہو گئی ہے ریحان! کل میں اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون کے لیے جا رہی ہوں۔''

یہ سن کر ریحان پر قیامت گزر گئی ہو گی اور انسانوں پر ایسی بڑی بڑی قیامتیں گزرتی ہی رہتی ہیں۔

مرینہ مری چلی گئی اور وہاں اس پر اتفاقاً ایک انکشاف ہوا۔

شادی سے قبل مرینہ نے شارب فاروقی سے کہا تھا۔ ''میں اب اگر شادی کروں گی تو صرف کسی ایسے شخص سے کروں گی جو میرا غلام بن کر رہ سکے۔ کوئی ایسا شخص جس کے عزیز و اقربا نہ ہوں جو اس کے حمایتی بن سکیں۔''

اور شارب فاروقی نے اس کے لیے حیدر کو ڈھونڈ نکالا تھا۔

''اس کا دنیا میں کوئی عزیز نہیں ہے۔'' شادی سے پہلے شارب فاروقی نے مرینہ سے کہا تھا۔

لیکن مری میں شارب فاروقی کی یہ بات جھوٹ ثابت ہو گئی تھی۔ وہ ایک اتفاقی سی امر تھا کہ مرینہ ہوٹل میں حیدر سے کچھ کہنے کے لیے اس کے کمرے میں گئی تھی۔ بات مختصر ہی تھی لیکن اسی وقت حیدر کو ٹوائلٹ جانا پڑ گیا تھا۔ دو تین منٹ گزارنے کے لیے مرینہ نے اس کے بستر کے تکیے پر پڑا ہوا اخبار اٹھایا تھا تو تکیہ بھی اپنی جگہ سے کچھ سرک گیا تھا۔ تکیے کے نیچے کوئی رنگین تصویر رکھی ہوئی تھی۔ مرینہ نے متجسس ہو کر وہ تصویر اٹھا لی۔

وہ ایک گروپ فوٹو تھا۔ ایک ادھیڑ عمر مرد، ایک ادھیڑ عمر عورت، ایک خوبصورت نوجوان لڑکی اور چوتھا خود حیدر!

اس تصویر نے وقتی طور پر مرینہ کو ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ تصویر میں حیدر کے ساتھ اس کے ماں باپ اور اس کی بہن تھی۔ مرینہ نے لڑکی کو حیدر کی بہن اس لیے سمجھا کہ وہ تصویر کھنچواتے وقت اپنا ایک ہاتھ حیدر کے گلے میں اور دوسرا ہاتھ ادھیڑ عمر مرد کے گلے میں ڈالے ہوئے تھی۔ اگر وہ حیدر کی بیوی ہوتی تو اس کا ایک ہاتھ ادھیڑ عمر مرد کے گلے میں نہیں ہوتا۔ کوئی بہو اپنے سسر کے ساتھ اتنی بے تکلف نہیں ہو سکتی تھی۔

حیدر کے نقش و نگار میں ادھیڑ عمر مرد کے نقش و نگار کی واضح جھلک موجود تھی اس لیے وہ دونوں باپ بیٹے ہی ہو سکتے تھے۔ ادھیڑ عمر مرد ادھیڑ عمر عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اس لیے وہ اس کی بیوی ہی ہو سکتی تھی۔ گویا حیدر کی ماں!

وہ تصویر تقریباً نئی تھی۔ حیدر اس میں بالکل ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا وہ تھا، اس لیے یہ بات نہیں سوچی جا سکتی تھی کہ اس کے ماں باپ اور بہن مر چکے ہوں گے۔

مرینہ کو یقین ہو گیا کہ اس سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ اس یقین کی وجہ سے اس کے جذبات بپھرے تھے لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ تصویر پھر تکیے کے نیچے دبا دی تھی۔ حیدر جب ٹوائلٹ سے باہر آیا تھا تو اسے مرینہ اخبار پڑھتی ہوئی نظر آئی تھی۔

مرینہ نے اس کے بعد حیدر یا شارب فاروقی پر یہ بات کبھی ظاہر نہیں ہونے دی تھی کہ اسے حقیقت کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے بس ایک فیصلہ کیا تھا کہ حیدر کو اس کے والدین یا بہن سے کبھی نہیں ملنے دے گی۔ اسے یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ لوگ کہاں رہتے تھے لیکن جب کئی مرتبہ حیدر نے کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ کم از کم کراچی میں ہرگز نہیں ہوں گے۔ حیدر انہی سے ملنے کے لیے کراچی سے جانا چاہتا ہو گا۔

مرینہ نے حیدر کو کراچی سے کہیں نہیں جانے دیا۔ اس طرح وہ حیدر کو اذیت پہنچانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ طویل عرصے تک دور رہنے کے باعث حیدر کے ماں باپ اور بہن بھی اذیت میں رہیں گے۔

مرینہ کو اس خیال سے لذت حاصل ہوتی تھی۔ اس نے یہ خود بھی محسوس کر لیا تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس کے مزاج میں یہ تبدیلی آئی تھی۔ دوسروں کو کسی تکلیف یا اذیت میں ڈال کر اسے لذت حاصل ہوتی تھی۔

دو سال بعد ایک روز وہ کہیں باہر سے آئی تو اسے امجد

نے بتایا کہ ایک ادھیڑ عمر جوڑا اور ایک نوجوان لڑکی ایک اٹیچی کیس کے ساتھ رکشا میں کہیں سے آئے تھے اور حیدر نے انہیں چھوٹے ڈرائنگ روم میں بلوالیا تھا۔

مرینہ کو شک تو کیا کسی حد تک یقین ہوگیا کہ وہ حیدر کی بہن اور اس کے والدین ہوں گے۔

امجد ہی سے مرینہ کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ آنے والے تینوں افراد معمولی لباس میں تھے اور وضع قطع سے کچھ آسودہ حال معلوم نہیں ہوتے تھے، اسی لیے مرینہ نے چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔

ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچتی رہی تھی کہ اگر ان لوگوں کے بارے میں اس کا یقین درست ثابت ہوا تو وہ اس منصوبے کو ضرور عملی جامہ پہنائے گی جس نے اس کے دماغ میں بڑی تیزی سے جنم لیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہونے پر اس کا یقین درست ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس نے جو کھیل کھیلا، وہ اس کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ وہ یہ بھی سوچ چکی تھی کہ اگر حیدر کے ماں باپ، بہن یا خود حیدر نے اس کے منصوبے میں کوئی رکاوٹ ڈالی تو وہ ان سب کو بہت ذلیل کر کے اپنے گھر سے نکالے گی اور حیدر کو ایسے قانونی جھمیلے میں ڈالے گی کہ وہ حد درجہ پریشان اور اپنی زندگی سے عاجز ہو جائے۔

مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کے منصوبے کی عمل پذیری میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی تھی اور وہ اس کے لیے ایک لذت خیز معرکہ ثابت ہوا تھا۔ حیدر کو تو وہ اپنا غلام بنائے ہوئے تھی ہی، اب اس نے اس کے ماں باپ اور بہن کو بھی اپنا ملازم بنالیا تھا۔

اور اس دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد لیٹے لیٹے اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ حمیدہ کو اپنے کمرے میں بلا کر اس سے اپنی ٹانگیں دبوائے اور حیدر کو بھی وہاں بلا کر اسے وہ منظر دکھائے۔

اس نے ایسا ہی کیا تھا اور ان دونوں کو پہنچنے والی اذیت سے لطف اندوز ہوتی رہی تھی۔

حمیدہ کے جانے کے بعد وہ ذرا دیر کچھ سوچتی رہی، پھر بڑبڑائی۔ اس دنیا میں میرے ساتھ بھی تو یہی سلوک ہوا ہے، مجھے بھی تو اذیت پہنچائی گئی ہے تو پھر میں دوسروں کے ساتھ یہی سلوک کروں تو اس میں برائی کیا ہے۔'' پھر وہ موبائل فون پر ریحان سے رابطہ کرنے لگی۔

☆☆☆

حیدر اپنے منتشر ذہن کو یکسو کرنے کے لیے اِدھر اُدھر اپنے دوستوں سے ملتا جلتا رہا۔ جب واپس گھر پہنچا تو اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ اس نے غسل کیا اور ہلکا پھلکا لباس پہن کر بستر پر لیٹ گیا۔

کئی گھنٹے تک اس کی کوشش رہی تھی کہ خود کو مجتمع کر لے مگر اسے کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے حاصل شدہ آسائشات کے لیے سمجھوتے تو کر لیے تھے لیکن اس کے والدین اور بہن کے آجانے سے جو صورتِ حال بنی تھی، اس نے اسے اذیت میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ماں باپ اس گھر میں ملازم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور اس کی بہن سے مرینہ اپنی ٹانگیں دبوا رہی تھی۔

اس صورتِ حال کے پیدا ہونے سے پہلے بھی حیدر مکمل طور سے پُرسکون نہیں رہا تھا۔ مرینہ کی شخصیت اس کے لیے الجھن کا سبب بنی رہی تھی۔

مری سے واپس آنے کے چند ماہ بعد اسے توقع تھی کہ مرینہ پھر کوئی ایسا ڈراما کرے گی کہ اپنے بچے کو اپنے پاس واپس لا سکے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

''تم اپنے بچے کو کس طرح واپس لاؤ گی؟'' وہ ایک دن مرینہ سے پوچھ بیٹھا تھا۔

''ابھی مجھے ضرورت نہیں ہے کہ اسے اپنے پاس لاؤں۔'' مرینہ کا جواب تھا۔

''کیسی ماں ہو تم؟'' حیدر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''بچہ جائز ہو یا ناجائز، وہ ماں کے دل کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ اگر ساقط کروا دیا جائے تو دوسری بات ہے مگر جنم دینے کے بعد ماں اس کو خود سے دور نہیں کر سکتی لیکن تم نے اسے اس کی پیدائش کے چند دن بعد ہی خود سے دور کر دیا۔''

''تم سے مطلب؟'' مرینہ نے اسے گھورا۔

''مطلب یہ کہ مجھے صرف حیرت ہوتی ہے تمہارے اس رویے پر۔''

''ضرورت نہیں ہے تمہیں حیرت زدہ رہنے کی۔'' مرینہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''اس بچے سے کوئی تعلق نہیں ہے تمہارا۔ اس کے باپ نہیں ہو تم! آئندہ تم مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کرنا۔''

چنانچہ حیدر نے اس کے بعد وہ موضوع کبھی نہیں چھیڑا تھا لیکن اسے الجھن تو بہرحال لاحق رہی تھی۔ اس کے لیے یہ بہت ہی غیر معمولی بات تھی کہ ایک ماں اپنی اولاد کو خود ہی اپنے آپ سے دور کر دے۔ نامعلوم برقع پوش عورت جس طرح اس بچے کو مرینہ سے لے گئی تھی، اس میں مرینہ کی مرضی کا عمل دخل یقینا تھا۔ وہ عورت اس بچے کو چھین کر نہیں لے گئی تھی۔

اب وہ بچہ کہاں ہوگا؟ کن حالات میں پرورش پا رہا ہوگا؟ حیدر اس بارے میں کچھ نہیں جان سکا۔

کبھی کبھی شارب فاروقی سے اس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ مرینہ جب اپنے باپ سے ملنے جاذب پیلس جاتی تھی تو حیدر کو ضرور اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ شارب فاروقی اور اس کے بیوی بچے بھی وہیں رہتے تھے۔ وہاں بھی سے ملاقات ہوتی تھی، لیکن ایک مرتبہ حیدر، شارب فاروقی سے ملنے اس کے دفتر پہنچ گیا تھا۔

''مجھے حیرت نہیں ہوئی ہے تمہیں یہاں دیکھ کر۔'' شارب فاروقی نے سپاٹ لہجے میں اس سے کہا تھا۔ ''مجھے تو خیال تھا کہ تم مری سے واپس آتے ہی مجھ سے ملو گے۔''

''میں الجھن کا شکار رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپ سے کس طرح بات کروں۔''

''اب آ گیا ہے سمجھ میں؟'' شارب فاروقی کا لہجہ سپاٹ ہی رہا تھا۔

حیدر نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ کسی بات سے بے خبر نہیں تھے۔ مجھے آپ کی باتیں یاد ہیں۔ آپ نے مجبوراً میرا انتخاب کیا تھا کیونکہ جب آپ نے مجھ سے ملاقات کی تھی، اس وقت تک، آپ ہی کے بقول خاصی دیر ہو چکی تھی یعنی اس بچے کو مرینہ کے بطن میں آئے خاصے دن گزر چکے تھے اور کچھ دن گزر جانے کے بعد لوگوں پر یہ بات عیاں ہو جاتی کہ وہ حاملہ تھی۔''

وہ سب باتیں سنتے ہوئے شارب فاروقی کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری رہا تھا۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' حیدر کا سوال تھا۔

''نہیں۔ تمہارا انتخاب میں نے اسی لیے کیا تھا کہ مسئلہ جلد از جلد حل ہو جائے ورنہ یہ بات ڈیڈی پر ظاہر ہوتی تو وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتے۔ وہ دل کے مریض ہیں۔ صدمے سے ان کا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا۔''

''آپ مرینہ کا اسقاط بھی کرا سکتے تھے۔ ایک حل یہ بھی تھا۔''

''مرینہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔''

''آپ بڑے ہیں اور غلطی اس نے کی تھی یا اس سے ہوئی تھی۔ آپ اس پر دباؤ بھی ڈال سکتے تھے۔''

''وہ اس معاملے کے بعد جنونی ہو گئی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ بچے کو جنم ضرور دے گی۔ اگر میں اس پر زیادہ دباؤ ڈالتا تو وہ چیخ پکار مچا دیتی۔ مجبوراً مجھے اس کا دوسرا حل تلاش کرنا پڑا۔'' اتنا بتانے کے بعد شارب فاروقی نے کہا تھا۔ ''تم مجھ سے اس معاملے میں پہلی بار گفتگو کر رہے ہو۔ اس گفتگو کو آخری بھی سمجھنا۔ آئندہ تم مجھ سے یہ باتیں نہیں کرو گے مگر آج تم مجھ سے وہ سب کچھ پوچھ لو جو تمہارے دماغ میں طوفان برپا کیے ہوئے ہوگا۔ جس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے، وہ میں ضرور دوں گا لیکن تمہارے دماغ میں کچھ ایسے سوال بھی ہو سکتے ہیں جن کا جواب شاید میں نہ دے سکوں یا نہ دینا چاہوں۔''

''میں اب کچھ زیادہ سوال نہیں کرنا چاہتا۔ صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس بچے کا باپ کون ہے!''

شارب فاروقی چند لمحے حیدر کو گھورتا رہا، پھر بولا۔ ''مرینہ سے پوچھا تھا یہ تم نے؟''

''ہاں۔''

''اس نے کیا بتایا؟''

''اگر اس نے بتا دیا ہوتا تو میں آپ سے کیوں پوچھتا!''

''اگر اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تو میں بھی تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔'' شارب فاروقی نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔

''گویا آپ اسے جانتے تو ہیں۔''

''اب تم جا سکتے ہو۔'' شارب فاروقی کا لہجہ یکا یک سخت ہو گیا۔

حیدر نے پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن شارب فاروقی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکتے ہوئے اپنا جملہ دہرایا تھا۔ ''اب تم جا سکتے ہو اور میری یہ بات بھی یاد رکھنا کہ آئندہ تم اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کرو گے۔''

''میں صرف ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔'' حیدر نے ہمت کی تھی۔ ''مرینہ نے وہ بچہ غائب کیوں کر دیا؟''

شارب فاروقی اسے پھر گھورنے لگا۔ کچھ توقف سے اس نے پوچھا۔ ''تم اس بارے میں کسی بھی حد تک کچھ جانتے ہو؟''

''صرف اتنا کہ مری سے لوٹتے ہوئے راولپنڈی کے ایئرپورٹ پر مرینہ نے وہ بچہ ایک برقع پوش عورت کے حوالے کر دیا تھا۔''

''اس کے علاوہ؟''

''اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''اب میں اپنی بات پھر دہراؤں گا۔ تم جا سکتے ہو۔''

"لیکن....."

شارب فاروقی نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"اب تم جاسکتے ہو۔" اس نے دانت پر دانت جما کر کہا تھا۔

اس کے بعد حیدر کے لیے شارب فاروقی سے کوئی اور بات کرنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ بس سوچتا ہی رہا کہ شارب فاروقی اس بچے کے باپ سے بھی واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ بچہ کہاں گیا۔

مگر چند ہی دن بعد حیدر کا ایک خیال غلط ثابت ہوگیا۔ وہ اس شام اپنے نئے معمول کے خلاف جلدی گھر پہنچ گیا تھا۔ پورچ میں اس نے شارب فاروقی کی کار کھڑی دیکھ لی تھی۔ اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔ وہاں نہ مرینہ تھی، نہ شارب فاروقی! حیدر اس وقت چونکا جب اس نے ٹی وی لاؤنج کی طرف سے آنے والی آوازیں سنیں۔ وہ آوازیں مرینہ اور شارب فاروقی ہی کی تھیں لیکن حیدر کی سمجھ میں فوری طور پر نہیں آسکا تھا کہ وہ دونوں کیا باتیں کررہے تھے۔ حیدر اس وقت غیر ارادی طور پر ٹی وی لاؤنج کی طرف لپک پڑا تھا۔ اس وقت اس نے مرینہ کی چیختی ہوئی سی آواز سنی۔

"میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی کہ وہ بچہ کہاں گیا۔" اس نے ہذیانی انداز میں کہا تھا۔ "مجھ سے یہ بات کبھی نہ پوچھی جائے۔"

مرینہ کے اس طرح چیخنے سے حیدر اتنا بوکھلا سا گیا تھا کہ اس نے چھپ کر ان دونوں کی باتیں سننے کے بجائے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس کی آہٹ شارب فاروقی نے بھی سن لی تھی اور مرینہ نے بھی! وہ دونوں ہی بڑے غصے سے حیدر کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ حیدر کو اندیشہ لاحق ہوا تھا کہ وہ دونوں ہی اس پر برس پڑیں گے لیکن کم از کم شارب فاروقی نے ایسا نہیں کیا۔ وہ مڑ کر تیزی سے چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ حیدر نے اسے جلدی سے راہ دے دی تھی اور وہ باہر نکل گیا تھا۔

"تم یہاں کیوں آگئے؟" مرینہ حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے چیخی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ وحشت زدہ سا تھا۔ غالباً شارب فاروقی سے اس کی خاصی تیز گفتگو ہوچکی تھی اور حیدر کے خیال کے مطابق موضوع گفتگو وہ بچہ ہی تھا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں کون کون ہے۔" حیدر نے دھیمی آواز میں جواب دیا تھا۔

مرینہ چند لمحے اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی رہی تھی اور پھر پیر پٹخنے کے انداز میں چلتی ہوئی ٹی وی لاؤنج سے نکل گئی تھی۔

حیدر گم صم کیفیت میں بنگلے سے باہر نکلا تھا تو اسے شارب فاروقی کی کار دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

یہ حیدر کے لیے ایک غیر معمولی معما بن گیا کہ مرینہ نے اپنے ناجائز بچے کو گویا ساری دنیا ہی سے چھپا لیا تھا۔ یہ معاملہ وہ شارب فاروقی کے لیے بھی راز رکھنا چاہتی تھی کہ اس نے بچے کو کہاں بھیج دیا تھا۔

مگر کیوں بھیج دیا تھا؟ یہ سوال حیدر کے دماغ پر ہمیشہ ضربیں لگاتا رہا۔

حیدر کے لیے یہ بات بھی تعجب خیز تھی کہ مرینہ نے شارب فاروقی کو بھی بچے سے بے خبر رکھا تھا حالانکہ شارب فاروقی نے اس کے ساتھ ہمدردی ہی کی تھی۔ اس نے یہ بھی برداشت کرلیا تھا کہ اس کی بہن کسی کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس نے مرینہ کو بدنامی سے بچانے کے لیے اسے شادی پر آمادہ کیا تھا اور اس کی شرط کے مطابق حیدر جیسے شخص کو تلاش بھی کیا تھا جسے وہ اپنے غلام کی طرح رکھ سکتی تھی۔

شارب فاروقی کے اس رویے کا ایک سبب یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے بیمار باپ کو اس صدمے سے بچانا چاہتا ہوگا۔

شارب فاروقی سے ملنے کے بعد حیدر کے دماغ میں دو خیال رچ بس گئے تھے لیکن اس میں سے ایک خیال غلط ثابت ہوجانے کے بعد وہ شبہ کرنے لگا تھا کہ شاید اس کا دوسرا خیال بھی غلط ثابت ہو۔ یعنی شارب فاروقی کو علم نہ ہو کہ مرینہ کس کے ناجائز بچے کی ماں بنی تھی۔ اسے کسی طرح بس یہ معلوم ہوگیا تھا کہ مرینہ نہیں "ٹھوکر" کھا چکی تھی۔

جاذب فاروقی کا خاندان بہت بڑا تو نہیں لیکن بہت چھوٹا بھی نہیں تھا۔ اس مختصر سے خاندان میں دو نوجوان ایسے تھے جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ انور اور افسر جو جاذب فاروقی کے مرحوم بھائی کے بیٹے تھے۔ وہ دونوں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ جاذب پیلس ہی میں رہتے تھے۔ حیدر کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جاذب فاروقی کا مرحوم بھائی اپنی بیوہ اور دونوں بیٹوں کے لیے کوئی ترکہ چھوڑے بغیر دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ یہ جاذب فاروقی کی اقربا پروری تھی کہ اس نے انور، افسر اور ان دونوں کی ماں کو جاذب پیلس میں اس طرح جگہ دی تھی جیسے وہ اس گھر کے لازمی افراد ہوں۔ افسر اور انور چار چار چھ چھ سال کے تھے جب ان کے باپ نے دنیا سے کوچ کیا تھا۔ اس وقت ان دونوں کی ماں کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

"چچی نے دوسری شادی کے بارے میں کبھی سوچا ہی



نہیں۔" شارب فاروقی کسی موقع پر رواروی میں حیدر کو بتا چکا تھا۔

افسر اور انور سگے بھائی ہونے کے باوجود مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ انور، افسر سے دو سال بڑا تھا۔ نہایت سنجیدہ اور متین کیونکہ جاذب فاروقی کے مختلف النوع کاروبار تھے اس لیے ایک کاروبار کی دیکھ بھال اس کے سپرد کردی گئی تھی لیکن افسر اس قابل تھا ہی نہیں کہ اسے کسی قسم کی ذمے داری سونپی جاسکتی۔ وہ شرابی، جواری اور عیاش نوجوان تھا۔ اسے جاذب فاروقی کی شرافت یا مرحوم بھائی کی محبت ہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ افسر کی ان تمام عادات کو برداشت کرتا رہا تھا۔

افسر نے کبھی مرینہ سے ملنے کے لیے اس کے بنگلے پر آنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ بس انور کبھی کبھی آجایا کرتا تھا لیکن مرینہ کے سرد رویے کے باعث اس کی آمد بھی بتدریج کم ہوتی چلی گئی تھی۔

حیدر نے بہت سوچا تھا کہ شاید انہی دونوں میں سے کوئی مرینہ کے بچے کا باپ ہو لیکن اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی تھی جس سے اس کے شک کو توانائی مل سکتی۔ اس نے زیادہ شک افسر پر کیا تھا جو شرابی اور عیاش تھا لیکن جب بھی مرینہ اور حیدر جاذب پیلس گئے تھے اور اس وقت وہاں افسر بھی ہوا تھا تو حیدر نے یہ بات شدت سے محسوس کی تھی کہ وہ مرینہ سے گریزاں ہی رہتا تھا۔ گریزاں بھی کچھ اس طرح جیسے مرینہ کو شدت سے ناپسند کرتا ہو۔

تو پھر وہ کون ہے؟

حیدر کے دماغ میں یہ سوال اکثر گونجا کرتا تھا۔ اس کے علم میں ریحان کی شخصیت تھی آچکی تھی جس سے مرینہ اب بھی محبت کرتی تھی۔ وہ حیدر کے سامنے بھی موبائل فون پر اس سے باتیں کیا کرتی تھی۔ انہی باتوں کی وجہ سے حیدر کو یقین تھا کہ مرینہ کے بچے کا باپ ریحان نہیں ہوسکتا..... اس کی اور مرینہ کی گفتگو سے یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی تھی۔ حیدر کے اندازے کے مطابق ریحان کو اس کا علم بھی نہیں تھا کہ مرینہ کسی بچے کو جنم دے چکی تھی۔

حیدر نے یہ اندازہ بھی لگایا تھا کہ ریحان اور مرینہ کا رابطہ اب صرف موبائل فون کی حد تک تھا۔ مرینہ اس سے ملنے نہیں جاتی تھی لیکن یہ اندازہ ہونے کے باوجود حیدر ایک مرتبہ اس سے پوچھ بیٹھا تھا۔

"شادی کے بعد تم ریحان سے کبھی نہیں ملیں؟"

"تم سے مطلب؟" مرینہ اسے گھورتے ہوئے بولی

## برف

ایک سردار کو ایک میت والے گھر سے مار پڑ گئی۔ وجہ؟ لوگ میت کے گرد برف رکھ کر رو رہے تھے۔ وہ سردار میت کے قریب آکر اسے زور زور سے ہلاتے ہوئے بولا۔ "او ماما ہن تے اٹھ جا۔ برف دے گا بک تیری جان نوں رو ندے پے نے۔"

مراسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم

تھی۔ "میں نے تو تم سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم رضیہ سے کب ملتے ہو اور کب نہیں ملتے۔"

رضیہ ایک کال گرل تھی جس سے حیدر کے تعلقات بہت بڑھ چکے تھے۔

مرینہ ہنس رہی تھی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم اس پر بے تحاشا پیسا لٹا رہے ہو لیکن میں نے تم سے اس بارے میں کبھی نہیں پوچھا۔ تم اس پر جتنا چاہو، لٹاؤ، میری بلا سے۔ وہ تمہارا پیسا ہے، تمہاری تنخواہ ہے۔"

حیدر کو ماہانہ پچاس ہزار روپے ملتے تھے، اسے مرینہ "حیدر کی تنخواہ" کہا کرتی تھی جو اسے ملازم شوہر کی حیثیت سے ملا کرتی تھی۔

جاذب فاروقی سے مرینہ کو اخراجات کے لیے دو لاکھ روپے ماہانہ ملا کرتے تھے۔ اسی میں سے پچاس ہزار روپے اس کے اکاؤنٹ سے حیدر کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوجایا کرتے تھے۔

حیدر اپنے ان پیسوں میں سے بیس ہزار روپے اپنے والدین کو بھیجا کرتا تھا مگر اچانک ان لوگوں کے آجانے سے اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسی دن وہ تاریخ تھی جس دن وہ ان لوگوں کو پیسے بھیجا کرتا تھا مگر اس دن وہ لوگ اسی گھر میں موجود تھے، اسی کے گھر میں، اس گھر کے ملازمین کی حیثیت سے۔

حیدر نے اسی رات چاہا تھا کہ موبائل فون پر حمیدہ سے رابطہ کرے لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ حمیدہ سے کیا بات کرسکتا ہے۔

اب دوسری رات آچکی تھی۔ دس بج چکے تھے۔ حیدر پھر سوچ رہا تھا کہ حمیدہ سے رابطہ کرے۔ گھنٹا بھر کی کشمکش کے بعد آخر اس نے حمیدہ کے نمبر ملائے لیکن رابطہ نہیں ہوسکا۔ حمیدہ کا موبائل بند تھا۔

پندرہ پندرہ منٹ کے وقفے سے حیدر نے چھ مرتبہ

کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہوسکا۔ حیدر الجھن میں پڑ گیا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ حمیدہ نے اپنا موبائل فون بند کیوں کر رکھا ہے۔

اسی الجھن میں کسی وقت اسے نیند آ گئی۔ نیند سے وہ اس وقت چونکا جب اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا جب اس نے اسکرین پر حمیدہ کا نام دیکھا۔

کچھ تذبذب کے ساتھ حیدر نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو'' کہتے وقت اس کی آواز میں مردنی تھی۔

''بھیا!'' حمیدہ کی بھرائی ہوئی سی آواز آئی۔ ''اگر گھنٹی سے ان محترمہ کی آنکھ کھل گئی ہو تو آپ رانگ نمبر کہہ کر بند کر دیں۔ میں پھر کسی وقت فون کر لوں گی۔'' یہ سب کچھ اس نے بڑی جلدی جلدی کہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ مرینہ بھی حیدر کے ساتھ ہوگی۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ دونوں ایک خواب گاہ میں صرف دو دن سوئے تھے جب شادی کے بعد وہ جاذب پیلس میں تھے اور وہ بھی اس طرح کہ حیدر نے وہ راتیں صوفے پر لیٹ کر گزاری تھیں۔

''نہیں حمیدہ!'' حیدر نے کہا۔ ''اس کی آنکھ نہیں کھلی اور میں تم سے بات کرتے ہوئے کمرے سے نکل آیا ہوں۔'' شرمندگی سے بچنے کے لیے وہ یہ جھوٹ بولنے پر مجبور تھا۔

''شکر ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔ ''بھیا میں کل سے ہی سوچ رہی تھی کہ آپ سے بات کروں لیکن یہاں آنے کے بعد دل و دماغ قابو میں ہی نہیں رہے تھے۔ اس وقت اماں ابا سو رہے ہیں تو میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ میں آپ کو.....'' حمیدہ کی آواز اس کے گلے میں گھٹنے لگی۔ اس نے بہ مشکل دوبارہ کہا۔ ''میں آپ کو شادی کی مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔''

حیدر پہلو بدل کر رہ گیا۔ حمیدہ نے جو بات کی تھی، اس کے جواب میں کچھ کہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

حمیدہ نے غالباً اپنی جذباتیت پر قابو پانے کی کوشش کی تھی ورنہ مبارک باد دینے کے بعد اس سے بولا ہی نہیں جاتا۔ وہ بہت روہانسی ہوگئی تھی۔ اب اس نے سنبھالا لینے کے بعد کہا۔ ''دوسری مبارک باد اس بات کی بھی دوں گی بھیا کہ ہم لوگ اب آپ کی بیوی کے ملازم ہیں۔''

یہ جملے ایک خنجر تھے جو کسی نشتر کی طرح حیدر کا دل چیر گئے۔

''کچھ بولیے بھیا!'' حمیدہ کچھ توقف سے بولی۔ ''یا آپ اپنی بیوی کی ملازمہ سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتے ہو۔''

''حمیدہ!'' حیدر کے لہجے میں کرب تھا۔

''جی بھیا!'' حمیدہ بولی۔

''غلطی تم لوگوں کی ہے۔'' حیدر نے کہا۔ ''تم لوگوں کو یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے ہمیشہ تم لوگوں کو لکھا تھا کہ میں اپنے گھر پر بہت کم رہتا ہوں۔ ملازمت ایسی ملی ہے کہ مجھے شہروں شہروں گھومنا پڑتا ہے۔ شادی کے فوراً بعد تو میں چھ ماہ تک مری ہی میں رہا تھا۔ میں نے اپنا دوسرا خط تم لوگوں کو وہیں سے لکھا تھا۔''

''ہاں بھیا!'' حمیدہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب ہم نے دیکھ بھی لیا ہے کہ آپ کو کس قسم کی ملازمت ملی ہے۔''

یہ جملہ بھی نوکیلا تھا جسے حیدر نے نظر انداز کیا اور کہا۔ ''اب بہتر یہی ہے کہ تم لوگ کل ہی لاہور واپس چلے جاؤ۔ مرینہ تمہیں ملازمت کرنے پر مجبور تو نہیں کر سکتی۔''

''ابا ابھی یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے آپ کے یہاں کے معاملے کو سمجھ لیں۔''

''کیا ضروری ہے کہ وہ ابھی سمجھیں۔ تم لوگ بس واپس چلے جاؤ۔ میں کسی دن لاہور آؤں گا تو بتاؤں گا۔''

''یہ تو آپ دو سال سے لکھتے رہے ہو بھیا کہ کسی دن لاہور آؤں گا لیکن آپ کو محترمہ سے کہیں جانے کی اجازت ہی نہیں ملتی ہوگی۔ خیر، چھوڑیں! آپ کو میری باتوں سے تکلیف پہنچ رہی ہوگی۔ آپ مجھے کو فون پر ہی بتا دو بھیا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟''

''بات ایسی نہیں کہ فون پر سمجھائی جا سکے۔ سامنے بیٹھ کر ہی بات کی جا سکتی ہے۔''

''اور ایسا ہوگا نہیں!'' حمیدہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

''ہوگا۔'' حیدر نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''میں کسی نہ کسی طرح لاہور آؤں گا۔''

''بھیا!'' اس مرتبہ حمیدہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ ''کیا آپ ان محترمہ کو یہ نہیں بتا سکتے کہ ہم آپ کے کون ہیں؟''

''ہاں۔'' حیدر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''نہیں بتا سکتا۔''

''اتنی مجبوری کی زندگی گزار رہے ہو آپ؟''

حیدر نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''تم ابا کو سمجھاؤ۔ یہ بھی بتا دینا کہ تم نے مجھ سے بات کی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔''

''ابا نہیں مانیں گے۔ میں نے اماں سے ان کی باتیں سنی ہیں۔ جب تک آپ خود ان سے بات نہیں کریں گے، وہ یہاں سے نہیں جائیں گے، یا اس وقت جائیں گے جب خود آپ کے معاملات کو سمجھ لیں گے۔''

''میں ان سے کس طرح مل سکتا ہوں۔'' حیدر نے بے بسی سے کہا۔ ''اگر میں سرونٹ کوارٹر میں آؤں گا تو امجد یا



کسی بھی ملازم کی نظر مجھ پر پڑ جائے گی اور جب اماں ابا گھر میں کام کر رہے ہوتے ہیں تو بھی میں ان سے بات نہیں کر سکتا۔ امجد کسی وقت بھی گھر میں آ جاتا ہے اور مرینہ بھی دن میں بہت کم کہیں جاتی ہے۔''

''تب تو پھر ابا یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔''

حیدر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! دیکھو میں کوشش کروں گا کہ گھر میں ہی کسی وقت مجھے ان سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔ یہ میرے لیے بہت اذیت ناک ہے کہ تم لوگ اس گھر میں ملازمت کرو۔''

''مجھے ان محترمہ کی ٹانگیں دباتے ہوئے آپ کو کیسا لگا تھا؟''

''حمیدہ!'' حیدر نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''معاف کرنا بھیا!'' حمیدہ جلدی سے بولی۔ ''ابھی میں نے خود چاہا تھا کہ آپ سے ایسی باتیں نہ کروں جن سے آپ کو تکلیف پہنچے۔ جانے کیسے یہ بات میرے منہ سے نکل ہی گئی۔ آپ مجھے معاف کر دو بھیا!''

''بس ٹھیک ہے۔'' حیدر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب تم سو جاؤ۔''

''ہاں۔'' حمیدہ نے بھی ٹھنڈی سانس لی۔ ''سو ہی جاؤں گی۔''

رابطہ منقطع کرنے کے بعد حیدر کو خیال آیا کہ وہ حمیدہ سے ایک بات پوچھنا بھول گیا تھا۔ وہ اپنا موبائل کیوں بند کیے رکھتی تھی۔

☆☆☆

صبح عدیل احمد بنگلے میں گیا اور خانساماں سے ناشتا لے کر آ گیا۔ حمیدہ جب سے بیدار ہوئی تھی، سوچ میں ڈوبی رہی تھی۔ جب وہ تینوں ناشتا کرنے بیٹھے تو حمیدہ نے انہیں اپنی اور حیدر کی گفتگو سے آگاہ کیا۔

قدسیہ تو بے چینی سے پہلو بدلنے لگی تھی لیکن عدیل احمد کے چہرے پر تفکر اور سوچ بچار کے علاوہ کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' سب کچھ سننے کے بعد کچھ توقف سے عدیل احمد نے کہا۔ ''دیکھتا ہوں کہ وہ بنگلے میں مجھ سے ملتا ہے یا نہیں، اور اگر ملتا ہے تو کیا بتاتا ہے لیکن آج شاید ممکن نہ ہو۔''

''کیوں؟'' قدسیہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''خانساماں بتا رہا تھا۔ مرینہ کے باپ کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ کوئی آدھے گھنٹے پہلے

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
نورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں۔
رابطہ: شمر عباس
(فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

فون آیا تھا جاذب پیلس سے۔ مرینہ بہت عجلت میں حیدر کو اپنے ساتھ لے کر جاذب پیلس چلی گئی ہے۔"

"تو وہ ساتھ بھی رکھتی ہے بھیا کو۔" حمیدہ اتنی دھیمی آواز میں بڑبڑائی کہ عدیل احمد اور قدسیہ کچھ نہ سن سکے۔ وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کچھ نہیں ابا!" حمیدہ جلدی سے بولی۔ "نہ جانے کیا بکنے لگی تھی میں۔"

"اچھا اب چلو۔" عدیل احمد نے قدسیہ سے کہا۔

"کہاں؟" حمیدہ پوچھ بیٹھی۔

"ملازمت پر۔" عدیل احمد نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن وہ دونوں تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ مالک گھر میں ہو یا نہ ہو، ملازمین کو تو اپنے کام کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ابھی مجھے امجد بھی ملا تھا۔ اس نے مجھے بتایا بھی تھا کہ آج ہمیں کیا کیا کام کرنا ہیں۔"

"وہ کیا سپروائزر ہے اس گھر کا!" حمیدہ نے منہ بنایا۔

"اس کے انداز تو کچھ ایسے ہی ہیں۔" عدیل احمد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا، پھر قدسیہ سے بولا۔ "اٹھو بھئی!"

"ابا!" حمیدہ جلدی سے بولا۔ "مجھے کچھ پیسے دے جاؤ آپ! میں تھوڑی دیر کے لیے شمع کے گھر ہو آؤں گی۔ آج مالکن تو گھر پر ہیں نہیں۔" حمیدہ کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "آج تو میرا بلاوا نہیں آئے گا۔"

"ضروری تو نہیں کہ وہ سارے دن نہ آئے۔"

"میں بھی سارے دن کے لیے تو نہیں جاؤں گی۔ بس گھنٹے دو گھنٹے میں یا زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک آ جاؤں گی۔"

اس وقت ساڑھے آٹھ بجے تھے۔

"لیکن۔" عدیل احمد نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارا اکیلے جانا مناسب نہیں ہوگا۔ اجنبی شہر ہے یہ تمہارے لیے اور تمہارے لیے کیا ہم تینوں ہی کے لیے اجنبی جگہ ہے۔"

"شمع کے گھر کا پتا بہت آسان ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا نا! میں نے کل شام کو بھی اسے فون کیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کوئی بھی رکشا، ٹیکسی والا مجھے بڑی آسانی سے اس کے گھر پہنچا دے گا اور وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اگر میں کہوں تو وہ مجھے لینے بھی آ جائے۔"

"نہیں نہیں۔" قدسیہ جلدی سے بولی اور پھر اس نے عدیل احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے یہاں بلانا تو ٹھیک نہیں ہوگا نا۔"

"تم نے اسے کیا بتایا تھا؟" عدیل احمد نے حمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مطلب یہ کہ..... ہم لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"میں نے اسے بتایا تھا کہ میرے بھیا یہاں ایک بڑے آدمی کے پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت سے ملازمت کر رہے ہیں اور بھیا نے اس بڑے آدمی سے کہہ کر ہمیں اس کے بنگلے کا ایک کمرا دلوا دیا ہے۔ ہم لوگ بھیا سے ملنے کے لیے آئے ہیں اور چند روز بعد واپس چلے جائیں گے۔"

"بات تو ٹھیک بنائی تو نے۔" قدسیہ نے کہا اور پھر عدیل احمد کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اپنے خیال کی تائید چاہتی ہو۔

"ہاں جواب تو اس نے ٹھیک دیا ہے شمع کو۔" عدیل احمد نے قدسیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی..... نہ جانے کیوں..... مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا ہے کہ وہ یہاں آئے۔"

"تو پھر میں چلی جاتی ہوں۔" حمیدہ بولی۔

"ابھی کیا کہا تھا میں نے۔" عدیل احمد نے اسے گھورا۔ "یہ شہر تمہارے لیے اجنبی ہے، پتا کتنا بھی آسان ہو، اجنبی جگہ تو اجنبی ہی ہوتی ہے۔"

"ایک تدبیر اور بھی ہو سکتی ہے۔" حمیدہ نے جلدی سے کہا۔ "جب ہم یہاں آئے تھے تو اسی سڑک کے موڑ پر کے ایف سی والوں کا ریسٹورنٹ دیکھا تھا۔ میں شمع کو وہیں بلا لیتی ہوں۔ اسے علاقے کا نام تو میں نے بتا ہی دیا ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس علاقے کا تو ایک ایک چپہ اس کا دیکھا ہوا ہے۔"

عدیل احمد پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"جانے بھی دیں اسے!" قدسیہ بولی۔ "یہ اکیلی پڑے پڑے گھبراتی ہی رہے گی۔"

"کل بھی گھبراتی رہی تھی۔" حمیدہ نے لقمہ دیا۔ "وہ تو بس تھوڑی سی دیر کے لیے بنگلے میں بلا لیا گیا تھا۔"

"اچھا!" عدیل احمد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بلا لو شمع کو! چلی جاؤ اس کے ساتھ۔"

"کچھ پیسے تو دے دیں۔" حمیدہ نے کہا۔ "وہ مجھے لینے کے لیے ٹیکسی ہی میں آئے گی اور یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ ٹیکسی والے کو پیسے بھی وہی دے۔"

عدیل احمد نے اسے پانچ سو کا ایک نوٹ دے دیا۔ اس نے لاہور سے چلتے وقت سفر خرچ کے علاوہ پانچ ہزار روپے بھی اپنے ساتھ رکھے تھے۔

جاری ہے